بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

مئی 2018

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیرِ اعلیٰ	محمود ریاض
مدیرہ	رضیہ جمیل
مدیرِ منتظم	آذر ریاض
مدیرِ اعزازی	امت الصبور
فلم ٹیلی وژن	شاہین رشید
اشتہارات	خالدہ جیلانی
قانونی مشیر	نور الدین سرکی اینڈ کمپنی ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار، کراچی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے

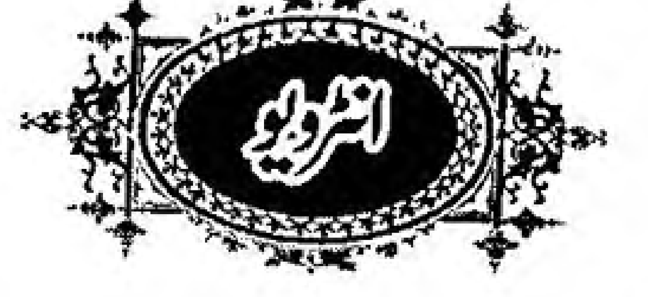
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

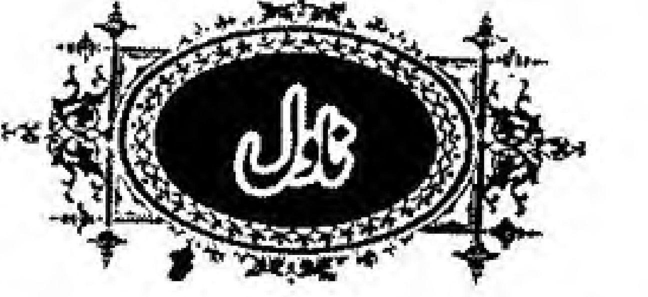
MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز



















مئی 2018
جلد 32 شمارہ 9
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا -

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسانہ نگار

شعاع کا مئی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو رمضان المبارک کے شروع ہونے میں چند ہی دن باقی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ ایک مرتبہ پھر رحمتوں، بخششوں، عظمتوں اور مغفرتوں والا مہینہ رمضان المبارک سایہ فگن ہو رہا ہے۔

اس ماہِ مقدس میں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ اس مہینے میں وہ مبارک اور بابرکت رات ہے جس میں رحمتوں اور برکتوں کے ساتھ زمین پر فرشتوں کا بھی نزول ہوتا ہے۔ یہ ایک رات جسے لیلۃ القدر کہا جاتا ہے، ہزار مہینوں سے بہتر رات ہے۔ رمضان المبارک وہ ماہِ مبارک ہے جس میں قرآن پاک نازل کیا گیا۔ جو تمام انسانوں کے لیے سراسر ہدایت اور قیامت تک کے لیے ایک زندہ و جاوید معجزہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام حمید میں رمضان المبارک کے روزوں کو فرض قرار دیا۔ روزہ افضل ترین عبادت و اطاعت ہے۔ اس کا ثواب بھی سب سے عظیم ہے۔ یہ ایک ماہ کا تربیتی پروگرام ہے۔ روزوں کی فرضیت کا مقصد تقویٰ اختیار کرنا ہے۔ صرف بھوکا پیاسا رہنے سے روزے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ بلکہ روزہ کی حالت میں ان تمام گناہوں کو چھوڑنا بھی ضروری ہے۔ جو ہر حال میں حرام ہیں۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کے مہینے میں نیکیوں میں اضافہ کرنے کا موقع دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکرانہ اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے روزہ کی اصل روح کے مطابق رکھے جائیں۔

محمود ریاض صاحب،

کچھ لوگ زندگی کے افق پر ایک روشن اور تاباں ستارے کی طرح ابھرتے ہیں۔ دنیا کو منور کرتے ہیں اور روشنی کا، امید کا، سچائی کا، محبت کا پیغام دے کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

محمود ریاض صاحب کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ ذاتی حوالے سے وہ کچھ المیوں سے ضرور گزرے لیکن مجموعی طور پر وہ ایک کامیاب اور بامقصد زندگی جیے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جو اصول وضع کیے، ان پر ساری زندگی کاربند رہے۔ انہوں نے اپنے اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، جو مقصد متعین کیا، اس میں کامیاب ٹھہرے۔

انسان کی اس سے بڑی کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اس کے اچھے کام باقی رہیں۔ اسے اچھے نام سے یاد کیا جائے۔ اس کے لیے بہت سے لب دعاگو رہیں۔

محمود ریاض صاحب آج اس دنیا میں نہیں لیکن ان کے روشن کیے چراغ یاس، ناامیدی اور غم کے اندھیروں میں امید، ہمت اور حوصلے کی علامت ہیں۔ تاریکی میں روشنی کی کرن ہیں۔ لاکھوں ذہنوں کو علم کی روشنی سے منور کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- فرزانہ کھرل کا مکمل ناول ۔ تو مکین شہر جمال کا،
- مہوش افتخار کا مکمل ناول ۔ شب تاب،
- مسکان قریشی کا مکمل ناول ۔ ثمرہ اور ثمرہ،
- سلویٰ سیف اللہ بٹ کے ناول کی آخری قسط،
- صائمہ اکرم اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- سائرہ رضا کا ناولٹ ۔
- افشین نعیم، قرۃ العین سکندر، قرۃ العین خرم ہاشمی اور سویرا فلک کے افسانے،
- بندھن ۔ آواز کی دنیا کا معتبر نام ۔ ہما کاشف،
- آنکھوں کے ماہر ڈاکٹر اسد جاوید سے ملاقات،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

تیری قدرت سے جو بندہ آشنا ہوتا نہیں
واقفِ اسرارِ لفظ لا اِلٰہ ہوتا نہیں

جتنے احسانات ہیں بندوں پہ تیرے اے خدا
رات دن سجدے کریں تو حق ادا ہوتا نہیں

زندگی بھر میں اگر حمد و ثنا لکھتا رہوں
ایک بھی نعمت کا یارب حق ادا ہوتا نہیں

تو ہی ان کا ہے سہارا اے خدائے ذوالجلال
جن کا اس دنیا میں کوئی آسرا ہوتا نہیں

سر نہیں اس سر کو تو کچھ اور کہنا چاہیے
جو مرے مولا ترے آگے جھکا ہوتا نہیں

جو کرے مولا تری حمد و ثنا صبح و مسا
ایسا انسان زندگی بھر بے نوا ہوتا نہیں

جو خدا کے نام پر قربان ہو جائے قمر
وہ بظاہر مر تو جاتا ہے فنا ہوتا نہیں

ریاض حسین قمر

آنکھوں میں بس گیا ہے مدینہ حضورؐ کا
دل میں سما گیا ہے مدینہ حضورؐ کا

جنت کی آرزو کبھی دل میں نہ لائے گا
جو دیکھ آیا جا کے مدینہ حضورؐ کا

بٹتی ہے روز و شب جہاں خیرات آپ کی
ہم سب کا آسرا ہے مدینہ حضورؐ کا

گو شرفِ باریابی نصیب ہم کو بھی ہوا
پھر دل میں ہے کہ دیکھیں مدینہ حضورؐ کا

نسبت ملی جو اُن سے مقدر سنور گیا
پایا ہے ہم نے ایسا خزینہ حضورؐ کا

ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی جہاں محوِ خواب ہیں
پہلو حضورؐ کا ہے، مدینہ حضورؐ کا

زاہد کی خوش نصیبی جو در آپؐ کا ملا
اس کا تو آسرا ہے مدینہ حضورؐ کا

زاہد قاسمی

ادارہ



نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روزوں کا بیان

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔

میں نے حضرت عائشہؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روزوں کے بارے میں سوال کیا تو ام المومنینؓ نے فرمایا۔

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم روزے رکھتے تھے، حتی کہ ہم کہتے کہ اب تو آپ روزے ہی رکھتے جائیں گے۔ اور روزے چھوڑتے تو ہم کہتے کہ اب تو آپ نے روزے چھوڑ ہی دیے ہیں۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی شعبان سے زیادہ کسی مہینے میں روزے رکھتے نہیں دیکھا۔ آپ چند دن کے سوا ماہ شعبان کے (سارے) روزے رکھ لیتے تھے۔“

فوائد

1۔ نفلی روزے مسلسل رکھنا بھی جائز ہے، جبکہ ہر روزہ افطار کیا جائے، یعنی وصال نہ کیا جائے، کیونکہ وہ ہمارے لیے ممنوع ہے۔

2۔ نفلی روزے سال کے ہر مہینے میں رکھے جاسکتے ہیں۔

3۔ مسلسل ایک مہینہ نفلی روزے رکھنا خلاف سنت ہے۔

4۔ ماہ شعبان میں نفلی روزوں کا اہتمام زیادہ ہونا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مسلسل) روزے رکھتے تھے، حتی کہ ہم کہتے، آپ افطار نہیں کریں گے۔ اور افطار کرتے حتی کہ ہم کہتے، آپ روزے نہیں رکھیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سے مدینہ تشریف لائے، آپ نے رمضان کے سوا کبھی مسلسل ایک مہینہ روزے نہیں رکھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ کو سب سے زیادہ محبوب روزہ داؤد علیہ السلام والا روزہ ہے۔ آپ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن چھوڑتے تھے اور اللہ کو سب سے زیادہ جو نماز پسند ہے وہ داؤد علیہ السلام کی نماز ہے۔ آپ آدھی رات تک سوتے اور تہائی رات میں نماز پڑھتے اور رات کا چھٹا حصہ سوئے رہتے۔“

فوائد

1۔ نفلی عبادات کی مقدار کم وبیش ہوسکتی ہے۔ آدمی چاہے تو زیادہ نوافل ادا کرے، چاہے کم رکعتیں پڑھ لے۔ اس طرح چاہے زیادہ روزے رکھے، چاہے کم رکھ لے۔ البتہ ان امور سے اجتناب کرے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

2۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے انداز پر نفلی روزے رکھنا سب سے افضل ہے۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس سے زیادہ نفلی روزے رکھنے سے ثواب کم ہوجائے گا۔

3۔ حضرت داؤد علیہ السلام والے روزے اس لیے افضل ہیں کہ اس طریقے سے انسان کو جسم کا، اہل وعیال کا اور دوسرے لوگوں کا وہ حق ادا کرنے کا بھی موقع مل جاتا ہے، جو ہمیشہ روزے رکھنے کی صورت بھی ادا نہیں کیا جاسکتا اور اللہ کی عبادت کرکے ثواب بھی حاصل ہوجاتا ہے اور ایک لحاظ سے یہ دائمی عمل بھی بن جاتا ہے۔ جو اللہ کو پسند ہے۔

4۔ نماز تہجد رات کے کسی بھی حصے میں ادا کی جا سکتی ہے، تاہم مذکورہ بالا صورت افضل ہے، کیونکہ اس میں بھی جسم کے حق اور اللہ کے حق کا ایک خوب صورت توازن موجود ہے۔

5۔ داؤد علیہ السلام والی نماز کی صورت یہ ہے، مثلاً ایک رات بارہ گھنٹے کی ہو تو اس میں چھ گھنٹے آرام کیا جائے، پھر اٹھ کر چار گھنٹے نماز تہجد اور عبادت میں گزارے جائیں، پھر دو گھنٹے تک آرام کرلیا جائے۔

شوال کے چھ روزے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جس شخص نے عید الفطر کے بعد چھ روزے رکھے اس کے پورے سال کے روزے ہوگئے۔ جو شخص نیکی کرے، اس کے لیے اس کا دس گنا ثواب ہے۔“

روزہ رکھنے کی فضیلت

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”یوں تو نبی آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے، سوائے روزے کے، کہ وہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا اور روزہ (گناہوں سے) سپر (ڈھال) ہے پھر جب کسی کا روزہ ہو تو اس دن گالیاں نہ بکے اور آواز بلند نہ کرے پھر اگر کوئی اسے گالی دے یا لڑنے کو آئے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔ اور قسم ہے اس پروردگار کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان اس کے ہاتھ میں ہے کہ بے شک روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے آگے قیامت کے دن مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور روزہ دار کو دو خوشیاں ملتی ہیں جن سے وہ خوش ہوتا ہے۔ ایک تو وہ اپنے افطار سے خوش ہوتا ہے اور دوسرا وہ اس وقت خوش ہوگا جب وہ اپنے روزے کے سبب اپنے پروردگار سے ملے گا۔“

ماہ رمضان کی فضیلت

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور شیاطین زنجیروں میں کس (باندھ) دیے جاتے ہیں۔“

ماہ رمضان سے پہلے ایک دو روزے نہ رکھو

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”رمضان سے پیشگی ایک دو روزے مت رکھو، سوائے اس شخص کے جو ہمیشہ ایک مقررہ دن میں روزہ رکھ رہا تھا اور وہی دن آگیا تو وہ اپنے مقررہ دن میں روزہ رکھ لے۔ (مثلاً جمعرات اور جمعہ کو روزہ رکھتا تھا اور انتیس اور تیس تاریخ میں شعبان کے وہی دن آگئے تو روزہ رکھ لے۔)“

روزہ چاند دیکھنے پر ہے

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاند کا ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا۔

”جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب تم اس کو دیکھو، تب ہی افطار کرو پھر اگر بادل آجائیں تو تیس روزے پورے رکھ لو (اس کے بعد عید کرو)۔“

چاند کی عمر

”سیدنا ابوالبختری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم عمرہ کو نکلے اور جب (مقام) نخلہ کے درمیان میں پہنچے تو سب نے چاند دیکھنا شروع کردیا اور بعضوں نے دیکھ کر کہا کہ یہ تین رات کا چاند ہے (یعنی بڑا ہونے کی وجہ سے) اور بعضوں نے کہا کہ دو رات کا ہے پھر ہم سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملے اور ان سے ذکر کیا کہ ہم نے چاند کو دیکھا اور کسی نے کہا کہ تین رات کا ہے اور کسی نے کہا، دو رات کا ہے، تب انہوں نے پوچھا کہ تم نے کون سی

رات میں دیکھا؟ تو ہم نے کہا کہ فلاں فلاں رات میں انہوں نے کہا۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ نے اس کو دیکھنے کے لیے بڑھا دیا اور وہ اسی رات کا تھا جس رات تم نے دیکھا۔''

ہر شہر (ملک) کے لیے ان لوگوں کی رویت

کریب کہتے ہیں کہ سیدہ ام فضل بنت حارث رضی اللہ عنہا نے انہیں سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس (ملک) شام بھیجا۔ انہوں نے کہا کہ میں شام گیا اور ان کا کام کر دیا اور میں نے جمعہ (یعنی پنجشنبہ) کی شب کو رمضان کا چاند دیکھا پھر مہینے کے آخر میں مدینہ آیا اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھ سے پوچھا اور چاند کا ذکر کیا کہ تم نے کب دیکھا؟

میں نے کہا کہ جمعہ کی شب کو۔

انہوں نے کہا کہ تم نے خود دیکھا؟

میں نے کہا، ہاں اور لوگوں نے بھی دیکھا اور روزہ رکھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اور لوگوں نے بھی تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ہم نے تو ہفتہ کی شب کو دیکھا اور ہم پورے تیس روزے رکھیں گے یا چاند دیکھ لیں گے تو میں نے کہا کہ آپ سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا (چاند) دیکھنا اور ان کا روزہ رکھنا کافی نہیں جانتے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، ہمیں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی حکم کیا ہے اور یحییٰ بن یحییٰ کو شک ہے کہ حدیث میں ''نکتفی'' کا لفظ ہے یا ''تکتفی'' کا۔

عید کے مہینے (اجر و ثواب کے اعتبار سے)

سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''عیدوں کے دو ماہ ناقص نہیں ہوتے۔ ایک رمضان شریف اور دوسرا ذی الحجہ۔

روزے کے لیے سحری کھانا

سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے۔''

سحری میں تاخیر کا بیان

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سحری کی پھر صبح کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔

میں (راوی) نے کہا کہ (سحری اور نماز) دونوں کے درمیان کتنی دیر ہوئی؟

انہوں نے کہا کہ پچاس آیات کے موافق۔ (سحری سے فراغت اور نماز کی تکبیر کے درمیان تقریباً دس منٹ کا فاصلہ تھا۔)

لفظ ''فجر'' کا نزول

سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری کہ۔

''کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ سفید دھاگہ نمودار ہو جائے۔''

تو آدمی جب روزہ رکھنے کا ارادہ کرتا تو دو دھاگے اپنے پیر میں باندھ لیتا۔ ایک سفید اور دوسرا سیاہ اور کھاتا پیتا رہتا یہاں تک کہ اس کو دیکھنے میں کالے اور سفید کا فرق معلوم ہونے لگتا، تب اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ''فجر سے'' کا لفظ اتارا، تب لوگوں کو معلوم ہوا کہ دھاگوں سے مراد رات اور دن ہے۔

بے شک بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) رات کو اذان دیتے ہیں، پس تم کھاؤ اور پیو

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو مؤذن تھے۔ ایک سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے سیدنا ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کہ نابینا تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''بلال رات کو اذان دیتے ہیں، پس تم کھاتے پیتے رہو۔ یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان دیں۔''

سورج غروب ہو جائے تو روزہ افطار کر لو

سیدنا عبداللہ بن ابی...... رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رمضان کے مہینے میں سفر میں تھے پھر جب آفتاب غروب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اے فلاں! اترو اور ہمارے لیے ستو گھول دو۔''

انہوں نے کہا۔ ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ابھی آپ پر دن ہے۔'' (یعنی ان صحابی کو یہ خیال ہوا کہ جب غروب کے بعد جو سرخی ہے، وہ جاتی ہے جب رات آتی ہے، حالانکہ یہ غلط ہے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا۔

''اترو (یعنی اونٹ پر سے) اور ہمارے لیے ستو گھولو۔''

پھر وہ اترے اور ستو گھول کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوش فرمایا اور پھر اپنے ہاتھ سے اشارہ فرمایا۔

''جب سورج اس طرف غروب ہو جائے (یعنی مغرب میں) اور اس طرف (یعنی مشرق سے) رات آ جائے تو پس روزہ دار کو روزہ کھول لینا چاہیے۔''

افطاری میں جلدی

ابوعطیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں اور مسروق، ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور مسروق نے ان سے کہا کہ۔

''اے مسلمانوں کی ماں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے دو شخص ایسے ہیں کہ ایک تو اول وقت افطار کرتے ہیں اور اول وقت ہی نماز پڑھتے ہیں اور دوسرے افطار اور نماز میں دیر کرتے ہیں۔''

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ''وہ کون ہیں جو اول افطار کرتے ہیں اور اول وقت نماز پڑھتے ہیں۔''

تو ہم نے کہا کہ ''وہ عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ ہیں۔'' تو انہوں نے کہا۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔''

سفر میں روزہ رکھنے اور نہ رکھنے پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رمضان کی سولہ تاریخ کو جہاد کیا تو کوئی ہم میں سے روزہ دار تھا اور کوئی افطار کیے (بے روزہ دار) تھا اور روزہ دار افطار کرنے والے پر عیب نہ کرتا تھا اور نہ افطار کرنے والا روزہ دار پر۔

اس افطار کرنے والے کے اجر کا بیان جو سفر میں کام کرے

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے پس کوئی ہم میں سے روزہ دار تھا اور کوئی بے روزہ دار۔ اور سخت گرمی کے وقت ایک منزل میں اترے اور سب سے زیادہ سائے میں وہ تھا جس کے پاس چادر تھی اور کتنے تو ایسے تھے کہ ہاتھ ہی سے دھوپ روکے ہوئے تھے اور روزہ دار جتنے تھے سب منزل پر جا کر پڑے رہے اور جن لوگوں کا روزہ نہیں تھا انہوں نے کھڑے ہو کر خیمے لگائے اور اونٹوں کو پانی پلایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''افطار کرنے والے آج بہت سا ثواب لے گئے۔''

میت کے روزے کی قضا

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مر جائے اور اس پر روزے (کی قضا) ہو تو اس کا وارث اس کی طرف سے روزے رکھے۔

سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک عورت آئی اور اس نے عرض کیا میں نے ایک لونڈی خیرات میں اپنی ماں کو دی تھی اور میری ماں مر گئیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کہ تیرا ثواب ہو گیا اور پھر وہ لونڈی میراث کی وجہ سے تیرے پاس آ گئی۔"

اس نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری ماں پر ایک ماہ کے روزے (قضا) تھے۔ کیا میں اس کی طرف سے روزے رکھوں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں اس کی طرف سے روزے رکھو۔"

اس نے عرض کیا کہ۔ "میری ماں نے حج نہیں کیا تھا۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "اس کی طرف سے حج بھی کرو۔"

اعتکاف کی قضا

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ ع سے روایت ہے 'انہوں نے فرمایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف کرنا چاہتے تھے تو صبح کی نماز پڑھ کر اس جگہ داخل ہوتے جہاں آپ کا اعتکاف کرنے کا ارادہ ہوتا۔ (ایک بار) آپ نے رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف کرنے کا ارادہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تو آپ کے لیے خیمہ لگا دیا گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی ایک خیمہ لگانے کا حکم دیا تو ان کے لیے بھی لگا دیا گیا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی ایک خیمہ لگانے کا حکم دیا تو ان کے لیے بھی لگا دیا گیا۔

جب حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان دونوں کے خیمے دیکھے تو انہوں نے بھی ایک خیمہ لگانے کا حکم دیا اور ان کے لیے بھی خیمہ لگا دیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ چیز دیکھی تو فرمایا۔

"کیا تم نیکی کا ارادہ رکھتی ہو؟" چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں اعتکاف نہیں فرمایا اور شوال میں دس دن اعتکاف کر لیا۔

بخاری

فوائد و مسائل

1۔ اعتکاف ایک دن یا ایک رات کا بھی ہو سکتا ہے۔

2۔ اگر کوئی شخص اسلام قبول کرنے سے پہلے کسی نیک کام کا ارادہ کرے تو اسلام قبول کرنے کے بعد وہ کام کر لینا چاہیے 'البتہ اگر کسی غیر شرعی کام کا ارادہ کیا ہو تو اسے پورا نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ کے لیے نذر ماننا عبادت ہے۔ لہٰذا ایسی نذر پوری کرنا ضروری ہے۔

حیا کی فضیلت

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری آدمی کے پاس سے گزرے جو اپنے بھائی کو شرم و حیا کے بارے میں نصیحت کر رہا تھا (کہ زیادہ شرم نہ کیا کر) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

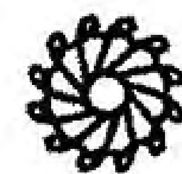
"اسے چھوڑ دے، یقیناً حیا ایمان کا حصہ ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1-انصاری اپنے جس بھائی کو سمجھا رہا تھا وہ شرم و حیا کا پیکر تھا۔ ایسا شخص دنیاوی معاملات میں زیادہ تیز طرار نہیں ہوتا کیونکہ حیا انسان کو غلط کاموں، دھوکے، فریب دہی اور جعل سازی وغیرہ سے روکتی ہے، اس لیے حیا کو ایمان کا حصہ بتلایا گیا ہے۔

2-یہ وصف اگرچہ فطری ہوتا ہے، یعنی پیدائشی طور پر بہت سے لوگ شرمیلے ہوتے ہیں، تاہم ان کی تربیت کی جائے اور ان کا رخ نیکیوں کی طرف موڑ دیا جائے تو شرم و حیا کے جذبے میں مزید اضافہ بھی ہو جاتا ہے جو اسلام کا مطلوب بھی ہے۔

☆☆





محبت اور امید کی نوید

تسنیم شریف

انسان ابتدا ہی سے قصے کہانیوں کا اسیر رہا ہے۔ کبھی جن، پریاں اور کوہ قاف کی کہانیاں اسے متحیر کرتی رہیں تو کبھی جواں مردی کے قصے اور معجزاتی واقعات اس کی عقل کو حیران کرتے رہے۔ ابتدا میں ان قصوں کا مقصد محض وقت گزاری تھا۔ اور ہر دور میں کوئی نہ کوئی قصہ گو انسانی معاشرے میں موجود رہا مگر جوں جوں تاریخ بدلتی گئی ان کہانیوں کے رنگ بھی بدلتے چلے گئے اور قصہ گو نانی، دادی کی شکل میں ہمیں گھروں میں ہی دستیاب ہو گئے۔

مگر یہ انسانی مزاج ہے کہ من پسند مشغلوں سے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اس کی فطرت میں ٹھہراؤ اور سکوت نہیں۔ اور تغیر تو ایک زمانے کے ساتھ ہے چنانچہ جب معاشرے کے ناز و انداز بدلے، تہذیبی اقدار بدلیں تو ہمارے جذبات و تجربات بھی تبدیلی کی زد میں آ گئے۔ ان ہی تبدیل شدہ تجربات نے خواتین ڈائجسٹ کی بنیاد ڈالی۔ میں نہیں جانتی کہ ریاض صاحب کے ذہن میں اس جریدے کے اجرا کے کیا مقاصد تھے مگر میں یہ جانتی ہوں کہ ادبی دنیا میں ایک یکسر نئی تبدیلی نے تیزی سے منظر نامے کو بدلا، اپنی علیحدہ شناخت بنائی اور بہت جلد ایک مقام حاصل کر لیا۔

ابتدائی دور کی کہانیاں ہجر و فراق اور وصال و نشاط کے قصے تھے جنہیں مرد حضرات نے تحریر کیا تھا۔ گو ان میں چٹخارے کے ساتھ ساتھ جذبات، احساسات کا بھی بیان تھا مگر ان تحاریر میں ندرت خیال سے زیادہ بانکپن تھا۔ البتہ ان میں خواتین کی تربیت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ مگر جب خواتین ڈائجسٹ وجود میں آیا تو اس کے ساتھ ہی خواتین لکھاری بھی وجود میں آئیں۔ جنہوں نے نہ صرف محبت کے نرم و نازک جذبات کو لطافت و چاشنی کی زبان دی بلکہ طوطا مینا کی کہانیوں کے بجائے خواتین کے حقیقی مسائل کو کہانی کے فنی محاسن میں پرو کر اس طرح پیش کیا کہ گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہو۔

ایسا نہیں ہے کہ خواتین کے اجرا سے پہلے خواتین شعور سے بے بہرہ تھیں۔ بے وقوف تھیں یا احساسات و جذبات نہیں رکھتی تھیں۔ ان کے پاس عقل، شعور اور دانائی بھی تھی اور کچھ خواتین علم کی دولت سے بھی مالا مال تھیں ہاں مگر جب ان کے ہاتھ میں قلم تھما دیا گیا، ان کی سوچ کو پذیرائی بخشی گئی ان کے اسلوب بیان کو اظہار کا وسیع میدان ملا تو بھولی بسری اقدار کو گویا نئی زندگی ملی۔

دم توڑتی روایات ''خواتین'' کے صفحات پر سانس لینے لگیں۔ کم زور اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتے رشتے ایثار و قربانی کے جذبے سے نمو پانے لگے۔

فرد کی تنہائی اور معاشرے کی بے راہ روی کی نشان دہی نے اہل دل کے لیے غور و فکر کے نئے دریچے وا کیے۔ ریاض صاحب کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے خواتین کو اپنے مسائل کے برجستہ اظہار کے لیے ایک وسیع اور کھلا میدان دیا۔ جہاں انہوں نے نہ صرف اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو صیقل کیا بلکہ خواتین کی تربیت کے ساتھ ساتھ مرد کی تربیت کو بھی اپنا اہم فریضہ جانا۔ گھر بنانے، خاندان کو جوڑنے اور رشتوں کو نباہنے میں جہاں عورت کی قربانی کو سامنے لایا گیا۔ وہیں مرد کو بھی اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا۔

یوں سمجھ لیں کہ ریاض صاحب نے سوچ کو بدلنے کی ایک خاموش تحریک کی بنیاد رکھی۔ اور یہ سوچ صرف خواتین کی سوچ نہ تھی۔ یہ تبدیلی مرد کے لیے بھی اتنی ہی ضروری تھی کیوں کہ زندگی کی شاہراہ پر مرد اور عورت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ سفر اس وقت سزا بن جاتا ہے جب ہم سفر پیچھے رہ جائے۔ ریاض صاحب کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ہم سفر کو قدم بہ قدم ساتھ چلنے کی جرأت و یقین بخشا۔

اب اس تحریک میں کس نے کتنا حصہ ڈالا......
کس نے اس سے فیض اٹھایا...... کوئی خاموش رہ کر برسوں اس کا ساتھی رہا، اس کا حساب کتاب تو شاید مشکل ہو مگر اس سچ کا یقین کرنا مشکل نہیں کہ سفر کی ابتدا کرنے والا خاموش ہو گیا ہے مگر قافلے کی گھنٹیاں اس کے رواں دواں ہونے کی گواہ ہیں۔

چمن میں کھلنے والی کلیاں اور شگوفے، بیج کی آبیاری کرنے والے کو سلام پیش کرتے ہیں۔

جو خود تو چلا گیا ہے مگر اپنے پیچھے بہار چھوڑ گیا ہے جس کی مہک اور تازگی نئی نسلوں کو محبت اور امید کی نوید دیتی رہے گی۔

☆



روشنیوں کا پیامبر

فلک تنویر

بانی خواتین ڈائجسٹ محمود ریاض صاحب کو ہم سے بچھڑے سترہ سال ہو گئے۔ آج ان کی یاد میں مضمون لکھتے ہوئے میرا قلم جانے کیوں لرز رہا ہے...... اور دل دھڑک رہا ہے۔ کہ ہر دفعہ غم دو چند ہوتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ سے میرا تعلق اگرچہ تین سال سے ہے لیکن ان تین سالوں میں، میں نے ان تمام گہرے رمزوں کو جان لیا...... جو کہ گپت تھے۔ مجھ میں، خواتین نے عیاں کر دیے۔

ایک رمز ''قلم'' کا......
ایک راز ''شعور'' کا......

خواتین ڈائجسٹ نے عمیرہ احمد، سائرہ رضا، نمرہ احمد، بشریٰ سعید، ایمل رضا جیسے قلم کار دیے۔ جن کی تحریروں نے جہاں نوجوان نسل کو سنوارنے میں کلیدی کردار ادا کیا تو وہاں تفریح کی سہولت بھی فراہم کی اور ان سب کے پیچھے ریاض صاحب کی محنت ہے۔

تھامس ایڈیسن، ایک مشہور سائنسدان، جنہوں نے بے شمار ایجادات کیں کا کہنا ہے کہ......
''ذہانت ایک فیصد تخلیقی تحریک ہے اور ننانوے فیصد پسینہ (محنت) ہے۔''

محمود ریاض صاحب کے اس پرچے نے، دیہاتوں، قصبوں، شہروں، صحرا دشت و بیاباں میں شعور کو بیدار کیا۔ ہماری مدیرہ صاحبہ، خطوط میں قارئین کو جوابات دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ ''یہ ہمارے پرچوں کی خوش قسمتی ہے کہ اسے اس قدر ذہین قارئین ملے۔'' میں تھوڑا سا رد و بدل کر کے لکھتی ہوں۔

''قارئین کی خوش قسمتی رہی ہے کہ انہیں خواتین اور شعاع جیسے پرچے ملے۔ جس نے ان کی ذہنی تربیت کی۔''

خواتین ڈائجسٹ میں شامل ہونا، اس ادارے کا حصہ بننا میرا خواب ہے...... اور خواب کی تعبیر پہلے سے طے ہوتی ہے۔ میں اپنی سانسوں کی آخری حد تک، لکھتی رہوں گی...... لکھتی رہوں گی...... کہ ریاض صاحب کے اس پرچے نے مجھے ہمت دی، حوصلہ دیا۔

ریاض صاحب، روزمرہ کی زندگی میں کیسے تھے، مجھے نہیں پتا...... لیکن ان کی یاد میں شائع ہوتے مضامین سے یہ ضرور اخذ کیا ہے۔ کہ وہ ایک ذہین انسان، بہترین باپ، مشفق بھائی، فرماں بردار بیٹا اور قابل مدیر رہے ہیں......

بنت سحر نے اپنے کالم میں لکھا تھا کہ ''جگنو پارسل کر کے بھیجوں گی۔''

میں کہتی ہوں۔ ''میں اپنے گاؤں کی وہ مسکراہٹ، شکر کا وہ سانس اور اپنے اس شوق کے لیے سہے ظلم بھیجتی...... کہ اس ادارے نے ''ظلم'' کے خلاف آواز اٹھانا، سکھایا ہے......'' میں یعنی فلک تنویر کہتی ہوں۔

''روشنیوں کا موجد تو نہ رہا، لیکن روشنیاں باقی ہیں...... جو ہیں اور رہیں گی۔''

☆......☆......☆

دستک دستک دستک

شاہین رشید



بہروز سبزواری

''کیسے ہیں؟''

''الحمدللہ۔''

''آج کل آپ پھر سے ڈراموں میں آرہے ہیں تو اچھا لگ رہا ہے۔''

''ڈراموں میں تو میں آتا ہی رہتا ہوں۔ مگر کم اس لیے کہ کبھی بہت اچھا اسکرپٹ مل جاتا ہے تو انکار نہیں کر سکتا۔''

''اور میں دیکھ رہی ہوں کہ اب آپ کے کردار خاصے سنجیدہ ہوتے ہیں...... کیوں؟''

''میں جس زمانے میں مزاحیہ رول کرتا تھا اس وقت بھی میں نے ایک دو ڈراموں میں سنجیدہ رول کیے تھے۔ مگر اب اس طرح کے رول کرنے میں مزہ آتا ہے۔''

''ابتدا تو خیر آپ نے سنجیدہ رول سے ہی کی تھی ''خدا کی بستی'' کو کون بھول سکتا ہے؟''

''ہاں...... بس پھر قباچہ کے رول نے عالمگیر شہرت دی تو ایک طرح سے مزاحیہ فنکار کی چھاپ لگ گئی...... مگر اب جیسا کہ میں نے کہا کہ مجھے سنجیدہ رول کرنا اچھا لگ رہا ہے۔''

''آج آپ کا بیٹا بھی ماشاء اللہ آپ کی طرح ''نام ور'' ہوتا جا رہا ہے...... تو کیسا محسوس کرتے ہیں؟''

''بہت اچھا محسوس کرتا ہوں۔ بہت فخر ہوتا ہے مجھے...... اور مجھے یاد ہے کہ میرے والدین نے مجھے بہت سپورٹ کیا تھا اس فیلڈ میں، تو میں بھی وہی کہانی دہرا رہا ہوں۔ اس طرح بچے آزادانہ طور پر کام کر سکتے ہیں۔ پابندیاں بچوں کو خراب ہی کرتی ہیں۔ میں تو سب والدین سے کہوں گا کہ بچوں کا رجحان جس طرف ہو انہیں اسی طرف جانے دیں۔''

''اگر فلم ناکام ہوتی ہے تو کیا فنکار بھی ناکام ہو جاتا ہے؟ ''چین نہ آئے'' میں شہروز بھی تھے تو آپ کیا کہیں گے اس بارے میں؟''

''اس فلم کی ناکامی سے شہروز پہ کوئی فرق نہیں پڑا کیونکہ وہ ایک محنتی فنکار، محنتی انسان ہے اور بہت اچھا فنکار ہے۔''

''اپنے پورے کو پھلتا پھولتا دیکھ کر کیسا لگتا ہے؟''

''بہت اچھا...... بہت فخر ہوتا ہے جس طرح میرے والدین کو مجھ پر فخر ہوتا تھا اس طرح مجھے اپنے بیٹے پہ ہوتا ہے۔ اور آپ دیکھیے گا کہ میرا بیٹا اس فیلڈ میں بہت آگے تک جائے گا...... بلکہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میرا بیٹا اس انڈسٹری کے لیے ایک تحفہ ہے۔''

''کام کے لحاظ سے آپ بتائیں کہ کتنا فرق پڑا ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ بہت فرق پڑا ہے۔ اب ہم جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ جدید کیمرے لائٹنگ، آؤٹ ڈور لوکیشنز، بہت کچھ بدل گیا ہے۔''

''زیادہ محنت آج ہے یا کل تھی؟''

''محنت تو ہر دور میں کرنی پڑتی ہے۔ اپنے آپ کو نکھارنے کے لیے، اپنے کردار کو نبھانے کے لیے، اسے حقیقت کا رنگ دینے کے لیے محنت تو کرنی پڑتی ہے اور کرنی بھی چاہیے۔''

''اور وقت کی پابندی کا اب لوگ کتنا خیال رکھتے ہیں کیونکہ پہلے کام کم تھا تو لوگ آرام سے آتے تھے اور سب؟''

''اگر آپ میری بات کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ میری کامیابی میں وقت کی پابندی بھی شامل ہے۔ میں پہلے بھی بہت زیادہ وقت کا پابند تھا اور اب بھی ہوں اور میں سب کو یہ بات ضرور سمجھتا ہوں کہ اگر کامیابی حاصل کرنی ہے تو وقت کی پابندی کو اپنی عادت بنالو...... اور ایک بات یہ بھی میں نوجوانوں کو سمجھاتا ہوں کہ کبھی فارغ نہ بیٹھو...... کچھ نہ کچھ کرتے رہو...... مصروفیت کی وجہ سے انسان بہت سی دوسری باتوں سے بچ جاتا ہے۔ کم سے کم مجھے تو ہر وقت کام کرتے رہنا بہت پسند ہے۔''

''آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟''

''مصروفیات تو ماشاء اللہ بہت ہیں۔ میرا اپنا کام ہے اس میں مصروف رہتا ہوں۔ مختلف سیریلز ہیں جن کی ریکارڈنگز میں مصروف ہوں...... بس اگر ایمان داری سے کام ہوتا رہے تو اللہ تعالیٰ برکت بھی بھی ڈالتا ہے۔''

''قاضی واجد صاحب کی وجہ سے تو بہت خلا پیدا ہوا ہے؟''



''ہاں...... سچ کہہ رہی ہو، اللہ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام دے، مجھے یاد ہے کہ گزشتہ سال ہی ہم اپنی پوری ٹیم کو لے کر آسٹریلیا گئے تھے اور وہاں ہم نے ''تعلیم بالغاں'' کیا تھا جو کہ بے حد پسند کیا گیا تھا...... بس یادیں رہ جاتی ہیں، اس معاملے میں تو انسان بہت بے بس ہے۔''

☆☆☆

امبر ارشد

''کیا حال ہے۔ کیا ہو رہا ہے؟''

''بس جی اچھا ہے اور شکر ہے اللہ کا کہ اچھا وقت گزر رہا ہے۔''

''کیا کر رہی تھیں؟''

''دوپہر کا وقت تھوڑا آرام کا ہوتا ہے مگر میں اس وقت اپنے بیٹے کو سلا کر سارے کام نبٹاتی ہوں۔ ویسے تو خیر میں صبح سے ہی اٹھی ہوئی ہوں اور ضروری کام کر لیتی ہوں۔ اور پہلے تو میں بھی دوپہر کو آرام کر لیا کرتی تھی مگر اب دوپہر کو باوجود کوشش کے نیند نہیں آتی۔''

''اور جو دوپہر کو آرام کر رہی ہوتی ہیں خواتین،



"ان پر تو بڑا رشک آتا ہوگا...... خود میں دوپہر کو آرام نہ کروں تو طبیعت بے چین ہونے لگتی ہے۔"

"میری ایک کزن ہے...... وہ بھی دوپہر کو آرام ضرور کرتی ہے، چاہے آندھی ہو یا طوفان اس نے دوپہر کو ضرور سونا ہوتا ہے حالانکہ وہ دو بچوں کی ماں ہے مگر وہ کہتی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے، مجھے ہر حال میں دوپہر کو سونا ہے...... ایک میں ہوں کہ دوپہر کو نیند نہیں آتی پھر رات کو دس بجے سونے کا دل چاہتا ہے۔ مگر بیٹے صاحب سوئیں گے تو ہماری باری آئے گی۔"

"گھر کے کام خود ہی کرتی ہو؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ سارے کام خود نہیں کرتی کیونکہ فیلڈ بھی ہے اور بیٹا بھی میاں بھی ــ تو میڈ کی ضرورت تو رہتی ہی ہے اور میں آپ کو بتاؤں کہ سارے کاموں کی عادت ہماری امی نے ڈالی، آپ کو بتاؤں کہ ہم ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ میری امی نے بھی ساری زندگی جاب کی اور ڈیڈی نے بھی بزنس کیا۔ میری امی سونے کا نوالہ لے کر پیدا ہوئی تھیں...... لیکن جب ڈیڈی سے شادی ہوئی تو امی بھی ایک نارمل خاتون ہو گئیں...... ہر شخص کا اپنا نصیب ہوتا ہے...... جو میکے میں ان کے ٹھاٹ باٹ تھے وہ شادی کے بعد نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے بھی نوکری کی، ہم چھ بہنیں اور ایک بھائی ہے اور امی نے ہماری تربیت اس انداز میں کی کہ ہمیں سسرال جا کر کوئی مشکل پیش نہ آئے اور اللہ کا شکر ہے کہ ایسا ہی ہوا...... امی نے ہر کام میں ماہر کر دیا تھا...... امی ہماری بہت زیادہ سمجھ دار خاتون تھیں۔"

"تم سب میں چھوٹی ہونا......؟"

"جی میں گھر میں سب سے چھوٹی ہوں اور لاڈ بہت اٹھوائے میں نے...... مگر کام کے معاملے میں امی نے کبھی بھی کمپرومائز نہیں کیا اور ہر طرح کی گھریلو ذمہ داریوں سے آراستہ کر دیا...... اور امی کی سختی میرے کام آئی اور میری سختی میری بھانجی کے کام آئی جو کہ اب ماشاء اللہ بہت اچھی شیف ہے...... اور ہم سب رج کے کھانے والے لوگ ہیں۔ کیونکہ امی پنجابی اور ابا پٹھان ہیں۔"

"آج کل اسکرین سے کیوں غائب ہو؟"

"گھریلو مصروفیات بہت ہیں۔ پھر کوئی بہت اچھا اسکرپٹ بھی نہیں ملا کہ جس کی وجہ سے گھریلو ذمہ داریوں کی قربانی دوں۔"

"مگر جس کو چسکا لگ جائے اداکاری کا، وہ کب چھوڑتے ہیں؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... اور میرا بیٹا ابوبکر تھوڑا سمجھ دار ہو جائے گا تو پھر کام کروں گی۔"

"ضرور......"

☆☆☆

کرن تعبیر

"کیا حال ہیں کرن؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"آپ کا نام کرن تعبیر ہے...... اپنے خوابوں کی تعبیر ملی آپ کو؟"

ہنستے ہوئے...... "جی، جی...... اللہ کا بہت شکر ہے، اللہ نے ہر نعمت سے نوازا ہوا ہے...... جو چاہا وہ

ملا ہے، ویسے ایک بتاؤں۔"

"جی بتائیں؟"

"میرا اصلی نام سائرہ ملک ہے اور چونکہ مجھے سب پیار سے کرن کہتے تھے تو بس پھر کرن ہی سب کی زبان پر چڑھ گیا اور میں ہر جگہ کرن ہی کہلانے لگی۔"

"سایہ میں بہت اچھا پرفارم کر رہی ہیں...... بہت اچھا لگ رہا ہے ذرا مختلف کردار میں دیکھ کر؟"

"بہت شکریہ...... ہاں کوشش کی ہے کچھ مختلف کرنے کی اور اللہ کا شکر ہے کہ کامیاب ہوں۔ بہت اچھا رسپانس مل رہا ہے کچھ نیا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کردار کے لیے بہت محنت بھی کی ہے۔"

"انڈر پروڈکشن کیا کیا ہے؟"

"جی اللہ کا شکر ہے کہ انڈر پروڈکشن بھی کافی کام ہے، شوٹس چل رہی ہیں اب جب مکمل ہوں گی اسی وقت آن ایئر بھی، تو اس لیے تفصیل بتا نہیں سکتی۔"

"چلو خیر...... آپ نے بتایا تھا کہ فیلڈ میں آئیں تو گھر والے ناراض ہوئے...... تو اب کیا صورت حال ہے؟"

"ہاں مجھے یاد ہے کہ جب اس فیلڈ میں آئی تو امی اور بھائی نے خاصی مخالفت کی تھی...... چپ کر کے بیٹھ گئی تو نہ جانے امی کو کیا خیال آیا کہ انہوں نے مجھے اجازت دے دی...... بس اجازت دینے کی دیر تھی اور بس باقاعدہ طور پر، اس فیلڈ میں آ گئی اب اللہ کا شکر ہے کہ کوئی کچھ نہیں کہتا۔"

"آپ کے ڈرامے شوق سے دیکھتے ہیں؟"

"جی...... جی...... بہت شوق سے دیکھتے ہیں...... اور پسند کرتے ہیں تو میری خوشی دوبالا ہو جاتی ہے۔"

"آپ کی کامیابی کو دیکھ کر فیملی میں کسی اور کو شوق ہوا اس فیلڈ میں آنے کا؟"

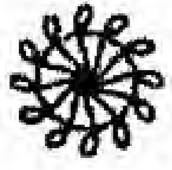
"نہیں جی...... ابھی تک تو نہیں...... لیکن مستقبل کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ہو سکتا ہے کسی کا موڈ بن جائے اور وہ اس فیلڈ میں آ جائے۔"

"شہرت جلد ملی یا وقت لگا؟"

"جلدی کہاں...... اچھا خاصا ٹائم لگا۔ پہلی بار ایک ڈرامے میں ایک سین کیا تھا تو پانچ سو روپے ملے تھے۔ خوشی پانچ سو روپے کی نہیں تھی خوشی یہ تھی کہ میں اسکرین پہ نظر آؤں گی۔"

"اور اب؟"

"جی بس کرم ہے اس کا۔"





آواز کی دنیا کا معتبر نام

ہما کاشف ہمراہ کاشف

شاہین رشید

اپنے مشہور و معروف سلسلے ''بندھن'' میں ہم آج آپ کی ملاقات آپ سب کی پسندیدہ آر جے ''ہما کاشف'' سے کروائیں گے اور معلوم کریں گے کہ یہ اپنی جاب اور اپنے گھر کے درمیان کس طرح توازن رکھتی ہیں۔

''کیسی ہیں ہما کاشف؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''کام کیسا چل رہا ہے؟''

''الحمد للہ، ٹھیک ٹھاک۔''

''ہما...... سوالات کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے میں چاہوں گی کہ آپ اپنے اور کاشف صاحب کے بارے میں کچھ بتائیں۔''

''جی...... ضرور...... میرے میاں صاحب کا پورا نام کاشف سعید راجپوت ہے۔ ان کی تین بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ کاشف کی فیملی ''راجپوت'' ہے۔ کاشف سے بڑی ایک بہن ہیں پھر کاشف اور پھر دو بہنیں...... اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔ اسی طرح مجھے ملا کر ہم چھ بہنیں اور دو بھائی ہیں اور میرا نمبر پانچواں ہے۔

میرے پاپا سندھ مدرسۃ الاسلام کے وائس پرنسپل تھے، 1997ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ والدہ کا تعلق رام پور سے ہے، ہماری کاسٹ ''شیخ

صدیقی'' ہے اور ہاں کاشف ''الیکٹرونک انجینئر'' ہیں۔''

''شادی کو کتنا عرصہ ہوا اور پسند سے ہوئی۔''

''مئی 2018ء میں میری شادی کو چودہ سال ہو جائیں گے۔ میرے تین بچے ہیں، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ کاشف میرے فرسٹ کزن ہیں اور ہماری ارینج میرج ہے، اکثر لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ کاشف آپ کی پھوپھی کے بیٹے ہیں تو آپ کی لو میرج ہوگی تو ایسا کچھ نہیں ہے، ہماری ارینج میرج ہے۔''

''منگنی کتنا عرصہ رہی اور دوران منگنی ملاقات ہوتی تھی؟''

''منگنی ہماری پانچ ماہ رہی، یعنی دسمبر میں ہوئی منگنی اور مئی میں ہوگئی شادی۔ بے شک میرے کزن تھے مگر ان کے گھر اتنا آنا جانا نہیں تھا۔ میں تو بہت ہی کم آتی جاتی تھی بلکہ جاتی ہی نہیں تھی مگر نصیب میں وہاں جانا لکھا تھا اور ملاقات پہلے نہیں تھی، منگنی کے بعد ہی ملاقات ہوئی ہے ہماری۔''

''چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوا یا ٹائم لگا؟''

''چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہوا، کوئی لمبا چوڑا ٹائم نہیں لگا اور جب میرا رشتہ آیا تو میں کراچی یونیورسٹی میں گریجویشن کر رہی تھی اور اسی دوران پھوپھی نے رشتہ بھیجا اور ''ہاں'' ہوگئی۔ پانچ مہینے منگنی بھی اس لیے رہی کہ دونوں گھروں کو شادی کی تیاری کرنی تھی اور ہاں ان ہی دنوں میں کراچی یونیورسٹی میں بہ حیثیت انویجیلیٹر پیپر بھی لیتی تھی۔''

''آپ کی شادی سینئر ہے یا ریڈیو کی جاب؟''

''میری جاب زیادہ سینئر ہے، جب میں کراچی یونیورسٹی میں انویجیلیٹر کر رہی تھی تو اس سے پہلے میں نے ایف ایم 100 جوائن کیا تھا اور ریڈیو کرتے ہوئے ماشاء اللہ سے سولہ سال ہوگئے ہیں یعنی 2002ء میں میں نے ریڈیو ایف ایم 100 جوائن کیا تھا۔ اس وقت صرف دو ہی ایف ایم تھے، 101 اور 100۔ تو میں نے 100 سے



اسٹارٹ لیا تھا اور مارننگ شو کرتی تھی اور کراچی یونیورٹی میں انویجیلیٹر پیپر لیتی تھی۔ تو اس لحاظ سے جاب پہلے کی اور شادی بعد میں۔''

''شادی دھوم دھام سے ہوئی؟ شادی کے بعد شہر بدر ہوئیں، یا اپنے شہر میں رہیں، رسمیں ہوئیں؟''

''جی ہاں...... شادی تو دھوم دھام سے ہی ہوئی اور شہر بدر نہیں ہوئی۔ ایک ہی شہر میں تھے اور ہاں رسمیں بھی ہوئی تھیں اور مجھے یاد ہے کہ ایک رسم تو انڈین ڈراموں والی تھی کہ جب دلہن گھر آتی تو گھر کی دہلیز پر تھوڑا سا آئل ڈالتے ہیں اور دلہن وہ آئل پھلانگ کر اندر آتی ہے تو جب مجھے اندر آنا تھا تو میری پھوپھی جو میری ساس بھی تھیں۔ انہوں نے آئل ڈالا اور میں پھلانگ کر آئی، مجھے بڑی عجیب سی رسم لگی۔ بہرحال پھلانگ کر آئی، شکر کریں کہ پھسلی نہیں یا کسی چیز سے الجھی نہیں ورنہ...... خیر باقی رسمیں تو وہی تھیں جو کہ عموماً شادی میں ہوتی ہیں۔''

''نکاح گھر میں ہوا یا ہال میں...... اور کیا نکاح پہلے ہو جانا بہتر ہے؟''

''نکاح ہال میں ہوا تھا اور میں تو سمجھتی ہوں کہ

نکاح اسی دن ہونا بہتر ہے جس دن رخصتی ہو اور میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا اور اس دن بھی جو رسمیں ہوئیں وہ میں نے انجوائے کیں۔"

"نکاح کے وقت کیا احساسات تھے اور نکاح رخصتی کے دن ہی کیوں؟ پہلے کیوں نہیں...... اور شادی کے دن کی کوئی خاص بات؟"

"نکاح کے وقت وہی احساسات تھے جو کہ ایک عام لڑکی کے ہوتے ہیں اور جو خاص بات آپ نے پوچھی ہے تو وہ یہ کہ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کی شادی کی ڈیٹ کیا ہے تو جو میری اصل ڈیٹ تھی، وہ 15 مئی تھی اور نکاح ہوا، رات کو بارہ بجے کے بعد یعنی سولہ مئی کو...... تو میں تو یہی سوچتی ہوں کہ میرا تو نکاح ہی سولہ مئی کو ہوا، اسے 15 کہنا تو غلط ہے۔

بس یہ خاص بات مجھے ابھی بھی ڈسٹرب کرتی ہے، اس زمانے میں یعنی چودہ سال پہلے تو شادیاں ہوتی ہی بہت لیٹ تھیں۔ اب اچھا سسٹم ہے کہ بارہ بجے سے پہلے ہال کی لائٹیں بند کرنا شروع کر دیتے ہیں اور نکاح رخصتی کے دن ہی کیوں کا جواب یہ ہے کہ نکاح کے بعد بھی کچھ پابندیاں ہوتی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ نکاح کے بعد میاں لوگ پابندیاں بھی لگاتے ہیں کہ فلاں سے ملنا ہے، فلاں سے نہیں۔ ادھر نہیں جانا، اُدھر نہیں جانا اور اگر نکاح پہلے ہو جائے اور آپ نے دوسرے ملک جانا ہے اور آپ کے کاغذات بننے میں ٹائم لگ جائے اور اس دوران میاں کو کوئی اور لڑکی پسند آجائے۔ تو اکثر دیکھا ہے کہ رخصتی کے بجائے طلاق کے پیپر ہاتھ آجاتے ہیں۔ ایسے بہت سے ڈرامے بھی دیکھے ہیں ہم نے، اس لیے میں تو پہلے سے نکاح ہو جانے کے بالکل بھی حق میں نہیں ہوں۔

نہ منگنی زیادہ عرصہ رہنی چاہیے نہ نکاح...... کیونکہ لڑکیاں رہتی اپنے ماں باپ کے گھر میں ہیں اور سوچتی اپنے میاں کے حساب سے ہیں اور دوسری یہ بات کہ نکاح کے بعد وہ اپنے میاں کی منکوحہ ہو جاتی ہے اور اگر وہ مل لیں تو کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے مگر ہمارے یہاں اس بات کو بھی برا سمجھا جاتا ہے کہ لڑکی کیوں مل رہی ہے، رخصتی سے پہلے۔ بہت عجیب سسٹم ہے ہماری سوچ کا۔"

"جوائنٹ فیملی تھی یا شروع سے ہی علیحدہ رہتی ہیں؟ اور سسٹم کون سا پسند ہے؟"

"پہلے جوائنٹ فیلی تھی اب الگ رہتی ہوں اور سسٹم دونوں ہی ٹھیک ہیں۔ جوائنٹ فیملی میں آپ کے بچے ہوتے ہیں تو آپ کو بہت ساری چیزوں میں سپورٹ مل جاتی ہے، اگر آپ ورکنگ وومن ہیں تب بھی اور اگر نہیں ہیں تب بھی۔

بچے دادا دادی اور دیگر بزرگوں کے سائے میں پلتے ہیں اور الگ رہنا بھی ٹھیک ہے لیکن ورکنگ وومن کے لیے الگ رہنا تھوڑا مشکل ہو جاتا ہے اور میں اپنی مثال دوں گی کہ مجھے اپنے بچوں کے لیے لازمی "میڈ" کو رکھنا پڑتا ہے۔ ماسیوں کا الگ چکر ہوتا ہے، قابل اعتبار نہیں ہوتیں اور نہ ہی ٹک کے رہتی ہیں اور یہاں بھی میں اپنی مثال دوں گی کہ میری جاب کا بہت لمبا ٹائم نہیں ہوتا۔ دو گھنٹے کا ڈیلی شو ہوتا ہے اور کہیں ریکارڈنگ کے لیے جانا ہو تب بھی زیادہ ٹائم نہیں لگتا۔ لیکن اگر آپ فل ٹائم جاب کرتی ہیں تو پھر آپ کے لیے علیحدہ رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ جوائنٹ فیملی میں بچوں کو اپنے بزرگوں سے سیکھنے کا بہت موقع ملتا ہے۔ اپنی ویلیوز کا پتا چلتا ہے۔ مینرز آتے ہیں۔"

"پہلے دن کا عروسی جوڑا کیسا تھا اور شادی کی شاپنگ آپ نے خود کی، سسرال والوں کے ساتھ یا آپ کو پتا ہی نہیں چلا اور شاپنگ ہو گئی؟"

"شادی کا عروسی جوڑا لال رنگ کا تھا اور غرارہ تھا کیونکہ میری ساس کی خواہش تھی کہ ان کی بہو غرارہ پہنے جبکہ میری خواہش تھی کہ شرارہ ہوتا...... مگر غرارہ بھی بہت خوب صورت تھا اور شادی کی شاپنگ کی

بات ہے تو سچ میں مجھے پتا ہی نہیں چلا اور شاپنگ ہو گئی۔ میں نے بالکل بھی شاپنگ نہیں کی، جیسی کہ عموماً لڑکیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ خود شاپنگ کریں۔ سب چیزیں اپنی پسند سے لیں، حالانکہ میری دیگر بہنوں نے اپنی پسند سے اپنی شادی کی تیاریاں اور شاپنگ کی، تو جناب میری شادی کی شاپنگ میری امی اور بہنوں نے کی اور میرا فرنیچر بھائی اپنی پسند کا لے کر آئے۔

میں تو بہت ہی شریف بچی تھی جس نے کچھ بھی اپنی پسند سے نہیں لیا۔ مجھے شاپنگ کے بعد چیزیں دکھائی جاتی تھیں اور میں "اچھا، اوکے" کہہ دیتی تھی۔"

"اب خیال آتا ہے کہ کاش اپنی پسند سے کر لیتی شاپنگ؟"

"ہاں نا...... اب خیال آتا ہے کہ اپنی پسند سے کر لیتی۔ اس وقت تو بہت ہی لاابالی پن تھا، بس جو جس نے دے دیا، پہن لیا، جو جس نے کہہ دیا، کر لیا۔"

"لاابالی پن میں تو بہت خواہشات ہوتی ہیں؟"

"بہت چھوٹی عمر میں شادی ہوئی، پھر والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا اور امی کی خواہش تھی کہ سب بیٹیوں کی شادیاں جلدی اور اپنے وقت پر ہو جائیں۔ میں نے گریجویشن کے بعد ماسٹرز (انگریزی لٹریچر) میں داخلہ بھی لیا مگر شادی کی وجہ سے پورا نہ کر سکی۔ پڑھا ضرور کیونکہ ٹیچر گھر آتے تھے پڑھانے، بس امتحان نہ دے سکی۔

پرائیوٹ انگریزی لٹریچر پڑھنا بہت مشکل ہوتا ہے اور پھر جو ٹیچر مجھے پڑھانے آتے تھے، وہ گوجرانوالہ کے پنجابی تھے تو وہ اپنے پنجابی لہجے میں انگریزی پڑھایا کرتے تھے تو خیر...... پڑھ لیا مگر امتحان نہ دے سکی کہ شادی کے بعد کی مصروفیات تعلیم جاری رکھنے نہیں دیتیں۔"

"شادی ضروری ہے یا تعلیم؟"

"دونوں...... اگر کوئی مجھ سے میری خواہش پوچھے تو میں اسے ضرور بتاؤں گی کہ میری بڑی شدت کے ساتھ خواہش تھی کہ میں بہت پڑھوں اور ابھی بھی خواہش ہے اور مجھے خواب بھی یہی آتے ہیں کہ جیسے میں امتحان دے رہی ہوں یا میں امتحان دینے جا رہی ہوں اور لیٹ ہو گئی ہوں یا پہنچنے ہی والی ہوں اور پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے اور جب آنکھ کھلتی ہے تو کوئی ادھر رو رہا ہوتا ہے کوئی اُدھر۔"

"کاشف گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں آپ کا؟"

"میں تو کاشف کو کچن میں ہی نہیں آنے دیتی کیونکہ میرا خیال ہے کہ مرد حضرات چیزیں زیادہ بکھیرتے ہیں اور کام کم کرتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی دعوت ہے گھر میں تو ضرور ہاتھ بٹاتے ہیں اور ایک کام تو میں ان سے ضرور کرواتی ہوں کہ جب میں کباب کا قیمہ بناتی ہوں تو قیمہ مجھ سے "چوپر" میں پستا نہیں ہے، تب میں کاشف کو کہتی ہوں کہ آپ قیمہ پیس دیں، تو ہمیشہ کاشف ہی قیمہ پیستے ہیں اور میں کباب بنا لیتی ہوں۔ بس یہی ہیلپ میں ان سے لیتی ہوں اور میری دعا ہے کہ وہ یہ ہیلپ ہمیشہ کرتے رہیں۔"

"یہ بتائیں کہ آپ کتنی سگھڑ خاتون ہیں، شادی کے بعد بھی آپ نے کام جاری رکھا تو شادی نے آپ کو پریشان کیا یا آپ نے بہت اچھے طریقے سے مینج کیا؟"

"ہاں...... سگھڑ تو میں نارمل ہوں اور جہاں تک مینج کرنے کی بات ہے تو کبھی سوچا نہیں تھا کہ شادی کے بعد کام بھی کروں گی اور بچے بھی پالوں گی اور آپ یقین کریں کہ کام کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ جس دن ریڈیو پر پروگرام نہیں ہوتا اس دن میں بہت سست ہوتی ہوں، مزاج میں بھی اور ویسے بھی میں تھک جاتی ہوں۔ جن کو کام کی عادت ہو جائے پھر وہ گھر نہیں بیٹھ سکتے اور مزے کی بات یہ کہ جس دن صبح کے وقت ریڈیو جانا ہو اتنی شدید نیند آتی ہے

کہ اٹھنے کو دل نہیں چاہتا اور جس دن چھٹی ہوگی، صبح ہی صبح آنکھ کھل جاتی ہے۔ خیر یہ تو انسانی فطرت ہے تو بس میں کام کرتی رہوں تو فریش رہتی ہوں ورنہ سست پڑ جاتی ہوں اور کام کرنے کا شوق ہو تو ہر چیز مینج ہو جاتی ہے۔“

”کاشف صاحب کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟ چٹورے ہیں؟“

”کاشف کی جو عادت اچھی ہے، وہ ہی ان کی بری عادت ہے۔ کاشف کی اچھی عادت یہ ہے کہ وہ کسی کے معاملے میں نہیں بولتے، نہ خود بولتے ہیں نہ مجھے بولنے دیتے ہیں کہ یہ ان کا اپنا معاملہ ہے۔ ہمیں اور تمہیں کیا ضرورت ہے بیچ میں پڑنے کی، اور یہی ایک طرح سے بری عات ہے کہ جہاں بولنا ہوتا ہے وہاں بھی نہیں بولتے۔ کم گو اور سنجیدہ مزاج کے انسان ہیں، انسان کو اپنی رائے تو دینا چاہیے، اتنا بھی کم گو نہیں ہونا چاہیے۔

نہیں چٹورے نہیں ہیں، میرے ہاتھ کی پکی چیزیں شوق سے کھاتے ہیں۔ البتہ انہیں میٹھا بہت پسند ہے اور میٹھے میں مجھے کچھ اتنا اچھا بنانا نہیں آتا، بس ”کھیر“ بہت اچھی بنا لیتی ہوں اور کاشف شوق سے کھا لیتے ہیں۔“

”سسرال کیسا ملا اور کبھی لڑائی جھگڑے ہوئے اور شادی کا بندھن کیسا ہے؟“

”جی، سسرال مجھے بہت اچھا ملا، سب سے پیار اور محبت ملا اور شادی کا بندھن بہت خوب صورت بندھن ہے اور میں تو اپنے پروگرام میں بھی سب کو یہی کہتی ہوں کہ یہ بندھن بہت خوب صورت ہے، اس بندھن میں باہمی اور ذہنی ہم آہنگی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ پھر لڑائی جھگڑے کی گنجائش نہیں رہتی لیکن جہاں یہ بات نہیں ہوتی وہاں پھر لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں اور اس میں قصور دونوں کا ہوتا ہے۔“

”آپ اپنے میاں صاحب کو سجی بنی اچھی لگتی ہیں اور ہنی مون پر کہاں گئی تھیں اور منہ دکھائی میں کیا ملا تھا؟“

”سجا بنا انسان تو سب کو ہی اچھا لگتا ہے اور میں بھی انہیں اچھی لگتی ہوں اور منہ دکھائی پر ”سونے کی چین“ ملی تھی۔“

”شادی کا بندھن ایک خوب صورت بندھن ہے، مگر جب یہ ٹوٹتا ہے تو قصور کس کا ہوتا ہے؟“

”قصور تو دونوں کا ہی ہوتا ہے مگر یہاں قصور وار لڑکی کو ہی ٹھہرایا جاتا ہے کہ تم ایسے نہ کرتیں، ایسے کر لیتیں، تم ہی گھر بسا لیتیں...... تو قصور صرف لڑکی کا نہیں لڑکے کا بھی ہوتا ہے کیونکہ گھر بھی دونوں کا ہوتا ہے اور بچے بھی دونوں کے ہی ہوتے ہیں اور میں تو یہ کہنا چاہوں گی کہ پوری دنیا بھی آپ کی مخالفت میں کوئی بات بول رہی ہے لیکن اگر آپ کا شوہر اس بات کو نہیں مان رہا ہوتا تو یہ ایک پوزیٹو سائن ہوتا ہے اسی طرح بیوی بھی اپنے شوہر پر بھروسا کرے، باوجود لوگوں کے بہکانے کے تو پھر کوئی بھی آپ کا گھر نہیں توڑ سکتا۔“

”شاید اسی لیے طلاق کا ریشو بھی بڑھتا جا رہا ہے؟“

”اس کی بھی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کو انڈر اسٹینڈ نہیں کرتے۔ ایک دوسرے کو ٹائم نہیں دیتے، ایک دوسرے کی بات کی مشکلات کو نہیں سمجھتے۔ طنز، روک ٹوک کہ آفس میں تو بہت خوش رہتے ہیں، وہاں تو پریاں نظر آتی ہوں گی۔ گھر آتے ہی شور مچا دیتے ہیں کہ میں تھک گیا ہوں، تو میاں لوگوں کو بھی چاہیے کہ گھر آ کر آفس کی پریشانیاں نہ شیئر کیا کریں۔ اگر آپ کی بیوی آپ کی مشکلات کو نہیں سمجھتی تو.. ورنہ تو میاں بیوی ایک دوسرے سے اپنی باتیں شیئر کر ہی لیتے ہیں...... اگر گھر کا ماحول اچھا رکھیں تو طلاق کا ریشو کم ہو سکتا ہے۔“

”کہتے ہیں کہ ارینج میرج میں ایسا کم ہوتا ہے، ویسے کیا والدین بھی شادی کے معاملے میں غلطی کر سکتے ہیں؟“

”بالکل کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ لڑکا بے روزگار ہے تو چلو جی شادی کر دو، شاید روزگار سے لگ جائے یا کوئی لڑکا صحیح نہیں ہوتا کسی بھی لحاظ سے تو کہا جاتا ہے اس کی شادی کر دو یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس طرح کی شادی کر دو اور لڑکی کی زندگی برباد کر دو۔

پھر اکثر دیکھا گیا ہے کہ لڑکے اور لڑکی کی عمروں کا فرق نہیں دیکھا جاتا کہ مردوں کی کون عمریں دیکھتا ہے۔ لڑکے کا تو بس پیسہ دیکھنا چاہیے تو اس طرح کے فیصلے جو اکثر و بیشتر والدین کر دیتے ہیں، لڑکا اور لڑکی دونوں کی ہی زندگی برباد ہو جاتی ہے...... تو کچھ فیصلے والدین کے بھی غلط ثابت ہوتے ہیں۔“

”اپنی والدہ کی لائف سے اپنی زندگی کا موازنہ کرتی ہیں یا شادی سے پہلے کی زندگی کا موازنہ کرتی ہیں تو کون سی بہتر نظر آتی ہے؟“

”شادی سے پہلے شادی شدہ لوگوں کی زندگی اچھی لگتی ہے اور شادی کے بعد پہلے والی زندگی اچھی لگنے لگتی ہے۔ شادی سے پہلے آپ کے اوپر ذمہ داریاں کم ہوتی ہیں۔ لاابالی پن اور بے فکری کی زندگی ہوتی ہے...... آپ کے سارے فیصلے ماں باپ اور گھر کے بڑے بہن بھائی کر رہے ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد ذمہ داریاں تو بڑھتی ہی ہیں، انسان باشعور بھی ہو جاتا ہے پھر بچے بھی ہو جاتے ہیں تو ہر لحاظ سے زندگی بدل جاتی ہے......

اور اگر پہلے اور بعد والی زندگی کا موازنہ کریں یا چوائس دیں تو پھر شادی کے بعد والی زندگی زیادہ بہتر ہے کیونکہ اپنی ایک ذاتی فیملی بن جاتی ہے۔ جس میں بچوں کی صورت میں اللہ تعالیٰ بہت خوب صورت تحفہ دے دیتا ہے میاں بیوی کو۔“

☆ اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ہما کاشف شکریے کے ساتھ اجازت چاہی۔



آنکھوں کے امراض کے ماہر اور سرجن

ڈاکٹر اسد جاوید سے ملاقات

تسنیم شریف

اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ محبوب کی تعریف و توصیف پر مبنی ہے۔ اور یہ تعریف آنکھوں کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ فیض صاحب نے تو ''تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے'' کہہ کر بات ہی ختم کردی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں صحت مند اور روشن نہ ہوں تو دنیا کے جلوے بے کار ہیں۔

انسانی جسم میں اہمیت کے اعتبار سے آنکھیں اہم ترین عضو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہمیں ان تمام محققین اور ڈاکٹر حضرات کا شکر گزار ہونا چاہیے جو آنکھوں کی صحت اور بصارت کی بحالی کے لیے کام کر کے حقیقی معنوں میں لوگوں کی زندگیوں میں روشنی پھیلانے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

پچھلے دنوں ملک کے ممتاز آئی سرجن ڈاکٹر اسد جاوید سے مختصر گفت گو کا موقع ملا جس کا احوال قارئین کی نذر ہے۔



☆ ''سب سے پہلے تو یہ بتائیں کہ آنکھوں کی عام بیماریاں کیا ہیں؟''

''گلوکوما (کالا پانی) موتیا، شوگر اور بلڈ پریشر کے پردے پر اثرات اہم بیماریاں ہیں۔ اس کے علاوہ آنکھوں کی خشکی، سوجن، سرخ رہنا، پانی بہنا، خارش، نظر کی دھندلاہٹ وغیرہ عام شکایات ہیں۔''

☆ ''بینائی کم زور ہونے کی کیا وجوہات ہیں؟ کیا کثرت مطالعہ بینائی پر اثر انداز ہوتا ہے۔''

''نظر کی کم زوری کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں۔ بڑھاپا یا چوٹ لگنا یا کسی دوسری بیماری کے اثرات۔ آنکھ کا شعاعوں کو فوکس کرنے کا اندرونی نظام صحیح کام نہیں کرتا جس سے آنکھوں پر دباؤ پڑتا ہے۔ آنکھ کی نشوونما میں اٹھارہ سال تک تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ لیکن اگر یہ نشوونما مناسب نہ ہو رہی ہو تو فوکس خراب ہونا شروع ہوجاتا ہے اور نظر کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ پڑھنے اور مطالعہ کرنے سے آنکھوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔''

☆ ''بینائی کی حفاظت کے لیے کیا احتیاطی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں؟''

''آنکھوں کو سورج کی روشنی سے بچایئے۔ اگر عینک کے استعمال کی ضرورت ہے تو اس کا استعمال کریں۔ آنکھوں کے مسلز کی ورزش کریں۔ مسلسل کام کرتے ہوئے کچھ دیر آنکھوں کو آرام دیں اور کسی دور کی چیز پر توجہ مرکوز کریں۔ کمپیوٹر پر اس طرح کام کریں کہ روشنیاں براہ راست آنکھوں پر نہ پڑیں۔''

☆ ''کیا آنکھوں میں عرق گلاب ڈالنا مفید ہے۔ کاجل، سرمہ یا دیگر پروڈکٹس آنکھوں کی صحت پر اثر انداز ہوتی ہیں؟''

''عرق گلاب آنکھوں میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ کاسمیٹکس سے آنسوؤں کی نالیاں بند اور انفیکشن کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔''



☆ ''بھینگے پن کے بارے میں بتائیں؟''

''بھینگا پن آنکھوں کے پپوٹوں میں نقص سے پیدا ہوتا ہے۔ جس سے آنکھیں سیدھی نہیں رہتیں۔ جب آنکھیں کسی خاص سمت میں بیک وقت مرکوز نہ ہوں یا کسی وجہ سے آنکھوں کا کوآرڈی نیشن خراب ہوجائے اور دونوں آنکھوں کے پٹھے مطلوبہ مقدار میں مربوط انداز میں دونوں آنکھوں کو بیک وقت حرکت نہ دے سکیں تو بھینگے پن کی بیماری سامنے آتی ہے۔ کم عمری میں بھینگے پن کا علاج چشمہ پہننے سے ممکن ہے لیکن کبھی کبھار آپریشن بھی کرنا پڑتا ہے۔ شوگر اور بلڈ پریشر کو کنٹرول میں رکھا جائے تو اس سے بچاؤ ممکن ہے۔ عینک کا مسلسل استعمال بھی ضروری ہے۔''

☆ ''ہائی بلڈ پریشر یا ذیابیطس کے مریضوں کو آنکھوں کے حوالے سے آپ کیا مشورہ دیں گے۔''

''ان دونوں بیماریوں کا آنکھوں پر خطرناک حد تک اثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات بلڈ پریشر زیادہ ہونے سے آنکھوں میں دھندلا پن محسوس ہوتا ہے۔ ایسا ذیابیطس میں بھی ہوتا ہے جب شوگر لیول بڑھ جاتا ہے۔ ذیابیطس آنکھ کے عدسے کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس سے سفید موتیا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ ان بیماریوں سے مریض کی بینائی بھی جاسکتی ہے اس لیے ان دونوں بیماریوں کے مریضوں کو بہت احتیاط برتنا چاہیے۔''

☆ ''موتیا کیوں ہوتا ہے اور اس کی کتنی اقسام ہیں۔''

''موتیا ہونے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ساٹھ سال کی عمر کے بعد موتیا ہونے کے مواقع بڑھ جاتے ہیں۔ آنکھ کی چوٹ بھی موتیا کی بڑی وجہ بن سکتی ہے۔ آنکھوں کے وہ قطرے جن میں اسٹرائیڈز ہوں، وہ بھی موتیا پیدا کرسکتے ہیں۔ جوڑوں میں مبتلا حضرات موتیا کا جلد شکار ہوسکتے ہیں۔ کچھ وائرل انفیکشن اور دوائیں جو ماں نے دوران حمل استعمال کی ہوں وہ پیدا ہونے والے بچے میں موتیا کرسکتا ہے۔ شوگر، بلڈ پریشر کی زیادتی، تھائی رائیڈ اور دمہ جیسی بیماریوں کو مسلسل کنٹرول میں نہ رکھنے سے بھی موتیا پیدا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔''

☆ ''گلوکوما (کالا موتیا) کے بارے میں تصور عام ہے کہ اس سے آدمی نابینا ہوجاتا ہے تو یہ بات کہاں تک درست ہے؟''

''گلوکوما میں بینائی جانے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ اگر گلوکوما کی عین وقت پر تشخیص نہ ہو اور اسے کنٹرول نہ کیا جائے تو اندھے پن کا باعث بن سکتا ہے۔ گلوکوما کی کوئی علامت نہیں ہوتی۔ اس سے جو نقصان ہوجائے اسے پورا کرنا ممکن نہیں البتہ بیماری کو بڑھنے سے روکنے کے اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔''

☆ ''فیکو کیا طریقہ علاج ہے۔''

''اس میں ایک چھوٹے سے سوراخ سے موتیا

کو الٹرا ساؤنڈ ویوز کے ذریعے گھلا کر نکال دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں عام طور پر سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ موتیا کو لیزر سے گھلایا جاتا ہے جبکہ لیزر کا موتیا کی سرجری سے کوئی تعلق نہیں۔"

☆ "کیا لیزک سرجری سے واقعی چشمہ اتر جاتا ہے؟"

"جی ہاں۔ ایک خاص نمبر تک یعنی 6۔ تک کا نمبر لیزک سے ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ نمبر کا لیزک ہوتا بھی نہیں ہے لیکن زیادہ نمبر کو کم کیا جا سکتا ہے۔"

☆ "بطور فیشن جو لینس لگائے جاتے ہیں وہ آنکھوں کے لیے کس حد تک نقصان دہ ہیں۔"

"اگر ان کا استعمال احتیاط سے کیا گیا ہے تو کچھ نقصان دہ نہیں۔"

☆ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے کیوں بنتے ہیں؟

"آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بننے کی بنیادی وجوہات میں نیند کی کمی، تھکاوٹ اور غیر متوازن غذا کا استعمال ہے جبکہ ذہنی دباؤ، ہارمونز میں عدم توازن، کم مقدار میں پانی پینے اور سورج کی روشنی میں زیادہ وقت گزارنے سے بھی یہ حلقے بن جاتے ہیں۔"

☆ "آنکھوں کی الرجی کی علامات کیا ہوتی ہیں؟"

"آنکھوں میں خارش رہنا، آنکھوں کا سرخ رہنا۔ آنکھوں کی اندرونی جلد کا سوجا ہوا ہونا اس کی علامات ہیں۔

اگر مستقل اور مناسب علاج کیا جائے تو بیماری کنٹرول میں رہتی ہے اور آنکھیں خطرناک بیماریوں سے بچی رہتی ہیں۔"

☆ "آنکھوں سے پانی کیوں بہتا ہے؟"

"آنکھوں سے پانی بہنے کی اہم وجہ آنکھ کے کسی حصے کی سوزش ہوتی ہے۔"

"☆ گلوکوما کس بیماری کو کہتے ہیں؟"

"کالا پانی یا کالا موتیا بنیادی طور پر وہ بیماری ہے جس میں آنکھ کا دماغ کے ساتھ رابطہ منقطع ہو جاتا ہے اصل میں وہ اعصاب کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ جو معلومات کو پردۂ بصارت سے دماغ تک منتقل کرتے ہیں یہ پردۂ بصارت کے اندر بھی موجود ہوتے ہیں اور آپٹک نروے کے اندر بھی۔"

☆ "موتیا کیا ہوتا ہے؟"

"ہر آنکھ میں ایک عدسہ ہوتا ہے جو بالکل شفاف ہوتا ہے اور نظر آنے والی چیزوں کی تصویر پردۂ بصارت پر بناتا ہے مختلف وجوہات کی بناء پر عدسہ گدلا ہو کر سفید موتی کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے بینائی متاثر ہوتی ہے۔ اس بیماری کا نام موتیا ہے۔"

☆ "کیا عینک کے استعمال سے نمبر ایک جگہ رک جاتا ہے۔

عینک بیماری کی وجہ سے دور نہیں کرتی بلکہ وہ دیکھنے کے عمل مدد دیتی ہے۔ آنکھ کی نشوونما کا عمل 20 سے 24 سال تک رہتا ہے۔ تو جب تک یہ عمل

جاری رہتا ہے۔ عینک کا نمبر بدلتا رہتا ہے۔ جب یہ عمل رک جاتا ہے تو عینک کا نمبر بھی رک جاتا ہے۔ 40 سال بعد چونکہ انسانی جسم میں پھر تبدیلیاں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ تو نظر میں بھی تبدیلی آنے لگتی ہے۔ اور اکثر لوگوں کو عینک کے استعمال کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

☆ "چلیں جناب! اب کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔ کہاں سے تعلیم حاصل کی۔ کہاں سے تعلق ہے؟"

"میرا کراچی سے تعلق ہے۔ میٹرک حبیب پبلک اسکول سے کیا۔ انٹر ڈی جے سائنس کالج سے کیا۔ ایم بی بی ایس ڈاؤ میڈیکل کالج سے جبکہ پوسٹ گریجویشن کالج آف فزیشن اینڈ سرجن آف پاکستان سے کیا۔"

میرے والد ڈاکٹر جاوید عالم خان پاکستان کے مایہ ناز آئی سرجن تھے۔ جنہوں نے مجھے سرجری سکھائی۔ آج جو کچھ ہوں ان ہی کی وجہ سے ہوں۔ میرے والد نے SPRV کے نام سے ایک سوسائٹی بنائی جو اندرون سندھ غریب اور نادار لوگوں کا مفت علاج کرتی ہے جس کو بطور پریذیڈنٹ میں آج تک چلا رہا ہوں۔ ہم ہر سال ہزاروں لوگوں کا مفت آپریشن کرتے ہیں۔ یہ ہماری ویب سائٹ ہے۔

www..SPRV.com.pk

www.Facebook.com/sprvpakistan

☆ "والدین کے علاوہ کن لوگوں کے ممنون رہے یا متاثر ہوئے۔"

"والدین کے علاوہ بہت سے لوگ ہیں جن سے میں متاثر ہوا ہوں۔ میں اپنے دادا، دادی اور دو پھوپھیوں سے خاص طور پر ــــ متاثر ہوا۔"

☆ "فرصت کے کیا مشاغل ہیں؟"

"فارغ وقت میں مختلف معلوماتی کتابیں پڑھتا ہوں۔ ٹی وی دیکھتا ہوں، زیادہ تر بی بی سی فوڈ دیکھتا ہوں۔"

"کیریئر کا کوئی یادگار واقعہ؟"

"جب میرے والد نے پہلی بار موتیا کا آپریشن کروایا اور بہت سالوں بعد میں نے اپنے والد اور والدہ کی اپنے ہاتھوں سے سرجری کی۔"

☆ "کسی بات کا ملال ہے؟"

"زندگی میں بہت غلطیاں کیں اور سیکھتا رہا اور آج تک سیکھ رہا ہوں۔"

"فخر کا لمحہ؟"

"میرے والد ڈاکٹر جاوید عالم خان میرے لیے فخر کا وہ لمحہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔"

☆ "جب پہلا آپریشن کیا تو دل کی کیا کیفیت تھی؟"

"سرجن کی زندگی میں وہ دن سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے جس دن اس نے پہلی سرجری مکمل کی ہو۔"

☆ "اب تک کتنے آپریشن کیے؟"

"اب تک پچاس ہزار سے زائد آپریشن کیے ہیں۔ سابق وزیر اعظم میر ظفر اللہ جمالی کی دونوں آنکھوں کا آپریشن کیا ہے اور بہت سے معروف ڈاکٹرز اور وکیل حضرات کا کیا ہے۔"

☆ "مزاجاً کیسے ہیں۔"

"مزاج میں نخرہ بالکل نہیں ہے۔ جو ملے صبر شکر سے کھا لیتا ہوں۔ اس حوالے سے میں اپنی بیگم کو دنیا کی خوش قسمت خاتون سمجھتا ہوں۔"

☆ بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں "اس کی آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو" تو جب ایسی جادو بھری آنکھ ڈاکٹر پاس علاج کے لیے آتی ہے تو ڈاکٹر کے دل کو بھی کچھ ہوتا ہے؟"

"آپ کو دل کا راز بتاؤں؟ شادی کے بعد جو محبت میں نے اپنی بیگم سے کی ہے وہ جنون کی حد سے بھی زیادہ ہے۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی جادو بھری آنکھ مجھ پر اثر انداز ہوگی۔"

اس دعا کے ساتھ کہ یہ محبت اور ساتھ ہمیشہ قائم رہے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے اجازت چاہی۔

عفت سحر طاہر

خوشبو کا رشتہ



تیز برستی بارش اور سماعتوں میں کسی کے تیز چبھتے جملے، یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں مبین آفندی اور سہیل آفندی ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگار سے محبت ہوجاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہوجاتی ہے۔

طلال اور مہر ماہ یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہر ماہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کرلیا جاتا ہے۔

مبین آفندی، آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کردیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلالیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا خان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کردیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں۔ تائی جان، مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیتے ہیں، ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگاہ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

موبائل کی بیٹری ڈاؤن ہوجانے کی وجہ سے مہر ماہ کا رابطہ نمیر سے ٹوٹ جاتا ہے اور وہ وقار آفندی اور زرنگار آفندی کی محبت اور آفندیز کی بے حسی کے بارے میں سوچتی رہ جاتی ہے۔

وہ موحد کے آفس میں رابطہ کرکے اس سے ملنے کا کہتی ہے وہ گھر آکر بات کرنے کا کہتا ہے۔ وہ اس کے آفس پہنچ کر اس کے سامنے نمیر کی داستان سن کر اس سے ہمدردی محسوس کرنے کا کہتی ہے۔ موحد کہتا ہے کہ اس کی پوری کہانی سن کر فیصلہ کرنا کہ وہ کس چیز کا حق دار ہے۔ سزا یا معافی۔

ملاحہ نئے ڈرائیور کو دیکھ کر پریشان ہوجاتی ہے۔ اور کبیر کے لیے اس کے دل میں شکایت پیدا ہوجاتی ہے۔ کبیر اسے کالج سے واپسی پر لینے آتا ہے اور اپنے گھر لے جاکر اسے اپنی ماں بہنوں سے ملوتا ہے۔ نمیر فون پر مہر ماہ کو اپنی ادھوری کہانی سناتا ہے۔ آغا جان مہر ماہ سے بات کرتے ہیں۔ اور نمیر سے نکاح قائم رکھنے پر اسے سخت سست سناتے ہیں۔ وہ نمیر کی حمایت کرتی ہے تو وہ اس سے ناراض ہوجاتے ہیں۔ مہر ماہ فون پر نمیر سے کہتی ہے کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ حامی بھرلیتا ہے۔ ملاحہ، موحد سے مدد مانگتی ہے۔ وہ اس کے لیے کوئی رشتہ لاتا ہے۔ ملاحہ ناراض ہوجاتی ہے۔

مہر ماہ، نمیر آفندی سے ملنے کبیر کے ساتھ جاتی ہے اور اسے باہر انتظار کرنے کا کہہ کر ریسٹورنٹ کے اندر چلی جاتی ہے پہلے سے بک کی ہوئی ٹیبل پر اس کا انتظار کرتی ہے۔ کہ اچانک ایک آواز پر چونک جاتی ہے۔

زرنگار کی کہانی جان کر مہر ماہ آفندی ہاؤس والوں کی بے حسی اور تکبر پر دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ موحد کو بلا کر اس سے بات کرتی ہے۔

موحد ملاحہ کے لیے رشتہ لانے کی بات کرتا ہے۔ تو ملاحہ بہت افسردہ ہوتی ہے۔ وہ کبیر کو چاہتی ہے۔ موحد اسے بتاتا ہے کہ کبیر گھر چھوڑ گیا ہے اور اس نے آفس سے اپنی پراپرٹی کے کاغذات بھی چرالیے ہیں۔
نمیر آفندی مہرماہ کو راستے میں ملتا ہے۔ وہ اسے جھڑک کر آگے بڑھ جاتی ہے۔
موحد ملاحہ کے لیے جو رشتہ لاتا ہے۔ ان کی شان وشوکت دیکھ کر سائرہ چچی کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ جبکہ ملاحہ شدید پریشان ہے۔
تزئین کی زبانی حقیقت جان کر طلال مہرماہ کو دوبارہ رشتہ جوڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ مگر وہ اپنا اور موحد کا رشتہ جتا کر اس سختی سے پیش آتی ہے۔ نمیر کی مہرماہ سے ملاقات ہوتی ہے وہ مہرماہ کو آزاد کرنے کے بجائے اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ موحد بھی مہرماہ سے شادی کا خواہاں ہے مگر اسے دونوں ناپسند ہیں۔ کبیر، آغاجی کی عیادت کرنے آتا ہے تو صدیقہ بیگم اسے خوب ذلیل کرتی ہیں۔ نمیر کو پیسہ دینے پر گھر کے سارے مرد غصے میں ہوتے ہیں مگر موحد کی باتوں میں آکر جائیداد کی خاطر ملاحہ اور کبیر کا رشتہ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

چوبیسویں قسط

ملاحہ ایک حیرت مسلسل کی زد میں تھی۔ گھر میں اس کی شادی کی بات شروع ہو چکی تھی لیکن اس کا دل ابھی تک یقین اور بے یقینی کے درمیان پنڈولم بنا ہوا تھا۔

"بھلا گھر والے مان کیسے گئے؟" دل چاہتا خود کو چٹکی کاٹ کر دیکھے کہ کہیں اتنا حسین خواب تو نہیں دیکھ رہی۔

"اف...... آج پتا چلا کہ لڑکیاں بھائی کیوں مانگتی ہیں اللہ سے۔" مہرماہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ملاحہ نے تجزیہ پیش کرنے والے انداز میں کہا تو مہرماہ نے عجیب سی کیفیت میں گھور کر اسے دیکھا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی اور اطمینان جھلک رہا تھا۔

"آج ایسا کیا ہو گیا؟" مہرماہ نے ناسمجھی کا تاثر دیتے ہوئے اس کو پکڑ کر اس کا رخ گھمایا اور آئینے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس کا کیچر اتار کر الجھے سلجھے بالوں کو تاسف سے دیکھا تو وہ ہنس دی۔

"کیا کروں، وقت ہی نہیں ملا۔"

"اتنے پیارے بال برباد کر رہی ہو گھونسلا بنا بنا کر۔" مہرو نے نرمی سے بال برش کرنے شروع کیے۔

"موحد بھائی کی بات کر رہی ہوں آپی! اللہ نے کتنا احسان کیا ان کو ہماری زندگی میں بھیج کر۔" وہ جذب سے بولی تو مہرو کی تیوری چڑھی۔

"ایسے کون سے گل بوٹے کھلا دیے ہماری زندگی میں آکر اس نے؟"

"میری زندگی میں تو کھلا ہی دیے اور آپی تم اگر صحیح فیصلہ کر لو تو تمہاری زندگی میں وہ ویسے ہی چاند بن کر آئے ہوئے ہیں۔" کیچر لگوا کر وہ جوش سے کہتی مہرماہ کی طرف مڑی۔

لوگ کتنی آسانی سے آپ کی زندگی کا جمع تفریق کر لیتے ہیں اور بظاہر نظر آتے سچ کو ہی حقیقت مان لیتے ہیں۔ مہرماہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ ملاحہ نے ذرا سا منہ بنایا (اب بندہ اتنا مغرور بھی نہ ہو)۔

"بعض چاند گرہن زدہ بھی ہوتے ہیں ملی! ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔"

"میرے دامن میں تو ہیرے موتی ڈال دیے انہوں نے آپی!" وہ بے اختیار بولی۔ حیا سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ مہرماہ نے بے ساختہ مسکرا کے ـــــ اس کی گلابی پڑتی رنگت کو نظر بھر کر دیکھا اور دل ہی دل میں

اس کی خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعا کی۔

"اور اللہ نہ کرے وہ گرہن زدہ چاند ثابت ہوں تمہارے لیے آپی! وہ تو ہمارے گھر والوں کی سوچ پر لگا گرہن اتار رہے ہیں۔ ورنہ امی تو ساری زندگی اس رشتے کے لیے نہ مانتیں۔" ملاحہ پر موحد کی شخصیت کا گہرا اثر پڑا تھا۔

"حیرت تو مجھے بھی بہت ہوئی تھی لیکن میرے خیال میں امی نے تمہاری ضد کے ساتھ سمجھوتا کر لیا ہے۔" مہرماہ نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا تو وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔

"توبہ کریں توبہ، وہ آپ ہی تھیں جن کے طلال بھائی کے ساتھ رشتے پر گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ یہاں تو کبیر کو وہ ایک ڈرائیور سے بڑھ کر اہمیت دینے پر راضی ہی نہیں تھے وہ تو نہ جانے موحد بھائی نے کیسے ان کو منا لیا۔"

"اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ نمیر سے سارا پیسہ واپس لے کر ان لوگوں کو دے گا تو تم ایسا کچھ خیال مت کرو کہ وہ کبیر کو داماد والا خاص پروٹوکول دیں گے۔" مہرماہ نے طلال والی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے کبیر کے سلسلے میں گھر والوں کی طرف بہت زیادہ توقعات وابستہ کرنے سے باز رکھنے کے لیے صاف صاف لفظوں میں کہا تو وہ مسکراتے ہوئے آنکھیں میچ کر گھوم گئی۔

"ابھی تو بس یہ سوچ کر خوش ہونے دو آپی! میری محبت میری زندگی کا حصہ بننے والی ہے۔" پھر آنکھیں کھول کر شرارت سے بولی۔ "اور فکر مت کرو ہم ایک دوسرے کو خود ہی پروٹوکول دے لیں گے۔"

مہرماہ کے ہونٹوں پر نم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ محبت اسی طرح دنیا ومافیہا سے بے خبر کر دیا کرتی ہے اور کوئی غم غم نہیں لگتا۔ ہر پریشانی ہیچ لگتی ہے اور وہ تو بس محبوب کو پا ہی لینے والی تھی۔

☆☆☆

"میں تو کہتی ہوں صدیقہ بھابی کی "کرنی" ان کے سامنے آئی ہے۔ مجال ہے زندگی میں اس عورت نے اپنے علاوہ کسی اور کو کچھ سمجھا ہو۔ اسی لیے اللہ نے ٹکے ٹکے کے لوگوں سے ذلیل کروایا ہے اسے۔ پہلے وقار کا نام نہاد بیٹا اس کے خاندان میں شامل ہوا اور اب یہ ڈرائیور۔" سائرہ چچی نے تائی جان پر فتویٰ لگاتے ہوئے آخر میں گویا بہ مشکل اپنی ہنسی روکی تو سہیل آفندی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آ گئی۔

"یہ سب مصیبتیں ان کی بیٹیوں کی وجہ سے ہی آئی ہیں اس گھر پر۔ اب بھگتنا بھی تو ان ہی کو تھا۔"

"مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ ملاحہ کو اور کوئی نہیں ملا کبیر کے سوا۔" چچی جان تو ابھی بھی کبھار بے یقینی کا شکار ہو جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں فرزین کا کردار قابل ستائش تھا کہ ماں اور بہن سے ہٹ کر اس کی طبیعت میں دوستانہ پن اور اپنائیت تھی یہی وجہ تھی کہ اگر ملاحہ کے کبیر کی طرف جذباتی جھکاؤ کا اگرچہ فرزین کو پتا بھی تھا تو اس نے ماں کو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

"خیر...... ایک ڈرائیور ہونا ہی اس کی خامی ٹھہری ورنہ بندہ تو وہ سونا ہے۔" سہیل آفندی نے نہ جانے کس رو میں آکر کھلے دل سے کبیر کی تعریف کی تو چچی جان کا منہ حلق تک کڑوا ہو گیا۔ یہ بات تو واقعی ماننے والی تھی کہ موحد ہو یا کبیر...... پرسنالٹی کے لحاظ سے تائی جان کے داماد واقعی نمبر ون تھے۔ اور اگر وقار کی خوب روئی کو ذہن میں لائیں تو خیال آتا کہ نمیر آفندی بھی خوش شکل ہونے میں باپ کی گدی پر بیٹھا ہوگا۔

"خیر...... کتنا بھی پیسہ آ جائے کبیر کے پاس، اس کی پہلی پہچان تو ڈرائیور ہونا ہی ہے نا۔" انہوں نے اپنے دل کی تسلی کے لیے کہا۔

"اس کی پہلی پہچان آغا جان کے دوست کا پوتا ہونا ہے۔" سہیل آفندی نے اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے انہیں یاد دلایا تو چچی جان نے تنفر سے کہا۔

"وہ کون جانتا ہے بھلا۔ تنخواہ دار ملازم تھا ہمارا۔ سب نے سالوں تک اسے ہماری چاکری کرتے دیکھا ہے۔ یہ تو اب بھابی بیگم کو خوب پتا چلے گا جب دنیا کے سامنے اپنے داماد کو پیش کریں گی۔" یہ تنفر اور اپنی ذات پر غرور اس خاندان کے بڑوں کی ایسی عادت بن چکا تھا کہ ہر ہر بات پر ان کے لب و لہجے میں عود کر آتا تھا اور ان لوگوں کو احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔

"اس کا موقع ہی نہیں آئے گا سائرہ بیگم!" وہ چمکتی آنکھوں کے ساتھ پراسرار سا مسکرائے تو چچی جان ٹھٹکیں۔

"کیا مطلب......؟"

"مطلب یہ کہ نکاح کے بعد موحد سارا روپیہ ہمارے حوالے کرے گا اور اس کے بعد کبیر کو درمیان سے ہٹا دیا جائے گا۔" ان کی بات کی تہ تک پہنچ کر چچی جان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

☆☆☆

کبیر کے گھر میں شادی کی تیاریاں روایتی جوش اور ارمانوں کے ساتھ جاری تھیں۔ اور وہ گھبرا کر بار بار بہنوں کو سمجھا رہا تھا۔

"سمپل نکاح اور رخصتی ہے۔ دھوم دھڑکے سے بارات تو لے کر نہیں جانی۔ اس لیے کوئی شور ہنگامہ نہیں ہوگا۔"

"لالہ، ہم گھر آکر اپنے سارے ارمان اور رسمیں پوری کریں گے۔ اس خوشی کے موقع پر تو کم از کم خوشی منا لینے دیں۔" کبیر کی شادی شدہ بہن نے ڈھولک کی رسیاں ٹائٹ کرتے ہوئے مسکرا کر محبت سے کہا تو اسے چپ ہونا پڑا مگر اصل رونق تو آفندی ہاؤس میں لگنے والی تھی۔ وہ رونق جو آفندیز کے گمان میں بھی نہ تھی۔

☆☆☆

"موحد نے کیا جواب دیا ہے۔ کب تک وہ اس خبیث شخص سے روپیہ واپس لے رہا ہے؟" آغا جان کا ہر کسی سے ایک ہی سوال تھا۔

"وہ اسی ہفتے کے آخر تک کا کہہ رہا ہے آغا جان۔ ہو جائے گا ان شاء اللہ۔ آپ فکر مت کریں۔" مبین آفندی نے ان سے زیادہ جیسے خود کو یقین دلایا۔

"وہ ہے کہاں، اسے میرے پاس بھیجو ذرا۔" آج بہت دنوں کے بعد آغا جان نے جیسے ہار کر موحد کو طلب کیا تھا۔ مبین آفندی کو جھٹکا سا لگا۔

"دفع کریں آغا جان! ہم خود اس سے نمٹ لیں گے۔ آپ کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں، میں نہیں چاہتا کہ وہ آپ کے ساتھ مزید کوئی گستاخی کرے۔" انہوں نے آغا جان کو در حقیقت موحد سے نہیں بلکہ گھر میں چل رہے حالات سے دور رکھنے کے لیے ناگواری سے کہا تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"بہت احترام کرتا ہے وہ میرا۔ بس ذرا غصے اور بے وقوفی میں آکر جذباتی حرکت کر گیا ہے۔ تم جاؤ اور اسے بھیجو میرے پاس۔ ابھی ہر بات کلیئر ہو جائے گی۔" اتنے دنوں تک موحد کو نہ دیکھنے کے بعد جیسے آغا جان کے دل میں اس کے لیے پھر سے نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔ مبین آفندی دل ہی دل میں موحد کو کوستے ہوئے اٹھے۔ اور ناراضی سے آغا جان کو دیکھا۔

"لیکن یاد رکھیے گا آغا جان اگر اب کی بار اس نے کوئی غلط حرکت کی یا آپ کا دل دکھایا تو اس کے لیے آفندی ہاؤس میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔" وہ غصہ دباتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولے۔

اب کھل کر باپ کو کیا بتاتے کہ کیسے وہ کل کا لڑکا سب کو اپنی انگلی پر نچا رہا تھا اور کیسے اس کھیل میں وہ اپنی دوسری بیٹی بھی داؤ پر لگانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ آغا جان کبیر کو دامادی میں لینے کا فیصلہ سن کر موحد کو تو شاید از راہ محبت چھوڑ دیتے مگر مبین آفندی کو ضرور گولی سے اڑا دیتے۔ انہیں سوچ کر ہی جھرجھری سی آئی۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ آغا جان نے تیکھی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"میں بہتر سمجھتا ہوں کہ کس کے لیے کیا فیصلہ کرنا ہے اور میرے جیتے جی تم لوگوں کو ان معاملات کا حل نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" آغا جان کا دبنگ لب و لہجہ ماضی کی یاد دلا رہا تھا۔ مبین صاحب کی پیشانی چمک اٹھی۔

"چلیں جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ میں آپ کا پیغام بھجواتا ہوں اسے۔" وہ کنی کترا کر باہر نکلے اور رومال نکال کر پیشانی صاف کی۔

مال اور اولاد کو اللہ نے یونہی تو آزمائش نہیں کہا نا...... تقریباً ہر آزمائش ان ہی دو راستوں سے زندگی میں آتی ہے۔ آپ کی اولاد یا مال۔

انہوں نے ملازمہ کے ذریعے موحد کو بلوایا اور خود لاؤنج ہی میں بیٹھ گئے اور ٹاک شو پر نظر جما لی۔ لیکن ذہنی پراگندگی اتنی تھی کہ ایک بھی لفظ سماعت سے ٹکرا کر معنی و مطالب واضح نہیں کر رہا تھا۔ ان کا ذہن مسلسل ان نکات کو سوچ رہا تھا جن پر موحد سے بات کرنے کے بعد اسے آغا جان کے پاس بھیجنا تھا۔ جانے وہ کتنی دیر بعد آیا تو وہ چونکے۔

"جی...... خیریت؟" بے حد تر و تازہ۔ اونچا لمبا شاندار مرد۔ وہ واقعی ان کا داماد ہوتا تو کیا ہی بات ہوتی۔ ان کے دل میں بے ساختہ حسرت اٹھی تو وہ کھنکھارے۔

"آغا جان نے یاد کیا ہے تمہیں۔"

"اووہ...... چشم ما روشن دل ما شاد۔" وہ صوفے پر پھیل کر آرام دہ حالت میں بیٹھتے ہوئے دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگا۔ تو وہ جزبز ہوئے۔

"دیکھو۔ تمہارے جو بھی معاملات ہمارے ساتھ چل رہے ہیں ان کے بارے میں آغا جان کے سامنے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" انہوں نے دبے لفظوں اسے تنبیہ کی تو وہ بھولپن سے بولا۔

"کیا مطلب...... ایسے کون سے راز چل رہے ہیں ہمارے بیچ؟"

"کبیر والے معاملے کا کہہ رہا ہوں (خبیث انسان)۔" انہوں نے دانت پیس کر باقی کا آدھا جملہ دل میں کہا تو وہ متاسفانہ بولا۔

"چچ چچ...... یعنی آپ کا ملاحہ کی شادی میں آغا جان کو انوائٹ کرنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں؟"

"بکواس مت کرو موحد! تم جانتے ہو کس سطح پر آکر ہم تمہارا یہ مطالبہ ماننے پر رضا مند ہوئے ہیں۔ اب تم مزید الجھنیں پیدا مت کرو۔ آغا جان قیامت لے آئیں گے گھر میں۔ کبیر اور ملاحہ کے نکاح کی جو ڈیل ہوئی ہے وہ پھر کینسل ہی سمجھنا۔" وہ تیز لب و لہجے میں بولے۔

"اس شادی کو آپ کب تک چھپا سکتے ہیں آغا جان سے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ابھی سے ان کے علم میں لے آئیں سارا معاملہ۔" موحد نے ریموٹ اٹھا کر چینل بدلتے ہوئے ناصحانہ کہا تو وہ بدک اٹھے۔

"شادی......؟ تم نے تو فی الحال صرف نکاح کا کہا تھا اور ویسے بھی جیسے حالات چل رہے ہیں ہم لوگ

ابھی رخصتی کے لیے تیار نہیں۔ ذرا آغا جان کی طبیعت سنبھل جانے دو پھر سوچیں گے۔ اصل چیز تو نکاح ہی ہے نا۔" وہ جلدی سے بات بنا کر بولے تو موحد نے ٹی وی پر سے نگاہ ہٹا کر انہیں دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔

"بہت اچھے۔۔۔ اصل چیز تو واقعی نکاح ہے تو پھر کب رخصت کر رہے ہیں مہرو کو نمیر کے ساتھ؟" محظوظ ہو کر پوچھا تو ان کا دل چاہا......

مگر بعض باتیں آپ واقعی صرف سوچ ہی سکتے ہیں۔ انہوں نے بہ مشکل ضبط کرتے ہوئے اس کی بات کو کڑوے گھونٹ کی طرح پیا۔ اور زہر کے گھونٹ بھر کر نرمی سے بولے۔

"اسے نمیر سے نجات دلواؤ موحد! ہم تمہارا اور مہرو کا دوبارہ نکاح کر دیں گے۔ خاندان کو تو ویسے بھی تم دونوں کے اس رشتے کا پتا ہے۔" وہ جیسے اسے للچا رہے تھے وہ بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس دیا اور کچن میں کھڑی اس ساری گفتگو کو چائے بنانے کے درمیان بے دھیانی سے سنتی مہر ماہ کے چہرے سے آگ کی لپٹیں سی نکلیں۔ کس قدر بے حس تھے یہ آفندیز...... بیٹیاں تو گویا داؤ پر لگانے والی چیز سمجھ رکھی تھیں انہوں نے اور ان کی بات پر موحد کا قہقہہ...... وہ ڈوب مرنے والی ہوگئی۔

"بہت خوب...... تو گویا مہر ماہ آفندی کو انعام میں رکھ دیا ہے آپ نے؟" وہ جیسے محظوظ ہو رہا تھا۔ مہر ماہ کی رنگت زرد پڑی، چکر سا آیا تو وہ کچن کاؤنٹر کا سہارا لے بیٹھی۔

" بکواس مت کرو اور جاؤ جا کر آغا جان سے ملو۔ درحقیقت تم سیریس بات کرنے کے قابل ہی نہیں۔" وہ تلملاتے ہوئے سلگ کر بولے۔

"سیریسلی......؟" اس نے بھنویں اچکا کر مذاق اڑانے والے انداز میں پوچھا تو وہ اسے مزید منہ لگائے بنا اٹھ کر ہی چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی موحد سنجیدہ ہوگیا۔ بہر حال وہ وقت آہی گیا تھا جب اسے اپنے مہرے بہت دھیان سے چلنے تھے یا شاید سفا کی سے۔ آفندیز والی مخصوص سفا کی۔ وہ پراگندہ سوچوں کو ذہن سے جھٹکتا اٹھا۔ آغا جان سے بھی آج بات ہو ہی جائے۔ مگر پلٹتے ہی ٹھٹک جانا پڑا۔ ضبط سے گلابی پڑتی آنکھوں کے ساتھ سامنے مہر ماہ آفندی کھڑی تھی مگر قابل ذکر بات ان آنکھوں سے نکلتے شعلے تھے۔ جن کا سبب وہ جان نہیں پایا۔

"ہیلو۔۔۔" مسکرا کر کہا۔

"اگر آفندیز کو عورت کی عزت کرنا نہیں آتی تو کم بے عزت تم بھی نہیں کر رہے موحد آفندی!" وہ درشتی سے لفظ چبا کر بولی تو آنکھوں میں نمی بے اختیار ہی چمک اٹھی۔ دل کتنا دکھا تھا ان کی باتیں سن کر۔ موحد کی مسکراہٹ تھمتی۔

"میں تو بارہا تمہیں کہہ چکا ہوں مہر! کہ میں پوری دلی رضامندی سے تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔"

" بکواس کرتے ہو تم۔ سنی ہیں میں نے ابھی تمہاری باتیں۔" وہ پھنکاری۔

"تو پھر یقیناً اپنے والد صاحب کے ارشادات بھی سنے ہوں گے؟"

"تم انہیں اس سطح پر لے آئے ہو کہ وہ یہ سب کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔" مہر ماہ انگشت شہادت سے اس کی طرف اشارہ کر کے غصے سے بولی۔

"بات ذرا تلخ ہے مہر! مگر کوئی باپ کتنا ہی مجبور کیوں نہ ہو جائے وہ بیٹیوں پر بازی نہیں لگاتا۔" وہ بازو سینے پر لپیٹتے ہوئے تحمل سے بولا تو مہر ماہ جلبلا اٹھی۔

"شٹ اپ۔"

" کبیر اور ملاحہ کا رشتہ ہی دیکھ لو۔ صرف پیسے کی واپسی کے لالچ میں ایک ڈرائیور کو داماد بنانے پر راضی ہو گئے ہیں سب۔ ورنہ تو شاید ملاحہ کو کاٹ کر دریا میں پھینکنا پسند کرتے۔" وہ شانے اچکا کر اسی لاپروائی سے بولا اور واقعی یہ سچ تھا۔

''لیکن والدین تو آئیڈیل ہوا کرتے ہیں نا۔'' مہر ماہ کو یک لخت نمیر کی بات یاد آئی۔ ''والدین کو آپ کے سامنے کوئی ڈی گریڈ کرے تو کیسا لگتا ہے۔'' وہ بھی تکلیف کی اسی اسٹیج پر تھی جس پر شاید کبھی ننھا نمیر تھا۔

اس کی ایک آنکھ سے بے اختیار آنسو چھلک گیا تو اتنی دیر تک سنگ دلی سے بولتا ہوا موحد بے اختیار اٹھا بلا ارادہ ہی ذرا سا آگے بڑھ کر انگوٹھے کی پور سے اس کا آنسو نرمی سے صاف کر دیا۔

"تم جانتی ہو میرے اختیار میں کیا کچھ ہے مہر! مگر اللہ گواہ ہے کہ میں خود کو تمہارے آگے بے اختیار پاتا ہوں اور میں تمہیں تمہاری دلی رضامندی سے پانا چاہتا ہوں۔" اس کے لب و لہجے میں کمال کی نرمی تھی۔ مہر ماہ نے رونا دھونا بھول کر گویا کرنٹ کھا کر اس کا ہاتھ جھٹکا تو موحد نے اس کی کلائی تھام لی۔

"یہ جھوٹے ڈرامے میرے سامنے مت کرو سمجھے۔" وہ غرائی۔

"پیسہ تو میں سارا اڑا ہی چکا ہوں۔ اب اپنی ماں کو ساتھ لوں اور یہاں سے کل ہی اڑان بھر جاؤں۔ کون روک سکتا ہے؟ سمجھتی نہیں ہو اس بات کو کہ مجھے کیا چیز پلان کے خلاف فیصلے کرنے پر مجبور کر رہی ہے؟" وہ ایک قدم مزید آگے بڑھا تو مہر ماہ کی سانس حلق میں ہی اٹک گئی۔ موحد کی نگاہ اس کے چہرے پر تھی۔

"مجھے کیا پتا اور کیا کیا اڑانا ہے تم نے ابھی۔" وہ کلائی چھڑانے کی کوشش کرتی درشتی سے بولی تو موحد نے اس کی کلائی اونچی کی۔

"یہ...... مہر ماہ آفندی...... اور اس کا دل۔" وہ کہہ رہا تھا۔ مہر ماہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی جدوجہد ترک کر دی اور شاکی نظر موحد پر ڈالی۔

"تم اس قابل ہو کہ مہر ماہ آفندی کا دل اڑا سکو؟"

"میں دعویٰ نہیں کرتا بلکہ ثابت کروں گا۔" وہ اسی دل میں اترتی مسکراہٹ کے ساتھ برجستہ بولا تو مہر ماہ اس کا ہاتھ جھٹک کر تن فن کرتی واپس پلٹ گئی۔

وہ بہت سبک احساسات لیے آغا جان کے کمرے کی طرف بڑھا۔ آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹا کر وہ اندر داخل ہوا تو آغا جان بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھے گویا اسی کے انتظار میں تھے۔ وہ سلام کر کے سنجیدہ سی شکل بنائے ان کی طرف بڑھا تو نہ جانے کیوں اس کی نافرمانی کے باوجود بھی آغا جان کے دونوں بازو دائیں بائیں پھیل گئے تو وہ بھی ایک سیکنڈ کی دیر کیے بنا حسب عادت جھک کر ان کے سینے سے لگ گیا اور اپنی آنکھیں نم پا کر آج ان کو خود پر حیرت ہوئی' شاید بیماری نے ان کو زود رنج بنا دیا تھا۔ انہوں نے خود کو دل میں تاویل پیش کی۔

"کیسے ہیں آغا جان؟" موحد نے نرمی سے پوچھا تو وہ بے اختیار شکوہ کر گئے۔

"بہت جلدی خیال آگیا تمہیں اپنے آغا جان کی طبیعت کا۔" انہوں نے ہلکی سی ناراضی کا مظاہرہ کیا تو وہ کرسی کا رخ ان کے بیڈ کی طرف کر کے بیٹھتے ہوئے اطمینان سے بولا۔

"مجھ پر تو آپ کے بیٹوں نے کرفیو لگا دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید میری شکل دیکھنا آپ کے لیے برا شگون ثابت ہو سکتا ہے۔" وہ مسکرا رہا تھا اور یہ وہی مسکراہٹ تھی جس میں وقار اور فاران آفندی دونوں کی جھلک آتی تھی۔ آغا جان کا دل اس کی مسکراہٹ سے بھر گیا۔ وہ شاید کچھ بھی کر لیتا آغا جان اس سے ہمیشہ

کے لیے قطع تعلق نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں خود سے اعتراف کیا۔ وہ ان کی اولاد کی اولاد تھا یعنی کہ سود اور اسی لیے اپنی اولاد کی دفعہ جو غلطیاں ان کے نزدیک ناقابل معافی تھیں، موحد کی باری ان سے بھی بڑی غلطیاں چند دنوں کے بعد انہیں چھوٹی لگنے لگتی تھیں۔

"وقار کے بیٹے کے ساتھ تمہاری بات چیت کہاں تک پہنچی، وہ مہرو کو کب تک آزاد کر دے گا؟" آغا جان نے بات شروع کی۔

"میں بھی اسی سلسلے میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا آغا جان!" موحد نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"انسان کو ماضی کی غلطیوں کو بھلا کر آگے کا سفر جاری رکھنا چاہیے۔ وہ آپ کا پوتا ہے اور اگر چاہتا ہے کہ دنیا کے سامنے آپ اسے تسلیم کر لیں تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟ مجھے بھی تو قبول کیا ہے نا آپ نے۔ ہمیں بھی تو نکالا گیا تھا یہاں سے۔" وہ جو کہہ رہا تھا آغا جان کے لیے متوقع نہ ہوتا تو شاید ان کا پارہ چڑھ جاتا۔

"اپنا اور اس کا موازنہ مت کیا کرو موحد۔" وہ موحد کے معاملے میں شاید اس اظہار پر مجبور تھے اسے ٹوک گئے۔ موحد کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ ابھی تک اس کا انتہائی فیصلہ کر چکے ہوتے۔ لیکن ان کے اس التفات پر بھی موحد کا دل شاد نہیں ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے جیسے کسی سوچ میں گم تھا۔

"تم نے یہ کیا کیا موحد! برسوں کی کمائی کو اس ناہنجار پر لٹا دیا۔ مہرو کا مسئلہ تو ہم کسی اور طریقے سے بھی حل کر سکتے تھے۔" آغا جان کا شکوہ کناں لہجہ ایسا مدھم کبھی نہ ہوا تھا، موحد نے چہرہ اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں عجیب سلگتی ہوئی سی کیفیت تھی۔

"اور اگر وہ مہرو کو نہ چھوڑنا چاہے تو؟" اس کی بات سن کر آغا جان کو کرنٹ لگا۔

"میں ایسی بات بھی سننا نہیں چاہتا موحد۔ پہلے مہر ماہ کو اس سے طلاق دلواؤ اور پھر سارا پیسہ واپس لو۔" وہ قطعی انداز میں بولے۔ پھر اسے بغور دیکھا۔

"تمہارا رابطہ کیسے ہوا وقار کے بیٹے سے؟" موحد چند لمحے ان کی آنکھوں میں دیکھتا رہا اور پھر بے نیازی سے بولا۔

"وہ میرے ساتھ پلا ہے آغا جان!" اس کی بات سن کر آغا جان کو شدید جھٹکا لگا جیسے ان کی قوت گویائی سلب ہوگئی ہو۔ وہ یوں ہی آر یا پار والے انداز میں انہیں دیکھ رہا تھا۔

"کیسے......؟" انہوں نے سرسراتے لہجے میں پوچھا تو اگلے ہی لمحے وہ ہنس دیا۔

"دل بڑا کیا کرتے ہیں آغا جان! تاکہ جھٹکے سہنے کی عادت پڑ سکے۔ اس دنیا میں ایسے گزارہ نہیں ہوتا۔"

"یہ کیسا بے ہودہ مذاق تھا موحد!" انہوں نے ناگواری سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"موحد کا آپ کا اور نمیر آفندی کا رشتہ قدرت کی مرضی سے بنا ہے آغا جان! اسے آپ جھٹلا نہیں سکتے۔"

"تقدیر سے تو بہت شکوے ہیں ہمیں۔ تم یہ نمیر والا سلسلہ ختم کرواب۔ اتنا بڑا قدم اٹھا لیا ہے تم نے بنا کسی سے مشورہ کیے۔ اب تو اس مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کرو گے تو ہی تمہارے تایا بھی خوش ہوں گے۔" وہ تنبیہی انداز میں کہتے ذرا تھمے اور پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد بولے۔

"ناراض تو میں بھی بہت تھا تم سے مگر دل کا سلسلہ تم سے کچھ ایسا جڑا ہے کہ تمہارے ساتھ ناراض رہ نہیں پاتا۔" وہ اپنی طرف سے اسے بہت طریقے سے ہینڈل کر رہے تھے۔ (تایاؤں کی تو ناراضی کے دن تو ابھی شروع ہو رہے ہیں) وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔ آغا جان کا دل ذرا بہتری کی طرف مائل ہوا۔ موحد کے انداز میں

پہلے والی سرکشی مفقود تھی۔ انہیں لگا کہ وہ ان کے بس سے باہر نہیں ہوا، ابھی بھی وہ اسے قابو کر سکتے ہیں۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ وہ جن ہے جس کو قید کرنے والا چراغ ابھی بنا ہی نہیں تھا۔ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بہت طمانیت سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

تائی جان نے ملاحہ اور مہر ماہ کو شاپنگ کرنے سے روک دیا۔

"پرسوں شادی ہے امی۔ ضرورت کی چیزیں تو لینے دیں اسے۔ پارلر سے ٹائم بھی لے چکی ہوں میں۔" مہر ماہ نے احتجاج کیا تو تائی جان نے کٹیلی نگاہ ملاحہ پر ڈالی۔ بنا پارلر کے چکر کے ہی اس کے گال قندھاری انار کی طرح چمک رہے تھے وہ اندر تک سلگ گئیں۔ (یہ بے وقوف اولاد)۔

"کوئی ضرورت نہیں نکاح ہی تو ہے اور جن حالات میں ہو رہا ہے ان میں، میں تمہیں ان چونچلوں کی اجازت نہیں دے سکتی۔" وہ اسی کٹیلے انداز میں بولیں تو ملاحہ نے شکوہ کناں نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"اب ایک کام ہو ہی رہا ہے تو اس کے تمام لوازمات پورے کر لینے دیں امی۔" مہر ماہ ناگواری سے بولی۔

"تم چپ رہو۔ تم نے جو چاند نہیں ٹانکے تھے وہ اس نے ٹانک کر پورے کر دیے ہیں اور اس پر ابھی بھی حسرت ہے لوازمات پورے کرنے کی۔" انہوں نے اسے ترشی سے جھاڑ دیا۔ مہر ماہ کا منہ پھر سے کھلتا دیکھ کر ملاحہ اسے پیچھے گھسیٹ کر لے گئی۔

"چھوڑو مجھے ملاحہ! زیادتی کی بھی حد ہوتی ہے۔ اگر دل پر پتھر رکھ کر اولاد کی خوشی کا پہلی بار سوچ ہی لیا ہے تو کم از کم وسیع القلبی تو دکھائیں۔" وہ تیز لہجے میں بولی تو ملاحہ نے مسکرا کر کہا۔

"میرے لیے موحد بھائی نے جتنا کر دیا ہے اتنا ہی کافی ہے، میری شکل دیکھو کیا مجھے کسی مصنوعی لیپا پوتی کی ضرورت ہے آپی!؟" ملاحہ کی بات نے اس کا غصہ سرد کر دیا۔ اندرونی خوشی اور طمانیت سے واقعی

اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں جو پہلے کبیر کو کھونے کے خیال سے بھیگی اور بجھی سی رہتی تھیں اب جگر جگر کر رہی تھیں۔

"میں ابو سے بات کروں گی۔ حد ہوتی ہے زیادتی کی۔ تم کون ساز بردستی شادی کروا رہی ہو، ان سب کی مرضی سے ہی یہ کام ہونے جا رہا ہے تو پھر گھر میں اس قدر سوگ کیوں منایا جا رہا ہے؟ اس فیصلے پر راضی ہوئی ہو جوان سب نے خود مل کر کیا ہے۔"

"آپی چھوڑ دو بھی، رہنے دو، بلکہ ایسا کرو کہ تم ہی مجھے مہندی لگا دینا ہاتھوں پر اور اپنے ہاتھ سے دلہن بنانا۔ سوچو کتنی یادگار شادی ہوگی نا۔ جب بھی میری شادی کی بات ہوگی تو میں یاد کیا کروں گی کہ مجھے آپی نے دلہن بنایا تھا۔" ملاحہ نے کسی بھی بات کو دل پر لیے بغیر جوش سے کہا تو مہرماہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔"

"پلوشہ آپی نے کہا تھا کہ شادی کا جوڑا ان کی طرف سے آئے گا اور زیور بھی۔" ملاحہ نے اسے تسلی دی۔

"میرا دل کر رہا ہے کہ میں گھر میں ایک تماشا لگا دوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ تمہاری شادی خیریت سے نمٹ جائے۔ اللہ جانے پہلے ہی کیں دل سے سب نے ہامی بھری ہے۔ چیزوں کا کیا ہے وہ تو بعد میں بھی بن سکتی ہیں۔" مہرماہ نے اسے اور خود کو تسلی دی تو ملاحہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مگر شام تک دونوں بہنوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ثمرہ اور موحد بازار سے لوٹے تو دونوں کے ہاتھوں میں ایک ایک سوٹ کیس تھا ثمرہ نے ملاحہ اور مہرماہ کو اپنے کمرے میں بلایا۔ موحد وہاں کرسی پر بیٹھا ستا رہا تھا۔ ملاحہ نے اسے سلام کیا مگر مہرماہ اسے قطعاً نظر انداز کر کے ثمرہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"جی آنٹی! آپ نے بلایا تھا۔" موحد نے ہینڈ کیری سوٹ کیس بیڈ پر لٹا رکھے تھے۔

ثمرہ نے مسکراتے ہوئے زپ کھولی اور سوٹ کیس کھول کر ان دونوں کے سامنے کر دیا۔

"اب اللہ جانے تمہیں یہ سب پسند آتا ہے یا نہیں۔ مگر یہ سب تمہارے لیے ہے ملاحہ۔ تمہارے بھائی کی طرف سے شادی کا تحفہ۔"

ان دونوں بہنوں پر شدید حیرت طاری ہوئی۔ پورا سوٹ کیس خوب صورت کام دار جوڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے دوسرا سوٹ کیس بھی کھولا تو ملاحہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس میں زیورات کے ڈبے اور پرس وغیرہ ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ کل ہی ثمرہ نے ملاحہ سے ایک سوٹ ناپ کے لیے لیا تو وہ یہی سمجھی کہ وہ شادی کے موقع پر اسے ایک آدھ ریڈی میڈ سوٹ دلوانا چاہ رہی ہوں گی۔ مگر ان کام دار جوڑوں کے ساتھ برانڈڈ ریڈی میڈ کئی جوڑے بھی موجود تھے اور یقیناً ملاحہ کے ناپ کے تھے۔ ملاحہ بے اختیار ثمرہ کے گلے لگ گئی۔

"ماں تو خوشی میں شریک ہونے کو اوپری دل سے بھی تیار نہیں آنٹی! مگر آپ کی محبت ساری زندگی یاد رکھوں گی میں۔"

مہرماہ خاموش کھڑی تھی۔ ثمرہ کے عمل نے اسے بھی متاثر کیا تھا مگر سامنے بیٹھا دلچسپی سے اس کے تاثرات نوٹ کرتا شخص، کسی بھی طور اسے تعریف کے لائق نہیں لگتا تھا...... ہونہہ۔

ثمرہ نے ملاحہ کی پیشانی چوم لی۔

"اب ایک چکر بازار کا لگانا اور جوتے اپنی پسند کے لے لینا۔"

"میرا اور آپی کا سائز سیم ہے آنٹی! آپی ہی لا دیں گی، مجھے تو امی نے سختی سے ایک بھی چیز خریدنے سے منع کیا ہوا ہے۔" ملاحہ نے منہ بسورا۔

"ان سے کسی بھلائی کی امید مت رکھنا ملاحہ! اور نہ ہی انہیں ان چیزوں کے بارے میں بتانا۔ تایا جان اور تائی جان تو شاید ہر ممکن کوشش کریں گے کہ یہ شادی نہ ہی ہو۔" موحد نے تنبیہہ کی تو اپنے ماں باپ کے بارے میں اس کے ارشادات سن کر مہرماہ کا خون کھول اٹھا۔

"شٹ اپ...... اگر انسان کے پاس بولنے کو کچھ اچھا نہ ہو تو اسے چپ ہی رہنا چاہیے۔"

"آپی......" ملاحہ گڑبڑائی۔ مگر مہرماہ اسے بخشنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"امی ابو کو کبیر کے پروپوزل پر جتنا بھی غصہ سہی مگر انہوں نے خود رضامندی دی ہے اس شادی کے لیے۔ تم پھر بھی ان کے خلاف باتیں کر رہے ہو اور وہ بھی ہمارے سامنے۔"

موحد نے مسکرا کر مہرماہ کا غصیلا روپ دیکھا۔

"چلو...... ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ نکاح والے روز ہی پتا چل جائے گا تمہیں کہ کیا کھچڑی پک رہی ہے۔" وہ یقین سے بولا تو اب کی بار ثمرہ نے بھی ناگواری سے تنبیہی انداز میں اسے ٹوک دیا۔

"موحد! کسی کے سامنے اس کے والدین کے بارے میں غلط بات نہیں کرتے۔"

"جی مام!" وہ فوراً مان گیا اور شریف بچہ بن گیا مگر مہرماہ کو پھر بھی زہر ہی لگا۔

چلو مان لیا کہ بہت مشکلوں سے امی اور ابو ملاحہ کے رشتے کے لیے راضی ہوئے تھے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا نا کہ وہ جو منہ میں آئے بک کر انہیں ان کے والدین سے متنفر کرنے کی کوشش کرتا۔ چند چیزیں خرید کر لے دینے سے یہ دونوں ماں بیٹا ان کے لیے والدین سے بڑھ کر نہیں ہو گئے تھے۔ مہرماہ اندر ہی اندر تنفر سے سوچ رہی تھی اور موحد کی گہری نگاہ جیسے اسے اندر تک پڑھ رہی تھی۔

شام کو وہ ثمرہ کے ساتھ اپنی اور ملاحہ کی باقی ماندہ شاپنگ کرنے مارکیٹ چلی گئی اور اپنی مرضی سے جو دل چاہا ملاحہ اور کبیر کے لیے خریدا اور ثمرہ نے ادائیگی کر دی۔ مہرماہ کا دل اس مصروفیت میں خوش اور مگن تھا۔

☆☆☆

مبین آفندی نے اسے آفس میں طلب کیا اور اب وہ ان کے سامنے بیٹھا ان کی ہدایات سن رہا تھا۔

"نکاح ہونے تک تم سارا روپیہ بزنس اکاؤنٹ میں ڈلوا دو گے اور ان زمینوں کے کاغذات بھی واپس کرنے ہوں گے جو تم نے کبیر کو واپس کی ہیں۔" موحد کے تاثرات یک لخت بدلے۔ وہ بے اختیار سیدھا ہو بیٹھا۔

"ہمارے درمیان صرف بینک اکاؤنٹس والا مسئلہ حل کرنے کی بات ہوئی تھی۔ کبیر کا معاملہ الگ ہے وہ اس جائیداد کا اصل مالک تھا۔ آغا جان نے تو بس اس کی جائیداد کے کاغذات رہن رکھے ہوئے تھے۔ حق دار کو اس کا حق دیا ہے میں نے اور اس مسئلے پر میں کوئی ڈیل نہیں کروں گا۔ صرف نمیر کو دیے ہوئے پیسے کو واپس لانے پر ڈیل کر رہے ہیں ہم، یہ بات آپ یاد رکھیے اور عین وقت پر کوئی تماشا نہیں چاہتا میں" موحد نے قطعی انداز میں کہا تو مبین صاحب دانت کچکچا کر رہ گئے۔

یہ الو کا پٹھا ان کے شکنجے میں کسی بھی طرح آنے والا نہیں تھا۔ لمحہ بھر کے لیے انہیں احساس ہوا کہ کہیں ملاحہ کا نکاح کبیر کے ساتھ کر کے وہ کوئی بہت بڑی غلطی تو نہیں کرنے جا رہے اور اس میں بھی موحد کی انہیں پھانسنے کی کوئی چال نہ ہو۔

موحد نے تعجب سے انہیں دیکھا اور بولا۔ "آپ کو تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ جس کے ساتھ آپ اپنی بیٹی کی شادی کر رہے ہیں وہ صاحب جائیداد ہے کوئی ٹٹ پونجیا نہیں۔ آپ کی بیٹی کی ہر خواہش پوری کرنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ ایک ماں باپ کو اپنے داماد کی طرف سے اس کے علاوہ اور کیا سیکیورٹی چاہیے ہوتی ہے۔"

وہ خلوص نیت سے کہہ رہا تھا اور مبین صاحب اس کی طرف تمسخر سے دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ سامنے بیٹھا خود کو دنیا کا ہوشیار ترین انسان سمجھنے والا یہ کل کا چھوکرا نہیں جانتا تھا کہ یہاں مبین صاحب نے اس کی چال اسی پر الٹنے کا پلان بنا لیا ہے۔

"تم نے کیسے کھیل کھیل کر مجھے اس شادی پر راضی کیا ہے وہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔" مبین آفندی پھنکارے تو موحد نے تاسف سے انہیں دیکھا۔

"بس کل کا دن باقی رہ گیا ہے اور آپ نے ابھی تک اپنے دل سے ہونے والے داماد کے خلاف زہر نہیں نکالا زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ والدین کو اپنی نہیں بلکہ اولاد کی نظر سے حالات کو دیکھنا پڑتا ہے۔"

"تم مجھ سے زیادہ میری اولاد کے سگے مت بنو۔" وہ ناگواری سے بولے تو وہ موحد نے گہری سانس بھری اور پھر قطعی انداز میں بولا۔

"بہر حال میں کبیر والے معاملے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ جو بات پہلے سے ہو چکی ہے صرف وہی پوری کروں گا۔"

"لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ ملاحہ کا نکاح ہو جانے کے بعد تم اپنی بات سے مکر نہیں جاؤ گے؟"

"فکر مت کریں تایا جان! آپ رخصتی تب کیجیے گا جب بینک اکاؤنٹس کی پوزیشن آپ کو پتا چل جائے گی۔" موحد نے انہیں تسلی دی تو مبین صاحب کا دل کھل اٹھا۔ شکار نے لاعلمی میں خود ہی ان کے بچھائے ہوئے جال کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تھا۔

"مگر اتنی بات یاد رکھنا! یہ مت سمجھنا کہ نکاح کے بعد میں ملاحہ کو رخصت کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ جس طرح میں یہ رشتہ جوڑ سکتا ہوں اسی طرح اس کو توڑنا بھی میرے لیے کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ دوسری صورت میں ثمیر کی ماں ہے نا ضمانت کے طور پر ہمارے پاس۔" مبین صاحب نے سرد لہجے میں اسے تنبیہ کی تو موحد دانت پر دانت جما کر رہ گیا۔

"مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ آفندیز کس سطح تک جا سکتے ہیں۔ میں اس گھر کی تمام روایات کو اچھی طرح جان گیا ہوں۔ انہیں رشتے بس توڑنے ہی آتے ہیں جوڑنے نہیں اور اگر جوڑیں بھی تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی مفاد ضرور ہوتا ہے۔" موحد نے شرم دلانے والے انداز میں تلخی سے کہا لیکن دوسری طرف کوئی اثر نہ تھا۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے سامنے رکھی فائل میں ایسے گم ہو چکے تھے جیسے بزبان خاموشی کہہ رہے ہوں کہ اب دفع ہو جاؤ۔ موحد کرسی گھسیٹ کر پیچھے کرتا ہوا کھڑا ہوا۔

وہاں سے وہ نکل کر سیدھا کبیر کی طرف آیا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی وہ ہنستا مسکراتا کھلے دل سے آکر اس کے گلے لگ گیا۔

"اور سناؤ دولہا میاں شادی کی تیاریاں مکمل ہو گئیں؟"

کبیر جھینپ سا گیا۔ "میں تو ان سب کو کہہ رہا تھا کہ سادگی سے نکاح کر رہے ہیں مگر ان عورتوں کو تب تک چین نہیں آتا جب تک یہ ساری رسمیں ادا نہ کر لیں۔"

موحد ہنسا۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے، بہنوں کے تو ویسے ہی بھائیوں کی شادیوں پر بہت ارمان ہوتے ہیں اور یہاں تو بھائی بھی اکلوتا ہے تو ظاہر ہے اسی پر سارے ارمان نکلیں گے نا۔" وہ کبیر کے ساتھ چلتا ہوا لان میں ٹہلنے لگا۔

"اس طرف تو کوئی بھی دل سے اس نکاح پر راضی نہیں ہے۔" موحد نے بات شروع کی تو کبیر کے

ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ کھیل گئی۔

"جس کو نکاح کے لیے راضی ہونا چاہیے، وہ تو راضی ہے۔ ہمیں کسی اور کی رضامندی سے کیا غرض،" اس کی بات سن کر موحد نے قہقہہ لگایا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔"

"خیر قاضی کو اب اتنا ہلکا مت لیں۔ سب سے اہم کام یعنی کہ نکاح پڑھانا اسی کے ہاتھ میں ہے۔" کبیر نے مسکرا کر کہا تو کچھ سوچ کر سنجیدہ ہوتے ہوئے موحد نے تنبیہی انداز میں کہا۔

"پھر بھی ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رہنا، آفندیز کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ہمارے پلانز تیار ہیں تو انہوں نے بھی کچھ نہ کچھ چالیں ضرور سوچ رکھی ہوں گی۔"

"اللہ بہتر ہی کرے گا یقیناً۔ اندر تو چلیں، چائے کا ایک ایک کپ ہو جائے۔" کبیر نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا اس کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

"مبین صاحب! دھیان رکھیے گا، یہ نہ ہو کہ ساری چال ہم پر ہی الٹی پڑ جائے۔" صدیقہ بیگم نے پریشانی سے کہا کل نکاح کا دن تھا اور آج رات ان کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ "میں اپنی بیٹی کو ایک ڈرائیور کے ساتھ رخصت نہیں کروں گی۔"

مبین آفندی نے تحمل سے انہیں دیکھا۔ "بے فکر رہو ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ یہی سمجھو کہ کچھ دیر کا ڈراما ہوگا اور بس۔ یہاں کون سا برادری یا رشتہ دار شامل ہو رہے ہیں جو ناک کٹنے کا اندیشہ ہوگا۔"

ان کی نسبت مبین صاحب اس بات کو سوچ کر بہت مطمئن تھے۔ گھر میں شروع ہونے والی بات گھر میں ختم بھی ہو سکتی تھی اور کسی کو کانوں کان پتا بھی نہ چلتا۔ ایک بار سارا پیسہ ہاتھ میں آ جاتا تو پھر وہ اور سہیل آفندی مل کر آغا جان کی برین واشنگ کرتے اور موحد کو ایک طرف۔ کر دیتے۔ اب وہ کسی طور کاروباری معاملات میں موحد کی دخل در اندازی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

"میرا تو بس نہیں چلتا کہ شام سے پہلے دونوں ماں بیٹے کو گھر سے باہر کھڑا کر دوں۔" تائی جان نے تلملا کر کہا۔

"یہ سب کہنے میں آسان لگتا ہے برابری کے حصہ دار ہیں وہ دونوں۔" مبین صاحب نے حقیقت بتائی۔

"یہ الو کا پٹھا موحد اگر ہمارے قابو میں رہتا تو ہماری بیٹی کی زندگی بھی سنور جاتی اور ہم لوگ بھی عیش کرتے، مجھے تو یہ لڑکا کبھی کبھی پاگل لگتا ہے، اپنے اکاؤنٹ میں پیسہ ڈالنے کے بجائے وقار کے بیٹے کی ہمدردی کا بخار چڑھا ہوا ہے اسے۔" مبین صاحب، موحد سے سخت برگشتہ تھے۔

"چھوڑیں مبین صاحب! ہماری اپنی اولاد کو زندگی سنوارنے کی تمیز نہیں ہے۔ تزئین کو دیکھیں، کیسے موقع ملتے ہی طلال پر ہاتھ صاف کیا ہے اس نے۔ ہماری بیٹیاں تو نری بیوقوف ہیں۔" انہیں مہر ماہ پر غصہ آیا۔

"چلو جو ہوا سو ہوا، اب دیکھنا یہ ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ بہت کر لی من مانی ان دونوں ماں بیٹے نے، اب تو وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔" مبین صاحب پُر اعتماد تھے مگر انسان غرور

کے یہ الفاظ بولتے ہوئے بھول جاتا ہے کہ ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ مبین صاحب نے بھی زور و شور سے ان کی تائید کی تھی۔ تائی جان مطمئن ہو کر بالآخر بستر پر لیٹ ہی گئیں، کل کی فکر کچھ کم ہو گئی تھی۔ سو تھوڑی دیر میں ہی ان کے خراٹوں کی ہلکی ہلکی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

☆☆☆

آج تو ملاحہ کے دل کی حالت ہی عجیب تھی۔ اتنے مہینوں سے جس کی شکل بھی دیکھنے کو نہ ملی تھی آج اس سے ملاقات کا وقت بس آیا ہی چاہتا تھا۔ صبح ہی کبیر کی بہنیں ملاحہ کے نکاح کا جوڑا اور زیورات دے کر جا چکی تھیں۔ اس موقع پر بھی صدیقہ بیگم نے رنگ میں بھنگ ڈالنے کی خوب کوشش کی۔

"ان سب چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے ہاں پہلے دن کا جوڑا لڑکی والوں کی طرف سے ہوتا ہے۔"

"چلیں آنٹی کوئی بات نہیں، یہ بھی تو بھابی ہی کا ہے۔" پلوشہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اسی رکھائی سے بولیں۔

"وہیں آ رہی ہے تو آ کر پہن لے گی۔ ہمارے سر ڈال کر جانا ضروری تو نہیں۔"

چائے لے کر آتی ملاحہ نے بے اختیار ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی مہر ماہ کو اڑی رنگت کے ساتھ دیکھا۔ وہ نظروں سے بہن کو تسلی دیتی ملاحہ سے پہلے اندر داخل ہوئی۔ اور جاتے ہی ساری چیزوں کو اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

"واؤ...... بہت خوب صورت جوڑا ہے اور جیولری بھی۔ کس کی چوائس ہے پلوشہ؟" اس باغی اولاد کے رال ٹپکاتے سوال نے تائی جان کو جز بز کیا۔

"جس کی بھی ہو۔ میں ان سے کہہ رہی تھی کہ پہلے دن کا جوڑا ہماری طرف سے ہوگا۔ یہ سب واپس لے جائیں۔ ملاحہ وہاں آ کر پہن لے گی۔" (اگر رخصت ہوئی تو) بمشکل ضبط کرتے ہوئے وہ رسان سے بولیں اور باقی کا آدھا جملہ دل میں کہتے ہوئے انہوں نے مہر ماہ کو جن تادیبی نظروں سے دیکھا، وہ ان کا مطلب بہت اچھی طرح سمجھتی تھی مگر انہیں قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے لاڈ کے مارے پلوشہ کو خود سے لپٹا کر شہد آگیں لہجے میں بولی۔

"نہیں بھئی...... منگنی کا جوڑا بھی واپس گیا تھا، اب کی بار یہ بدشگونی نہیں کرنی ہم نے، ورنہ ان کا دل بھی ٹوٹے گا۔"

"رسم و رواج بھی کوئی چیز ہوتے ہیں جن کی پاسداری کرنا پڑتی ہے مہرو!" ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایک دو ہاتھ مہرو کو جڑ ہی دیں۔

"افوہ امی...... جب رشتہ داری ہونے والی ہے تو پھر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں کیا سوچنا۔"

مہر ماہ نے ڈھٹائی کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے ساری چیزیں اٹھا لیں تو وہ دانت پیس کر رہ گئیں۔ ملاحہ ہنسی روکتی، چائے کی ٹرالی اندر لائی تھی۔ اسے دیکھ کر آنکھ دباتی مہر ماہ ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

"میں یہ سب سنبھال کر آتی ہوں۔"

ملاحہ، کبیر کی بہنوں کے ساتھ گپ شپ کر رہی تھی اور اس نے ایک بار بھی ماں کی شعلے اگلتی تنبیہی نظروں کی طرف دیکھنے کی کوشش نہ کی تھی۔ صدیقہ بیگم اندر ہی اندر اپنے آپ کو پُرسکون رہنے کا درس دے رہی تھیں اور یہ یاد کر رہی تھیں کہ رات تک سب معاملہ نبٹ چکا ہوگا اور بساط لپیٹ دی جائے گی۔

☆☆☆

"تم نے مہرو سے بات کی اپنے اور اس کے رشتے کے بارے میں؟" وہ نکاح کی تقریب کے لیے تیار ہو کر ان کے کمرے میں آیا تو نظروں ہی نظروں میں اس کی بلائیں لیتے اور باآواز بلند ماشاءاللہ کہہ کر ثمرہ نے بے چینی سے پوچھا۔ تو وہ ہنسنے لگا۔

"یہ اچھا ہے۔ ذرا سا حسن کیا دیکھ لیا بیٹے میں، آپ کو فوراً روایتی ماں کی طرح ہولانے کی پڑ گئی۔"

"منٹوں میں تم نے کبیر اور ملاحہ کی شادی کا حل نکال لیا۔ ورنہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جاتی مگر صدیقہ بھابی کبھی اس رشتے کے لیے نہ مانتیں۔ اور اپنے لیے تم نے منہ میں گھنگھنیاں ڈالی ہوئی ہیں۔" ثمرہ نے جس طرح خفگی سے اسے لتاڑا موحد بے اختیار قہقہہ لگا بیٹھا۔

"آپ کی بہو رانی پھولن دیوی ہے۔ وہاں آپ کے بیٹے کی چالیں نہیں چلتیں۔"

"بکواس نہ کرو۔ سارا قصور ہی تمہارا ہے۔ وہ بے چاری تو پھر بھی اتنے حوصلے سے ہمارے اور نگار کے ساتھ کھڑی ہے۔" ثمرہ خفا ہوئیں۔

"آپ کے ساتھ کھڑے ہونے سے کیا ہوگا۔ بات تو تب بنے گی جب وہ محترمہ میرے لیے اسٹینڈ لیں گی" وہ مسکراتے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"اس کا دل دکھا ہوا ہے موحد!" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولیں۔ "بے چاری نے خوشیاں دیکھی ہی کہاں ہیں۔"

"افوہ...... آج تو یہ اداس شکل مت بنائیں۔ آج تو وہ بھی بہت خوش ہوگی۔ بس دعا کریں، ملاحہ اور کبیر کے لیے جو سوچا ہے وہ اچھے سے ہو جائے۔" اس نے جلدی سے بات سمیٹ دی تو وہ اسے گھورنے لگیں۔

"سومیہ بے چاری کا خیال آتا ہے مجھے۔ کتنی بددل ہو کر وہ واپس شارجہ گئی ہے۔ کیا میں نہیں جانتی کہ کس کے پیچھے وہ ملک بدر ہو رہی تھی۔" اب انہیں بھتیجی کا دکھ ستانے لگا۔

"وہ تو ایویں جھلی ہے بس۔ آپ جلدی کریں میں ذرا باہر کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔ لان ریڈی ہوا یا نہیں"

"بس بات پلٹنی خوب آتی ہے تمہیں۔ پچاس آدمی لگائے ہوئے ہیں ایک لان کو ارینج کرنے کے لیے تو کیا اب بھی نہ ہوگا۔" وہ اس کے سومیہ کے ذکر سے پہلو تہی کرنے والے انداز کو سمجھتے ہوئے جل کر بولیں۔ وہ ہنستے ہوئے کمرے سے نکل گیا اور باہر نکل ہی جاتا اگر مہر ماہ کے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھلا نہ دیکھ لیتا۔ گزرتے ہوئے کھلے دروازے کی درز سے اسے ادھر ادھر چلتی پھرتی تیار ہوتی مہر ماہ کی جھلک دکھائی دی تو اس کے قدم پیچھے ہٹنے کے انداز میں واپس ہوئے۔ ایک نظر کمرے کے اندر ڈالی۔ زرنگار سامنے بیڈ پر لیٹی دکھائی دیں منہ پر اپنا لان کا دوپٹا ڈال رکھا تھا اور مہر ماہ جلدی جلدی اپنی تیاری نمٹا رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ ملاحہ کو تیار کر کے آئی تھی۔ وہ دروازہ کھٹکھٹانے کی زحمت کیے بنا اندر داخل ہو گیا تو ہڑبڑا کر دوپٹہ شانے پر ڈالتی مہر ماہ نے تیز نظر اس کے مسکراتے چہرے پر ڈالی۔

"کسی کے کمرے میں داخل ہونے کے بھی کچھ آداب ہوا کرتے ہیں۔"

"سوئے ہوئے انسان کی نیند کا خیال کرنا بھی مینرز اور ایٹی کیٹس کی کیٹگری میں آتا ہے۔" اس نے زرنگار کی طرف اشارہ کیا مگر اس کی نگاہ مہر ماہ کے سجے سنورے روپ پر تھی...... اور مہرو کو اسی نظر کے جمود کا احساس جز بز کر رہا تھا۔

" کوئی بات ہے کیا؟" چند لمحوں تک یوں ہی کھڑا رہنے کے بعد مہر ماہ نے مجبوراً پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔
" کچھ نہیں۔ اچھی لگ رہی ہو۔"
مہر ماہ خجالت کا شکار ہوئی تو چہرے سے آگ کی لپٹیں سی نکلیں۔
"بس یہ فضول بات کہنے آئے تھے تم۔" وہ تنک کر کہتی اپنی گھبراہٹ دور کرتے ہوئے بولی تو موحد نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ نرم سفید ہتھیلی کے درمیان گول ٹکیہ اور انگلیوں کی پوریں لال مہندی سے دہک رہی تھیں۔ مہر ماہ کی سانس اندر ہی کہیں اٹک گئی۔ وہ موحد سے اتنی جرأت کی امید نہیں رکھتی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا مگر موحد کی گرفت مضبوط تھی۔
"میں نے اتنی خوب صورت مہندی کبھی نہیں دیکھی۔" اس کی نرم نگاہ نے مہر ماہ کے نقوش کو چھوا۔ اوبسیشن کی دلفریب مہک نے مہر ماہ کا گھیراؤ کیا ہوا تھا۔ اس پر موحد کے بدلتے انداز و الفاظ۔
"بدتمیزی مت کرو اور جاؤ یہاں سے۔" مہر ماہ نے زبردستی اپنا ہاتھ کھینچ کر اسے درشت لہجے میں کہا مگر نگاہ اس کی بے خود نظر سے نہ ملا پائی تھی۔ خوب صورت ڈریسنگ اور بالوں کو سلیقے سے سنوارے خوشبوئیں اڑاتا وہ شان دار مرد، اسے اپنے حواس پر طاری ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔
" نکاح میں ہو میرے، اتنا تو حق ہے کہ دیکھ سکوں۔" وہ بے اختیار بولا تو مہر ماہ نے جیسے کسی سحر سے نکلتے ہوئے کٹیلی نگاہ اس پر ڈالی۔
"اس نکاح کی اصلیت تم اچھی طرح جانتے ہو اور حالات و واقعات بھی ازبر ہوں گے تمہیں۔ بس کچھ ہی دن باقی ہیں پھر تم کہاں میں کہاں۔" وہ تلخی بھرے انداز میں جتا کر بولی۔
"میں آغا جان سے بات کروں گا۔ ان سے مانگوں گا تمہیں۔" موحد نے بے ساختہ کہا تو مہرو نے فی الفور اسے ٹوک کر قطعی انداز میں کہا۔
"یہ حق صرف نمیر آفندی کے پاس ہے موحد آفندی!" مہر ماہ نے بہت چبا کر اس کا نام لیا تو وہ اس کے الفاظ سن کر ساکت ہوا۔
"اسے بہت شوق ہے مجھے نکاح میں رکھنے کا۔ اپنے کیے کا مداوا کرنے کا۔ تو بس پھر وہی ہے جو اپنی تمام تر حقیقت کے ساتھ آغا جان کے سامنے کھڑا ہو کر مجھے اپنے لیے مانگے گا۔"
"تم...... اسے معاف کرنا چاہتی ہو؟" اول جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد موحد نے بے یقینی سے پوچھا تو مہر ماہ کی آنکھ کا کونا نم ہونے لگا مگر وہ کسی کے بھی سامنے کم زور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔
"جب وہ اتنی ہمت کرے گا تب سب کو پتا چل جائے گا کہ میرا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن میری زندگی میں موحد آفندی کی کوئی جگہ نہیں۔" وہ تمام تر ہمت مجتمع کر کے بمشکل کہہ کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ موحد آفندی کے قدموں کو جیسے زمین نے جکڑ لیا۔

☆☆☆

تائی جان کو لان کی سجاوٹ دیکھ کر ہول اٹھ رہے تھے۔
"یہ اس خبیث کو کس نے کہا لان سجوانے کو، یہاں کون سا خاندان والوں کو انویٹیشنز بھیجے ہوئے ہیں جو اس نے پورے لان میں سٹنگ کا انتظام کیا ہوا ہے۔" تائی جان مبین صاحب سے تلملا کر بولیں تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اشارے سے انہیں ٹھنڈا رہنے کا کہا۔
"بس یہ وقت کسی طور گزر جائے دو پھر دیکھنا میں سارے بدلے اتار دوں گا۔"

" آپ بس سوچتے ہی رہیے گا، میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر وہ اپنے وعدے سے مکر گیا تو پھر کیا بنے گا ملاحہ کا نکاح تو ہو چکا ہو گا۔" تائی جان کو پھر سے فکر ہوئی مبین صاحب نے انہیں تسلی دی۔
" میں یہ ساری بات موحد سے کلیئر کر چکا ہوں اگر اکاؤنٹس میں پیسہ واپس نہ آیا تو میں یہ نکاح کسی صورت قائم نہیں رہنے دوں گا۔" تایا جان نے جذباتی ہو کر کہا۔
" نکاح تو خیر پیسوں کی واپسی کے بعد بھی ختم ہونا ہی ہے۔ بس دعا کرو کہ اندر آغا جان کو کسی بات کی بھنک نہ پڑے۔"
"ان کی طرف سے آپ بے فکر ہیں، میں نے دوپہر کی دوائی کے ساتھ نیند کی گولی بھی دے دی تھی، وہ رات تک سوتے رہیں گے۔" تائی جان نے اپنی ہوشیاری بتائی۔
"اور اگر مہر ماہ یا ملاحہ میں سے کسی نے کوئی فضول بات کرنے کی کوشش کی تو سنبھال لینا۔" مبین صاحب نے انہیں جتایا۔
" آپ بے فکر رہیں، ہو گا وہی جو ہم نے طے کیا ہے، ان میں سے کسی کی بھی مجال نہیں جو ہماری اجازت کے بغیر کوئی قدم اٹھا سکیں۔"
اسی وقت دروازہ بجایا گیا اور ساتھ ہی مہر ماہ نے اونچی آواز میں لڑکے والوں کے آنے کا مژدہ سنایا۔ تائی جان کا دل بھاری ہونے لگا۔ ایک کمّی کمین کو آج داماد کی مسند پر بیٹھے دیکھنا بڑے حوصلے کی بات تھی اور مجبوری یہ تھی کہ یہ حوصلہ انہیں کرنا ہی تھا۔ وہ مبین صاحب کے ساتھ ہی باہر پنڈال میں آئیں جہاں گیٹ سے کبیر خان اپنی بہنوں کے ہمراہ اندر داخل ہو رہا تھا اور ثمرہ اور مہر ماہ کے ساتھ کھڑی فرزین بھی ان پر گلاب کے پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہی تھی جبکہ سائرہ چچی پنڈال میں رکھی کرسیوں کے پاس کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔
صدیقہ تائی کا دل جیسے کسی نے جوتے تلے مسل دیا تھا۔ چاہے اس روپ میں کبیر خان شاندار لگ رہا تھا مگر وہ اسے آج بھی اپنے ڈرائیور کی حیثیت سے دیکھ رہی تھیں۔ مبین صاحب نے کبیر خان کا گلے لگ کر روایتی استقبال کرنے کے بجائے محض ہاتھ ملا کر اسے سٹیج کی طرف چلنے کا اشارہ کیا اور باقی سب بھی ان کی معیت میں اس طرف بڑھ گئے۔ ماحول میں کشیدگی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ قاضی صاحب آ چکے تھے اور نکاح میں کچھ ہی دیر باقی تھی — تائی جان کی نظر گیٹ کی طرف اٹھی تو ان کی اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رہ گئی جب انہوں نے خاندان کے کئی لوگوں کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔ ان کی سج دھج سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں باقاعدہ اس نکاح کے موقع پر مدعو کیا گیا ہے۔ تائی جان نے گھبرا کر خشک ہوتے حلق کے ساتھ سٹیج کی طرف دیکھا تو موحد آفندی کو محظوظ نظروں سے اپنی طرف متوجہ پا کر ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ ان کی ہر چال ان ہی پر الٹ دی گئی تھی۔
اسٹیج پر بیٹھے ہوئے مبین آفندی کی حالت بھی خراب ہو گئی، انہوں نے گھبرا کر موحد کی طرف دیکھا۔
"ان سب کو کس نے بلایا ہے؟"
وہ بکمال اطمینان سے مسکرایا۔ " تایا جان! خوشیوں کو اکیلے نہیں منانا چاہیے، بے فکر رہیں، ان سب کے کھانے کا انتظام کر رکھا ہے میں نے۔ آپ جائیں، جا کر سب سے ملیں اور مبارک باد وصول کریں، اس کے بعد نکاح کی سنت ادا کرتے ہیں۔"
مبین صاحب کا سر چکرانے لگا۔ انہوں نے سہیل آفندی کی طرف دیکھا جو خود بے بسی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ خاندان کے سب ہی لوگ اتنی ایمرجنسی میں نکاح پر مدعو کرنے کا شکوہ کر رہے تھے اور انہیں جو

بن پڑا وہ جواب دیتے ہوئے صدیقہ بیگم کا ذہن مسلسل موحد کی چال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مبین صاحب کا زمانہ شناس دماغ اس کل کے بچے کی سازش کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ خاندان کے لوگوں کے سامنے وہ کسی بھی صورت ملاحہ کی رخصتی کو روک نہیں پائیں گے اور یہی موحد آفندی کی چال تھی۔ ان کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ اب سارا معاملہ ان کے ہاتھ میں آئے بغیر ہی نکل چکا ہے۔ نکاح کے بعد سہیل آفندی بینک کال کر کے اکاؤنٹس کی تفصیل پوچھ چکے تھے۔ سارا پیسہ ان کے اکاؤنٹ میں واپس آچکا تھا۔ انہوں نے تھکے ہارے انداز میں کال ڈراپ کر دی۔ روپیہ تو واپس آ گیا تھا مگر گھر کی عزت اونے پونے جا رہی تھی۔ سب مہمان کھانا کھانے میں مصروف تھے۔

"یہ کیا بے غیرتی ہے تمہاری؟" موحد کے پاس آ کر وہ غرائے تو مہر ماہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ موحد زمانے بھر کی معصومیت چہرے پر لیے حیران سا ہو کر ان کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا، کھانا اچھا نہیں بنا کیا؟"

"تم نے سارے خاندان کو اکٹھا کر کے یہ کیا تماشا لگا دیا ہے۔" وہ اپنے بال نوچنے کو تھے۔

"اس میں تماشے کی کیا بات ہے، شادی ایسے ہی ہوا کرتی ہے۔" وہ شانے اچکا کر بے نیازی سے بولا۔ "ویسے بھی لڑکی کو سب کی دعائیں لے کر ہی رخصت ہونا چاہیے۔"

"بکواس بند کرو، رخصتی کون کم بخت کرنے والا تھا تم نے صرف نکاح کی بات کی تھی۔" مہر ماہ نے بے یقینی سے باپ کو دیکھا اور تیزی سے ان کی طرف آئی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ نکاح ہوگا تو رخصتی بھی آج ہی ہوگی۔"

"اس کمینے نے سارے خاندان کو مدعو کر کے ہمیں ذلیل کر دیا ہے ورنہ ایک کمی کمین کے ساتھ رخصت کرنے سے بہتر تھا کہ میں اپنی بیٹی کو دریا برد کر دوں۔" مہر ماہ کا دل جیسے کسی نے چیر دیا۔ اسے موحد کے کہے الفاظ یاد آئے۔ تب اسے محسوس ہوا تھا کہ موحد اسے اس کے والدین کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اب مبین صاحب کی باتیں سن کر اسے احساس ہوا کہ وہ اس کے والدین کو اس سے زیادہ جانتا تھا۔ اسی لیے اس نے پہلے سے ہی ان کی چال کا توڑ کر رکھا تھا۔ اگلا ایک گھنٹہ سب نے خوش گپیوں میں اور مبین صاحب کی فیملی نے پریشانی میں گزارا پھر رخصتی کا وقت بھی آیا۔ ان سب کی چالیں دھری کی دھری رہ گئیں اور ملاحہ کبیر خان کے سنگ شان و شوکت کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ صدیقہ بیگم اور مبین آفندی سکتے کی سی کیفیت میں ہارے ہوئے انداز میں لان میں پڑی کرسیوں پر تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

افشین نعیم

سارا دل سا دلدار

"حیدر، محب اللہ، عادل، اٹھو یار، اذانیں شروع ہو گئی ہیں۔" احسن کی آواز پر تینوں ہڑبڑا کر اٹھے۔

"تو جلدی اٹھانا تھا نا۔ اذانیں شروع ہو گئی ہیں...... اب اٹھا رہا ہے۔" حیدر نے آدھی کھلی، آدھی بند آنکھوں سے گرتے پڑتے کارنس تک پہنچنے کی کوشش کی۔

”میری تو اپنی آنکھ ابھی کُھلی ہے۔“ احسن چڑ کر بولا۔

کارنس تک پہنچنے کی کوشش میں اس کا پاؤں دیوار کا سہارا لے کر اٹھتے عادل کی ران پر جا پڑا۔ تھوڑا سا لڑکھڑا کر وہ زوردار آواز کے ساتھ عادل سمیت نیچے جا پڑا۔

آواز ان دونوں کے گرنے کے بعد تک آتی رہی کہ گرتے گرتے اس کا بازو کارنس تک پہنچ گیا تھا پر بُرا ہو قسمت کا کہ ہاتھ برتن تک پہنچا ہی تھا کہ یہ سانحہ وقوع پذیر ہو گیا۔ اسٹیل کا ناشتے دان پہلے زوردار آواز کے ساتھ نیچے گرا پھر گول گول گھومتا ان سب کی آنکھیں پوری طرح کھول گیا۔

”یہ تو کر کیا رہا ہے؟“ احسن جھنجھلایا۔

”رات کو دو، تین پکوڑے بچ گئے تھے وہی کھانا چاہ رہا تھا۔“ کہتے ہوئے دیوار کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کی۔

”وہ میں نے کھا لیے تھے رات کو۔“ کمرے کے دوسرے کونے سے محبّ اللہ کی آواز آئی۔

”اب اٹھ بھی جا، کہ ساری ہڈیاں توڑ کر اٹھے گا۔“ عادل بلبلایا۔

حیدر اٹھ کر کھڑا ہوا، اٹھتے اٹھتے بھی عادل کی ہڈیوں کے کڑاکے نکال دیے۔

”تجھے اللہ پوچھے گا۔“ عادل کراہتے ہوئے بولا۔

”یار، کچھ کھانے کو پڑا ہے تو جلدی نکالو، اذانیں ختم ہونے والی ہیں۔“ احسن کی آواز پر سارے الرٹ ہوئے۔

”یہ میرے پاس بسکٹ پڑے ہیں۔“ محبّ اللہ نے ایک بسکٹ منہ میں ڈالا باقی پیکٹ ان لوگوں کی طرف بڑھایا۔

”یہ دو امرود ہیں۔“ احسن نے چندہ پیش کیا۔

جلدی جلدی ان لوگوں نے دو چار نوالوں میں چیزیں ختم کیں۔ پانی پیا۔ اذان ختم ہونے سے پہلے پہلے نیت کر لی۔

”اب ذرا مجھے یہ بتا، تُو رات کو الارم لگا کر کیوں نہیں سویا۔ تیری باری تھی نا سحری لانے کی؟“ حیدر نے تھانے دارانہ انداز میں احسن سے تفتیش شروع کی۔

”یہ مولوی اٹھتا ہے نا روز تہجد پڑھنے کے لیے، میں نے سوچا، اٹھا دے گا تو لے آؤں گا سحری۔“ اس نے محبّ اللہ کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں کھلی آنکھ، تہجد بھی گئی آج۔“ محبّ اللہ نے افسوس سے سر جھٹکا۔

”اوئے، شہزادے! تُو نے آج رات نہیں لکھنے تھے محبوبہ کو خط......؟“ اب کے روئے سخن عادل کی جانب کیا۔

”ختم ہو گیا ہے کام۔ نیا کام ملنے تک فارغ ہوں۔“ عادل کی کمزور سی منمناتی ہوئی آواز حلق سے برآمد ہوئی۔

”اوئے تجھے تو ابھی سے روزہ لگنا شروع ہو گیا ہے۔ پورا دن کیسے گزارے گا......؟“

”یہی تو سوچ رہا ہوں۔ میرا تو سحری کھا کے بھی روزہ نہیں کٹتا۔ آج تو شاید شام تک تم لوگ میرے گزر جانے کے چاول کھا رہے ہو گے۔“

”گزر جانے کے چاول......؟ یہ کیا ہوتے ہیں؟“ احسن حیران ہوا۔

”مطلب، میں بھوک سے چل بسوں اور میرے وفات پانے کے بعد جو کھانا آپ سب تناول فرمائیں گے اس کی بات کر رہا ہوں۔“

”تیرے مرنے کے بعد چاول کی دیگ کس نے دینی ہے......؟ زیادہ سے زیادہ کوئی کچھ دے گا نا تو لعنت بھیج دے گا تجھ پر۔ بس۔ ویسے مولوی!“ عادل محبّ اللہ کی طرف مڑا۔

”کوئی بندہ اگر روزہ رکھ کر بھوک سے مر جائے تو وہ کیا کہلائے گا؟“

”بھوکا، مردہ، منحوس۔“ ایک ساتھ تین آوازیں

...ہوئیں۔

”تو، ادھر ادھر کی ہانکنا چھوڑ۔ تیری وجہ سے خالی پیٹ روزہ رکھنا پڑا ہے آج۔“ عادل، اب کے احسن کی طرف متوجہ ہوا۔

”آج کی افطاری تُو کروائے گا۔ وہ بھی ٹائٹ کی۔“

”بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔“ حیدر اور محبّ اللہ نے دونوں کی طرف دیکھتے عادل کی بات کی تائید کی۔

”بس ہر وقت دوسروں کو لوٹنے کا ہی سوچتے رہنا۔ پتا نہیں کب جان چھُوٹے گی تم جیسے بھوکے، ندیدوں سے۔“ احسن جل کر بولا۔

”آج ہی چھُوٹ سکتی ہے جان تیری۔ اٹھا اپنا یہ کباڑ خانہ اور دفع ہو جا یہاں سے۔“ حیدر جارحانہ انداز میں بولا۔ انگلی سے اس کے سامان کی طرف اشارہ کیا۔

”دفع ہو جاؤں گا تو پیچھے کرائے اور بلوں کے تین حصے ہوں گے چار نہیں۔ جب بھرنا پڑے گا نا فالتو روپیہ، تب یاد آؤں گا میں۔“ احسن نے بدلہ لیا۔

”تم تینوں اپنا اپنا منہ بند کرو اور نماز کے لیے اٹھو۔ جماعت قضا ہو جائے گی۔“ محبّ اللہ خود بھی وضو کرنے اٹھ گیا۔

☆☆☆

محبّ اللہ عصر کی نماز پڑھ کر واپس آیا تو تینوں سر جوڑے کسی کھسر پھسر میں مصروف نظر آئے۔

”یہ کون سی کانفرنس چل رہی ہے؟“ وہ نڈھال سا چارپائی پر گر گیا۔

”آجا، تجھے بھی بتائیں کون سی کانفرنس چل رہی ہے۔“

”میرے اندر تو بالکل ہمّت نہیں ہے ہلنے جلنے کی۔“ اس نے لیٹے لیٹے ہی نظر اٹھا کر ان تینوں کو دیکھا۔

”ابھی دوڑاتے ہیں تیرے اندر برقی رو۔ احسن چل اٹھ، شاباش، بھائی کو الیکٹرک شاک (بجلی کا جھٹکا) دے۔“

محبّ اللہ نے گردن گھما کر احسن کو دیکھا۔ اس نے وہیں سے ہاتھ بڑھا کر ایک کاغذ کا رول سا بنا کر اس کی طرف اچھالا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے بے دھیانی سے پکڑ کر کاغذ کھولا۔

”یہ برقی رو ہے جو ابھی آپ کو ہشاش بشاش کر دے گی۔“

”بجلی کا بل......ہوں۔“ لیٹے لیٹے کھولا۔

اور کھولتے ہی زوردار جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھا۔ نیند، بھوک، پیاس سب اُڑن چھو۔

”واہ بھئی واہ، سبحان اللہ، کس تیزی سے اثر دکھایا ہے اس برقی رو نے۔“ عادل نے سر دھنتے کہا۔

”پانچ ہزار سات سو ستاون روپے؟“ محبّ اللہ نے باآواز بلند دو بار بل پر تحریر ہندسے پڑھے۔

”پچاس بار اور بھی دہرا لے گا نا تو یہ اتنا ہی رہے گا۔ ایک روپے کا بھی فرق نہیں پڑے گا۔“

”یار، یہ اتنا زیادہ بل کیسے آ گیا؟“ پریشان لہجہ، حیران نظریں احسن کے چہرے پر گاڑ دیں۔

”میرا کوئی ماما، چاچا، پھوپھا، تایا، واپڈا میں نہیں ہوتا، بند کر مجھے گھُورنا۔“ احسن کو الجھن ہوئی۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر۔

”اس سے پہلے تک حد سے حد اٹھارہ، انیس سو تک بل آ جایا کرتا تھا۔ کبھی اس سے کچھ کم، کبھی زیادہ اور زیادہ سے زیادہ ساڑھے چار، پانچ سو ایک بندے کے حصے میں آتے تھے۔

افطاری کی تیاری کی، فکر سب بھول بھال، بھوکے پیاسے روزے دار بے چارے اب اک نئی فکر میں گھرے بیٹھے تھے۔

☆☆☆

ڈیڑھ مرلے کے اس مکان میں داخل ہونے کے لیے ایک معرکہ سر کرنا ہوتا تھا۔ ایک تنگ و تاریک گلی جس میں اگر تین نفوس ایک ساتھ داخل

ہوں تو ''قطار بنائیے'' کے سنہری اصول پر عمل کرنا ہوتا ہے۔

پھر اس گلی کے واحد مکان جو کہ ان چاروں کا مسکن ہے۔ اس میں داخل ہونے کے لیے ایک عدد نالی کم نالہ چھلانگ لگا کر عبور کرنا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس گھر کے مکین ایک بار نہیں بار بار کبھی لکڑی اور کبھی ٹین کا پھٹہ رکھ کر ایک پل بنانے کی کوشش کر چکے ہیں پر ہر بار ہی یہ کوشش چھان بورے والوں نے ان کے پل کو غائب کر کے ناکام بنا دی تھی۔

چلیں جی، چھلانگ لگا کر ہم اس مکان میں داخل ہو چکے ہیں۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر باتھ روم ہے جو کہ اس قدر مختصر ہے کہ اس پر رکھا جانے والا پہلا قدم فلش کی سیٹ پر ہوتا ہے۔ دوسرا قدم بھی فلش کی سیٹ پر ہی ہوتا ہے اور بس اس کی ساتھ ہی باتھ روم ختم۔

دروازے کی جگہ پر ایک خستہ حال پردہ جھولتا رہتا ہے جس میں جا بہ جا سوراخ ہیں۔ سو اخلاقی اقدار کی پاس داری کرتے ہوئے اندر سے باہر، یا باہر سے اندر آتے ہوئے لوگ حتی الامکان اس طرف دیکھنے سے احتراز برتتے ہیں۔

باتھ روم کے بالکل برابر میں غسل خانہ ہے۔ جہاں بالٹی اور نہانے والے کے بعد بس صابن دانی کی جگہ بچتی ہے۔ اس پر لگا ہوا پردہ نسبتاً نیا محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ کہ اپنا قدرتی رنگ زمانوں سے کھو بیٹھا ہے پر چونکہ اس میں کوئی سوراخ نہیں ہے سو بالکل نیا دکھتا ہے۔

غسل خانے کے بالکل برابر میں غسل خانے جتنی ہی جگہ خالی چھوڑی گئی ہے۔ جس میں ایک عدد چولہا اپنی مدد آپ کے تحت ان لوگوں نے سیٹ کیا ہوا تھا۔ چولہے کے برابر میں ایک چوکی اور بس، جگہ ختم، برتنوں کا چھینکا کمرے میں رکھا جاتا تھا۔

یہ تو تھا دائیں طرف کا حصہ، اس کے بالکل سامنے یعنی کہ بائیں طرف کے حصے میں دو عدد گملے رکھے گئے ہیں جس کے بعد اتنی جگہ بچتی ہے کہ ایک موٹر سائیکل کھڑی کی جا سکے اور موٹر سائیکل کھڑی کرنے والا سانس روک کر گزر جائے۔

''اندر آ جائیے۔ ایک کونے میں کباڑیے سے خریدی گئی واشنگ مشین رکھی ہے۔ اس کے ساتھ دیوار پر ایک گول آئینہ کیل پر ٹنگا ہوا ہے۔ آئینے کے نیچے ایک چارپائی ہے جس پر ایک ہفتہ باری باری یہ چاروں سوتے ہیں۔

باقی کی تین دیواروں کے ساتھ ایک ایک گدا بچھا ہے۔ اس کے بعد درمیان میں اتنی جگہ بچتی ہے کہ چاروں گول دائرے میں بیٹھ کر کھانا کھا لیں، تاش کھیل لیں، لڈو کھیل لیں یا انگلیوں کی مدد سے اشاروں اشاروں میں کرکٹ کھیل لیں۔

گردن اٹھا کر اگر چھت کی طرف نگاہ کریں تو اونچی سی چھت پر بابا آدم کے زمانے کی لکڑی کی بلیاں لگی ہوئی نظر آئیں گی۔ چھت کے بیچوں بیچ ایک زرافے جیسی لمبی سی گردن والا پنکھا لٹک رہا ہے جس کے پر چپٹے ہیں اور جو ہوا کم، آواز زیادہ دیتا ہے۔ رہائش گاہ کا تعارف ختم ہوا۔ آیئے واپس چلتے ہیں۔

☆☆☆

''یار! میں نے تو یہ ایک نوٹ بچا رکھا تھا بجلی کے بل کی مد میں۔'' محب اللہ نے پانچ سو کا نوٹ ان تینوں کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ''باقی تھوڑے سے پیسے خرچ کے لیے پڑے ہیں۔''

''میرے پاس کل ملا کر سات سو روپے ہیں۔'' حیدر کی آواز آئی۔

''سب سے امیر آدمی؟'' احسن نے فخر سے گردن اکڑائی۔ ''تیرہ سو پچاس روپے۔'' کہتے ہی کندھے خود بہ خود ڈھلک گئے۔ آواز پست ہو گئی۔

''سب سے غریب آدمی۔'' عادل نے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ ''میرے پاس صرف ایک پچاس کا نوٹ پڑا ہے۔ میں نے تو خرچ بھی تم لوگوں سے ادھار لے کر چلانا تھا۔''

''ہمیشہ کی طرح۔'' حیدر نے گرہ لگائی۔ عادل بس اسے گھور کر رہ گیا۔

''یار، کوئی حل سوچو نا......؟ اس مسئلے کا۔''

محب اللہ ان سب کا ایڈمن تھا۔ معاملات چلانا، اصول بنانا، ان اصولوں پر عمل کروانا سب محب اللہ کے ذمے تھا۔ اس کی بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ انصاف اور سوجھ بوجھ کے ساتھ فیصلے کرتا اور زیادہ اس وجہ سے کہ یہ مکان محب اللہ نے ہی کرائے پر لیا تھا۔ کرایہ نامہ اسی کے نام پر تھا۔ باقی سب بعد میں آ آ کر شامل ہوئے تھے اس ماہ پورا ایک سال ہو جانا تھا ان سب کے ساتھ کو۔

''یار، اس مہینے تو ہم نے اس گھر میں اپنے ساتھ کی سالگرہ منانا تھی۔'' عادل کی آواز میں بے بسی ملا دکھ تھا۔

''سالگرہ نہیں بیٹا، اینی ورسری۔'' حیدر نے ٹکڑا لگایا۔

''اینی ورسری بھی نہیں بھائی جان، برسی، اب تو برسی منانا پڑے گی۔'' احسن نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ آنکھیں موندتے ہوئے بولا۔

''ہم سال پہلے یہاں شفٹ ہوئے تھے۔ فوت نہیں ہوئے تھے جو برسی منائیں۔'' عادل نے منہ بنایا۔ (اس کو برسی والی بات پسند نہیں آئی تھی۔

''آئندہ آنے والے وقت میں برسی منانا پڑے گی۔ جب بل نہیں بھریں گے، میٹر کٹ جائے گا۔ مکان مالک دھکے مار کر ہمیں نکال باہر کرے گا۔ تو پھر برسی منایا کریں گے۔'' بات کی وضاحت کی۔

''او، خدا کے لیے چپ کر جاؤ تم لوگ کچھ سوچنے دو، مسئلے کا حل نکالنے دو۔'' محب اللہ کی ایک دھاڑ نے سب کی بولتی بند کر دی۔

''یار، تم سب بھی کوئی مشورہ دو، یہ اتنا بل کیسے بھریں گے؟'' محب اللہ نے فکر مندی سے ان سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آئیڈیا......!'' عادل نے چٹکی بجائی۔

سب متوجہ ہوئے۔

''بل اگلے مہینے جمع کروا دیں گے۔ کیسا......؟'' کہہ کر داد طلب نظروں سے حاضرین کو دیکھا۔

''کیوں، اگلے مہینے کوئی لاٹری نکلنی ہے تیری؟'' احسن نے طنز کیا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہے احسن۔ اگلے ماہ تو عید کا خرچا بھی ہو گا۔ پھر سر چارج (اضافی بل) بھی لگ کر آ جائے گا۔'' حیدر نے بات آگے بڑھائی۔

''نہیں، بات اگلے ماہ تک نہیں جا سکتی۔ حاجی صاحب (مکان مالک) آخری تاریخ کے اگلے ہی دن بل واپس لینے آ جاتے ہیں۔''

''انہیں ہماری طرف سے یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں بل جمع کروائے بغیر ہی نہ ہم لوگ بھاگ جائیں۔'' محب اللہ سنجیدگی سے پیشانی مسلتے ہوئے بولا ''بل تو ابھی ہی جمع کروانا ہو گا۔ دو دن ہیں ہمارے پاس بل جمع کروانے کے لیے۔''

''یار عادل! تو آج کل فارغ ہے نا۔ یہ مسجد کے باہر چندے والا بکس لے کر بیٹھ جا۔ رمضان میں لوگ ویسے بھی صدقہ وغیرہ کافی نکالتے ہیں۔ ایک دن میں ہی بل کے پیسے اکٹھے ہو جائیں گے۔'' احسن نے مشورہ پیش کیا۔

''اس سے بہتر یہ نہیں ہے میں کسی دربار، مزار وغیرہ پر جا کر بیٹھ جاؤں۔'' عادل جل کر بولا۔

''ہاں، یہ زیادہ بہتر ہے۔ اس سے تو ہمارے راشن، پانی کے مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔''

''مسخریاں بند کرو تم لوگ۔'' اب کے محب اللہ ذرا درشتی سے بولا۔

''ایک ہی حل ہے بس، پھر اس مسئلے کا۔'' کافی دیر سے خاموش بیٹھے حیدر کی آواز آئی۔

محب اللہ، احسن، عادل تینوں نے بیک وقت اسے دیکھا۔

مشورہ دینے کے بعد اب وہ احسن اور عادل کے تابڑ توڑ حملوں کی زد میں تھا۔ بس محب اللہ تھا جو

چپ چاپ کنگھی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔
"ٹھیک ہے حیدر۔" اس نے گرین سگنل دیا اور تراویح کے لیے اٹھ گیا۔
"یہ کیسے ممکن ہے؟" عادل سخت بے چین ہوا۔
"پہلے ہی ہمارے مسائل کم ہیں......؟ تجھے کوئی ڈھنگ کا مشورہ نہیں دینا ہوتا نا تو چپ بیٹھا رہا کر۔"
ابھی احسن اس کے مزید لتے لیتا کہ دروازے میں کھڑے محبّ اللہ کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔
شلوار ٹخنوں سے اونچی کر رکھی تھی۔ چہرے سے وضو کے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔
"ایک بات تم لوگ کان کھول کر سن لو، یہ مکان اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود ہمیں یہاں کے کسی بھی ہاسٹل سے سستا پڑ رہا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔
اس کو کسی بھی قیمت پر چھوڑا نہیں جا سکتا۔ جس کو حیدر کے مشورے پر اعتراض ہے۔ وہ بل بھر دے پورا۔" محبّ اللہ نماز کے لیے جا چکا تھا۔
احسن اور عادل کی زبانیں بھی گویا ساتھ ہی لے گیا تھا۔
"میرا خیال ہے آج کے لیے اتنی بے عزّتی کافی ہے۔" حیدر نے دانت نکالے۔
احسن بس اسے گھور کر رہ گیا۔

☆☆☆

"حیدر بھائی! دیکھ لیجیے، کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔ آپ کے کہنے پر میں نے ہاسٹل والوں کو جواب دے دیا ہے۔ اب اگر چھ ماہ کے اندر اندر مجھے واپس جانا پڑ گیا نا تو ڈبل فیس چارج کریں گے وہ لوگ۔ یہ ان کا اصول ہے۔"
"اوہ، ویری گڈ!" حیدر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ (چھ ماہ کے لیے تو پھنس گیا)
"جی......؟" انس نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔
"مطلب یہ کہ، جس جگہ میں تمہیں لے کر جا رہا ہوں نا وہ ویری گڈ ہے۔" حیدر نے جلدی سے بات سنبھالی۔
حیدر، جس کمپنی میں پچھلے پانچ سال سے جاب کر رہا تھا، انس وہاں پچھلے سال ہی آیا تھا، نازوں پلا، اکلوتا لاڈلا بیٹا۔ جس کو ہر وقت ہاسٹل سے کچھ نہ کچھ مسئلہ ہی رہتا تھا۔
"دیکھ چھوٹے بھائی! تو ہاسٹل میں ہر ماہ کتنی رقم دے رہا تھا......؟"
"بارہ ہزار۔" انس نے جواب دیا۔
"اب یہاں پر تجھے ہر ماہ زیادہ سے زیادہ پانچ، چھ ہزار دینا ہوں گے پھر گھر والا ماحول ملے گا۔ اپنی مرضی سے سونا، اپنی مرضی سے جاگنا، جب دل چاہا، جو دل چاہا بنا کر کھا لیا۔ ایسے میں اگر تھوڑا بہت کوئی مسئلہ ہوتا بھی ہے تو وہ تو قابل برداشت ہے نا......؟"
(حیدر کل اس سے پانچ ہزار ایڈوانس لے کر محبّ اللہ کو دے چکا تھا۔ ان کا بل جمع ہو گیا، باقی ہر بات کی حیثیت ثانوی تھی)
"حیدر بھائی! اصل میں، میں کمفرٹ (آرام دہ ماحول) پر کمپرومائز نہیں کر سکتا۔"
(یا اللہ مجھے معاف کر دینا) حیدر نے دل ہی دل میں معافی مانگی۔
اب وہ دونوں اپنی گلی میں داخل ہو رہے تھے۔
"یہ کتنی عجیب سی جگہ ہے حیدر بھائی؟" انس نے کچھ پریشانی سے حیدر کو نالی کے اس پار سے دروازہ بجاتے دیکھا۔
"یہ ٹریلر ہے بیٹا۔ اصل فلم تو اندر ہے۔" حیدر زیر لب بڑبڑایا۔ دروازہ محبّ اللہ نے کھولا۔
حیدر نے ان دونوں کا آپس میں تعارف کروایا۔ انس نے ایک نظر پچیس چھبیس سال کے اس باریش جوان پر ڈالی۔
محبّ اللہ اس کا کندھا تھپتھپاتا باہر نکلا۔ "میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔" حیدر اس کو لیے اندر چلا آیا۔
"یہ انس ہیں۔" با آواز حیدر نے عادل اور احسن سے اس کا تعارف کرایا۔ انس بے چارہ حیران پریشان کھڑا اس جگہ کو دیکھ رہا تھا۔
"ہائے!" عادل نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "میں عادل ہوں اور ان سب میں، اب تک سب سے چھوٹا ہونے کا اعزاز مجھے حاصل تھا جو آپ کے آنے کے بعد مجھے چھنتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔"
"جی! یہ ابھی تک روٹی کو چوچی اور چاول کو ہپّا کہتا ہے۔" احسن نے آگے بڑھ کر عادل کی بات مکمل کرتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔
"اچھا، میں ذرا نماز پڑھ کر آتا ہوں۔ آپ دونوں ان کو یہاں کے اصول وضوابط بتا دیں۔" وہ کہتے ہوئے باہر کو دوڑا۔
"حیدر، اوئے، رک بے، نماز تو خالی جمعہ کی پڑھتا ہے اور آج جمعہ نہیں ہے۔" پر وہ یہاں مزید نہیں رک سکتا تھا۔ انس کی شکل دیکھ کر لگ رہا تھا وہ ابھی رو پڑے گا۔ اور یہ منظر حیدر دیکھ نہ پاتا' سو بھاگنے میں عافیت جانی۔
"آجا، یار بیٹھ جا۔" انس کو مسہری پر بٹھاتے وہ خود بھی ساتھ بیٹھا۔
"چل عادل! شروع ہو جا۔"
"ہاں تو برادر۔ کرائے اور بلوں کی ڈیلنگ تو ہو گئی ہو گی۔ اب باقی باتیں سن لے۔" عادل نے بولنا شروع کیا۔
"یہ چارپائی جس پر تم بیٹھے ہو' ایک ہفتہ تمہیں اس پر سونے کا موقع ملے گا۔"
"اور باقی کے دن؟" بمشکل انس کی آواز نکلی۔
"یہ، نیچے بچھے گدوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر سونا ہو گا۔ سحری لینے باری باری جاتے ہیں۔ افطاری کچھ بازار سے آتی ہے کچھ مل جل کر بنا لیتے ہیں۔"
"صفائی اور برتن دھونے کی باری ایک ایک ہفتے کی ہے۔ باتھ روم دھونے کی باری مہینے میں دو بار آتی ہے۔"
"باتھ روم......دھونا؟" وہ ہکا بکا ان کی باتیں سن رہا تھا۔
"اور ہاں کپڑے سب اپنے اپنے خود دھوتے ہیں۔ چارپائی کے نیچے اپنا سامان سیٹ کر لو۔ مگر دھیان رکھنا، کسی دوسرے کے سامان کو نقصان نہ پہنچے۔"
"آپ لوگ حیدر بھائی کو بلائیں۔ مجھے واپس جانا ہے۔ یہاں نہیں رہ سکتا میں۔" احسن اور عادل بس اسے گھور کر رہ گئے۔

☆☆☆

محبّ اللہ اور حیدر بمشکل اسے ایک ماہ کے لیے روکنے میں کامیاب ہوئے تھے۔
"یہ کوئی انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ مجھے چاہے تین گنا زیادہ پیسے بھرنے پڑیں، میں واپس جاؤں گا۔"
"ہاں، ہم تو کیڑے، مکوڑے ہیں۔" عادل تپ کر بولا۔
"تو آپ لوگ بھی شفٹ ہو جائیں کسی ہاسٹل میں، اس کچرا کنڈی سے تو بہتر ہی حالات ہوتے ہیں وہاں کے۔"
اس بات کا بہترین جواب خاموشی کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔
انس نے بیس دن میں ان لوگوں کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ حیدر سے وہ مستقل خفا تھا۔ باقی سب سے روٹھا روٹھا رہتا۔
ہر چند کہ وہ اپنے طور پر پوری کوشش کرتے اسے آرام پہنچانے کی پر وہ بڑی ہی ٹیڑھی کھیر تھا۔
حیدر کو سخت افسوس تھا اپنے فیصلے پر، اس کا خیال تھا دو چار دن میں سیٹ ہو جائے گا جیسے وہ لوگ سیٹ ہو گئے تھے۔ پر اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ سب مجبور تھے۔ انس کو ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔

☆☆☆

حیدر اور انس اکٹھے واپس آئے تھے آفس سے۔ محبّ اللہ نماز پڑھنے گیا ہوا تھا۔ عادل ٹیوشن پڑھانے اور احسن افطار سے کوئی آدھ گھنٹہ پہلے پہنچتا تھا۔
"انس! ناراض ہو یار؟" حیدر نے بازو

آنکھوں پر رکھ کر لیٹے انس کو مخاطب کیا۔

اس نے بازو ہٹا کر ایک شکوہ کناں نظر حیدر پر ڈالی اور بازو دوبارہ آنکھوں پر رکھ لیا۔

"آئی، ایم سوری یار۔" اس نے دوبارہ انس کا بازو ہٹانے کی کوشش کی۔

"آپ نے بہت زیادتی کی ہے میرے ساتھ حیدر بھائی۔"

"میں شرمندہ ہوں یار! میں دھوکے باز نہیں ہوں۔ بلکہ ہم چاروں میں سے کوئی بھی دھوکے باز نہیں ہے۔ بس مجبور ہیں۔ یہاں اس گندے سندے علاقے کے ایسے مکان میں رہنے پر ہم خود سے زیادہ ایک دوسرے کی وجہ سے مجبور ہیں۔

انس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہنوز اسی انداز میں لیٹا رہا۔

"یہ جو محب اللہ ہے نا اس کے والد کو کینسر ہے۔ یہ یہاں کماتا ہے اور پائی پائی جوڑ کر گھر بھیجتا ہے۔ اس کے دو بھائی چھوٹے ہیں۔ دونوں پڑھتے ہیں۔ والدہ گھر میں سموسے، رول بنانے کا کام کرتی ہیں۔ ہاسٹل کی عیاشی یہ افورڈ نہیں کر سکتا۔"

انس نے بازو ہٹایا، اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حیدر نے بات جاری رکھی۔

"احسن کی پانچ بہنیں ہیں۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ سب سے بڑا ہے۔ پانچ بہنوں کی شادی کرنی ہے اس نے۔ والد اس کے نہیں ہیں۔ دو بڑی بہنیں اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ چھوٹی تینوں پڑھتی ہیں۔ سب مل کر گھر کی گاڑی کھینچ رہے ہیں۔"

انس چپ چاپ، ساکت بیٹھا اسے سن رہا تھا۔

"پھر یہ عادل ہے چھوٹا، اس کے والدین حیات نہیں ہیں۔ ہم سب تو برسر روزگار ہیں۔ یہ ابھی پڑھ رہا ہے۔ دو بڑے بھائی ہیں اس کے، ایک دبئی میں ہوتا ہے۔ اپنی فیملی کے ساتھ، وہی اس کی پڑھائی کا خرچ اٹھا رہا ہے۔ مگر پیسے اتنے کم ہوتے ہیں کہ مجبوراً ٹیوشن پڑھا کر اور ایک دو اخباروں میں آرٹیکلز لکھ کر اپنا خرچ پورا کرتا ہے۔ دوسرا بھائی، یہیں پاکستان میں ہوتا ہے۔ یہ کبھی چار ماہ بعد چار دن کے لیے بھی اس کے گھر جاتا ہے تو دو دن میں واپس آجاتا ہے۔ بھابھی اس نکھٹو، ویلے (بقول بھابھی کے) کو دو دن بھی برداشت نہیں کرتی۔ عید، تہوار پر برملا کہتا ہے۔ "یہ تہوار تو ماں باپ کی زندگی میں اچھے لگتے ہیں۔ میرا تو دل کرتا ہے یہ تہوار آیا ہی نہ کریں۔" ہم یہاں پر خود اپنی مجبوریوں سے زیادہ ایک دوسرے کی وجہ سے بندھے ہوئے ہیں۔

مہینے کے آخر میں جب ہم کھانے والے چار ہوتے ہیں اور روٹیاں بھی چار ہی ہوتی ہیں تو ہم میں سے ہر ایک کا پیٹ آدھی روٹی میں ہی بھر جاتا ہے ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنا نوالہ بھی دوسرے کے پیٹ تک پہنچا دے۔"

"اور آپ.....؟" انس کے منہ سے بے ساختہ پھسلا۔

"میں.....؟" اس نے نظر اٹھا کر سوال سمجھنے کی کوشش کی۔

"میرا اللہ کا شکر ہے۔ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تین بھائی ہیں ہم، ایک بہن ہے مجھ سے بڑی۔ اس کی اب عید کے بعد شادی ہے۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ ابو میرے بھی حیات نہیں ہیں، پر شکر ہے گھر اپنا ہے۔ دونوں بھائی اپنا اپنا خرچ اٹھاتے ہیں، شادی شدہ بال بچے دار ہیں۔ امی اور بہن کا خرچا میں اٹھاتا ہوں۔ اپنی شادی کے لیے بھی مجھے خود ہی جوڑنا ہے۔ سو ہو رہا ہے گزارا۔"

"آپ لوگ کسی بہتر جگہ بھی تو گھر دیکھ سکتے تھے۔" کچھ توقف کے بعد انس گویا ہوا۔

"کی ہے دو، ایک بار کوشش مگر اتنے کم کرائے میں کوئی گھر ملتا نہیں ہے۔ مل جائے تو لوگ چھڑے چھانٹ لوگوں کو کرایہ دار رکھتے ہوئے گھبراتے ہیں۔" حیدر اب جوتے کی نوک سے زمین کھرچ رہا تھا۔

انس اپنی جگہ کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

"آج کی افطار میری طرف سے۔" انس نے سحری کے فوراً بعد اعلان کیا۔ چاروں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"واپس ہاسٹل جانے کی خوشی میں الوداعی پارٹی دے رہا ہے کیا.....؟" عادل کو اس کی بات ہضم نہیں ہوئی۔

"واپس ہاسٹل جانے کا خیال اب آپ لوگ نکال دیں اپنے دل سے، میں کہیں نہیں جا رہا۔"

"واپس ہاسٹل کا خیال، ہمارے دل کا تھا.....؟" عادل نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"لالے! اصل بات بتا۔" احسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔

"اصل بات۔" انس نے ڈرامائی وقفہ دیا۔

حیدر کا دل زور سے دھڑکا۔ (کہیں یہ راز تو نہیں کھولنے جا رہا)

"اصل بات یہ ہے کہ یہاں پر بچت زیادہ ہے۔ تو میں سوچ رہا ہوں پیسے بچا بچا کر گاڑی لے لوں۔"

"بلے بھئی بلے۔" عادل نے اس کی عقل کو داد پیش کی۔ "جب تک تیرے پیسے جمع ہوں گے نا۔ تیری آنکھوں میں موتیا اور ہاتھوں میں رعشہ آچکا ہوگا۔"

"پھر مجھے گاڑی کے ساتھ ڈرائیور رکھنا پڑے گا۔"

"تو رکھ لوں گا۔"

"یار مجھے کچھ چکر سمجھ نہیں آ رہا۔ کل تک تو، تجھے مہینہ گزارنا مشکل لگ رہا تھا۔ آج تو یہاں سے جانے کو تیار نہیں ہے۔" احسن نے غور سے اسے دیکھا۔

"اوئے مولوی!" احسن نے محب اللہ کو مخاطب کیا۔ "اس پر نظر رکھ۔ کہیں دل تو نہیں لگا بیٹھا اس محلے میں، پتا چلے اس کی وجہ سے ہمیں بھی نکال دیا گیا ہے۔"

"ہاہ، ہاہ، ہاہ.....!" زوردار قہقہہ انس کے حلق سے برآمد ہوا۔

"بالکل صحیح پہنچے ہیں احسن بھائی۔ دل لگا لیا ہے میں نے۔"

آنکھیں صاف کیں۔ "آپ لوگوں کے ساتھ دل لگا لیا ہے۔ اب آپ لوگوں کے بغیر گزارا مشکل ہے میرا۔"

"کہتا تو ٹھیک ہے ویسے، ہم جیسے لوگ کہاں ملیں گے اسے۔" عادل نے فرضی کالر کھڑے کیے۔

حیدر کے دل پر پڑا بوجھ کچھ کم ہوا۔

"اصل میں نا، میں نے آپ لوگوں کو اپنا وہ مان لیا ہے۔"

"کیا گرو.....؟" عادل بولا۔

"نہیں، یار دلدار۔"

"اچھا تو پھر دے ہاتھ۔" عادل نے اپنی ہتھیلی پھیلائی۔

انس نے اس پر اپنا ہاتھ رکھا۔ انس کے ہاتھ پر احسن نے اپنا ہاتھ رکھا۔

احسن کے ہاتھ پر حیدر نے اور ان سب کے اوپر ہاتھ تھا محب اللہ کا۔

یہ تھا آغاز۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

☆

کھرو

قرۃ العین سکندر

''کیا بات ہے مسز سعدیہ؟ آج آپ بہت خاموش سی ہیں؟'' میاں سے لڑائی تو نہیں ہوگئی۔'' میں نے مسز سعدیہ کو ہنوز یک ٹک خلا میں دیکھتے گہری سوچ میں گم پایا تو سوال کیے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

''جی نہیں، یونہی اداسی سی ہے، میرے میاں تو میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ کسی کام کو ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتے ہیں۔ آج کل تو ان کی والدہ بھی آئی ہیں یعنی میری ساس امی، بس کیا بتاؤں، الم غلم بنا بنا کر مجھے کھلاتی رہتی ہیں۔''

مسز سعدیہ کی بات پر میں منہ کھولے حیرانی سے ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

ان کی باتیں سن کر میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا اور ان کا موازنہ کرنے لگی۔ میں اپنی زندگی کے انتہائی مشکل وقت سے گزر رہی تھی۔ ان کی سسرال اور شوہر کی تعریف اندر ہی اندر میرے لیے کھولن کا سبب بن جاتی تھی۔

''اگر ایسا ہی ہے مسز سعدیہ، تو آپ اس جاب کے لیے خود کو کیوں خوار کر رہی ہیں وہ بھی ایسی حالت میں، جبکہ آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔''

مسز رشیدہ اسکول کی سب سے سینئر ٹیچر اور خاصی منہ پھٹ تھیں۔ بنا لگی لپٹی رکھے بول دینے والی۔

اس وقت ان کی بات پر میں نے اچھنبے سے مسز سعدیہ کو دیکھا تھا۔ جہاں ہمیشہ کی طرح ٹھنڈی میٹھی پرسکون مسکان سجی تھی۔

واقعی اس نہج پر تو میں نے بھی نہیں سوچا تھا۔ اگر مسز سعدیہ اس قدر خوش قسمت تھیں تو پھر چند ہزار کی معمولی تنخواہ کے لیے اس قدر بے آرامی کیوں؟ جب کہ چند ماہ بعد ان کے گھر ایک ننھا مہمان آنے والا تھا۔ خیر ایسا ہی کچھ معاملہ تو میرے ساتھ بھی تھا۔ مگر میں تو اس جاب کے لیے مجبور تھی۔ حالات کی وجہ سے چاہ کر بھی ان دنوں میں آرام نہیں کر سکتی تھی۔ سرد موسم میں صبح سویرے اپنے آرام دہ بستر کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ مگر جب مجبوریوں کا گھن لگ جائے تو پھر انسان جہد مسلسل کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

''ارے پڑھانے کا مجھے بے حد شوق ہے۔ شادی سے قبل امی نے نوکری نہیں کرنے دی میرا یہ خواب اب پورا ہوا ہے۔ کیونکہ فرید میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔ اب بھی کہتے ہیں آرام کرو گھر پر رہو۔ لیکن میں نہیں مانتی اب ڈاکٹر نے مجھے چلنے پھرنے کی سخت تاکید کی ہے۔''

مسز سعدیہ بے نیازی سے گویا ہوئی تھیں۔

بڑی سیاہ بھنورا آنکھیں، گھنیری پلکوں تلے، دلکش نقوش سرخ و سفید رنگت، متناسب سراپا، وہ خوب صورتی اور دلکشی کا پیکر تھیں۔ عام سا کپڑا ان پر سج جاتا۔ ان کے میاں اگر ان پر اس قدر مہربان تھے تو اس میں کوئی عجب نہیں تھا۔ میں نے ایک ستائشی نگاہ ان کے چہرے پر ڈالی تھی۔ وہ صرف ساتھی ٹیچرز ہی نہیں تمام طالبات کی پسندیدہ ٹیچر تھیں۔ بچیاں اسمبلی میں ان کو گلاب یا موتیا پیش کر کے اپنی والہانہ چاہت کا اظہار کرتی تھیں اور مسز سعدیہ بھی مسکرا کر ان کے پرخلوص جذبے کو سراہتی تھیں۔

جبکہ میں ایک انتہائی مشقت بھری زندگی کے شب و روز جفاکشی سے گزار رہی تھی۔ ذہنی انتشار کے باوجود میں تن دہی سے یہاں تمام فرائض ادا کر رہی تھی۔ بسا اوقات نیند کی کمی بچوں کے ساتھ میرا رویہ

درشت کر دیا کرتی تھی۔ مجھے دیکھ کر بچوں کے چہرے پر مسکان کے بجائے خفگی بندھ جاتی تھی۔ درحقیقت میں جس طرح کی اذیت ناک زندگی بسر کر رہی تھی یہ اس کا شاخسانہ تھا۔ جو لے رہی تھی وہی لوٹا بھی رہی تھی۔

☆☆☆

میں آج بہت پریشان تھی کیونکہ میڈم صبوحی نے ایمرجنسی ٹیچرز میٹنگ رکھ دی تھی۔ اور وہ بھی تمام کلاسز کے اختتام کے بعد۔ میں جانتی تھی اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میں آج معمول سے زیادہ دیر سے گھر پہنچوں گی اور دیر سے گھر پہنچنے کا مطلب تھا ساس کی بے بھاؤ کی سننا، شوہر کا خراب موڈ سہنا اور پھر پڑوس میں آباد نند کی چار باتوں کو طنز سمجھنے کے بجائے محبت بھرے جملے سمجھ کر سہنا۔ میں خالی الذہنی کی کیفیت سے دوچار تھی۔ میٹنگ میں وہی عام سی باتیں جو اس طرح کی میٹنگ میں ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ہماری کلاس لی گئی تھی۔ اور اس کے بعد ہمیں طالبات کی کلاس لینی تھی۔ میں دو بسیں بدل کر اسٹاپ پر اتری تو سہ پہر کے چار بج چکے تھے۔ میں تیز تیز قدموں سے گھر کے راستے پر رواں دواں تھی جب عقب سے اپنا نام سن کر ٹھٹکی تھی۔ یہ ہماری ہمسائی ریحانہ تھی۔ جس سے میری اچھی خاصی سلام دعا تھی۔

"کیا بات ہے ارم! آج بہت ہی دیر کر دی؟" وہ میرے لیے متفکر تھی۔ دیوار سے دیوار ملی ہونے کی وجہ سے وہ میرے حالات سے واقف تھی۔

"تمہارے شوہر گھر آ چکے ہیں اور نند اور ساس نے مل کر خوب کان بھرے ہیں۔ اللہ ہی رحم کرے۔ میں ذرا عابدہ کی طرف جا رہی تھی۔" ریحانہ تو اطلاع دے کر آگے بڑھ چکی تھی۔ مگر میری فکر میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں داخلی دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئی تھی۔ گھر میں مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سامنے ہی تخت پر ندرت بیگم (ساس) نیم دراز تھیں۔ ساتھ نرگس بیٹھی تھی اور کرسی پر ارسل بیٹھے، ہوئے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ میں متوحش نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"کہاں رہ گئی تھیں میری بوڑھی بیمار ماں اکیلی سارا دن کھانستی رہی۔"

سہ پہر کی خاموشی میں ارسل کی چنگھاڑتی ہوئی آواز نے جیسے ہلچل مچا دی تھی ان کا لہجہ جرح کرتا ہوا تھا۔ اگر وہ نرم انداز سے استفسار کرتے تو مجھے بھی اتنا غصہ نہ آتا۔ ایک تو میں ان دنوں میں اتنی مشقت بھری اذیت سہہ رہی تھی۔ فقط اس لیے کہ بقول ارسل کی اماں۔

"کھانے والے زیادہ ہیں کمانے والا میرا اکیلا بیٹا ہے۔"

میری شادی سے قبل جاب کی خبر سب کو تھی۔ اب وہی میرے لیے گلے کا طوق بن گئی تھی۔ ہر ماہ دس ہزار کی معقول رقم مل رہی تھی۔ اور کیا چاہیے تھا ان ماں بیٹے کو۔

"میں اسکول سے آ رہی ہوں میٹنگ تھی۔ اگر یقین نہیں آ رہا ہے تو فون کر کے پوچھ لیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"دیکھا دیکھا کیسی زبان چلا رہی ہے۔ پیسہ کمانے والی کہاں ٹک کر بیٹھ سکتی ہے۔ اسے کہو ماں کی خدمت کرے ورنہ چھوڑ دے۔ یہ دو ٹکے کی نوکری۔"

یہ نرگس تھی میری اکلوتی نند۔

"ان دس ہزار میں سے پانچ ہزار تو آپ کی اماں آتے ہی مجھ سے لے لیتی ہیں، باقی بھی کسی بہانے سے نکلتے رہتے ہیں۔ مجھے بھی شوق نہیں ہے خوار ہونے کا۔"

میرا پیمانہ صبر اور لبریز ہو چکا تھا۔ تبھی جواب دیتی کمرے میں آ گئی اور بیڈ پر ڈھے سی گئی تھی۔ میں اس وقت شدید جذباتی کشمکش اور توڑ پھوڑ کا شکار تھی۔ میرا دل ایک دم ہی ہر رشتے سے جیسے اچاٹ ہو گیا تھا۔ میں — اس جاب کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ دو بسیں بدل کر مشقت سے وہاں جانے کے

باوجود یہی وہ واحد روزن تھا۔ جہاں سے آتی تازہ ہوا مجھے زندگی کی نوید دیتی تھی کیوں کہ اس گھر اور اس میں بسنے والے تنگ دل مکینوں کا ظرف تھا۔ میرا بھی جی چاہتا تھا کہ ارسل میری حمایت کریں۔ میرا کرب جانیں۔ ہر لڑکی کی آرزو ہوتی ہے کہ زندگی کی بے ثباتی میں اس کا ہم نفس ایسا ہو جو اس کو سمجھے اس کے جذبات واحساسات کی قدر کرے۔

کنپٹی کے پاس گرم سیلن کا احساس مجھے چونکا گیا تھا۔ نا معلوم میں کب سے رو رہی تھی۔ میں نے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلی کی پشت سے رگڑ ڈالا تھا۔ میں کمزور نہیں۔ زمانے کی تلخیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہتی تھی۔

"اب کیا اندر جا کر بیٹھ گئی ہو' باہر آؤ۔ اماں کو کھانا بنا کر دو۔"

ارسل چیخ رہے تھے۔ میں نے کچن میں آ کر فوری طور پر پلاؤ بنانے کا ارادہ کیا اور پھر اس پر عمل بھی کر ڈالا تھا۔ ساتھ ساس کے لیے سوپ بھی بنایا تھا۔ اچانک ہی مجھے زوردار چکر۔ آیا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے صبح دو توس چائے کے ساتھ کھائے تھے۔ بھوک تو لگی ہی بھی تھی۔ مجھے کام کرتا دیکھ کر میری نند اپنے گھر چلی گئی تھی۔ اس کا گھر دو گلی چھوڑ کر ہی تھا۔ وہ صرف لڑنے بھڑنے کے لیے آیا کرتی تھی۔ اللہ نے بھی اتنی توفیق نہیں دی تھی کہ جس بوڑھی ماں کے لیے بڑھ چڑھ کر بول رہی ہے اس کے لیے آ کر کھانا ہی بنا دے بلکہ اس کی کوشش ہوا کرتی تھی کہ یہاں سے کفن بھر کر اس کے گھر جائے۔

جس وقت وہ ندرت بیگم کو کھانا کھلا کر چائے اور دوا پلا کر فارغ ہو کر کچن میں برتن رکھنے آئی تو ارسل کچن کے دروازے میں ایستادہ تھے وہ جانتی تھی نرگس کی لگائی آگ اب بجھ چکی ہے۔ اکثر نرگس کے جاتے ہی معاملات ٹھیک ہو جایا کرتے تھے اور ارسل پرسکون ہو جاتے تھے۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا، وہ محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"راستہ چھوڑیں میرا۔" میں نے ناراضی سے کہا تھا۔

ارسل کی یہی ادا تو مجھے بھاتی تھی۔ لڑ جھگڑ کر منانے کی ذمہ داری بھی ارسل ہی کی ہوا کرتی اور اکڑ دکھانے کی باری میری ہوا کرتی تھی۔

"کیسے راستہ چھوڑ دوں۔ تمہاری منزل تو میں ہی ہوں ناں؟" ارسل شوخ ہو رہے تھے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ کچھ دیر پہلے والے ارسل تھے جو اپنی آنکھوں سے خون آشام تاثر دے رہے تھے۔ میں آخر کب تک روٹھی رہ سکتی تھی۔ میں نے اور ارسل نے محبت کی چھاؤں میں بیٹھ کر مل کر کھانا کھایا تھا۔

☆☆☆

"فرید میرے لیے گولڈ کی رنگ لے کر آئے ہیں۔" مسز سعدیہ ساتھی ٹیچرز کے ساتھ محو گفتگو تھیں۔ میں بچوں کی ٹیسٹ رپورٹ تیار کر رہی تھی۔ مگر میرا روم روم کان بن چکا تھا۔

"ارے واہ مسز سعدیہ آپ تو بہت خوش قسمت ہیں، ایک ہم ہیں منہ دکھائی کے بعد تو کبھی ہمیں کچھ ملا ہی نہیں۔"

یہ مسز نعیم تھیں۔ جو متوسط گھرانے کی ذمہ داریوں میں گھری ہوتی تھیں اور کئی ایسی ٹیچرز بھی تھیں جو یہاں اچھے رشتے کے انتظار میں وقت گزار رہی تھیں۔

"ویسے مسز سعدیہ آپ ہیں بہت لکی۔" مسز نعیم کی آنکھوں میں اشتیاق در آیا تھا۔

"ویسے ہم سب کو بہت شوق ہے آپ کے میاں کو دیکھنے کا۔ بہت پردے میں رکھا ہے۔"

یہ مسز رشیدہ تھیں سخت گیر ٹیچر لہجہ بھر کے لیے مسز سعدیہ کے چہرے پر ناقابل فہم تاثرات ابھرے تھے۔ مگر پھر اگلے ہی پل معدوم بھی ہو گئے تھے۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ مسز سعدیہ ایک معمہ بن رہی تھیں۔ باقی ساری ٹیچرز مل کر یہاں اسٹاف روم میں فارغ اوقات میں اپنے اپنے سسرال کے

دلوں ... روتی تھیں۔ چھوٹی موٹی بے ضرر سی عیبتیں تو ہر لوئی کرتا تھا۔ کچھ کے اپنے بہت بڑے تھے۔ خیر سسرالی رنجشیں اور مسئلے مسائل تو ہر لڑکی کا مسئلہ تھے سوائے مسز سعدیہ کے۔

"جی فرید ماشاء اللہ جس طرح نفیس طبیعت کے مالک ہیں' اس طرح حسین و جمیل بھی ہیں۔ ہونٹوں سے لفظوں کے پھول کھلتے ہیں۔"

تفاخر بھرا لہجہ سب کے دلوں کی آگ پر گرم پانی کے چھینٹے چھوڑ گیا تھا۔ جہاں دھواں اٹھا تھا۔ بھی بریک ختم ہوجانے کی گھنٹی بجنے پر بھی اٹھ گئی تھیں۔

☆☆☆

میرا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا۔ صبح کا وقت یونہی ہڑبونگ لیے ہوتا تھا۔ خستہ خستہ پراٹھے اترتے جا رہے تھے توے سے اور پاس بیٹھے میرے شوہر نامدار ارسل اور میری نند صاحبہ بمعہ دو بچوں کے جو رات سے یہیں تھیں ان پراٹھوں پر ہاتھ صاف کرتے جا رہے تھے۔ میری نگاہیں بار بار بھٹک کر گھڑی کی سوئیوں میں الجھنے لگتی تھیں۔

"ارے مجھ بوڑھی کو بھی ناشتہ ملے گا کیا؟" دور سے آتی میری ساس ندرت بیگم کی کمی تھی۔ آج تو اسکول سے دیر یقینی تھی۔ میں چاہ کر بھی آج وقت مقررہ پر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں لذیذ آملیٹ بناتے ___ جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے سوچ میں تھی۔

جلدی سے اماں کو ناشتہ کی ٹرے پہنچائی اور خود دوڑ لگا دی کمرے کی طرف۔ آج نند صاحبہ کا قیام ادھر ہی تھا۔ دو دن کے لیے ان کے خاوند کسی کام سے دوسرے شہر گئے تھے۔ اب ان کی آمد پر واپسی بھی جلدی ضروری تھی۔ اور کھانا بھی عام روٹین سے ہٹ کر دعوتی طرز کا بننا تھا۔ اور یہ سب مجھے اس حالت میں کرنا تھا۔

کتنے دنوں سے میرے بائیں پاؤں میں سوجن تھی۔ مانا کہ ان دنوں میں خواتین کے پاؤں سوج جایا کرتے ہیں۔ مگر اس پر اچانک ہی ایک ننھا سا سرخ دانا نمودار ہو گیا تھا۔ جس کے بعد وہ پھول رہا تھا اور پھولے ہوئے پاؤں پر زخم سا بن گیا تھا۔ اس حالت میں بس اسٹاپ تک جانا بھی کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ میں نے چادر لپیٹی تھی جب ارسل بولے تھے۔

"ٹھہرو میں خود چھوڑ آتا ہوں۔" پہلے تو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ساری کلفت ساری تھکان جیسے اڑن چھو ہو گئی تھی۔ پھر ارسل نے اسکول میں چھوڑ کر دم لیا۔ میں وقت مقررہ پر پہنچ چکی تھی۔ صرف ارسل کی بدولت اور ذہن بھی جیسے ایک دم ہی ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔ میں خوش گوار موڈ میں بائیک سے اتری تھی۔

"واپسی پر بھی میں آجاؤں گا۔ شام کو ڈاکٹر کی طرف چلتے ہیں تم رات بھر پاؤں کی تکلیف سے کراہتی رہی ہو۔" ارسل آج مجھے زیادہ ہی مہربان لگ رہے تھے۔

ایک عورت کیا چاہتی ہے۔ محض دو بول محبت کے۔ انہی دو بولوں کے عوض وہ اپنا تن من سب وار دیتی ہے۔ مرد یہ نکتہ سمجھ لے تو بھی زندگی میں تلخیوں کا گزر نہ ہو۔ میں مطمئن سی قدرے تفاخر سے اندر داخل ہوئی تھی۔ سیدھا اسٹاف روم کا رخ کیا۔

غیر معمولی خاموشی کا احساس مجھے اسٹاف روم میں قدم رکھتے ہی ہو گیا تھا۔ سب ٹیچرز سر جوڑے کسی اہم مسئلہ پر محو گفتگو تھیں۔

"کیا بات ہے!" میں نے مسز رشیدہ سے پوچھا جو سب سے آگے تھیں۔

"مسز سعدیہ صبح آئیں تو ایک دم ان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ ابھی ابھی میڈم صبوحی انہیں ہسپتال لے گئی ہیں وہیں جہاں ان کا کیس ہونا تھا۔"

"ابھی مگر ابھی تو بہت وقت باقی ہے۔" میں چونکہ خود اسی حالت میں تھی۔ اس لیے حواس باختہ ہو گئی تھی۔

"ارے ارم! حوصلہ کیا ہوا رنگت کیوں زرد پڑ گئی ہے۔ ان کے ساتھ ہو گا کوئی مسئلہ۔ آپ بیٹھیں۔" مسز رشیدہ نے میری متغیر رنگت دیکھ کر مجھے بٹھا دیا تھا۔

"آج میڈم صبوحی نے ہاف ڈے کر دیا ہے۔ اس کے بعد سب خیریت معلوم کرنے جائیں گے۔"

یعنی معاملہ گمبھیر تھا۔

جیسے تیسے کلاسز ختم کر کے ہم سب ایک پک اپ میں ہسپتال روانہ ہوئے۔

کاریڈور میں صبوحی میڈم موجود تھیں۔ سارے اسٹاف کو علم تھا کہ صبوحی میڈم نے سعدیہ کو اپنی بیٹی بنا رکھا ہے۔ اسی وقت آپریشن روم سے ڈاکٹر باہر نکلی تھی۔

"بہت معذرت ہم بچے کو نہیں بچا سکے۔" ڈاکٹر افسردگی سے بولی تو تب میری نگاہ سعدیہ کی ساس پر پڑی جو خاصی خرانٹ چہرے والی عورت تھی۔ اسی وقت وہ واویلا کرنے لگی تھیں۔

"کھا گئی ڈائن میرے پوتے کو، منحوس عورت۔" میں ہی نہیں سارا اسٹاف۔ اس نئی افتاد پر حیران تھا۔

"ارے آنٹی آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔" مسز رشیدہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"تو اور کیا کہوں؟ بچپن سے ہی یہ منحوس رہی ہے۔ مجھ سے زیادہ کسے علم ہو گا۔ پیدا ہوتے باپ کو کھا گئی۔ جوان ہوتے ہی ماں چل بسی۔ ہم نے تو اس کی دادی کی مروت میں یہ رشتہ کر ڈالا تھا۔ شادی ہوئی تو بڑھیا کو بھی نگل گئی۔ اب میرا معصوم بچہ اسے نبھا رہا ہے۔ سات سال بعد یہ خوشی ملی تھی۔ اور اس نے اب اپنے بچے کو بھی دنیا میں آنے سے پہلے ہی مار ڈالا۔"

مس سعدیہ کی ساس نے جہالت کی انتہا کر ڈالی تھی۔ میں ہونق چہرہ لیے یہ ساری صورت حال سمجھنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی جا رہی تھی۔

"ارے آ گیا میرا بچہ۔" تبھی کاریڈور میں دوائیوں کا شاپر تھامے کالے رنگ کا ایک شخص داخل ہوا تھا۔ میں اس شخص کو دیکھ کر نجانے کیوں پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ چیچک زدہ چہرے والا یہ شخص کہیں سے بھی قبول صورت نہیں دکھ رہا تھا۔ تو یہ تھا مسز سعدیہ کا خوابوں کا شہزادہ، جس کی تعریفیں کرتے ان کی زبان نہ تھکتی تھی۔ ساس صاحبہ اپنے بیٹے کو ڈاکٹر کی ساری بات بتا رہی تھیں۔ اس شخص نے سر جھکا لیا تھا۔

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا اماں، اس عورت کو فارغ کر دیتا ہوں تو تھی جو خدا ترسی میں ... تھی۔"

اس شخص کے منہ سے خرافات نکل رہی تھیں۔

وہ سعدیہ کو طلاق دینے کے منصوبے بنا رہا تھا مگر جس بے کار شخص کو گھر بیٹھ کر روٹیاں توڑنے کی لت پڑ جائے اس سے طلاق دینے جیسا معرکہ بھی کہاں سر ہوتا تھا۔ میں جانتی تھی یہ سب لفاظی ہے کیونکہ بطور نائب پرنسپل سعدیہ کی ایک معقول تنخواہ تھی۔ پھر میں نے سنا تھا کہ وہ اسکول کی اکثر طالبات کو ٹیوشن بھی پڑھاتی ہیں۔ ایسی سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو کون حلال کرتا ہے۔

"مسز ارم آپ کے شوہر آئے ہیں باہر۔" کسی کی اطلاع پر میں نے خود کو سنبھالا تھا۔ اعصاب تن چکے تھے۔ میں دیوار کا سہارا لے کر اٹھی تھی۔ میں نے ارسل کے لیے میسج چھوڑ دیا تھا کہ مجھے یہاں سے پک کر لیں۔ اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی آ جائیں گے۔ میں جیسے ہی باہر آئی انہوں نے لپک کر مجھے قریب کر لیا تھا۔

"کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی؟ معلوم ہے ناں کہ ایسے حالات دیکھنا تمہارے لیے اچھا نہیں ہے۔ چلو فوراً اور ہاں راستے میں ڈاکٹر کی طرف لے چلوں گا اور کل سے تم استعفیٰ دے دو۔ میری تنخواہ کافی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مزید تکلیف اٹھاؤ۔ پاؤں دیکھو اپنا زخم بڑھ رہا ہے۔" ارسل کے لب و لہجہ میں تفکر دیکھ کر میں نہال ہی تو ہو گئی تھی۔

میں بائیک پر بیٹھی تو ارسل نے گھر کی راہ لی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ ہم جیسی کتنی ہی عورتیں ہیں جو دوسری عورت کی آسودگی دیکھ کر اپنے اندر تشنگی بھر لیتی ہیں۔ اپنی چادر میں موجود نعمتوں پر نگاہ ڈالے بغیر دوسروں کی جھولی میں کیا ہے؟ اس پر نظر کیے اپنی خوشیاں بھی غارت کر لیتی ہیں۔ میرے دل میں سعدیہ جیسی عورتوں کے لیے بہت عزت و مرتبہ تھا۔ جو اپنی ناموس کا بھرم رکھنے کی خاطر ہر درد و کرب کو مسکان کی لپیٹ میں گم کر دیتی ہیں۔

☆☆

فرزانہ کھرل

تو مکیں شہرِ جمال کا

رات کے آخری پہر جب چھوٹی بڑی اور طویل شاہراہوں کے کشادہ سینوں میں خاموشیاں دھڑکتی ہیں، اکا دکا گاڑیوں میں فراٹے بھرتی ایک سفید بلینو بھی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی، شدید تھکاوٹ کے باوجود ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان شخص اپنی تمام حسیات کے ساتھ چوکس اور بیدار تھا۔ اس کی تیز ذہین آنکھیں جیسے چہار سو دیکھ رہی تھیں تاہم وہ گاہے بہ گاہے اپنے گھنے بالوں کو حسب عادت سنوار لیتا ...... وہ ایک صحت مند، اسمارٹ اور دراز قد شخص تھا اور اس کا شمار انتہائی پرکشش مردوں میں کیا جا سکتا تھا۔ مگر اس کے سیل فون کی ہلکی سی گھنٹی گاڑی کے سناٹے میں مخل ہوئی...... ”مسز فرہاد کالنگ“ ان روشن حروف پہ نگاہ ڈالتے ہی اس کی پیشانی پر ایک ساتھ کئی سلوٹیں پڑیں۔ فرہاد نا صرف اس کا کزن بلکہ بہت اچھا دوست بھی تھا۔

”رات کے اس پہر“ وہ پر تفکر سا بڑبڑایا......

اور کال ریسیو کر لی...... نیند کے تاثر کے ساتھ اس کی

مکمل ناول



آواز معمول سے زیادہ بھاری تھی۔

''ہیلو......'' دوسری جانب ایک بے حال قسم کی ہائے نے ٹھنڈی آہ سمیت سائب کو حد درجہ کوفت میں مبتلا کیا۔''

''میں تو تمہاری نیند توڑنے کے خیال سے گلٹی فیل کر رہی تھی مگر جس طرح دوسری تیسری بیل پر تم نے میری کال ریسیو کی تو، موصوف پہلے سے ہی بیدار تھے''۔

کچھ شریری ہنسی کے ساتھ ذو معنی سی بات کی تھی۔ وہ پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔

''ویسے وہ کون ہے؟'' سائب کے کان اس سوال پر سرخ ہوئے۔

''کیا کال کرنے کا مقصد یہ چیکنگ ہی تھی'' وہ سنجیدگی اور سرد مہری سے گویا ہوا۔

''ارے نہیں یار ...!'' مسز فرہاد کا خمار جھٹ سے اترا...... کہ فون بند بھی ہو سکتا تھا۔ دراصل تمہارے ویلی ہاؤس میں اپنا ایک گیسٹ چھوڑے جا رہی ہوں تو آج ہی اپنے اس زاہد و عابد ملازم کو اس کا خیال رکھنے کی تاکید ذرا دھیان سے کر دینا۔'' اس نے اپنا جملہ سرعت سے مکمل کیا۔

''واٹ!'' سائب کے لیے یہ خبر بم کی طرح تھی'' کیا گیسٹ...... اور کیوں بھئی؟'' ''آپ جانتی ہیں میں اپنی غیر موجودگی میں اس ویلی ہاؤس میں کسی بھی قسم کا گیسٹ افورڈ نہیں کر سکتا۔'' اس کا لہجہ تپا ہوا تھا۔

''کم آن سائب...... یہ تم جیسا بندہ کب سے قسموں کا حساب رکھنے لگا ہے۔'' وہ دھیما سا ہنسی تھی اور سائب نے فون کو غصے سے گھورا۔

'' ارادتاً کسی کو نہیں چھوڑے جا رہی۔ تمہاری ویلی کے بالکل پاس تھے جب اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ سو اسے مجبوراً چھوڑنا پڑا...... اس اسے...... ڈاکٹر کو دکھا، ملازم...... س سے...... کہہ دینا''۔ اب اس کی آواز کٹ رہی تھی۔

''او شٹ!'' وہ لب بھینچ کے بھنایا...... اور ایک گہرا سانس بھر کے اطراف پہ دھیان دیا...... پھر گاڑی کی اسپیڈ کم کی...... کہ سڑک کے بائیں جانب ایک ریسٹورنٹ کھلا تھا۔ وہ چائے یا کافی کی طلب لیے گاڑی سے باہر آیا۔ گھسی ہوئی جین، جس میں سے شرٹ کے دونوں کونے باہر تھے۔ ہلکی بڑھی شیو کے ساتھ، اپنی چال ڈھال کے لحاظ سے وہ ایک پریشان حال شخص محسوس ہوتا تھا۔

چائے پیتے ہوئے بھی اس کے دوسرے ہاتھ میں سلگتا سگریٹ تھا۔ آج اس کا دھیان غیر ارادی طور پر بار، بار اپنے ویلی ہاؤس کی سمت بھٹک رہا تھا...... گو کہ عابد اس کا بہت پرانا گھریلو اور قابل اعتبار ملازم تھا...... مگر گھر میں رکنے والے مہمان کے بارے میں وہ کوئی اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھا...... مسز فرہاد کا سوچتے ہی اس کے اندر غصے کی ایک تیز لہر دوڑی۔

اس عورت میں سوائے حسن کے کچھ بھی قابل قبول نہیں تھا کہ مڈل کلاس کے سلجھے ہوئے گھرانے سے تعلق رکھنے والی خوب صورت' اسٹائلش اور بے حد خوب صورت لب و لہجے کی مالک رمشا اسے پہلی بار یونیورسٹی میں دیکھنے پر بھی اچھی نہیں لگی تھی اور فرہاد اسے دیکھتے ہی اس پر لٹو ہو گیا تھا۔

سائب پر کافی سے زیادہ لائن مارنے کے بعد مایوسی کی صورت میں رمشا نے فرہاد کی طرف دوستی کا بڑھایا تھا۔ سائب کا ماموں زاد حسن علیم ، رمشا کے خاندان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے اپنے منتشر خیالات کو سمیٹا اور بل میز پر رکھ کر کھڑا ہوا۔

☆☆☆

مختلف راہداریوں سے گزرتا وہ ایک ہال نما کمرے میں پہنچا۔ جہاں موجود بشاش چہروں نے اسے مسکرا کے خوش آمدید کہا ان کے اور سائب کے درمیان محض مسکراہٹ کا تبادلہ اور اشاروں میں ہیلو ہائے ہوئی۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے لمحہ بھر ٹھہرا۔ اور ہلکی سی دستک کے بعد دوسری جانب یس کی آواز پہ دروازہ احتیاط سے دھکیلتا اندر داخل ہوا۔

آفس ٹیبل کے دوسری جانب اپنی سربراہی کرسی پر براجمان ادھیڑ عمر شخص جیسے اسی کا منتظر تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور چہرے پہ رعب تھا نگاہ ملتے ہی اس نے سائب کی جانب محتاط سی مسکراہٹ اچھالی اور پرجوش انداز میں مصافحہ کیا۔ اس نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''سب سے پہلے میں تمہیں تمہارے کامیاب مشن پر مبارکباد دینا چاہوں گا۔'' وہ اپنا انداز نشست برقرار رکھتے ہوئے خوش مزاجی سے مخاطب ہوا۔

''تھینک یو سر!'' وہ بھی مؤدبانہ انداز میں کہہ کر مسکرایا۔ ''بلاشبہ اس کامیابی کے لیے تمہیں بارہا موت کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔ اب تمہارا انعام یہ ہے کہ جب تک چاہو تم چھٹی کر سکتے ہو''۔ آفیسر نے سائب کی الرٹ آنکھوں میں خفیف سا جھانکا جو اپنی نشست چھوڑتا پھر انہیں الوداعی سیلوٹ کرتا ایڑیوں پر گھوم کے واپسی کی راہ ہو لیا۔ ان متوقع چھٹیوں پر اس کا ارادہ کوئٹہ اپنی دادی کے پاس رہنے کا تھا مگر اب مسز فرہاد کے مہمان کو وہاں سے کہیں اور ٹھکانا دینے کی خاطر اس کا ویلی ہاؤس جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔

☆☆☆

وسط مارچ تک بھی ان کے صحن کے اکلوتے درخت پر صورت حال امید افزا نہیں تھی۔ بہار جیسے اس درخت کی چند شاخوں کو چھو کے آگے سرک گئی تھی کہ شاخوں پر بس گنتی کے چند پتے تھے پھر بھی معمول کی طرح آج بھی زینیا ظہر کی نماز اس چھدری سی چھاؤں میں ہی ادا کر رہی تھی۔ ساتھ ہی چھوٹی میز پر اس کا سیل فون رکھا تھا۔

دوران نماز بھی اس کا دھیان اینا کی طرف ہی بھٹکتا رہا۔ کل اس کا آخری میسج اس نے نماز ادا کرنے کے بعد پڑھا تھا۔ قریب ہی سبزی کاٹتی تائی ندرت نے اس کے فون پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔

''ذرا دیکھو تو آج کل کی لڑکیاں، نماز پڑھتے ہوئے بھی اس شیطان کو آس پاس ہی رکھتی ہیں۔'' ان کی پڑوسن، جس کا پسندیدہ ٹاپک آج کل کی لڑکیاں تھا۔ اب شروع ہو چکی تھی۔ ندرت نے ایک نگاہ شوہر پہ ڈالی جو جانے آسمان پہ کیا ڈھونڈ رہے تھے۔ اگر دو سال قبل کا زید ہوتے تو پڑوسن کی اس بات پر اک طوفان کھڑا کر چکے ہوتے —— مگر ندرت ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے پڑوسن سے مخاطب ہوئیں۔ ارے نہیں آپا! فون کہیں بھی رکھا ہو۔ زینیا کو پروا نہیں ہوتی۔ آج کل میرے ہی کہنے پر اپنے ساتھ رکھتی ہے۔''

ندرت ہمیشہ کی طرح اس کی طرف داری میں بولیں۔ تو زید نے بیوی پر اک توصیفی نگاہ ڈالی کہ نشے کا اثر کچھ زائل ہو رہا تھا۔

''آج کل ہی کیوں بھئی...... سب خیر ہے نا؟'' پڑوسن کے لہجے میں اشتیاق کچھ زیادہ تھا۔

''ہاں، ہاں خیر ہے تم جانتی ہی ہو ماشاء اللہ سے رمشا ملکوں ملکوں گھومنے کی شوق ہے' اپنی انعام نے جب سے اس کے یہاں رہنا شروع کیا ہے تو رمشا کا چھوٹا منان تو انعام کے بغیر اب جھوماں کو تنگ کرتا ہے' اس لیے اب انعام بھی ان کے ساتھ چین جا رہی ہے۔''

ندرت کا لہجہ اس قدر سپاٹ تھا جیسے انعام قریبی مارکیٹ تک جا رہی ہو۔ جب کہ پڑوسن کے پیٹ میں آنتیں دہری ہوئی جا رہی تھیں۔

''مم...... مطلب اپنی انعام چین'' الفاظ جیسے اس کے حلق میں پھنس گئے، ندرت اس کی بوکھلاہٹ پر متعجب ہوئیں۔

''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے آپا...... اب زمانے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے اب تو لڑکیاں تعلیم کی خاطر بھی سالوں پردیس میں گزار آتی ہیں

۔انعام تو پھر ایک آدھ ماہ تک واپس آجائے گی ان شاء اللہ!" وہ پڑوسن کی پوری کھلی آنکھوں میں دیکھ کے اعتماد کے ساتھ مسکرائیں مگر دھیان فون اٹھائی زینیا کی طرف تھا۔

"یار...... یہ سفر تو شیطان کی آنت سے بھی لمبا ہے...... میں تو ابھی سے تھک چکی ہوں۔ دل چاہ رہا ہے گاڑی کا رخ کراچی کی طرف موڑ لوں۔"

اس نے اینا کا کل کا آیا میسج آج بھی دلچسپی سے پڑھا...... اس نے گردن موڑ کر دیکھا ہمسائی منہ ہی منہ میں استغفار پڑھتی بیرونی گیٹ پار کر رہی تھی۔

" انعام نے ایسا کیا پیغام بھیجا ہے زینو! جو اس قدر سنجیدگی سے پڑھا جا رہا ہے۔"

"کہہ ہی تھی کہ سفر بہت لمبا ہے۔" وہ اسکرین سے نگاہ ہٹا کر خوشگواری سے گویا ہوئی۔ وہ انہیں باور نہیں کروانا چاہتی تھی کہ کل دوپہر کے بعد سے اینا کا کوئی میسج نہیں آیا......

"میں بھی اسے کہتا رہتا ہوں کہ ابھی سفر بہت طویل ہے ندرت! اور پاؤں ہیں کہ رکتے ہی نہیں۔"

زید کی بوجھل آواز میں جانے کیا تھا کہ ان دونوں خواتین کا سکون پل میں درہم برہم ہو گیا۔

ایک ننگی سی شاخ کی نادیدہ چھاؤں میں بیٹھا پکھیرو بھی جیسے اونگھ سے جاگا تھا۔ جیسے کسی گھنی چھاؤں میں وہ اپنی نیند پوری کر چکا تھا۔ زینیا اس پکھیرو کو کبھی سمجھ ہی نہیں پائی تھی کہ وہ اپنی سردیاں اور گرمیاں اس ٹنڈ منڈ سے درخت پر کس قدر پرسکون ہو کر گزارتا تھا۔ وہ بے خبر تھی کہ وہ پرندہ بھی اس کے بارے میں کچھ ایسی ہی رائے کا حامل تھا۔ تایا کی آواز پر اس نے تیزی سے جائے نماز تہ کی۔

"آپ نہا کر نماز پڑھیں گے۔" وہ ان کی طرف لپک کے آئی۔ جن کی آنکھوں میں ٹوٹتا نشہ بھی کرب آمیز تھا۔ اس لڑکی کو اب کون سمجھائے۔ ندرت نے معمول کی جھنجلاہٹ سے سر جھٹکا۔ "نشے کا مارا تایا۔ اللہ جانے نماز میں کیا پڑھتا ہو گا۔ زید نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم تخت پر جائے نماز بچھاؤ ساتھ ہی ایک گلاس پانی بھی رکھنا میں وضو کر کے آتا ہوں۔"

"یہ عمل کیا صحیح ہے زینیا!" روز کی طرح یاد دہانی ندرت پر فرض تھی۔ زینیا نے انہیں بے بسی سے دیکھا۔

"وہ اس وقت ہوش میں ہوتے ہیں' دو چار سجدے کر لینے سے ان کا باقی دن پرسکون گزر جاتا ہے تائی۔" وہ انہیں جواب دے کر کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ "اس دنیا میں کون ہوش مند ہے۔" وہ جیسے خود سے گویا ہوئی۔

☆☆☆

گزشتہ رات اس گھر کا دروازہ کھولنے والے ہٹے کٹے دیو قامت شخص کو انعام امیر نے گھومتے سر کے ساتھ دیکھا تھا۔

"یہ عابد ہے اینا!" رمشا آپا نے کچھ یوں مسکرا کے تعارف کرایا جیسے کراچی سے گلگت کا سفر اس نے اس ملازم عابد نامی شخص سے ملنے کے لیے بے صبری سے طے کیا تھا۔

"چند روز تک اینا تمہاری مہمان ہے۔ اس کی دیکھ بھال اچھے طریقے سے کرنا۔" وہ عابد کو ہدایت دینے کے بعد چلی گئی تھیں جس کا حواس باختہ انداز اینا کی گھبراہٹ کو بھی مات دے رہا تھا۔

"آپا مجھے اس حال میں یوں ایک ملازم کے رحم و کرم پر چھوڑ کے کیسے جا سکتی ہیں" ڈگمگاتی، لڑکھڑاتی انعام امیر جیسے یکلخت ہوش میں آئی تھی ۔وہ بچپن ہی سے مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ وہ پریشانیوں میں گھلنے کے بجائے ان کا حل ڈھونڈ کے مقابلے پر اتر آتی تھی مگر اس وقت بے بسی کے احساس میں گھری انعام بس رو سکتی تھی۔

"صاحب کی بھابھی نے خواہ مخواہ ہمارے سر مصیبت ڈال کے ہمارا نیند خراب کیا۔" جمائی پر جمائی روکتے ملازم نے اسے غصے سے دیکھا تو اس کے آنسو خشک ہوئے۔

وہ اپنی مصیبت میں اسے جس کمرے میں چھوڑ گیا تھا وہ آپا کے گھر سے کہیں پر تعیش تھا۔ صبح کے سات آٹھ بجے تک جی متلانے اور سر چکرانے میں کچھ افاقہ ہوا تو اس نے اپنا سامان کھنگالا۔ تو سیون اپ کے ساتھ اسے اپنی مطلوبہ دوائیں بھی مل گئیں زینیا نے اس کے سامان میں کیا کچھ نہیں رکھ دیا تھا۔ احساس تشکر سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

دوا لینے کے بعد اسے جتنی آیات یاد تھیں اس نے پڑھ کر خود پر پھونکیں، پھر دروازہ لاک کر کے یوں بے سدھ سوئی کہ سہ پہر میں ہی بیدار ہوئی تھی۔

پہلے تو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے اور جب ہوش ٹھکانے پر آئے تو ایک بار پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ رمشا کو کبھی بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ پھر حالات نے یوں پلٹا کھایا کہ اس سے امداد طلب کرنا ان کی مجبوری میں شامل ہوا۔ وہ خود غرض تو تھی مگر اس قدر بے حس اور لاپروا بھی ثابت ہو گی کہ اسے جان پہچان سے عاری گھر میں ایک ملازم کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کے اپنی منزل کی جانب بڑھ جائے گی' اینا اس سے پہلے رمشا کے متعلق ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ اپنی ہمت مجتمع کرتی کھڑکی تک آئی...... ذرا سا پردہ سرکا کے دیکھا۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ گھر میں اس دیو قامت عابد کے سوا ایک چڑیا تک نہیں تھی۔ یا اللہ یہ میرے کون سے برے اعمالوں کی سزا ہے۔ وہ خود کو کوستی بیڈ تک آئی خالی پیٹ میں گرہیں پڑ رہی تھیں۔ اس نے سیون اپ کے بچے کھچے گھونٹ بھرے اور بیگ میں سے بسکٹ نکال کر ذرا، ذرا کترنے لگی۔

اگر اسے رمشا کی واپسی تک یہیں رہنا تھا تو وہ یہاں چھپ کر، بھوک، پیاس اور بدحالی کی صورت کیسے رہ سکتی تھی' آخر کار اس عابد نامی شخص کا سامنا کرنا ہو گا...... اس نے اپنے سامان سے پانی کی بوتل نکالی نئی سوچ نے اس کے اندر توانائی سی بحال کی تھی وہ مسئلوں سے نہیں گھبراتی تھی وہ بہت حد تک بہادر تھی' وہ ایک عام دل کی لڑکی نہیں تھی وہ انعام امیر تھی۔

☆☆☆

زینیا صفدر جس گھر میں پلی بڑھی اسی گھر کے نچلے پورشن میں اس کے تایا کی فیملی بھی رہائش پذیر تھی' اس کا باپ اس کے لڑکپن میں ہی کسی بیماری کا شکار ہو کر چل بسا تھا۔ ایک بھائی تھا برسوں پہلے کمائی کی غرض سے سعودیہ گیا تو لوٹ کے بہن کی شادی پر ایک ہفتے کے لیے آیا تھا...... اپریل کی ایک خوش گوار سی شام وہ اپنے تایا زاد اکمل کے سنگ دھوم دھڑکے سے رخصت ہو کے نچلے پورشن کی مکین بن گئی تھی۔ اس کی تائی ندرت خوش مزاج عورت تھیں تو تایا زید امیر اسی قدر سخت طبیعت رکھتے تھے۔ ندرت اور وہ ایک دوسرے کے مزاج کو بخوبی سمجھتی تھیں۔ اگرچہ زینیا کی زندگی یکسانیت کا شکار تھی مگر سہل انداز میں گزر رہی تھی۔

زندگی اس وقت ہلچل کا شکار ہوئی جب زینیا کے بھائی عبداللہ نے گھر میں سے اپنا حصہ طلب کیا۔ تو زید امیر نے برسوں کی جمع پونجی نکالی اور گنتی کی۔ رقم کم پڑنے کی صورت میں ندرت اور زینیا کے

زیورات بھی بیچ دیے اور یوں عبداللہ اپنا حصہ سمیٹ کر نو دو گیارہ ہو گیا جس کی بوڑھی ماں کی آنکھوں میں بیٹے کی بے حسی جم سی گئی تھی۔

شادی کو ابھی دو سال بھی مکمل نہیں ہوئے تھے کہ ایک بم دھماکے میں اکمل بھی انہیں داغ مفارقت دے گیا۔ اگلے کئی مہینوں تک ان کی زندگیاں جیسے ساکت ہو گئیں۔ پھر اس گھر کے چاروں افراد کا سکتہ معاشی مسائل کے سر اٹھانے پہ ہی ٹوٹا تھا کہ زید کی پنشن سے گھر کا چلنا ناممکن تھا۔

اسی دوران اینا کی پڑھائی بھی تقریباً مکمل ہو چکی تھی ۔ نہ کوئی جمع جوڑ نہ زیورات جو بوقت ضرورت کام میں لائے جا سکتے۔ وہ بالکل خالی دامن ہو چکے تھے۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی میں برستی دونوں میاں بیوی کی آنکھیں تنگئ حالات نے خشک کر دی تھیں' جوان بیٹی کی اجڑی زندگی زینیا کی ماں کو گھن کی طرح چاٹ گئی۔ زینیا گھر میں آس پڑوس کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگی کہ وہ صابر شاکر قسم کی تھی جو بھی ہے جیسا بھی ہے کی بنا پر زندگی گزار سکتی تھی۔ مگر انعام امیر ایسا نہیں سوچتی تھی نہ اپنے لیے نہ زینیا کے لیے' وہ برے وقت پر ایک حد تک آنسو بہاتی تھی اور اچھے وقت کو گھسیٹ کر اپنے زور بازو کے بل پر مقابل کر لینے کا ہنر جانتی تھی۔

☆☆☆

سرگوشیاں کرتی پریوں کی وادی آج چھ ماہ بعد اپنے مکین کو یوں اچانک پا کر حیران ہوئی تو وادی میں اتری سہ پہر کی دھوپ بھی اس آوارہ منش کی طرح السائی ہوئی سی تھی جو ایک تھکا دینے والے سفر سے لوٹا تھا۔ اور عابد کو بھی اسے سامنے دیکھ کر حیرانی کے ساتھ خوشی بھی ہوئی تھی ۔ وہ مطمئن بھی ہوا کہ صاحب بھی رات کو اچانک نازل ہونے والی مصیبت کی وجہ سے ہی یہاں آیا ہوگا۔

"ہاں بھئی عابد کیسی گزر رہی ہے"۔

اسے ایک جملے سے نوازتا وہ اپنے بیڈروم کی طرف بڑھا تھا کہ گھر میں آتے ہی ہر احساس پر تھکن غالب آ چکی تھی۔

"صاحب سنیں تو......" وہ چلاتا رہ گیا۔

"واپسی کے بعد میری پہلی خواہش بس نیند ہوتی ہے سو پلیز......" اور عابد بند دروازے کو گھورتا رہ گیا۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح جانتا تھا کہ اس کی نیند چند گھنٹوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ پھر جب سائب بیدار ہوا تو شام تاریکی میں مدغم ہو رہی تھی' ایک بھرپور شاور کے بعد ہی وہ بیڈروم سے باہر آیا تھا کہ کافی پیش کرنے کے بعد عابد نے گھنٹہ بھر تو گرد و پیش کے رہائشیوں کے ساتھ اپنے اختلافی معاملات اسے بتانا ہوتے تھے۔ مگر آج عابد کی غیر متوقع خاموشی نے اسے حیرت میں مبتلا کیا۔

"لگتا ہے پچھلے چھ ماہ کچھ زیادہ ہی خیریت رہی ہے۔" اس نے کافی کا ذائقہ محسوس کرتے مسکرا کے دریافت کیا...... "جو ہمارا باغیچہ اجاڑتی تھی بوڑھے بابو کی وہ بدمعاش بکری یقیناً اس دار فانی سے کوچ کر چکی ہوگی اور مادام راحت کی آوارہ پوتی نے لگتا ہے تمہارے معصوم بچے کا پیچھا چھوڑ ہی دیا ہے۔"

اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ گہری ہوئی اس نے دونوں ٹانگیں سامنے میز پر پھیلائیں۔

"کل آدھی رات تک تو سب خیریت سے چل رہا تھا مگر اس کے بعد آپ کی بھابھی ادھر جو مہمان چھوڑ کے گئی ہیں۔ وہ بالکل بھی خیریت سے نہیں۔"

عابد کی سرد آواز نے اس کے سکون کی دھجیاں اڑائیں۔ کہ وہ اس مہمان کو یکسر بھول چکا تھا۔ ساتھ ہی رمشا کی ڈاکٹر والی ہدایت یاد آئی تو اس کا دماغ گھوما۔ "اسے کسی ڈاکٹر کو بھی دکھایا ہے کہ بس تیمارداری میں ہی لگے رہے ہو۔" وہ بےزاری سے کہتا اپنی جگہ سے کھڑا ہو......" وہ بستر سے اٹھتی تو لے جاتا نا جب بھی چابی سے دروازہ کھولا اسے بےسدھ ہی پایا۔" وہ بھی اپنے صاحب کے انداز میں تپ کے گویا ہوا تو سائب نے اسے گھور کے دیکھا۔ "ایک بے چارے سے مریض کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالنا تمہارے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا عابد......" وہ مہمان کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے یوں ہی ہنسا۔

"وہ بے چارا سا مریض اگر مرد ہوتا تو ہم ایسا بھی کر گزرتا۔" عابد جواباً کھل کے ہنسا تھا۔

"تو کیا وہ۔" مارے بوکھلاہٹ کے وہ اپنی جگہ پر جم سا گیا...... اوہ...... نو......" وہ اپنے بدترین اندازے کی بنا پر چکرا کے رہ گیا۔

"جی آپ کا بھابھی ادھر ایک لڑکی کو ٹھہرا گیا ہے۔" صاحب کی حالت پہ ترس کھاتا عابد بمشکل سنجیدہ ہوا۔

"رمشا ایسا بھی کر سکتی ہے۔ یوں ایک اکیلی لڑکی کو تنہا...... وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے۔" اس کے حواس جھنجھنا اٹھے تھے۔

☆☆☆

"زینیا کو اب مزید تعلیم کی کیا ضرورت ہے ندرت! تم بھابھی سے آج ہی کہہ دینا کہ بارہ جماعتیں کم نہیں ہوتیں۔"

وہ اپنی یاد میں ابھرنے والے اپنے ہی سخت لہجے سے آج جیسے ڈر کے چونکے تھے۔ مگر نگاہ ابھی بھی گھر سے باہر جاتی زینیا پر ہی تھی، اگر وہ آج نوکری نہ کر رہی ہوتی تو وہ لوگ فاقوں مر رہے ہوتے، ایک گرم قطرہ ان کی کنپٹی پہ رکا۔

"تو کیا وہ اب زندہ تھے۔" انہوں نے اپنا نقاہت زدہ ہاتھ کنپٹی پہ رکھا۔

دوسرے دن وہ یونی ورسٹی سے آئی تو زید گھر میں ہی تھے۔ اکمل بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ وہ اپنے تایا کو سلام کرنے کے بعد سیڑھیاں چڑھ گئی تو انہوں نے بیوی پر قہر بھری نظر ڈالی۔

"کیا تم نے بھابھی سے بات نہیں کی تھی۔؟"

ان کا لہجہ نظر سے بھی بڑھ کے تھا۔

"کیوں نہیں کی تھی۔ وقت جانے کس طرف جا رہا ہے اور کامیاب لوگ ہی اس کے تعاقب میں ہیں تو کیا میری بیٹی پیچھے رہ جائے۔ پہلے میں اس کے پلو سے کامیابی کی کنجی باندھوں گی، اس کے بعد بھائی صاحب کا کہنا سر آنکھوں پہ...... آپ کی بھاوج نے مجھے یہ جواب دیا تھا۔" ندرت نے ہمیشہ کی طرح سر جھکائے دھیمے لہجے میں بات کی۔

"ہنہ کامیابی کی کنجی۔" کس کر و فر سے انہوں نے دہرایا تھا۔ اب ان کی دائیں آنکھ سے بھی پانی بہنے لگا تھا۔ انہوں نے دوسرا ہاتھ اٹھانا چاہا جو پہلو چھوڑنے سے انکاری ہوا۔

"زید! اٹھیں، تھوڑا سا جوس پی لیں۔" ندرت نے اپنی کرسی چارپائی کے قریب گھسیٹی۔

"اسے رہنے دو' فی الحال تو میں سگریٹ پیوں گا۔" انہوں نے پیلے جوس کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"کیا میں ان تمام نعمتوں کے قابل ہوں۔" انہوں نے اذیت بھرے انداز میں اپنا سر تکیے پہ پٹخا۔ ندرت آنکھوں میں نمی لیے وہاں سے اٹھ گئیں۔

"کمانا اور نوکری کرنا یہ مردوں کا کام ہے بھابھی!" اور یہ جملہ ادا کرتے ہوئے ان کی گردن اکڑی ہوئی اور غرور بھرا لہجہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

"عبداللہ......اور اکمل ہیں نا۔"

وہ اس پل ہونے کے نشے میں سرشار تھے...... کہ گھر کی ناتواں عورتوں پہ ان دونوں مضبوط مردوں کا ہونا جتاتے ہوئے انہیں ماشاءاللہ یا ان شاءاللہ کہنا بھی یاد نہیں رہا تھا۔ ماچس کی جلتی تیلی نے ان کی انگلیاں جلائیں۔

"اکمل...... عبداللہ! تم دونوں کہاں ہو۔" مگر ان کا سوال ان کی سماعتوں نے ہی سنا۔ "ایک اللہ نے لے لیا، دوسرا، زمانہ جیتنے نکلا تھا۔ وہیں کا ہو کے رہ گیا اور تیسرا ہاں اس گھر کا تیسرا مرد وہ خود تھے۔ وہ کہاں چلے گئے۔"

انہوں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ "زید امیر تم کہاں چلے گئے ہو۔"

ان کی آواز اتنی نیچی نہیں تھی۔ کچن میں کھڑی ندرت کا ہاتھ گرم برتن سے ٹکرایا۔ "سس......" ایک

سسکاری سی ابھری تھی۔
"ہاں یاد آیا تین سال پہلے میں نے گھر سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ وہ تکلیف میں تھا۔" وہ رو رہے تھے، پھر بے دھیانی میں ہی آنسو بہاتے وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں گھنے درخت تھے، بے پناہ سکون تھا۔ نڈر پرندے تھے اور ایک خنک مہک تھی ہر قسم کے پھولوں پہ اگربتیوں کی خوشبو حاوی تھی، وہاں کے مکین خاموش تھے۔ بالکل خاموش...... وہ شاخوں کے ہلکورے لیتے سایوں کے نیچے پھوٹ پھوٹ کے روتے۔ "اے بندے نام گیا اور نشان بھی" جانے وہ جوان بیٹے کو روتے تھے یا خود پہ روتے تھے۔

"مرد ہونے کا اس قدر بھی کیا غرور۔ زید امیر...... کہ عورت راہ میں پڑی کسی چیز کی طرح ٹھوکر لگا کر دیوار کے ساتھ لگا دی جائے۔"

ان کی بھاوج لہجے کی مضبوطی کے ساتھ ان سے مخاطب تھی کہ آنے والے وقت کے لیے چند اندیشوں کا دامن میں پلنا ضروری ہوتا ہے اور زاد راہ میں ایک چمکتا ہوا جملہ رکھ کے سفر کرنا پڑتا ہے کہ خدا جانے کل کیا ہو جائے۔

"مرد ہونے کا غرور کرو اور جس قدر چاہے کرو، مگر ذہن میں رکھو زید امیر! کہ بلندیوں کی طرف ایک ایک قدم پہ اللہ اکبر کہنا ہی مسلمان کا اصل کام ہے، یہ تمہاری اور میری طاقت اس کی عطا کردہ سانس کی محتاج ہے۔"

اس روز ان کی بھاوج اپنی بیٹی کے لیے نہیں۔ انعام امیر کے لیے ان کے مقابل تن کر کھڑی تھی۔

"بارہ جماعتوں سے آگے بھی ایک جہان ہے، انہیں وہاں تک جانا ہے زید امیر! کہ مشکل وقت میں پہلی پکار پہ انسان کا ہنر اور اس کی تعلیم ہی کام آتی ہے۔" وہ ان کی بیٹی کا ہاتھ تھام کے نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔

مشکل وقت آیا تو گھر کی دونوں عورتوں نے اپنی تعلیم کا ہی سہارا لیا تھا...... اور خود...... زید...... وہ خود کو پکار سکے نہ اللہ کو...... بھلا ایسا بھی ہو سکتا ہے اور کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اللہ جانے کل کیا ہو۔ اس جملے کی تاثیر کو ان کی گفتگو نے کبھی چکھا ہی نہیں تھا۔ تب ہی تو وہ صحن میں موجود درخت کی طرح ٹنڈ منڈ ہو گئے تھے۔

"سکون چاہتے ہو؟"

ایک دن میلی چادر میں لپٹا کوئی بدحال سا وجود...... سگریٹ کا دھواں اڑاتا ان کے سامنے سوال لیے کھڑا تھا اور انہیں واقعی سکون چاہیے تھا۔

"پہلی پکار پہ کام آنے والی چیز صرف عورت ہے۔" یہ چند الفاظ انہوں نے دانتوں میں پیس پیس کر ادا کیے تھے کہ ندرت کے دانتوں تلے پسینہ آ گیا کہ شوہر نے ہاتھ میں پکڑا جگ اکلوتے درخت کے تنے پہ کھینچ مارا تھا۔ درخت کے عشق میں گرفتار پکھیرو نے سہم کر نادیدہ شاخوں میں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔

"انعام...... اینا...... ارے اینا...... سنو تو۔"

بیٹے کی التجائیہ سی آواز پہ انہیں غصہ آتا۔

"تمہیں اور عبداللہ کو آباؤ اجداد کا لہجہ کیوں بھولتا جا رہا ہے۔" وہ ہزار تاؤ کھا کے دھاڑتے اور اب اس شہر خموشاں میں ان نڈر پرندوں کی بولیاں سنتے ہوئے سگریٹ کے پرسکون کش لیتے ہوئے...... زید امیر کو بھی اپنے آباؤ اجداد کا لہجہ بھول چکا تھا۔

☆☆☆

"لگتا ہے گزشتہ چھ ماہ کچھ زیادہ ہی خیریت سے گزرے ہیں۔"

قدرے بھاری، اس آواز پہ وہ سُن ہوئی اور ادھ کھلے دروازے پہ اس کے ہاتھ جہاں کے تہاں رہ گئے۔ اس گھر میں عابد نامی شخص کے علاوہ بھی کوئی رہتا ہے، اسے یہ جان کر افسوس ہوا۔ وہ الٹے قدموں دوبارہ بیڈ پہ ڈھے سی گئی۔

"کوئی کسی کے ساتھ یوں بھی کرتا ہوگا۔ جیسے آپا رمشا میرے ساتھ کر چکی ہیں۔"

مارے ضبط کے اس نے مٹھیاں بھینچ لیں، اس کی آنکھوں میں بس گنتی کے آنسو تھے جو یہاں آنے کے بعد وہ بہا چکی تھی۔ کتنا ہی وقت اس دکھ کی سی کیفیت کی نذر ہوا دفعتاً قدموں کی قریب آتی آہٹوں پہ اینا نے ذہنی اور جسمانی کمزوری پہ لمحوں میں غلبہ پایا تھا اور کچھ یوں اپنا بیگ کھنگالنے لگی، جیسے کاؤنٹر پہ پے منٹ کرنی ہو۔

اگلے ہی لمحے وہ ہلکی دستک کے بعد کمرے میں آ چکے تھے۔ لڑکی پہ نگاہ ڈالتے ہی سائب کو حیرت آمیز جھٹکا لگا۔ وہ نہ صرف ہوش میں تھی، بلکہ آنے والوں کو استفہامیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

سائب نے اپنی ذہین نگاہوں سے اس کا بغور جائزہ لیا۔ وہ اسمارٹ سی لڑکی دیکھنے میں کافی معقول اور پُراعتماد تھی...... تو کیا علاج کی ضرورت عابد کو تھی۔ سائب نے چہرہ گھما کے عابد کو درشتی سے گھورا۔

"اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں۔" وہ ہلکا سا کھنکار کے سپاٹ سی آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔ مگر پیشے کے لحاظ سے وہ اس کی باڈی لینگویج تک نوٹ کر رہا تھا کہ وہ رمشا کی مہمان تھی اور رمشا کوئی سیدھی عورت نہیں تھی، وہ سیدھے لوگوں سے بھی الٹے کام کروانا جانتی تھی۔

"میں اسے اپنا ہی گھر سمجھ رہی ہوں اور بہت آرام سے ہوں۔ اگر آپ مجھ سے یہ جملے سننے کے متوقع ہیں تو مجھے افسوس ہے۔"

وہ خفیف سے کندھے اچکا کر دوبارہ سے اپنا بیگ کھنگالنے لگی تھی۔ وہ کئی لمحے۔ سوچ نہیں پایا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔ بس سابقہ انداز میں عابد کو گھورا، جس نے اپنی آنکھیں فی الفور گریبان کے اندر اور دانت منہ میں گھسائے تھے۔ بہر حال وہ لڑکی کے انداز تخاطب سے الجھ چکا تھا۔ "جو بندی ایبٹ آباد سے گلگت تک الٹیاں کرتی آئی ہو تو سوچیے اس کے معدے میں رتی بھر ہوا تک کہاں ہوگی۔"

اور اس شخص نے ''......'' اس نے عابد کی طرف انگلی اٹھائی۔ "اس بے چاری مہمان سے ایک کپ چائے تک نہیں پوچھی۔" وہ پھر سے بیگ میں جھانکنے لگی، جس میں شاید ہاتھی گم ہو چکا تھا۔

اب کے سائب نے اس بے چاری مہمان پہ کٹیلی سی نگاہ ڈالی۔

"آپ نے دروازہ اندر سے لاک کر رکھا تھا۔" میزبان نے تیزی سے صفائی پیش کی۔

"جسے تم نے باہر سے دو مرتبہ کھولا تھا۔" وہ اسے گھور کے بولی۔ ساتھ ہی سائب پہ بھی جتاتی سی نظر ڈالی کہ مجھے آسان چیز مت جانیے۔

"عابد! چائے کے ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی لے کر آنا۔" عابد کے دوسری بار صفائی دینے سے قبل سائب کے حکم پہ وہ الٹے قدموں بھاگا تھا۔

اینا نے اسے ترچھی نگاہ سے دیکھا، جو اسی کا ایکسرے کر رہا تھا، یعنی کہ یہ حضرت اس گھر کے مالک تھے، اس نے بیگ کی زپ بند کی۔

"کیا میں آپ کا آئی ڈی کارڈ دیکھ سکتا ہوں۔" اس نے پیش قدمی کرتے ہوئے جیسے مودبانہ گزارش کی کہ وہ لڑکی خاصی ٹیڑھی ثابت ہو رہی تھی، اس نے زپ دوبارہ سے کھولی اور کارڈ اس کے حوالے کیا۔

"انعام امیر......" سائب نے ابرو بھینچ کے اسے دیکھا۔ جس کا مزاج نام کے متوازی ہی تھا۔

"آپ کا رمشا سے کیا رشتہ ہے؟" وہ سنجیدہ تیوروں کے ساتھ ہی گویا ہوا۔

"یہ بات تو آپ کو رمشا آپا سے پوچھنا چاہیے تھی۔" وہ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی قائل تھی۔ "بہر حال باقی کی معلومات میں چائے پینے کے بعد ہی آپ کو فراہم کر سکوں گی۔"

اس نے سامنے کھڑے شخص پہ سرسری سی نظر ڈالی، جس کے مزاج میں ابال سا آ رہا تھا۔ اس نے انگوٹھے اور انگلی سے اپنی پیشانی دبائی۔ یعنی اسے کمرے سے باہر جانے کا اشارہ دیا جا رہا تھا اور وہ ضبط کرتا باہر چلا بھی گیا تھا۔

☆☆☆

باہر آنے کے بعد اس نے پہلا کام رمشا کو فون ملانے کا کیا۔ صد شکر کہ کال ریسیو کر لی گئی۔

''یہ کیا بلا میرے گھر پہ پھینک گئی ہو۔'' بنا کسی لحاظ تمیز کے وہ جیسے پھٹ پڑا تھا، اس کی آواز کمرے تک آرہی تھی۔ بے عزتی کے احساس نے اینا کی آنکھیں بھگوئیں۔

''اب عابد کی سنی سنائی میں اچھی خاصی لڑکی کو بلا تو مت کہو سائب۔ بس وہ ذرا مزاج کی تیز ہے۔ ورنہ......'' رمشا کی مترنم آواز میں پریشانی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

''او......شٹ اپ۔'' وہ اپنے طیش کو سنبھالتا دبی آواز سے دھاڑا......تو کمرے میں کھڑی انعام کا بہادر دل سہم کے دھڑکا، جس شخص کا مزاج نظروں سے اوجھل ہوتے ہی بدل چکا تھا تو سمجھو جلد سمجھ میں آنے والی شے وہ بھی نہیں تھا۔ انعام نے سانس بھی جیسے احتیاط سے لیا۔

''بے چاری سی لڑکی سے تمہارے ملازم کو کیا تکلیف ہے؟'' رمشا کے خیال میں سائب جانے کہاں کی چھاؤنی میں اپنے کسی آفیسر کے زیر اطاعت تھا۔

''بہرحال میں تمہیں وارن کر رہا ہوں کہ اس لڑکی کو کل شام تک یہاں سے لے جاؤ۔'' وہ رمشا کی بات کاٹ کر روانی سے بولا......تو لہجہ ناگوار اور سرد تھا۔ اینا نے جھرجھری لی۔

''ورنہ کیا ہوگا میجر صاحب!'' رمشا کے لہجے نے محظوظ سا رنگ اوڑھا۔

''ورنہ......'' کل شام میں اسے کسی بھی سڑک پہ چھوڑ آؤں گا۔''

اس نے بات ختم کرکے فون صوفے پہ اچھال دیا تھا۔ اپنی اس قدر بے وقعتی پہ اینا کا دل دھاڑیں مار کے رونے کو چاہا تھا، مگر وہ اپنے دل سے ذرا کم ہی واسطہ رکھتی تھی۔ اس نے اپنی بھیگی پلکوں کے ساتھ بھاپ اڑاتی، چائے کو دیکھا، عابد ٹرے بیڈ پہ رکھ کے جا چکا تھا۔ کیا رمشا واقعی اس کی خالہ زاد تھی۔ وہ اسے کبھی زندگی بھر سمجھ نہیں سکتی تھی، اس عورت کی خود پرستی کی کوئی حد نہیں تھی، جیسے اس کی خواہشوں کا کوئی دوسرا کنارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

رمشا ستار، ندرت کی سگی بھانجی تھی، دونوں بہنوں کے گھر ایک ہی گلی میں تھے۔ رمشا ذہین ہونے کے ساتھ بہت چالاک بھی تھی، اس پہ خدا نے اسے حسن بھی فراوانی سے عطا کیا تھا۔ آواز و انداز میں بلا کی کشش...... وہ محفل پہ چھا جاتی تھی۔ وہ شروع سے ہی اونچے اڑنے کے محلوں کے خواب دیکھتی تھی، پھر یونی ورسٹی میں فرہاد سے ٹکرانے کے بعد درحقیقت وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ پہلے بھی اپنی خالہ ندرت کے ہاں اس کا آنا جانا زیادہ نہیں تھا۔ وہ اپنی پھوپھی کے پاس کراچی رہنا زیادہ پسند کرتی تھی۔ اس نے اپنی تعلیم بھی کراچی سے ہی مکمل کی تھی۔ شادی کے بعد اس کا حیدرآباد آنا نہ آنے کے برابر رہ گیا۔

زید کو بھی اس کے بدلتے رنگ ڈھنگ پسند نہیں تھے، جس کی وجہ سے رمشا بھی خالہ کے ساتھ اپنا رشتہ جیسے فراموش کرچکی تھی۔ زینیا اور انعام کو اپنی غرض سے ہی پہلی بار رمشا کے یہاں کراچی جانا پڑا تھا۔ وہ اس کا گھر دیکھ کے مبہوت رہ گئیں۔ تو کیا رمشا کے سارے خواب پورے ہوچکے تھے۔ وہ دونوں پُریقین ہوکر سوچتیں۔

رمشا خوش تھی۔ پُرسکون تھی۔ بے فکر تھی، مگر اس کا ایک ٹوٹا ہوا خواب دل کے اندر کرچی سا چبھتا تھا۔ سائب، حسن، علیم اور فرہاد، ان تینوں میں سے اس کا دل پہلی بار سائب کا مطلوب ہوا تھا۔ مگر وہ اس کی جانب سے توجہ کی اک نگاہ بھی نہیں پاسکی۔ حسن علیم کی شخصیت میں جو وقار تھا۔ جو بات تھی، وہ فرہاد میں نہیں تھی۔ فرہاد واجبی سی شکل و صورت کا مالک ہونے کے ساتھ بے بہا دولت کا بھی مالک تھا۔ سو ان دونوں سے مایوس ہوکے وہ جلد ہی فرہاد کی طرف بڑھ گئی، مگر آج بھی اس کے پاس کچھ ٹھنڈی سی آہیں تھیں جو صرف سائب کے لیے تھیں۔

زینیا جب فائنل ایر میں تھی تو اس کی اسٹیبلشمنٹ کی پریکٹیکل ٹریننگ کراچی میں ہورہی تھی، یوں بہ امر مجبوری اسے وہ ایک ماہ رمشا کے گھر گزارنا تھا، جس دوران اس پہ رمشا کے مزید جوہر کھلے تھے، وہ فرہاد کی کلاس سے بھی بہت آگے کا سوچتی تھی، اس کے تعلقات زیادہ تر بیوروکریٹس سے تھے، وہ نامور سیاست دانوں کی بھی کوئی پارٹی مس نہیں کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کی ہر اچھی چیز پر صرف رمشا فرہاد حق رکھتی ہے، ان چیزوں کا شمار انسانوں میں ہو، تعلقات میں یا پھر مادی اشیاء میں' کیا کوئی عورت اس کے برابر ہوسکتی تھی، اس کے گھر سے واپس آنے کے بعد زینیا نے ہر بات انعام سے شیئر کی تھی۔ مگر زینیا نے انعام سے بہت کچھ چھپا بھی لیا تھا۔

☆☆☆

عابد اپنے معمول کے کام نمٹانے کے بعد کچن میں جا چکا تھا۔ چڑیوں کا پنجرہ اس کے قریب ہی تھا اور طوطا اس سے خاصے فاصلے پہ...... مگر سائب طوطے کی نگاہوں میں تھا۔

''صاحب......صاحب!'' طوطے کی آواز میں معمول سے ہٹ کر خوشی تھی۔

''اوئے باز آجا۔ صاحب کا موڈ خراب ہے۔'' عابد نے اسے پلٹ کے دیکھا۔ ''آج تجھے سیب ملے گا۔ نہ مجھے شاباش۔'' جواباً طوطے نے گٹ مٹ کی...... کہ موڈ کیوں آف ہے۔

''تم نے اسے نہیں دیکھا شہزادے...... مگر پریشانی کی وجہ وہ بی بی ہی ہے۔''

عابد نے اسے ہلکی آواز میں مطلع کیا اور کام کی طرف متوجہ ہوا۔ کھانا تقریباً تیار تھا۔ ''بی بی......بی بی......'' اب طوطے نے اپنا رخ بھی اخبار پڑھتے سائب کی طرف موڑ لیا۔

''اوئے...... ساون...... یہ کیا کر رہے ہو؟'' عابد نے گھبرا کے ہونٹوں پہ انگلی رکھی...... کچھ صاحب کی گھوری اور کچھ عابد کی منت سن کر ساون نے آنکھیں ہی بند کرلیں۔ سائب کی ہر بار آمد پہ عابد بس پہلے ڈنر پہ ہی اہتمام کرتا تھا، جس میں صاحب کا پسندیدہ اچار گوشت اور ابلے چاول تو ضرور ہوتے تھے۔

اب وہ ٹیبل پہ برتن سیٹ کر رہا تھا۔

''چھلا مڑ کے نہیں آیا۔'' عابد نے سریلی تان لگائی۔

''گھر میں آج ہم دونوں کے علاوہ بھی کوئی ہے۔'' اس نے عجب تاثرات کے ساتھ عابد کو ہلکی آواز میں ٹوکا۔

عابد تو فوری خاموش ہوگیا، مگر ساون نے خوب چھلا گایا۔ عابد کی آواز اچھی تھی، وہ ہمیشہ سائب کے کندھوں اور پاؤں کی مالش کرتے ہوئے صاحب کی فرمائش پہ چھلا ضرور گاتا تھا اور جب اپنے موڈ کے مطابق گانا شروع کرتا تو صاحب کا فارورڈ......فارورڈ ساتھ ساتھ چلتا...... کہ آخر عاجز آکر عابد کو اپنا ٹیپ ریکارڈ بند کرنا پڑتا۔ وہ کڑے سے کڑا مسئلہ بھی ایک حد تک سوچتا تھا، پھر بقول دادی کے وہ معاملہ اللہ اور وقت پہ چھوڑ دینے کا عادی تھا۔ معاملہ پروفیشنل ہوتا یا پھر نجی...... مگر اس بار صورت حال عجیب تھی۔

اس نے ہر لحاظ سے سوچا تھا کچھ دنوں کے لیے بھی ایک انجان اور جوان لڑکی وہ اپنے گھر میں کسی بھی اور عورت کی موجودگی کے بنا کیسے رکھ سکتا تھا اور بالفرض وہ کوئٹہ بھی چلا جاتا، لیکن عابد نے کہاں جانا تھا۔

''دادی یا پھر حسن...... سے مشورہ لینا چاہیے۔'' اس خیال کے ساتھ ہی وہ کچھ پُرسکون سا ہوا۔ وہ کھانے کی غرض سے آیا تو ٹیبل پہ اپنی پسندیدہ ڈشز دیکھ کر بھی اس کی بھوک کھل نہ سکی۔

''صاحب! کھانا شروع کریں۔'' عابد نے ڈش سامنے سرکائی۔

''ان خاتون سے بھی کھانے کا پوچھ آؤ۔'' انسانیت بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔ یہ اس نے محض سوچا تھا۔ گمان تھا کہ کھانا کمرے میں آرڈر

کیا جائے گا، مگر اسے عابد کے ساتھ آتا دیکھ کے حیران ہوا۔ انداز ایسا تھا جیسے معمول کا ڈنر اٹینڈ کرنے آ رہی ہو۔ وہ لڑکی سپاٹ اور خشک چہرے کی مالک تھی، مگر اس کی چال کا ٹھہراؤ اور بے نیازی دیکھنے لائق تھی۔ عابد نے پھرتی سے کرسی اس کے لیے پیچھے گھسیٹی۔ جس پہ اس نے عابد کا شکریہ ادا کیا۔

اس نے نہایت سلیقے سے اپنی پلیٹ میں چاول نکالے اور سر جھکا کر رغبت سے کھانے لگی، جیسے وہ بے خبر تھی کہ سائب اسے بغور جانچ رہا تھا۔ کیا کرتا اس کا پیشہ ہی ایسا حساس تھا کہ دوستوں کا بھی پوسٹ مارٹم کرنا پڑتا تھا۔ کچھ دیر بعد ایتا نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر ٹشو سے منہ اور ہاتھ صاف کر کے سامنے دیکھا۔ وہ پانی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہا تھا۔

"رمشا میری خالہ کی بیٹی ہے۔ میں پچھلے ایک سال سے جاب کی غرض سے اس کے گھر رہائش پذیر ہوں۔ اس نے مجھے اپنے چھوٹے بیٹے حنان کی خاطر اپنے ساتھ چین جانے کی آفر کی۔ جو میں اپنے شوق کی وجہ سے رد نہیں کر سکی۔ پھر اس کے بعد کی اسٹوری آپ جانتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ آپ کو کچھ پوچھنا ہو تو......"

اس کی خاموش نگاہیں سائب کے چہرے پہ جمی تھیں۔ اس نے آخری گھونٹ بھر کے گلاس ٹیبل پہ رکھا۔ اس چہرے پہ بھلے پتھریلے تاثرات تھے، مگر آنکھوں میں تیرتی بے چینی نم سی تھی، جو وہ نوٹ کر چکا تھا، ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ رکھنے والا وہ آفیسر اتنا جان سکتا تھا کہ لڑکی کا کہا حرف بہ حرف سچ تھا کہ ٹریننگ کا پہلا حصہ لہجے اور چہرے پڑھنا ہی ہوتا تھا۔

"بی بی! بی بی!" عابد ایک طرف ہوا...... تو ساون کی نظر اس پہ پڑی تھی۔ ایتا نے ذرا سے ہونٹ بھینچ کے اس ذہین طوطے کو تیکھی نظروں اسے گھورا اور جوں ہی نگاہ موڑی۔

"بی بی!" ساون کو اس کے تاثرات سے گلہ سا ہوا کہ ٹون بدل کے بولا تو وہ اسے دیکھ کے مسکرائی۔ وہ خشک اور پتھر چہرے کے ساتھ مسکرائی تھی۔ یہ بات حیران کن نہیں تھی۔ سائب کو متحیر کرنے والا وہ لمحہ تھا کہ آنکھوں کی بھیگی سی بے چینی سمیت مسکرا کے اگلے لمحے وہ سنجیدہ ہو چکی تھی کہ اس کا مسکرانا گمان میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ اس کے کپڑوں کا رنگ لائٹ براؤن تھا جو اس کی آنکھوں کے ساتھ میچ کر رہا تھا۔ وہ پراعتماد ضرور تھی۔ مگر اتنی سخت مزاج نہیں تھی، جتنا وہ خود کو ظاہر کر رہی تھی کہ اس کی نگاہ کے مسلسل ارتکاز سے اس کی جھکی آنکھیں ٹیبل پہ پڑی ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"دراصل وہ ہے کیا۔" اس کا اندازہ سائب کو بہ خوبی ہو چکا تھا۔

"آپ نے تو جی چاولوں کے سوا کچھ اور لیا ہی نہیں۔" عابد دل مسوس کے رہ گیا۔ وہ تو اپنے کھانوں کی تعریف کا منتظر تھا۔

"میں کچھ اچھا فیل نہیں کر رہی۔" وہ اپنے پیچھے [illegible] کے کھڑی ہوئی۔ "مگر تمہارے ہاتھ میں ذا [illegible] عابد۔"

اس کا [illegible] مسکراتا سا محسوس ہوا۔ وہ ڈھول کا سا وجود نہیں رکھتی تھی، اس میں کچھ بھی وقتی نہیں تھا۔ اس کا ہر انداز دائمی اثرات کا حامل تھا۔ اس کا ہونا محسوس ہوتا تھا۔ اس کے قدموں کا اٹھنا اور پھر آگے بڑھنا دیکھتی نگاہوں کو ہپناٹائز کر سکتا تھا۔

☆☆☆

"کھڑکیوں کے پیچوں پہ بھی ہلکا سا تیل لگا دینا...... زینی...... ذرا سا بھی کھولو...... تو گلی والے متوجہ ہو جاتے ہیں۔"

وہ جو بوتل کا ڈھکن بند کر چکی تھی۔ تائی کی نرم آواز پہ بلا تامل تعمیل کی۔

"اور آئندہ خبردار جو اس کے سر میں مالش کی تو......" بات کے اختتام پہ تائی جانے منہ میں کیا بڑبڑائی تھیں کہ چوکھٹوں پہ تیل ڈالتی زینیا کے تلکے

[illegible] نہیں پڑا۔

[illegible] کی بات سن کے زید نے کروٹ بدلی۔

"[illegible] تمام رات پہرہ دیا کروں۔" اس نے بیوی کو [illegible] دکھا کر دوبارہ بند کر لیں۔

"تمام رات نشے میں گزارنی ہوتی ہے تو زینی بے چاری کے ہاتھ کیوں تھکاتے ہو۔"

زینیا کھڑکی بند کر کے مسکرائی کہ مغرب سے عشاء تک ان کی نوک جھونک چلتی تھی۔

"مساج کے بعد جو چار گھڑی کو نیند آتی ہے نا...... تو سمجھو، پوری رات سو لیتا ہوں۔ باقی جو دن چڑھے تک پڑا رہتا ہوں، وہ نیند کہاں ہوتی ہے۔ بس اونگھتا رہتا ہوں۔" انہوں نے ایک بکھری سی آہ بھری، ساتھ ہی سگریٹ سلگایا۔

"انعام خیر خیریت سے چین پہنچ چکی ہوگی۔" اب وہ کمرے سے باہر جاتی زینیا سے مخاطب ہوئے۔

"جی!" اس کا گلا خشک ہوا۔

"تھوڑی دیر پہلے اس کا میسج آیا تھا۔" وہ جواب دے کر رکی نہیں تھی کہ اسے جھوٹ بولنے کا ڈھنگ کہاں آتا تھا۔ دروازہ عبور کرتے ہی پاؤں برآمدے میں پڑی تپائی سے ٹکرایا۔ اس نے "سی" بمشکل لبوں میں دبائی کہ تائی نے سن لیا۔

"تو پریشان ہوتی رہے گی۔ یہ اچھی عادت نہیں ہے زینی۔" وہ سرگوشی کس کی تھی، اس نے سوالیہ سا ہو کے چہار سو دیکھا۔

"کون سی عادت، وہ جھوٹ تو میں نے......"

ماں نے بنا آہٹ کمرے میں قدم رکھا تھا۔ اپنے تئیں وہ گلابی اور پیلے آنچل میں چہرہ چھپا کے پڑی تھی۔ جیسے وہ اک صدی سے ساکت ہو۔ اس نے ماں کا آنا محسوس کر لیا تھا۔ جان کے ہوتے بے جان ہو جانا یہ دکھ جسموں میں اترنے جیسا ہوتا ہے۔ ماں کی آنکھیں اک ذرا سی بچی کے کورے وجود کو اک سادہ اوراق کی کتاب کی مانند سنبھالتی ہیں، پھر اس کتاب کے ہر ہر ورق پہ لکھی تحریر انہیں ازبر ہوتی ہے۔

وہ زینیا کے پہلو میں ٹکیں۔ ان کے پاس جو جمع پونجی تھی۔ بیٹی کی تعلیم پہ خرچ کر دی، برتنوں کے چند قیمتی سیٹ، چند نہایت نفیس جوڑے گلے کا لاکٹ فرنیچر میں بیڈ روم سیٹ اس کے علاوہ وہ جہیز میں کچھ نہیں دے سکی تھیں۔ بچھڑنے کا دکھ بھی نہیں تھا۔ بیٹی کون سا پردیس جا رہی تھی۔ پھر بھی ہر پل — اک ملال سا چھونے لگا تھا۔ انہوں نے بیٹی کی آنکھوں میں اک بزم سجتے دیکھی تھی، پھر اس بزم میں سے جیسے کوئی بہت اپنا چپکے سے اٹھ گیا تھا کہ اک جہان کے ہوتے بھی اب وہاں ویرانیاں تھیں۔ وہ جدائی کا دکھ سہ لیتیں بھلے بیٹی پردیس چلی جاتی، بس ان آنکھوں کی بزم آباد رہتی۔ انہیں آنکھوں سے دکھ چننے کا ہنر آتا تھا، مگر وہ تقدیر سے نہیں لڑ سکتی — نہ ہی وہ سادہ اوراق پہ لکھی تحریریں کسی بھی اسم سے مٹا سکتی

انہوں نے بیٹی کا مہندی سے سجا ہاتھ نرمی سے تھاما۔ "سانس روک لینے سے بھی وقت نہیں رکتا۔ زینو دل کو بہر حال کسی کے لیے بھی دھڑکنا پڑتا ہے۔" اس نے بیٹی کا ہاتھ اپنے خنک لبوں سے چوما۔

"مگر میں یہ بھی جانتی ہوں دل دھڑکنوں کی آبادی سے چلتے ہیں، بستے نہیں ہیں۔" انہوں نے زینیا کے چہرے سے آنچل سرکایا۔ جو آنسوؤں سے تر تھا۔ "جب ماں سہیلی بن جاتی ہے تو درد ستارہ بن جاتا ہے، پھر درد اندھیروں میں کہاں بھٹکتا ہے۔ میں نے ان تحریروں کو مٹانے کی ایک کوشش تو کی ہے نا۔"

"وہ بے آواز بولی، پھر مسکرائی...... ماں بھی مسکرائی...... "یہ اچھی عادت نہیں ہے زینی...... تکلیف پہ آہ بھر لیا کرتے ہیں۔" اس دن زینیا صفدر نے ماں کے گلے لگ کر اگلے پچھلے تمام دکھ رو دیے تھے۔

"بس انتظار آج آخری سانس بھی لے

چکا۔اس جوگی پکھیرو سے کہو کہ چوڑے تنے پہ جلتے چراغ کو پھونک کی ضرورت ہے کہ اب راہ نہیں دیکھنا۔اب اندھیرے کہاں تھے کہ درد ستارہ بن چکا تھا۔“ زینی نے ہنس کر مٹھی میں دبے چند سمٹے دانے ماں کی ہتھیلی پہ رکھے۔ ”مجھے اب جوگی سے دعا نہیں کروانی۔“

میں اب تائی کے بھرے کٹورے سے اناج اٹھا کے بنا کسی رشوت کے ڈالا کروں گی۔“ اس نے ماں سے کیا وعدہ پوری ایمان داری سے نبھایا، وہ اب بارش سے دھلا نوک دار پہاڑ تھی، جو بدلتی رتوں کی زد سے باہر تھا۔ جس پہ پگڈنڈیاں تھیں، نہ راستے، پھر کوئی کیوں کر آ سکتا تھا۔

☆☆☆

دادی سے بات کرنے سے قبل حسن علیم سے مشورہ لینا زیادہ بہتر تھا، سائب کی پوری گفتگو میں حسن کی ہوں، ہاں کا سلسلہ ”وہ رمشا کی خالہ زاد ہے۔“ ان چار الفاظ پہ منقطع ہوا تھا۔

”ہیلو...... ہیلو...... کیا ہوا؟“ کہ کال کٹی بھی نہیں تھی۔ مگر اس کا مخاطب کہیں گم ہو چکا تھا۔

”کچھ نہیں یار!“ گہری خاموشی کے بعد۔ حسن نے اپنی موجودگی کا ثبوت ان تین حروف کے ساتھ دیا۔ وہ مزید گویا ہوا۔

”کیا تم یقین کرو گے۔ سائب کہ خاموشی کے اس مختصر دورانیے میں الٹے قدموں چلتا حسن علیم کئی سال پہلے کا وقت کھنگال آیا ہے۔ جہاں کوئی میرے وقت سے نکل گیا تھا اور میری زندگی میں ہمیشہ رہا۔“ سائب نے انداز نشست بدلا اور سیل فون پہ خاصا کنٹرول کیا، جس کے ساتھ وہ خود بھی حیرت زدہ تھا۔

”کہیں حسن علیم نشے میں تو نہیں۔“ ذہن میں اک الارم سا بجا تو سائب کے ہاتھ ٹھنڈے اور اعصاب کشیدہ ہوئے۔

”انعام امیر۔“ اندازہ زبان کی نوک پہ چبھا۔

”جواب درست نہیں۔“ حسن جیسے سنبھل کے مسکرایا۔ ”جلد آؤں گا کہ مجھے بھی کوئی گتھی سلجھانا ہے۔ تاہم اپنی مہمان کو مسز فرہاد کے برابر کھڑا کرنے کے بجائے اس سے الگ کر کے دیکھو، کسی ایک انسان کا کردار اس کے پورے خاندان کی ترجمانی نہیں کر سکتا۔ دنیا اس امتیاز کی بنا پہ ہی قائم و دائم ہے اور پھر گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا میجر مجھ سے کہیں بہتر طور پر انسانوں کی پرکھ کر سکتا ہے۔“

حسن اسے اپنی سنا کر اسے خدا حافظ بھی کہہ چکا تو وہ چونک کے کچھ مطمئن ہوا۔

”اب تک تو اس خاتون کو گھور...... گھور کے جانے اس پہ کیا تاثر قائم کر چکا ہوں۔ پرکھ کی بھی حد ہوتی ہے۔“ وہ جیسے اپنی حرکت پہ ہنسا اور صوفے کی پشت سے سر ٹکایا ہی تھا کہ فون کی ٹیکسٹ ٹون بجی۔

”میں اپنی بوا سے بات کرتا ہوں، اس کی بہن گلگت میں ہوتی ہے۔“ حسن کے میسج نے اسے مزید ہلکا پھلکا سا کر دیا تھا۔ اس نے طمانیت بھرا سانس لیا۔

”حسن صاحب کی کون سی گتھی الجھی ہوئی ہے۔“ ذہن بار بار اس خیال سے الجھ رہا تھا۔ اس نے ٹیبل پر سے جیپ کی چابی اٹھائی، اس کا ارادہ اب شام تک ہی لوٹنے کا تھا۔ آج عابد کی حسینہ کی طبیعت خراب تھی۔ (بکری) عابد کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کے وہ زیر لب مسکرا دیا۔

☆☆☆

”سحر زدہ کیسے ہوتے ہیں۔“ اینا...... اس کیفیت سے آج آشنا ہوئی تھی۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے وقتاً فوقتاً کھڑکی میں چلی آتی۔ حد نگاہ خوب صورتی کا یہ عالم تھا۔

دوپہر سے ذرا پہلے اس نے سائب کو پورچ سے جیپ نکالتے دیکھا تھا اور جیپ کا موڑ کاٹنے سے قبل اس بندے کی تفتیشی آنکھیں لمحہ بھر کو کھڑکی کی جانب اٹھیں تو وہ گڑبڑا سی گئی' کیا وہ جالی میں سے نظر آ رہی تھی، جب کہ کمرے میں اندھیرا تھا۔ جیپ کے اوجھل ہونے کے بعد وہ باہر لان میں چلی آئی

تھی۔ عابد اپنی بکری کو کچھ کھلانے کی کوشش رہا تھا، جب کہ وہ سستی سے منہ مار رہی تھی۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ اس نے قریب جا کر پوچھا۔

”مجھے شک ہے، حکیم حیات کا پوتا اسے پھیپھڑے ڈال کے گیا ہے۔“ وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا۔ مگر اس کی توجہ سرگوشیاں کرتی پریوں کی وادی اپنی جانب کھینچ چکی تھی۔

تھوڑی دیر کی آوارہ گردی کے بعد وہ ایک ٹوٹے تنے پہ بیٹھ چکی تھی۔ اب اس کا سیل فون چارج ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سیل فون آن کیا۔ واٹس اپ پہ زینیا کے کئی میسجز تھے۔

”اس وقت کہاں ہو؟“ وہ اس سے رابطے کی منتظر تھی کہ فون آن ہوتے ہی تازہ ترین میسج آیا۔ وہ محبت سے مسکرا دی۔

ہائے...... یہ اپنے پیارے بھی کیا چیز ہوتے ہیں۔ ”میں اس وقت جہاں ہوں، وہاں پھیلا سکون بھی گفتگو کرتا ہے، کیا میں یہ سب جاگتی آنکھوں کے ساتھ محسوس کر رہی ہوں۔“ اس نے یہ جملے میسج کیے اور مزے سے مسکرائی۔

”انعام تم اس وقت یقیناً کسی چونگ لی کی آنکھوں پہ نظم لکھ رہی ہو۔“ زینیا کا جوابی میسج ایک حیران کن ایموجی کے ساتھ آیا تھا کہ مارچ کی اس مندی مندی سی دوپہر میں انعام کا ہلکا سا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ حالانکہ تمام رات آنکھ کھلنے پہ اس شخص کا ہتک آمیز لہجہ یاد آتا تو آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔

زید امیر کی بیٹی کو اب یہ دن دیکھنا ہی رہ گیا تھا۔ وہ ایک آہ بھر کے کھڑی ہوئی۔ جیسے بھی دنوں سے سامنا ہو قسمت کے ساتھ اس میں خدا کی مصلحت بھی ہوتی ہے، اسے چچی کی بات بروقت یاد آئی۔ فیصلہ کر لیا، آگے اللہ مالک ہے، ابھی اندر جا کے اسے اپنا سامان پیک کرنا تھا۔

☆☆☆

کل تک میری حسینہ کی طبیعت بحال نہ ہوئی تو دیکھیے گا۔ میں اس حکیم کے پوتے کا وہ حشر کروں گا۔“

مارے ضبط کے عابد کی آواز پھٹے ڈھول کی سی ہوئی۔ سائب نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی۔

”بہتر یہ ہی ہوگا کہ تم اس کا علاج خود کرنے کے بجائے صبح اس کا معائنہ کسی ڈاکٹر سے کرواؤ۔“ سائب نے مناسب لہجے میں نرمی سے بات کی کہ اب وقتاً فوقتاً یہ حسینہ نامہ جاری رہنا تھا۔ اس نے ٹیبل پہ پڑا چائے کا کپ اپنی جانب سرکایا۔ پھر سامنے کا منظر بے یقینی سے دیکھا کہ وہ مہمان لڑکی اپنے تمام سامان سمیت سٹنگ روم کے وسط میں کھڑی تھی۔

”آپ کو زحمت تو ہوگی، مگر پلیز مجھے چھوڑ آئیں۔“

وہ اک انوکھے احساس کے ساتھ چونکا، وہ لہجہ سپاٹ تھا نہ سنجیدہ، اس میں ناراضی کی جھلک تھی۔ گلے کی آمیزش تھی، جیسے کوئی دیرینہ دوست منہ پھلا کے شکوہ کناں ہو۔ نظر ملاتا ہوا۔ نظر چراتا ہوا...... کپ کی طرف بڑھتا اس کا ہاتھ ٹھہرا۔ اس نے ذرا سنبھل کے نگاہ پھیری، ممکن ہے کہیں کسی قریبی شہر میں کسی رشتہ دار یا تعلق دار سے اس کا رابطہ ہو چکا ہو۔

”او...... کے۔“ اس نے کپ اٹھایا...... اور چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے سرسری سا پوچھا۔

”آپ کو چھوڑنا کہاں ہے؟“ اس کے دماغ سے حسن کی الجھی گتھی بھی محو ہو چکی تھی۔

”کسی بھی سڑک پہ۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولی۔

آج نمی نہ آنکھوں میں تھی، نہ لہجے میں، مگر انداز میں تھی کہ گھر کا مالک صاحب اختیار ہوتا ہے۔ دل توکل اور تقویت سے بھر سا گیا۔

وہ بارہا ایسی تنگ و تاریک سرنگوں میں سفر کر چکا تھا کہ رگڑ سے جسم بے طرح چھل جاتا تھا اور اس کی جلن اور تکلیف بے تحاشا درد سے کہیں بڑھ کے ہوتی ہے' ابھی یہاں بیٹھے بیٹھے وہ شرمندگی کی

کسی ایسی ہی سرنگ سے گزرا۔ وہ لڑکی نئے راستے ڈھونڈنا جانتی تھی۔ گھر کے اندر بھی اور گھر سے باہر بھی اور اس پل اپنی ناراضی کا تاثر دیتے ہوئے وہ اس کی ہم سفر تھی۔

''عابد ان کا سامان اٹھاؤ۔'' شرمندگی اور حیرانی کے پل سمیٹتے ہوئے وہ کسی کیفیت سے نکلا اور بالکل سادہ سے لہجے میں کہا۔

عابد نے اپنے صاحب کو برے دل کے ساتھ دیکھا۔

انعام نے بیگ ذیلی دروازے کی جانب گھسیٹنا شروع کیا۔ وہ لڑکی بے وقوف تھی نہ بہادر، البتہ خود دار اور ضدی ضرور تھی۔

''عابد! سامان پکڑو۔'' وہ کڑے تیوروں سے کہتا کھڑا ہوا۔ ''اور واپس ان کے روم میں شفٹ کرو۔'' انعام نے جھٹکے سے رخ بدلا۔

''کل شام تک میں اس لڑکی کو کسی بھی سڑک پہ چھوڑ آؤں گا۔ کل آپا سے آپ نے کچھ ایسا ہی کہا تھا۔ انعام نے جیسے سامنے تن کر یاددہانی کروائی۔

''وہ میرا اور ان کا مسئلہ تھا۔'' وہ نرمی سے جواب دیتا اپنے بیڈروم کی جانب بڑھا۔ وہ جان بوجھ کے اسے دیکھنے سے گریز برت رہا تھا۔

''آپ دونوں کے مسئلے میں بار، بار مجھے اپنی انسلٹ گوارا نہیں۔''

وہ ٹھٹک کے رکا۔ وہ خوددار ہی نہیں سمجھ دار بھی تھی۔ وہ اس سے کیا عہد چاہتی تھی۔

''آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' وہ ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے بولا اور بیڈروم کا لاک کھولا کہ وہ اپنا بیڈروم کسی بھی مہمان کی موجودگی کے باعث لاکڈ رکھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس لڑکی کے یہاں ٹھہر جانے سے عابد کا موڈ بھی یقیناً خوش گوار ہو چکا ہوگا۔ اگر حسن علیم یہاں آنے کا ذکر نہ کرتا تو سائب نے کل کسی وقت یہاں سے کوچ کر جانا تھا۔

☆☆☆

''جناب آج پھر مووی لگا کر استراحت فرما رہے ہیں۔'' سائب نے کف فولڈ کرتے ہوئے بات عابد سے کی اور نگاہ کھلی کھڑکی سے باہر ڈالی، جہاں اختر بوا، پرندوں سے میٹھی میٹھی سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ اس نے بوجھل سی آہ بھر کے سر جھٹکا۔ عابد نے ایل سی ڈی فوری بند کی اور بلاوجہ مسکرایا۔

آج سائب خاصی دیر سے جاگا تھا۔ ''فٹافٹ اسٹرونگ سی چائے لے کر آؤ۔''

''آج میں لنچ جلدی کروں گا۔'' اس نے ٹیبل پر سے اخبار اٹھایا۔ معاً اس کا دھیان کچن میں ہونے والی کھٹ پٹ پر گیا

''آج پھر مہمان سے کام کروایا جا رہا ہے۔'' اس نے عابد کو گھورا۔ جو جواباً کھل کے ہنس دیا تھا۔ پھر پلٹ کے اس کی طرف آیا۔

''ویسے یہ خاصی عجیب بات ہے کہ دونوں مہمان خواتین کے نام اگرچہ مردانہ ہیں، مگر صد شکر کہ نکمی بالکل بھی نہیں۔ اب دیکھیں پچھلے چار دنوں سے میرے پرندوں اور جانوروں کی ڈیوٹی اختر بوا دے رہی ہیں اور میرا کچن اینا بی بی نے اپنے ذمے لے رکھا ہے کہ میں آج کل اچھے دنوں کی زد میں ہوں۔'' اس نے کھی کھی کی۔

تب ہی بیل ڈور بجی۔

''اور میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہا کہ پچھلے کچھ دنوں سے مجھ میں کون سے اخلاقی پر پرزے نکل آئے ہیں کہ آس پڑوس میں سے ایک آرہا ہے تو دوسرا جا رہا ہے۔'' سائب نے جھنجلا کے اخبار ٹیبل پہ پٹخا۔ مگر بے تحاشا مسکراتا عابد دروازہ کھولنے جا چکا تھا۔

''بابا! بابا!'' عطا صاحب کو دیکھ کے طوطا خوب چہکا۔ جس پہ عطا صاحب نے اسے قاتلانہ نگاہوں سے گھورا۔

''عابد! تمہارے ساون کو عینک کی ضرورت ہے۔'' انہوں نے جیسے کریلا نگلا تھا۔ ''لو...... خواہ مخواہ عابد کو یاد آیا کہ صاحب نے چائے کا آرڈر دیا تھا۔

''گلگت جانا ہوا تو سوچا میجر صاحب کے لیے

رسیلے سیب خریدنا چاہئیں۔''

عطا صاحب اک ادا سے مسکرائے۔ سائب نے انہیں ذرا غور سے دیکھا۔ کپڑے استری شدہ، بال اور مونچھیں کلف شدہ، مگر وہ صاحب دولت مند ہونے کے باوجود مکھی چوس ہونے کی بنا پہ ازل سے غیر شادی شدہ تھے۔

''عطا صاحب! آپ نے زحمت کی۔ میں ذرا کھٹے قسم کے سیب کھاتا ہوں۔'' وہ جبراً مسکرایا۔ اور اپنا ہی جملہ جیسے گلے پڑا۔

''لو...... یہ کون سی بڑی بات ہے، کل وہ بھی آجائیں گے۔''

جی......'' میجر صاحب گھوم سے گئے۔ ''مجھ غریب پہ کیوں دولت لٹائی جا رہی ہے۔''

''کیا حال ہیں عطا صاحب؟'' عطا صاحب کا احوال پوچھنے والی اپنی مہمان کو میجر صاحب نے استعجابیہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر حال سے بے حال اپنے پڑوسی کو اور تیسری نگاہ چور سے چہرے کے مسکراتے ملازم پہ ڈالی، جس نے اپنے مالک سے نگاہ ملانے سے شدید گریز برتا تھا۔

☆☆☆

آج وہ آفس سے کافی لیٹ گھر آئی تھی اور تائی جیسے اس کی منتظر تھیں کہ آج تائی کو کہیں تعزیت کے لیے جانا تھا اور تایا کی جمعراتیں قبرستان میں گزرتی تھیں، جانے وہ وہاں رہتے تھے یا پھر مست پڑے سوتے رہتے تھے۔ اس نے چادر تہ کر کے تائی کے بچھے تخت پہ رکھی اور کچن کی طرف بڑھی۔ اندر آتے ہی اس کی نگاہ مٹھائی کے فل سائز ڈبے پہ پڑی۔

''تو کیا...... بسمہ کی دعا سن لی گئی تھی۔'' وہ جم سی گئی، برف کی مانند، تو کیا بسمہ جوگی پہ کسی اللہ والے ہی کی طرح یقین رکھتی تھی، اس کے خون میں ابال سا اٹھا اور یہ جوگی...... اگلے ہی لمحے وہ پگھل چکی تھی، پل میں اترنے والے ٹھنڈے پسینے نے اس کی رگوں کو اندر تک چھوا کہ ایک مدت بعد دل کسی پرانے ملال سے اٹھتا دھواں سینچ کے دھڑکا تھا۔

وہ انہیں قدموں سے صحن میں واپس آئی اور اس نے قریب پڑے گملے سے مٹی کا سخت سا ڈھیلا اٹھایا اور اس پکھیرو کا نشانہ لے کر ہاتھ اوپر اٹھایا ہی تھا کہ وہ رک گئی۔ اسے یاد آیا، وہ ایک بار پہلے بھی ایسا کر چکی ہے۔ مگر تب وہ صحن میں نہیں۔ اوپر اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی اور نیچے تایا کے پورشن میں لڑکیاں ڈھولک پیٹ رہی تھیں۔

چٹا چولا سامب رکھا۔
(میں سفید جوڑا اب سنبھال کے رکھوں گی۔)
کیے تائیں ڈھولا تیری تانگ اکھساں۔
(محبوب آخر میں کب تک تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔)

''ایسا مت کرنا زینی۔'' اس کی ماں کا چہرہ ہی نہیں لہجہ بھی پیلا، زرد تھا۔ ''یہ پکھیرو کسی جوگیا نے دیس سے ہے، یہ درویش صفت ہے، ہر موسم کی دھوپ محبت کے ساتھ سینکتا ہے۔ کبھی بادل گھر آئیں تو بے چین ہو جاتا ہے۔ کبھی بارش ہو تو تنے کی کھوہ میں چھپ جاتا ہے اور محبت سے دھوپ سینکنے والے ہی دوزخ کی تپش سے پناہ مانگتے ہیں، یہ تو جوگی ہے جھلی۔''

اور زینیا نے آج بھی جیسے ہارتے ہوئے ہاتھ نیچے گرا لیا۔

جوگی نے دیکھا کہ ان ملال سینچتی آنکھوں میں اک قدیم گلہ آج مدت بعد پتوں پہ جمے پانی کی مانند سرک رہا تھا۔ آج وہ گھر خالی پا کر خاموش نہیں رہ سکی۔

''کیوں جوگی، میں نے بھی تو تجھے گڑ لگے دانے مٹھیوں بھر اور بے حساب کھلائے تھے۔ تیری یہ میلی کٹوری میں بھی شہد ملے پانی سے بھرتی تھی۔ پھر کیوں، دنیا تجھے میٹھے دانے ڈالتی ہے اور بامراد ہوتی ہے، مجھ پہ تو یہ بھید آج کھلا کہ تو میری دعائیں ان کنگال شاخوں پہ اور ان سوکھے تنوں پہ رکھتا تھا اور جب اوروں کی باری آتی تو چوٹی پہ جا کے تو اللہ کو پکارتا تھا۔'' اس کی بلند آواز بھرا گئی۔ ''تو چاہتا ہی

نہیں تھا کہ میں یہاں سے جاؤں۔“
جوگی نے ایک بے چین سی جھرجھری لی کہ ان رنگ برنگے پھڑ پھڑاتے پروں سے ایک بوجھ سا جھٹکا۔
”میرے اور تیرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، محبوب کے انتظار کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ زینی! قسمت اور مقدر اس حد سے باہر ہمیں گھیر لیتے ہیں اور انتظار اس حد کے اندر یہیں تکتے تھک جاتا ہے۔“ آج جوگی نے بھی زینی کی تپتی سلگتی آنکھوں کو جی بھر کے دیکھا تھا۔
اے نگاہ عشق حصار سن ...... مجھے دائروں کی طلب نہیں، اس نے ایک گول پھیری لی۔ مجھے دائروں کی طلب نہیں۔ اس نے ایک وجد بھرا چکر ......کاٹا ...... اے بندے تو دائروں کا (مطلوب) ہے۔ تو بندھن، بندھن کھیلنا چاہتا ہے۔ میں ایک ادنی پرندہ ...... نہ توڑنے والا نہ جوڑنے والا۔ میں تو تیرے ڈالے دانوں کا ذائقہ بھول جاتا ہوں۔ مگر تیرے گڑ لگے دانوں کا گڑ جب تیری ہتھیلی کا لمس چکھتا ہے تو ہتھیلوں میں دبی دعائیں تو تجھے فقیر کر دیتی ہیں۔ پھر تو مانگتا ہے مجھ سے۔“ ”کبھی اس سے۔“ جوگی کی نگاہ آسمان کی جانب اٹھی۔ ”اور فقیر کی طلب دائرے ۔ نہیں ہوتے۔ قیام نہیں ہوتا۔“
آج زینی کے شکوے نے اس پر کوئی اور ہی رنگ چڑھا جاتا تھا۔
ندرت پھوپھی کہتی ہیں یہ پکھیرو درلیش ہے۔
بسمہ میٹھا دانہ اچھالتی۔
”میری مراد پوری ہوگی۔“ وہ مزید کئی دانے اچھالتی ......
”وہ مجھے مل جائے گا......“
جوگی چونکا۔ ”کون ...... کیا کوئی انسان“ بسمہ باقی دانے عقیدت کے ساتھ تنے پر رکھ دیتی۔
”وہ بسمہ کو مل گیا ہے جوگی۔“
اب اس نے پکھیرو کو اپنی بات کا پتھر مارا تھا۔ اور دوبارہ کچن کی جانب بڑھی وہ مٹھائی کسی کی مراد بر آنے کی تھی۔ اس نے پیکنگ پھاڑی ...... یہ مٹھائی کوئی عام سی نہیں تھی ...... زینی نے اسے محبت سے چکھا۔ پھر جانے کیا سوچ کے ذرا سا میٹھا مٹھی میں رکھا ...... اور مدت بعد رکھا تھا ...... حاصل ...... نہ لا حاصل ہر خواہش جیسے قبروں میں جا سوئی تھی بس ہتھیلی پہ مٹھائی چپکی تھی کہ آج مٹھی میں کوئی دعا جو نہیں تھی۔ وہ صحن میں لگے بیسن کی طرف آئی اور دیوار پر لگے شیشے میں تا دیر اپنی ہی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔
اے نگاہ عشق حصار سن مجھے دائروں کی طلب نہیں۔“ اس نے پانی بہایا اور میٹھا دھو دیا۔ ”پگلی یہاں انسانوں کا تو شمار ہی نہیں“۔ جوگی نے آنکھیں موندیں۔
فقیر تو کوئی ہی ہوتا ہے۔

★ ★ ★

”اینا بی بی آج آپ کی ایک اور فرینڈ شپ ریکویسٹ آئی ہے۔“ عابد نے سامان سے بھرے شاپرز کچن کاؤنٹر پر رکھے اور ساون کو بسکٹ کھلاتی انعام کے پاس لپک کے آیا ...... کچن ایریا کی جانب بڑھتا سائب حیران ہوا۔ عابد اس لڑکی کا سیل فون کیونکہ چیک کرتا ہے۔
”کل بھی تم نے خبر اڑائی تھی کہ تین فرینڈ شپ ریکویسٹ آئی ہیں۔ میں نے فوری چیک کیا مگر کچھ نہیں تھا۔ اور مجھے تم سے پوچھنا یاد نہیں رہا۔ کہ تم میرا سیل فون کب چیک کرتے ہو؟“ وہ اس کی جانب رخ پھیرتے ہوئے سنجیدہ ہوئی۔ وہ سوال سائب کے حسب خیال تھا' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی انعام کو دیکھا جو کس قدر مناسب لہجے میں بات کرتی تھی وہ بوا اختر ہوتیں۔ یا پھر عابد ...... یا پھر وادی کا کوئی بھی بڈھا کھوسٹ اور وہ عطا صاحب ...... سائب کے مزاج میں نمک کی کان سی گھلی۔ ”توبہ کریں جی ...... میری اس طرح کی عادت نہیں۔“ عابد نے خاصا برا سا منہ کیا۔ گویا اینا کی بات کا اس نے برا مانا تھا۔ مگر اگلے ہی پل وہ مسکرایا۔
”یہ فرینڈ شپ ریکویسٹ تو میں زبانی کلامی لے کر آتا ہوں۔“
لیجیے فیس بک جائے کھوہ میں۔

اینا بڑبڑائی اور عابد کا فخریہ چہرہ۔ پوری آنکھیں پھیلا کے دیکھا۔
”یعنی کہ اس وادی میں یہ کام بنا فیس بک کے ...... مطلب ......“ اب وہ کیا بولتی۔
”پہلے کا تو پتا نہیں مگر آج کل“۔ عابد نے سلطان راہی کی طرح اترا کے رخ بدلا' وہ گنگ ہوا ...... اور اپنے مگر کا اگلا حصہ اب اسے بنا کفن کے ہی دفنانا تھا۔ وہ اپنے صاحب کے تاثرات سے اخذ کر چکا تھا اس کی پوری گفتگو ملاحظہ ہو چکی ہے۔“
”دراصل وہ تو یہ کام ہوا کی لہروں پہ ہی مطلب وائے فائے آن کر کے ...... مگر ...... انہیں ...... انعام ...... امیر کے اسپلنگو۔“ وہ گڑبڑایا۔ عابد اس لمحے سبزی والے شاپر کے اندر ڈوب مرنا آسان سمجھ رہا تھا۔ اینا نے اپنی آنکھوں کا رخ محسوس کیا کہ وہ سائب کو ہی تکے جا رہی تھی کیا وہ مسکراہٹ ضبط کر رہا تھا۔ کیا وہ واقعی سنجیدہ تھا۔ ...... کیا وہ غصے میں تھا اس قدر ملے جلے تاثرات' وہ ابھی مسکرا دے گا یا چپ چاپ واپس مڑ جائے گا۔ اس چہرے کو سمجھنا آسان نہیں تھا کہ اینا نے بھی ایک مشکل سی آہ بھر کے نظر ہٹالی۔ تو سائب نے اسے لمحہ بھر کو دیکھا۔
اینا کے چہرے پر محتاط سی مسکراہٹ رینگ کے ساکت ہوئی۔ وہ چار قدم آگے بڑھا۔ اور گیان میں اترے ملازم سے مخاطب ہوا۔ ”اپنی زبان اور کانوں کے بجائے ہاتھ زیادہ ایکٹو رکھا کرو۔
اب بہت ہو چکا، اختر بوا سے بھی کہہ دیجیے گا اور آپ بھی ۔“ وہ ذرا سا ترچھا ہو کے انعام سے مخاطب ہوا......
”پلیز کچن کی ذمہ داریاں اسے ہی سنبھالنے دیں۔“
لہجے نے اچانک رنگ بدلا اور نرم سی التجا کی ...... وہ شخص کیا چیز تھا ایک جملے میں ہزار تاثر دیتا اور ہر تاثر دیکھنے لائق ہوتا اور فرصت سے دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے۔
”اسے اب انسانوں کی جون میں واپس آ جانا چاہیے' یہ کبوتروں والے کام شروع کر چکا ہے۔“ عابد کا چہرہ مارے خجالت کے سرخ ہوا ...... اور اینا نے مسکراہٹ لبوں میں ہی سمیٹ لی تھی ...... وہ چاہے اپنے مخاطب پر پتھر مارتا تھا یا پھول برساتا پھر اس کی حالت ٹھہر کے دیکھنے کا عادی نہیں تھا۔ اینا کو یہاں آئے ہفتہ ہو چلا تھا۔ اتنا تو وہ جان چکی تھی کہ وہ پلٹ کے دیکھنے کا عادی بھی نہیں تھا۔ وہ اس شخص کی ممنون تھی بلکہ تہ دل سے عزت بھی کرتی تھی کہ وہ ایک مہذب اور قابل عزت انسان تھا تب ہی تو اسے دوسروں کی عزت اور ریپوٹیشن عزیز تھی ورنہ انعام امیر اس کی کون تھی۔
محض عورت ذات کا سوچتے ہوئے اس نے جس طرح فی الفور اختر بوا کا انتظام کیا تھا تو انعام نے اس کے اس عمل کو اپنی عزت افزائی گردانا تھا۔ ورنہ دوسری صورت میں بھی وقت تو کٹ ہی جاتا۔ وہ اگر اس سے بے تکلیف نہیں تھی تو ان کے درمیان پہلے جیسا کلف اور اجنبیت بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

”آپ یقیناً انعام امیر ہیں۔“ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ کتنی ہی دیر تک اس پر سے نگاہ نہیں ہٹا سکا تھا۔ اور سائب' حسن کی اس کیفیت پر پہلو تک نہیں بدل سکا تھا۔ اینا میں ایسا کون سا شہر آباد تھا۔ کہ وہ اجنبی آنکھیں کسی نا معلوم گھر میں کسی بہت اپنے کو تلاش رہی تھیں۔ اور حسن علیم ایک ایسی ہستی تھی جس سے ملنے کے بعد اس کے احساسات ہر دو گام چلنے کے بعد رنگ بدل لیتے تھے۔ ہر دو گام کے بعد وہ ایک نئے موسم سے آشنا ہوتی۔ اف اس قدر دل آویز چہرہ ...... نہیں نہایت باوقار شخصیت ...... یوں اپنا سا بندہ' جیسے اجنبیت تو کبھی تھی ہی نہیں۔ وہ اپنے اندازے تعمیر کرتی۔ ادھر مسمار کرتی۔
”اس کا لہجہ اچھا ہے یا پھر وہ تذکرے ہی خوبصورت کرتا ہے......“
اس قدر خشک سا قصہ بھی وہ الفاظ چھو کے بھیگ سا جاتا ہے ...... ان دونوں نے ایک ہی دن

میں سالوں کی باتیں کرڈالیں اور اس ایک دن میں سائب سالوں جتنا حیران ہوا تھا۔

یہ لڑکی کس قدر باتونی ثابت ہوئی تھی۔ اس دن سائب نے انعام امیر کو محتاط سا ہو کے کئی بار دیکھا اور بلاوجہ دیکھا...... وہ سائب کے لئے بالکل نیا تجربہ تھا‘ مکمل اجنبی۔ حسن علیم اور اینا جیسے مدتوں کے بچھڑے ملے تھے پھول، بادل، ساون، گیت، ہجرت سیاست، ثقافت، کون سا موضوع تھا جو انہوں نے ڈسکس نہیں کیا ہوگا۔ دن ڈھلا اور رات بھی ہوگئی۔ سائب‘ حسن کو دیکھتا اور دیکھتا ہی جاتا۔ رہ گئی اس کی بات، کتنی ہی باتوں کے بعد......

اس کے دوست پر یہ کڑا وقت تھا کہ وجود جس کے ذکر کا ورد کررہا تھا۔ وہ ذکر چھیڑنا آسان نہیں تھا۔ اس کا دوست گفتگو کے جنگل میں بھٹکتے بھٹکتے اب تھک سا گیا تھا۔

ڈنر کے بعد وہ تینوں کافی کے مگ لیے لاؤنج میں آگئے...... وادی میں اچانک بارش ہونے لگی تھی۔

”کھانا اچھا بنالیتی ہو۔“

حسن کی تعریف پر وہ اپنا نچلا لب دبا کے متعجب سی ہوئی۔

”میں عابد کے ہاتھ کا ذائقہ جانتا ہوں۔“ وہ گمان کے جیسا مسکرایا۔ ”رمشا فرہاد تم لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔“

وہ اچانک اپنے موضوع پر آیا۔ دانستہ ان سے ہٹ کے بیٹھے میجر صاحب کی سماعتیں ادھر ہی متوجہ تھیں۔

”بالکل......“ اینا اس سے فوری متفق ہوئی۔

”مگر ہماری مجبوری ہے کہ کراچی میں ہمارا اور کوئی رشتہ دار نہیں رہتا...... اور رمشا آپا کو ہمیں مجبوراً برداشت کرنا پڑتا ہے۔“

اینا کی صاف گوئی پہ دونوں مرد مسکرائے تھے۔

”مجھے ایک اجنبی جگہ پر چھوڑ کے انہوں نے پلٹ کے خبر تک نہیں لی...... یہ سفر میری زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔“

اس نے یہ جملہ جیسے لبوں میں ادا کیا جو تیز ہوتی بارش کے باعث بھی سن لیا گیا تھا۔ اب کے اس کی جانب اٹھنے والی نگاہ میں احتیاط نہیں۔ سمجھنے کی ایک کوشش تھی۔

”زینیا صفدر نے جاب شادی کے بعد اسٹارٹ کی ہوگی......“

حسن کی دھیمی آواز میں درآتے نام نے...... بارش کے شور کو بے طرح مات دی تھی۔ سائب نے تیزی سے گہرے سانس لیے اور اینا حسن کی جانب اٹھتی اپنی نگاہ کے حال سے بے حال سی ہوئی۔

اس نے ایک عام سی بات پوچھی تھی۔ وہ فرہاد کا فرسٹ کزن تھا زینیا کچھ عرصہ فرہاد کے گھر رہی تھی‘ حسن یقیناً اس سے ملا ہوگا۔ چونکنے کی کیا بات تھی...... زینیا صفدر اسے ابھی تک یاد تھی۔

”شادی کے بعد تو نہیں مگر اپنے ہزبینڈ کی وفات کے بعد جاب کرنا اس کی مجبوری تھی۔“

وہ تلخی سے مسکرائی۔ سائب نے اپنے فون کی روشن اسکرین سے نگاہ ہٹا کے اسے دیکھا...... اینا نے ادھوری گفتگو میں آدھا میسج چھپالیا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھے اجنبی کے چہرے پر سیاہ تاریکی چھا چکی تھی...... اینا کے دل نے قلابازیاں کھائیں...... وہ ششدر ہوئی۔ کہ ہر بات سمجھ میں آچکی تھی۔ کہ کیوں اس شخص کی نگاہ شہر تلاشنے جیسی تھی۔ وہ نامعلوم شہر...... وہ گمشدہ نہیں...... اب اس نے سارے پتے پالیے تھے تو جیسے خود گم ہوچکا تھا۔ بالکل ان کے درخت پر مقیم...... جوگی کی طرح...... باخبری کے بیابان میں کھڑا...... استفسار یہ سا سوالیہ سا۔ کہ کچھ اور کہو...... پھر کوئی نام لو، اینا نے نگاہ جھکائی۔

”میری چچی یعنی زینیا کی ماں ایک دور اندیش عورت تھیں۔ انہیں عورت کی ذات میں...... مایوسی اور خزاں پسند نہیں تھی وہ کہتی تھیں عورت شہرزادت میں فلک بوس ارادوں کی ملکہ ہے‘ وہ فلک بوس موسموں پر حکومت کرتی ہے۔“ سائب نے اسے تمام تر دھیان کے ساتھ دیکھا۔ جو شہرزادت کے

موسموں پر حکومت کرتی تھی...... وہ پیلے درختوں کے سایوں تلے ستانے والی لڑکی نہیں تھی۔ وہ اپنی چال میں ماہ بہار کی ہوا سمیٹے چلتی تھی۔

”مگر عطیہ چچی بیٹی کا مقدر تو نہیں لکھ سکتی تھیں۔ جو آج بھی تنہا ہے۔“ اس نے مسکرانے کی کوشش تک نہیں کی تھی۔

”زینیا کی فیملی؟“ حسن کے لہجے میں بے تابی تھی وہ کیا کچھ نہیں جان لینا چاہتا تھا۔

”بیٹی کی بیوگی کے بعد چچی دل کے مرض میں ہی ایک روز چل بسیں۔ اور پردیس میں بیٹھے بھائی نے بہن کو فون پر ہی پرسہ دیا تھا۔ اپنی ساس اور سسر کے پاس ہی رہتی ہے کہ ہمیشہ سے وہی گھر اس کا میکہ بھی تھا اور سسرال بھی۔“ اینا خاموش ہوئی...... بارش بھی خاموش ہوئی...... وقت گویائی خول ہوا...... دن بھر کے آوارگی کے بعد......ضبط کی کڑی، دھوپ جھیلنے کے بعد...... اب رات بھی کانچ کی سی ہوچکی تھی۔

حسن علیم کی سانس کئی حصوں میں بٹ کر لبوں سے ادا ہوئی...... اینا نے بکھری نگاہ سمیٹی...... پھر اٹھائی...... اسے بغور دیکھا...... جو سانس کے حصے جوڑ رہا تھا۔ وہ پھر سے سفر کرسکتا تھا۔

”میں آپ کو زینیا صفدر کا ایڈریس دے سکتی ہوں۔ جو شاید ماضی میں آپ سے گم ہوگیا تھا۔“

کیا وہ دن بھر چلنے کے بعد کسی سائے تلے آ گیا تھا؟ کیا وہ بارش میں کھڑا تھا۔

”اگر ایڈریس ہوتا تو کیا حسن علیم دل پر نہ لکھتا۔“

اس نے اینا کے لہجے کی کاٹ سے گلہ کیا۔ اور شکوہ کناں ہوا......

”میں نے اس سے کہا تھا میں جلد اپنے پیرنٹس کے ساتھ آؤں گا...... تو کیا میں نہ جاتا...... میں زینیا سے اپنا انتظار کرنے کو کہتا...... اور نہ جاتا کیا یہ ممکن تھا۔“

حسن کے لہجے کی بے بسی اور حزن...... سائب کے لیے عجب صورت حال تھی کہ کئی چہرے آنکھوں بھائے مگر محبت نامی بلا سے اس کا اب تک واسطہ نہیں پڑا تھا......

وہ آواز دھیمی تھی مگر سوال کرتے الفاظ...... برس ہا برس کے دھوپ زدہ تھے۔ وہ پٹر پٹر حسن کی کھلی آنکھوں میں تکے جارہی تھی۔ جیسے سورج سے نگاہ ملا لی ہو۔ کہ آنکھیں چندھیا سی گئیں...... پھر اس کے انداز میں کھنچاؤ لے آیا۔ موڈ لمحوں میں بدلا۔ کہ اب کڑی دھوپ میں وہ خود کھڑی تھی۔

”آپ نے یقیناً زینیا کے گھر کا اتا پتا۔ رمشا فرہاد سے طلب کیا ہوگا۔ کہ جس کے لگژری گھر میں آپا کا کمرہ‘ انعام کا بیڈروم ہے جو ہمارے ہم رنگ ڈریسز بھی زیب تن کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہے اور کبھی اتفاقیہ ایسا ہوجائے تو اپنا قیمتی لباس فوری تبدیل کرلیتی ہے...... جس کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر اچھی چیز...... اور ہر بہترین مرد صرف رمشا ستار ڈیزروو کرتی ہے۔ وہ عورت کیا حسن کی انگلی پکڑ کے زینیا کی گلی کی نشان دہی کرتی...... ناممکن......“ وہ استہزاء سے ہنسی......

”محبت ہوگئی اور محبوب کی گلیوں کی خاک چھاننے بنا...... دعوے دار بھی بن بیٹھے کہ یہی عشق ہے...... میں اسے محبت نہیں مانتی......“

وہ اب صحرا...... سا ہنسی، سائب نے گھبرا کر پہلو بدلا...... یہ لڑکی کیسے کیسے راستوں پر بے سوچے سمجھے چل پڑی تھی‘ اب وہ اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

”اس کے شہر میں درجن بھر جوتے گھسانے کا...... اور وہ گلیاں ڈھونڈنے کا آپ میں حوصلہ نہیں تھا تو اتنا کام ہی کرلیتے کہ زینیا سے خود...... اتا پتا مانگتے۔“

کیا تمتماتا انداز...... اور کیا تنتناتا لہجہ تھا...... سرخ چہرے کے ساتھ محبت کے سبق پڑھاتی لڑکی نے اس سفر زدہ شخص کی راہ پر آکے جیسے دم لیا تھا۔ سانس بحال کی تھی۔ وہ اب حدود دل کو چھورہی تھی۔

☆☆☆

ندرت کی نگاہ زید کے کٹے پھٹے داغ زدہ تلووں پر پڑی...... جیسے وہ نوکیلے پتھروں پر ننگے

پاؤں چلتا ہو۔ کبھی یہ انسان خود کو کس قدر مکمل سمجھتا تھا' ذرا سی خامی بھی برداشت سے باہر ہوتی تھی۔ ہر وقت بنا ٹھنا۔ محلے کی مسجد کا وہ پکا نمازی جو حقوق خدا کے سوا بندوں کا کوئی ایک حق بھی خوش اسلوبی سے نہ نبھاتا ہوگا۔

"دیکھو' یہ کف پہ داغ ہے۔" وہ ان کے سامنے جم جاتا۔

"کہاں؟" وہ غور سے دیکھتیں۔

"اچھا یہ...... مجھے غور کرنے پر نظر آیا ہے۔ زید صاحب! پھر لوگ کہاں باریک بینی سے......" ابھی بات ان کے منہ میں ہوتی کہ وہ بول اٹھتا۔

"مگر میں تو علم رکھتا ہوں کہ کہیں داغ ہے۔"

اچھی بھلی شکل کا مالک زید امیر بھی ندرت کے لیے اور بھی بہت سوں کے لیے کبھی اچھے لہجے میں، اچھے انداز میں بات کرنے کا روادار نہ ہوا...... ندرت کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ شادی کے بعد شوہر سے گفتگو کرتے ہوئے کبھی وہ اپنا جملہ مکمل کر پائی ہوں۔

"کپڑے کے داغ کا علم ہے اور اپنی خامیوں کی خبر نہیں۔"

وہ کمرے میں آکے بڑبڑاتیں...... تو اکمل بے ساختہ ہنس دیتا۔

"کام سے سیدھا گھر آتے ہیں نہ نشہ، نہ چوری...... نہ عیاشی، بابا میں خامیاں کہاں ہیں اماں!" مسکرا کے کہتا اور پس در پردہ وضاحت بھی چاہتا تھا۔

"جنہیں تم گن رہے ہو' یہ خامیاں نہیں تباہیاں ہوتی ہیں۔ انسان اپنی ہی ذات اور کردار اپنے ہاتھوں سے خسارے کے سپرد کرتا ہے۔"

فالسے ٹھنڈے میٹھے فالسے' خربوزہ کھنڈا بھر لے لو......"

پھل والے نے ہانک لگائی ان کے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھٹاک سے کھلا تھا۔

"جب تمہیں پتا ہے کہ اس گلی میں تمہارے پھل کسی نے نہیں خریدنا...... تو کسی کو دو گھڑی آرام کا موقع دے دیا کرو۔"

اف زید صاحب کی کرخت آواز دو چار گھروں نے تو ضرور ہی سنی ہوگی۔"

ندرت نے نگاہ چُراتے بیٹے پر جتاتی سی نظر ڈالی...... جو فوری صحن میں آیا...... اکمل کو اپنی چچی کی گفتگو پسند تھی جو اس وقت بھی بابا کے سامنے کھڑی تھیں۔

"زید صاحب! کیا یہ تکبّر کے زمرے میں نہیں آتا۔ پھل بے شک نہ خریدیں مگر رزق حلال کمانے والے کی بے عزّتی بھی مت کریں۔ آنے والے وقت سے ڈرنے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں مگر آخر وہی کامیاب ہوتے ہیں۔"

"جانے عطیہ کو زید سے ڈر کیوں محسوس نہیں ہوتا۔" ندرت انہیں رشک سے دیکھتی تھیں۔

زید اپنی بھاوج کی چڑھی پیشانی اور سخت نگاہوں کو دیکھتا رہ جاتا۔ اب دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

"پتا نہیں ان عورتوں کو گھر میں کیوں چین نہیں آتا۔"

ندرت کا رنگ فق ہوا۔ انہوں نے گیٹ کی درز سے دیکھ لیا تھا کہ دوسری جانب گلی میں ان کی بہن کھڑی تھی۔ اور اس نے بہنوئی کا تبصرہ بخوبی سن لیا تھا۔

"خدا تو ہی ہے شان والا...... بندہ انسان کو انسان ہی سمجھ لے تو بڑی بات ہے۔" عطیہ بڑبڑاتی ہوئی اوپری سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

"یہ تایا کو کیا ہوا ہے' دو چار روز سے بہت چپ چپ سے ہیں۔" ندرت کو چائے کا کپ تھماتے ہوئے زینی نے سرگوشی میں پوچھا۔

"شاید اپنے پاؤں کے داغوں پر نظر پڑ گئی ہو۔"

تائی کے گم صم سے انداز اور اس تلخ سے جواب پر اسے رنج سا ہوا۔

"پاؤں کے داغ ٹیس نہ دیتے ہوں تو ان پر

کون دھیان دیتا ہے' پھر پاؤں کے داغ ہر زمین کو کہاں چومتے ہیں' کسی درگاہ کا صحن، مسجد کا احاطہ...... سسی کا تھل، روہی کی مٹی اور حال کو بھول کر فنا کا ہاتھ تھام کر بے حال راستوں پر کسی بچھڑ گئے پیارے ہجر میں دھمال ڈالتے زید امیر جیسے ان داغوں کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ یہ داغ نرم اور قیمتی قالینوں کو اپنی کہانیوں سے، اپنے حال سے بے خبر رکھتے ہیں اور اللہ جسے چاہتا ہے اسے ہی خود سے قریب کرتا ہے اسے ہی دنیا سے دور کرتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد زینیا اپنی نرم انگلیوں سے زید امیر کے پاؤں کا مساج کر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ جیسے گہری نیند سے جاگا تھا...... اس نرم مساج میں سکون نہیں محبت تھی...... اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگے۔

"جب میں نے اسے پہلی بار درخت پر بیٹھے دیکھا تو یہ چڑیا کے نومولود بچے جتنا تھا...... اس کے ساتھ ایک مادہ بھی تھی۔ جانے یہ راستہ بھٹک کے آئے تھے یا ہجرت زدہ تھے کچھ دنوں بعد وہ مادہ تو اڑ گئی۔ شاید قبیلہ ڈھونڈنے گئی یا پھر جوگی کو ہی ٹھکانا دینے آئی تھی۔ بھئی کسی نے ایسا پکھیرو دیکھا ہوگا کبھی ڈھیروں رنگ تو کبھی یک رنگ۔"

آج وہ زندگی میں پہلی بار ندرت کی طرح اس پکھیرو کو تکے جا رہے تھے۔ جسے ان کی بھاوج جوگی کہتی تھیں۔

"یہ ڈار سے بچھڑ گئے ہوں گے دو آئے تھے' پھر یہ اکیلا رہ گیا۔ سو وقت نے اسے سکھا دیا۔ درد نے چپکا دیا جوگی بن گیا۔"

اور وہ خود...... وہ کیوں روتے تھے ندرت سے بیٹا بچھڑا تھا۔ انعام کا واحد رشتہ ختم ہو گیا۔ اور زینی...... اس کے پاس کیا تھا۔ وہ تینوں عورتیں جی رہی تھیں۔ زندگی کا ہاتھ تھامے چل رہی تھیں وقت کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں۔ خواب تو ان کے بھی ٹوٹے تھے...... اور...... زینی۔

"تو چاہتا ہی نہیں تھا کہ میں یہاں سے جاؤں۔" پچھلے چار روز سے یہ ایک جملہ ان کے کانوں میں گونجتا تو وہ اک انوکھی سی سانس لیتے۔ اس جمعرات کو گھر کے دروازے پر دستک دیتا ان کا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا تھا۔ زینیا کا مخاطب جوگی پرندہ تھا۔

"تو میری دعائیں ان کنگال شاخوں پر اور ان سوکھے تنوں پر رکھتا تھا۔"

دعائیں تو زینی کی بھی پوری نہیں ہوئی تھیں...... مگر وہ ایک کمزور عورت ہو کے بھی مسلمان ہی رہی...... وہ پچھلے چار روز سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی نماز میں ویسی ہی محبت تھی وہ اب بھی جوگی کو دانہ ڈالتی تھی وہ ایک مضبوط مرد ہو کر بھی بھٹک چکے تھے۔ وہ تکبّر کے مارے۔ اپنے ارادوں کی ٹوٹی کرچیاں سگریٹوں میں بھر کے پی رہے تھے وہ اگر "میں" جیسی بیماری کے مریض نہ ہوتے تو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے خدا کو پہچان لیتے۔ پھر میں اکمل کا جوگ کاٹتا...... اس کی بخشش کی دعائیں مانگتا۔

وہ اکمل کو کب روتے تھے وہ تو آج بھی خود کو رو رہے تھے۔ وہ آج بھی زید امیر کو روتے تھے حسن کا وجود نشے کے دھوئیں میں گم ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

"آج وادی میں دھوپ جیسے چراغ لے کر اتری ہے...... اُف......" وہ سٹنگ روم سے ملحق اس باؤنڈری نما رہداری میں آئی جس میں کچن کا دروازہ کھلتا تھا......

وہ کچن میں تھا، اسے دھوپ کی شکایت لگاتی وہ آواز اچھی لگ رہی تھی۔

"اور تمہیں حیرت کی بات بتاؤں۔ آج کم گو سی بوا بھی جیسے بولنے کے موڈ میں تھیں۔ یونہی سا پوچھ لیا کہ گزرے وقت کی کوئی اچھی سی بات بتائیں۔ اللہ اللہ بوا کے پاس اس قدر نایاب باتیں کہ میں تو حیران رہ گئی۔"

وہ چونکا...... کیا وہ اس سے مخاطب تھی۔

"عابد! چائے بنا رہے ہو تو ایک کپ پلیز میرے لیے بھی......" اس نے کچن میں عابد کی

موجودگی محسوس کرتے ہوئے کہا...... تو سائب کے چہرے پر دھوپ کے جیسی ہی مسکراہٹ چمکی۔ کہ اینا کا رخ کچن کی جانب ہی تھا۔

"اینا، اینا!" وہ ساون کی پکار پر ٹھہر گئی۔

"تمہارا ساون بڑا ہی ہرجائی ہے عابد! تمہارے عطا صاحب...... بابو...... اور تاثیر کی طرح دل پھینک۔"

اس نے ہنستے ہوئے جیسے اپنی ہی بات کو انجوائے کیا...... اندر کھڑے میجر صاحب کے دل میں، چائے کی کھولن جتنا ہی ابال اٹھا تھا...... وہ پلٹ کر پنجرے کے پاس آئی۔

"پہلے صاحب صاحب کرتا تھا اور اب مجھ پر لٹو ہو چکا ہے"۔ اوہ، اوہ...... کی آواز کے ساتھ اس نے ساون کو چھیڑا تھا...... کسی کی ٹھنڈی آہ نے کھولتی چائے کے بھی چھکے چھڑائے۔

"یہ آوارہ اس قدر پیار سے جب، اینا کہتا ہے تو پنجرے کے پاس ٹھہرنا ہی پڑتا ہے......" بقول انعام کے وہ دھوپ جھیل کے آئی تھی مگر اس کا موڈ چنچل ہوا کی طرح ہو رہا تھا۔

"ایک بات تو بتاؤ...... تمہارے میجر صاحب نے اب تک شادی کیوں نہیں کی...... اور ان کی فیملی کہاں ہوتی ہے۔"

"صاحب! صاحب!" ساون کی پر بہار چہچہاہٹ پر وہ حیران ہوئی پھر پلٹ کے دیکھا۔ حیران در حیران...... دونوں ہاتھوں میں چائے کے کپ لیے وہ اس سے چند قدم پیچھے تھا۔ اس لڑکی کی مسکراہٹ اور ہنسی کا تاثر بجائے سماعتوں کے جیسے آنکھوں نے مقید کر لیا تھا۔

آج وادی پر اترے دھوپ کے چراغ بھی جیسے ان آنکھوں میں اتر آئے تھے۔

وہ پورے وجود سے ٹھٹکا۔ وہ پلکیں کیونکہ جھک گئی تھیں۔ کیا ان آنکھوں کی کسی سرگوشی نے وہ محبت نامہ پڑھا تھا۔ کیا بھید کھل چکا تھا۔ وہ بے چین ہوا۔ اور' چائے کے دونوں کپ لیے آگے بڑھ گیا......

اس کے سفر کی شرط ہی راستے بدلنا تھا۔ وہ اس لڑکی کے پاس صدیوں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ وہ اس شخص کے پیچھے کب آئی تھی' وہ تو دھیمے قدموں کے ساتھ...... اپنی چائے کے کپ کے لیے آئی تھی......

سائب کو اب اپنی سانس کو سمیٹنے کی' جوڑنے کی عادت ہو چکی تھی۔ وہ اب پرسکون تھا۔

"آپ پھر شکایت کریں گی کہ میں نے تو یونہی سا پوچھ لیا تھا۔ اور سائب نے یوں داستان حیات سنائی کہ اب سر درد چائے کا طالب ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا جو چائے کا کپ اٹھا چکی تھی۔ وہ کچھ جھینپ کے پیچھے ہوئی......

"میری فیملی کوئٹہ میں ہوتی ہے۔" اس ایک جملے کے بعد وہ گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگا۔

"وہاں تو صرف آپ کی دادی رہتی ہیں۔"

اس نے تیزی سے کہا...... سائب نے اسے نظر اٹھا کے دیکھا......

وہ اس کے سامنے سوالیہ انداز لیے کئی وضاحتوں کی طالب تھی۔

سائب نے نگاہ ہٹائی اور ٹیبل پر پڑے۔ سیل فون کو دیکھا جہاں رمشا کی کال آرہی تھی۔

" چار سال قبل پاپا کی ڈیتھ کے بعد مما اب نانو کے پاس رہتی ہیں۔ اینا کا دھیان اس کی گفتگو پر اور نگاہیں فون پر تھیں...... جواب خاموش ہو چکا تھا۔

"جانے کیوں دادی اور مما کی آپس میں عام یا خاص کسی طرح کی بھی نہیں بنتی۔" وہ کندھے اچکا کے ہنسا تھا اور اگلے لمحے سنجیدہ ہوا...... کہ فون کی اسکرین اس کی کال کے ساتھ دوبارہ روشن تھی۔

اینا نے اسے حیرت سے دیکھا...... جس نے چائے ختم کرنے کے بعد کال ریسیو کی تھی۔

"تم وادی میں واپس آچکے ہو اور مجھے بتانے کی زحمت تک نہیں کی۔" بنا کسی سلام دعا کے رمشا نے بپھرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"بڑی بات ہے بھئی۔" وہ ذرا سا ہنسا......

تمسخرانہ سا...... "سائب مجید تمہارا پابند کب سے ہو گیا ہے' کہیں بھی رہنا اور پھر لوٹ آنا یہ میرا نہایت ذاتی فعل ہے مسز فرہاد۔"

اینا اندازہ لگا سکتی تھی کہ سائب کے اس مذاق اڑاتے لہجے سے دوسری جانب رمشا پر کیا گزری ہوگی۔

"تمہارے گھر میں ایک جوان لڑکی کو چھوڑ کے گئی تھی۔ گھر آنے سے پہلے تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھا۔" اس کا غصہ سائب کی سمجھ سے باہر تھا۔

"یہ پہلی بات سے کہیں قد آور بات ہے۔" اس نے قہقہہ لگایا...... آج وہ اس کے سامنے پہلی بار قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"بارہ تیرہ دنوں بعد تمہیں اچانک یاد آیا کہ رمشا فرہاد میرے گھر میں ایک لڑکی چھوڑ کے چین چلی گئی تھیں...... کیا کمال کی یادداشت ہے۔" وہ ہنسے جا رہا تھا۔

"میں اسے اکیلے گھر میں چھوڑ کے گئی تھی۔" وہ لفظ لفظ چبا' کچھ جتا کے بولی تھی۔ سائب کے چہرے کا رنگ بدلا۔

"مطلب؟" وہ یکلخت سنجیدہ ہوا۔

"مطلب تم خوب سمجھ چکے ہو۔" اب کے رمشا کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ اک جھنجھنا دینے والی ذومعنویت سے بھرپور......

"جسٹ...... شٹ اپ...... مسز فرہاد!" وہ ایک دم کھڑا ہوا...... اینا پریشان ہو چکی تھی اس نے سوکھے حلق کے ساتھ سائب کا سرخ چہرہ دیکھا۔

"ہر عورت رمشا نہیں ہوتی۔" اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی جتایا حالانکہ وہ اینا کے سامنے اس طرح سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا اور وہاں سے چلے جانا بھی اینا کو وسوسوں میں ڈالنے جیسا تھا۔

"مگر سارے مرد ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔" رمشا کے دھیمے سے قہقہے نے سائب کے ہوش و حواس کو بلا کا پامال کیا کہ وہ اس لڑکی کی موجودگی فراموش کرتا...... دہک کے گویا ہوا۔

"اگر تمام مردوں جیسا ہوتا تو ہر بار تمہاری پیشکش سے فائدہ اٹھاتا۔" اس کا جلتا بھنتا لہجہ رمشا کو خاک کر چکا تھا۔ اینا نے اسے تیزی سے باہر جاتے دیکھا۔ صوفے پہ اچھالے گئے سیل فون سے رمشا کی سنائی دیتی گالیاں اینا بخوبی سن رہی تھی کہ سائب کے جاتے ہی اس نے فون اٹھا لیا تھا۔

"اس فقیر کی اولاد سے کہہ دینا...... کہ حاکم اسے کل تک لینے آجائے گا، میڈم کو فون کرو تو اٹھاتیں ہی نہیں۔ ایسی لڑکیاں دو دن لگژری گھر میں کیا گزار لیں اوقات بھول جاتی ہیں۔"

اینا کے اعصاب ٹھنڈے ہوئے۔

"ہنہ!" ایک نفرت آمیز ہنکارے کے بعد فون گونگا ہو چکا تھا۔ یہ اس کی خالہ زاد تھی۔ اینا نے ہمیشہ خالہ کے حالات، اپنے گھر سے بدتر ہی دیکھے تھے۔

خالو ہمیشہ زید امیر سے نگاہ جھکا کے بات کرتے تھے۔ انہیں تو زید امیر کا غرور لے ڈوبا تھا۔ جواب مدہوش رہتے تھے پہلے تکبّر کے نشے میں رہتے تھے۔ ان کے خاندان کے لیے دونوں نشے ہی تباہی کا باعث تھے۔ رمشا نے اپنے تئیں سائب کو انعام امیر کی اوقات بتا دی تھی۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے لبالب تھیں۔

"انعام کسی ریاست کی مالک ہے میں نے اسے کب کہا ہے۔ مجھے تو ابھی تک اس چوٹ کا درد تڑپا رہا ہے جو رمشا فرہاد نے زینیا صفدر کو لگائی تھی۔ جس کے لگژری گھر میں زینیا اپنی اوقات بھول کے حسن علیم کے خواب دیکھنے لگی تھی۔"

کوئی پردہ سا اٹھا۔ اینا چونکی...... رمشا کو کون سا ڈر ستا رہا ہے کہ وہ مجھے یہاں سے...... او مائی گاڈ جو تم نے زینیا کے ساتھ کیا۔ کیا وہ قابل معافی ہے کہ میں اب تم سے گفتگو کروں۔ تمہیں دیکھنا تو بڑی بات ہے رمشا ستار۔"

اس نے بردباری سے آنکھوں کا پانی صاف کیا اور چائے کا وہ خالی کپ دیکھا جس میں کچھ دیر

پہلے پی جانے والی چائے کا ذائقہ اس نے کئی صدیوں تک یاد رکھنا تھا۔

☆☆☆

"حساب برابر ہو گیا نا......زید صاحب!
بدمزاجی تمہارے خمیر میں تھی پہلے اس کی زد میں ہم تھے
اک زمانہ تھا......اور اب تم خود اپنی بدمزاجی کی زد میں
ہو......"

"مان لیا تم پہلے بھی مجھ سے برتر تھے اور اب مجھ سے کہیں بھلے ہو۔ میرے لیے اولاد کا سہارا بہت بڑی چیز تھی۔ وہ بھی بجھو بچی دیوار ثابت ہوئی۔"

وہ ایک بار پھر آگے بڑھیں زینیا نے سہم کے دل پہ ہاتھ رکھا۔

"تم جانتے ہو تم کس قدر آسانی سے جی رہے ہو۔" وہ پاس آ کے پھنکاریں۔ "اور میں ذمہ داریوں کی جلتی بھٹی میں دانوں کی مانند بھن رہی ہوں۔ تم غافل، مدہوش خود سے بے خبر......میں عذاب میں ہوں کہ میں باخبر ہوں۔ اسے دیکھو زید!"

وہ گم صم کھڑی زینیا کو کندھے سے پکڑ کے ان کے پاس کھینچ لائیں۔

"مجھے اس کی خبر رکھنا پڑتی ہے۔ یہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو میں ہولتی ہوں اگر کسی دن اس نے کاجل لگا لیا تو۔ یہ بال سنوارتی ہے تو میں کھڑکیاں بند کرنے لگ جاتی ہوں کہ خوشبو بڑی ظالم ہوتی ہے زید۔ یہ پکھیرو نہیں ہے کہ تیرے گھر کے درخت پہ دھوپ سینکتا رہے۔ اسے ابھی سائبان کی ضرورت ہے۔ اس کا سوچو، ہوش کرو زید اور تمہاری وہ انعام......تم جانتے ہو۔"

"اف!" زینی نے خشک آنکھیں زور سے میچیں......چہرہ پھر بھی گیلا ہوا تو کیا وہ روئی تھی......زینیا نے آج تائی کو زندگی میں پہلی بار اس قدر غصے میں دیکھا تھا۔ وہ آج پہلی بار شوہر کے سامنے باآواز بلند دکھڑا رو رہی تھیں......ورنہ زید نے سن لیا تو کیا ہوگا۔

"اس بات کی خبر انعام کے بابا کو نہیں ہونی چاہیے۔" ان کے لبوں سے اس طرح کے جملے ادا ہوتے تھے۔

"تمہاری وہ انعام، جانتے ہو......دس بارہ دنوں سے غیروں کے در پہ پڑی ہے۔ جانتے ہو کیوں؟"

زینی کے دل کو کچھ ہوا......وہ غصہ نہیں تھا وہ بے بسی تھی جو تائی کا لہجہ چھو رہی تھی ان کی آنکھوں سے بہہ رہی تھی۔

"انعام امیر کس کو اتا پتا بتاتی......مجھے یا پھر اسے۔" ان کی انگلی زینی کی جانب اٹھی جس نے نگاہ جھکا لی تھی جو دھندلا چکی تھی۔

"اگر اور کچھ نہیں کر سکتے ہو تو عطیہ بھابھی کو دعا دیا کرو جنہوں نے تمہاری بیٹی کو دنیا داری کا پتا سمجھا دیا تھا۔ اگر دوسری صورت وہ سفر میں رک جاتی، تو دوسرا سانس لینا بھی اس کے لیے مشکل ہوتا۔"

تائی اب اپنی آواز نیچی کر چکی تھیں زینیا نے ہمت کر کے خاموش بیٹھے تایا کو دیکھا۔ ندرت کے لبوں سے ادا ہونے والے الفاظ تایا کی سرخ آنکھوں میں جل رہے تھے وہاں اب ہر منظر دھوئیں کی لپیٹ میں تھا۔

☆☆☆

"چند بہت اہم فائلز کا کام مکمل کرنا تھا تو پورے چھ گھنٹوں بعد کمرے سے باہر آیا ہوں۔

وہ دادی سے بات کر رہا تھا "جی بیچ میں کھانے کا وقفہ بھی ہوا تھا۔" عابد نے صاحب کی غلط بیانی پہ آنکھیں دکھائیں۔

"ایک کپ کافی اور دو سینڈوچز اسے کھانا کہا جا سکتا ہے۔" اس نے باآواز بلند کہا تاکہ دادی سن لیں۔

"تم سے تو بعد میں پوچھوں گا؟" وہ عابد کو گھورتا باہر چلا آیا جب وہ دادی سے بات کر رہا ہوتا تو یونہی لقمے دینا عابد کی عادت تھی۔

اس نے کمرے سے باہر آتے ہی اسے تلاشا تھا جو کل دوپہر سے کمرے میں بند تھی۔

"جانتا ہوں۔ میری ضرورت کی تمام چیزیں، یہاں سے زیادہ آپ کے یہاں پائی جاتی ہیں۔" وہ بات کرتے ہوئے لان کے آخری سرے تک آ گیا۔ آج سر شام ہی آسمان ستاروں سے بھر چکا تھا۔

"پلیز دادی امید ہی بہتر ہے۔ آپ جانتی تو ہیں آپ کے انتظار کو خود آپ کی ہی نظر لگ جاتی ہے۔" دادی کے کسی جواب پہ وہ کھل کے ہنسا تھا۔

اس نے قدرے نشیب میں لکڑی کے بنچ پر بیٹھی اینا کو دیکھ لیا تھا۔ جو آج خود بہت ڈسٹرب تھی۔ رمشا فون پہ حیدر آباد والوں کو صورت حال سے مطلع کر چکی تھی۔ نتیجے میں ماں اور زینیا نے ناراضی کا بھرپور اظہار کیا تھا۔

"اکیلا کہاں ہوں......گھر میں خوب رونق ہوتی ہے۔" اینا نے اس کے محظوظ سے انداز پہ بے ساختہ اسے دیکھا۔ "پرندے تو پہلے بھی ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔" اس کا لہجہ معنی خیز سا ہوا۔

"اچھا پھر بات ہو گی۔" وہ خدا حافظ کہہ چکا تو اس کی طرف متوجہ ہوا۔ جو بالکل سپاٹ خشک چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بالکل ویسے ہی جب اس نے پہلی اور دوسری بار اسے دیکھا تھا۔

"آپ نے کافی ستارے گن لیے ہوں گے۔" سائب نے اسے بغور دیکھا۔

"مجھے کبھی بھی ستارے گننے کا شوق نہیں رہا۔" اس نے فوری جواب دیا۔ پھر وہ دونوں کتنی ہی دیر خاموش رہے۔

"مجھے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔" وہ ذرا سا ترچھا ہوا۔

"میں جانتی ہوں۔ آج بوا کا بیٹا انہیں لینے آیا تھا اور آپ نے اسے دو چار روز بعد آنے کا کہا ہے۔" اس نے کہیں سیدھ میں دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔

"اور مجھے دو چار روز تک چلے جانا چاہیے۔"

وہی روٹھا سا انداز۔ وہ خاموش ہوئی تو سائب نے چند گہرے سانس لیے۔

اسے سگنل آنے شروع ہو چکے تھے کہ اب کسی وقت بھی رخت سفر باندھنا پڑ سکتا ہے اسے ایک دو روز دادی کے ساتھ بھی گزارنے تھے۔" اور یہ لڑکی۔

"کیا آپ کے گھر سے کوئی آپ کو لینے آ رہا ہے۔" اس نے خاصا توقف برتتے ہوئے نہایت نرمی سے دریافت کیا۔

اینا کے دل کو دھکا سا لگا اس کے چہرے پہ شام جیسا ملگجا پن اترا ...... جسے سائب نے لمحوں میں محسوس کیا۔ بھرے زمانے میں دل کو کسی ایک کی تسلّی۔ درکار ہوتی ہے۔ کسی مہربان لہجے کی نرم ہتھیلیوں پہ آنسو اپنا ذائقہ بونا چاہتے ہیں۔ وقت کبھی کبھی سازگار ہوتا ہے۔

"اس فقیر کی بیٹی سے کہہ دینا۔" اس کی یاد میں رمشا کا لہجہ ابھرا۔

"تم اپنا مہربان لہجہ سمیٹ لو......میں فقط مسافرت میں مختصر سا قیام ہوں۔" اینا نہیں جانتی تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چپ تھے یا محو گفتگو۔ اس کی آنکھوں کا پانی پتھر سا تھا یا کانچ کا سا......وہ عجیب سی لڑکی وہ ناراض سی نگاہیں جس کی سطح پہ چمکتا پانی سائب کو کہیں بہا لے گیا تھا۔ "اے وقت سازگار کبھی ہجر کے موسموں میں آواز دوں تو لوٹ آنا......" وہ اچانک کھڑی ہوئی۔

"لو اینا بی بی! آپ ادھر ہیں اور میں آپ کو راحت صاحبہ کے گھر تک ڈھونڈ آیا ہوں۔" عابد جیسے ہانپ کے بولا تھا۔

"ہوا کیا ہے؟" اس نے قریب جا کے پوچھا۔

"آپ بڑی بے وفا ثابت ہوئی ہیں۔" سائب مسکرایا اسے اس لمحے وہ جملہ اچھا لگا تھا۔ "جانے کی تیاری بھی کر لی......بتایا بھی نہیں کہ مجھے کل چلے جانا ہے۔" عابد سچ مچ اداس دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ کل کہاں سے آ گیا۔" بینچ پہ بیٹھے تنہا شخص

کے دل میں پکڑ دھکڑ ہوئی۔
''ارے بھائی کھل کے کہو نا۔'' اس نے الجھ کے پوچھا۔
''حیدر آباد سے آپ کے کوئی کزن حاکم صاحب آئے ہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا آیا ہوں۔''
وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔
''کہہ رہا تھا، انعام صاحبہ کو لینے آیا ہوں۔'' عابد کے لہجے میں اداسیاں گھلی ہوئی تھیں۔
''اے وقت ساز گار ذرا سا مڑ کے دیکھ اور وہ لمحہ مجھے دان کر جو لمحہ بھر پہلے میری زندگی کا حاصل تھا۔ اور لمحہ بھی کہاں لوٹ کے آتا ہے ابھی وہ تھی اور اب وہ گھڑی خواب ہوئی۔ وہ گھڑی کل ٹھہری، گزر چکا موسم ٹھہری۔ آج سانس کا بکھراؤ دور تک تھا جو پہنچ سے باہر تھا تلاش سے باہر تھا۔
اسے حسن علیم کے لہجے کی بے بسی یاد آئی۔ اس نے چمکتے آسمان کو دیکھا۔ ستارے مسکن نہیں چھوڑتے پرستاروں کی گنتی سے انکاری وہ لہجہ پھر یاد میں سرگوشی نما سارہ جائے گا۔
ابھی وہ بہت دیر تک یہاں بیٹھے رہنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

''اینا ...... اینا!'' ساون اسے دیکھتے ہی ہمکا...... جیسے پنجرہ توڑ دینا چاہتا ہو۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سائب کی بھی ہوئی جو آج نگاہ پہ پہرہ لگا کے کمرے سے باہر آیا تھا۔ اس کے سامنے بار بار گھڑی پہ نگاہ ڈالتا حاکم بھی اینا کا ہی منتظر تھا۔
سائب نہیں جانتا تھا کہ رات کو ان دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی تاہم عابد نے اسے بتایا تھا کہ یہ بندہ انعام کا نہیں رمشا کا تایا زاد ہے۔
اینا کا موڈ خوش گوار تھا وہ پہلے ساون کی طرف گئی۔
''اوں ہنہ...... اینا نہیں کہو صبح بخیر۔'' اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگاتی وہ مسکرائی۔
''دن کے گیارہ بجے کون صبح ہوتی ہے۔''
حاکم نے اینا کو پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھا۔ اخبار پڑھتے سائب کے چہرے پہ ناگوار سا تاثر ابھرا۔
''اگر ہم سویرے ہی نکل جاتے تو اب تک۔''
''تمہارے خیال میں تم یہاں آگئے ہو تو مجھے واپسی کا سفر تمہارے ساتھ کرنا ہوگا۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر درشتی سے گویا ہوئی تھی۔ ''اور رمشا سے کہہ دینا یہ وادی اس کے باپ کی نہیں ...... کہ اس کے چاہنے سے میں یہاں قیام کروں اور جب وہ چاہے تو چل پڑوں۔''
حاکم اس کے اس انداز پہ جل بھن ہی گیا تھا اور سائب کو اخبار سمیٹنا ہی پڑا۔ اسے وہاں اپنی موجودگی غیر مناسب محسوس ہوئی۔
''اسے یہ بھی بتا دینا۔ میں اس کی ذمہ داری ہرگز بھی نہیں' اس کے گھر میں رہنے کی قیمت، میں بطور اس کے بچوں کی آیا کے ادا کر چکی ہوں اب تم جا سکتے ہو۔''
وہ گردن اکڑا کے بالکل سیدھی کھڑی ہوئی۔
''ایسے کیسے چلا جاؤں۔'' وہ روبرو ہوا۔
''جب آ گیا ہوں تو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''
عقبی باؤنڈری کی جانب جاتا سائب ٹھٹھک کے رکا تھا۔
''تم اپنی عیاشیاں اپنی محنت کی کمائی سے کرو' یہی بہتر ہے' میں تمہارے ہاتھوں بک کر تمہارے نشے پانی کا سبب بالکل بھی نہیں بن سکتی۔'' وہ استہزائیہ سا ہنسی۔
سائب تو کیا عابد تک ساکت رہ گیا۔ رمشا کا رشتے دار ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ عابد کے ہاتھ یوں لرز سے گئے کہ جوس سے بھرا گلاس آدھا چھلک گیا جو وہ انعام کے لیے لا رہا تھا۔
''بس اب تم اپنی فیملی کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ' اگر وائے قسمت تم میرے ہاتھوں بک گئیں۔ خود ہی عیش نہیں کرو گی بلکہ قسم لے لو باقی کی ساری زندگی تمہارے باپ کا سگریٹ نشہ بھی میرے ذمے ہوگا۔'' وہ ٹھٹھا لگا کر ہنسا تھا۔

''اف!'' اینا کے وجود نے کڑوا دھواں اگلا۔ جب کوئی حقیقت منہ پہ مارتا ہے تو وہ اس قدر ڈراؤنی شکل اپنا لیتی ہے۔ اس کی حالت زہر پھانکنے والوں جیسی ہو چکی تھی کہ چہرہ ٹھنڈے پسینے سے تر بتر تھا کاش اس کا باپ اس قدر کمزور مرد نہ ہوتا...... کیسے لمحوں میں بھرم تار، تار ہوا تھا۔
وہ اینا کی اس حالت پہ ڈسٹرب ہوا۔ اس نے اس کے ٹھنڈے وجود سے نگاہ ہٹائی اور بے نیازی سے چلتا حاکم کے سامنے آیا۔
''اگر اس لمحے کے بعد تم مجھے گلگت میں بھی نظر آئے نا...... تو آئندہ کسی کو نظر نہیں آسکو گے۔'' سائب کا لہجہ اس لڑکی کی مانند ہی ٹھنڈا تھا۔ ''میں اپنی بات دہرانے کا عادی بالکل بھی نہیں ہوں۔''
سائب کی آنکھوں اور انداز میں اس قدر قطعیت تھی کہ حاکم ایک دم آگے بڑھا، جانے وہ کیا سمجھی کہ بدک کے سائب کی آڑ میں ہوئی۔ اس کی اس حرکت پہ حاکم کے چہرے پہ کمینی سی مسکراہٹ رینگی، پھر وہ وہاں رکا نہیں تھا...... سیکنڈ، منٹوں کی طرح بھاگے جا رہے تھے۔ سائب اس لڑکی کو پلٹ کے نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ آج اس کی اپنی آنکھیں باغی ہو رہی تھیں۔
''وہ کہیں راستے میں مجھے سچ میں بیچ دیتا۔'' وہ خود ہی دھیرے سے اس کے مقابل آ گئی تھی۔
وہ کیا کہتا ان یخ ہاتھوں کو اپنی تمازت میں لیتا...... وہ مسکراتا اور ان ہراساں آنکھوں کے درد چن لیتا...... اس کے پاس صرف تسلی تھی مگر سائب مجید کا وجود اس کا اپنا تھا نہ وہ خود اپنے اختیار میں تھا۔ دادی اس کی منتظر تھیں۔ اسے سفر کے لیے نکلنا تھا۔ وہ اپنی دادی کی طرح اس شہر جمال کی طرح اس لڑکی کو انتظار دان کر سکتا تھا مگر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے سفر میں واپسی شرط نہیں تھی۔ بس وفا شرط تھی اور وہ وفادار تھا۔ وہ بس نرمی سے اسے محسوس کر رہا تھا۔ تیرے ہونے کا اک لمحہ، یوں مثل وصال تھا۔ جیسے صدیوں نے پلک تک نہ جھپکی ہو۔ وہ نگاہ نہیں ملانا چاہتا تھا۔ نگاہ ملی اور وہ اسے دیکھتا رہ گیا...... وہ خود کو ڈھونڈتا رہ گیا۔

☆☆☆

ندرت کچھ دیر پہلے بازار سے لوٹی تھیں اور پھر قضا پڑھنے کے بعد اپنے کمرے میں ہی لیٹ گئیں۔
زینیا نے پلاؤ دم پہ رکھا اور کچن کیبنٹ میں گروسری وغیرہ سیٹ کرنے لگی' کچن کی کھلی کھڑکی سے آنے والی ہوا۔ اسے بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ اپریل کی ان اولین شاموں میں چلنے والی ہوا۔ ہجرت زدہ سی محسوس ہوتی تھی دیوانوں کی سی' وقت بے وقت دستکیں دیے جاتی' تب ہی دروازہ بجا۔ آج کل ان کی اطلاعی گھنٹی خراب تھی۔ ضرور ہی مغرب سے ذرا پہلے کا آخری سوالی ہوگا جو ان کے دروازے پہ برسوں سے خیرات لے رہا تھا۔ اس نے بعجلت کبنٹ سے دس کا نوٹ اٹھایا کہ وہ انجان سی ہلکے ہاتھ کی دستک دوبارہ ہوئی۔
پاؤں میں چپل پہنتے زید امیر چونکے، زید نے دروازے کی جانب جاتی زینی کے بجائے نگاہ درخت کی اور اٹھائی وہ پرندہ آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا آج کل زید ہمہ وقت اسے دیکھتے تھے۔
رانجھا تخت ہزارے دا
کیویں جوگی ہو گیا
انہوں نے خاموش سی آہ بھری...... زینی نے دروازہ ذرا سا وا کیا۔
''آج جلدی بھی آئے ہو اور صدا بھی نہیں لگائی۔''
اس نے نوٹ والا ہاتھ باہر نکالا۔ نوٹ پکڑنے والے کی کلائی پہ بندھی گھڑی بہت قیمتی تھی زینی کے اندر اک دکھ چھن سے ٹوٹا۔ دروازہ ذرا اور وا ہوا۔ باہر گلی میں اڑتی خوشبو ان کی گلی میں موجود گاڑی سے بھی کہیں مہنگی تھی۔ وہ خیرات پا کر کھلے دروازے کے سامنے آیا۔
تیری زلف دا ہو کے اسیر
رانجھا جوگی ہو گیا

"صدا اس لیے نہیں لگائی۔ پھر میرے لیے یہ دروازہ کب کھلنا تھا کہ بہت دیر سے آیا ہوں۔"

وہ دانستہ ہلکی آواز میں بات کر رہا تھا...... وہ چاند کیسا تھا جو سورج کی ہتھیلی پہ چمکتا تھا زینی کے چہرے پہ بے اعتباری مدھم ہو رہی تھی مٹتی جا رہی تھی۔ تو کیا یہ سچ تھا دوپہر کے گھنے سکوت میں دو گھڑی شام ستانا چاہتی تھی۔ وہ مبہم سا مسکرایا اور دس کا نوٹ پینٹ کی جیب میں رکھا۔

"اندر آنے کا نہیں کہو گی۔ میں دو گھڑی ستانے نہیں آیا۔"

زینی ہوش میں آئی...... پھر پلٹ کے اپنے تایا کو دیکھا جن کی نگاہ دروازے پہ ہی تھی۔ اجنبی ہوتا تو دروازہ کھولنے والی کے لبوں سے کون کی پکار ابھرتی، فقیر ہوتا تو خیرات پا کر چلا جاتا۔

"زینیا! مہمان کو اندر لے آؤ۔" تایا کی آواز پہ وہ راستے سے ہٹ گئی تھی۔

اس کے راستوں کی نایاب مسافت سمیت حسن علیم اندر آچکا تھا۔

☆☆☆

ندرت نے شوہر کو یوں دیکھا جیسے آج ہی ان سے ملی ہوں۔ کیا یہ نشے میں ہیں یہ بات ہوش مندی میں کہاں کی جاسکتی ہے۔

"میں حسن علیم کے ساتھ زینیا کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

ندرت جیسے قوت گویائی کھو چکی تھیں...... ورنہ اتنا تو کہتیں کچھ دیر قبل اس حسن نامی شخص کو آپ فرہاد کا رشتے دار بتا رہے تھے کہ وہ انعام کی خیر خبر لے کر آیا ہے اور اب آپ کہہ رہے ہیں وہ زینیا کا طلب گار ہے۔ "تھوڑی دیر تک اس مسافر سے راز و نیاز کیا کر لیے...... یعنی کہ حد ہی ہو گئی۔"

زینیا کی عدت کے بعد اس کے ننھیال سے دو تین رشتے آئے تھے۔ ندرت نے شوہر کو بہتیرا سمجھایا تھا۔

"یہ میرے اکمل کی نشانی ہے۔" ان کا جواب پا کر وہ حق، دق رہ گئی تھیں۔

"انسان نشانیاں نہیں ہوتے زید!" ہزار دلیلوں کے باوجود وہ نہیں مانے تھے اور آج یوں اچانک فیصلہ بھی سنا دیا۔

ندرت نے مدت بعد انہیں بغور دیکھا۔ پہلے وہ اپنی جانب غور سے دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دیتے تھے بعد میں ان کی اپنی آنکھوں میں بسے شکوے اور دکھ اجازت نہیں دیتے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے زید؟" انہوں نے گہرا سانس بھر کے نگاہ ہٹائی، پھر ان کا نحیف سا ہاتھ تھاما......

ندرت کی آواز نرم اور انداز ترحم آمیز تھا۔ "وہ ایک اجنبی ہے، ہم اسے جانتے ہی نہیں اور آپ..."

"اسے انعام جانتی ہے ورنہ وہ یونہی کسی انجان کو ان راستوں کی خبر دیتی کیا...... تمہیں اس میں کوئی کمی نظر آتی ہے۔ جاؤ...... وہ باہر بیٹھا ہو گا کوئی اتنی سی خامی۔" انہوں نے انگوٹھے اور انگلی کو برابر کیا۔

"وہ کیوں بیٹھا ہو گا؟" ندرت نے جیسے انہیں جھڑک دیا تھا اور پھر ان کے قریب سے اٹھیں۔

"بالکل دیوانے ہو گئے ہیں۔" انہوں نے کھڑکی کا ایک پٹ کھولا۔ اب زینی چوکھٹوں پہ تیل جو لگائی تھی، چوں چرا کیسے ہوتی...... وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ زینی کی نیت میں نیم وا کھڑکیوں کی کشش نہیں تھی ورنہ ان کی گلی میں با کمال راہگیر بھی گزرتے ہی ہوں گے...... اور سالوں بعد آنے والا وہ مسافر بے مثال بھی تھا جو دستک دے کے آیا تھا اور اب زینی کے سامنے فقیر سا ہو کے بیٹھا تھا۔

"رانجھا تخت ہزارے دا۔"

آج کل زید کے لبوں پہ یہ جملے انہیں چونکاتے تھے۔ وہ پٹ کھلا چھوڑ کے شوہر کی طرف پلٹ آئیں زید نے ان کا مسکراتا چہرہ دیکھ کے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کوئی جھلا سا قبرستان کی خاموشی میں ہیر گاتا تھا اور جیسے بدمست ہنستے تھے۔

بولی ہیر وے اڑیا جا سانوں
کوئی خوشی نہ ہووے تا سیئے کیوں

(ہیر نے کہا جب کوئی خوشی ہی نہیں تو کیوں افسوس۔)

حسن کو اس وجود میں جم چکے موسم اذیت دے رہے تھے۔

پردیسیاں کملیاں جوگیاں نوں
اسی دل دا بھید دسیئے کیوں

(ان پاگل پردیسیوں جوگیوں کو میں دل کا بھید کیوں بتاؤں۔) اس نے اب تک اس لوٹ کے آنے والے سے نگاہ نہیں ملائی تھی۔

نگاہ سخی ہو جائے تو عنایات پر اتر آتی ہے۔ زینی اب اسے کچھ دان نہیں کرنا چاہتی تھی...... جو اچھا موسم گزار کے آیا تھا۔ زینی کا وجود اب یک رنگ نہیں تھا۔ وہ اکمل کی سنگت میں کئی ماہ گزار چکی تھی۔ "میری آنکھ کے وہ پہلے موسم جو تمہاری محبت کے زمانوں میں بھٹکتے رہے۔ بس وہی تمہیں مبارک اور میرے وہ تمام الفاظ وہ سارے جملے مجھے واپس چاہئیں جو میں تم سے کہہ نہیں پائی تھی اور میں نے کہہ بھی دیے تھے۔"

اس شخص کی تھکی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

"وہ سب رمشا کی بے ایمانی تھی زینیا، ورنہ میں تو جیسے اسی وقت سے اٹھ کے آیا ہوں۔" وہ تڑپ کے بولا تھا۔

"لیکن میں...... اب وہ نہیں ہوں حسن!" وہ بھی اسی کے انداز میں جواب دہ ہوئی تھی۔ وہ سمجھ کے بھی نہیں سمجھنا چاہتا تھا۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔

"تم وہی ہو زینی، واپس آیا ہوں تو جان لو۔ حسن کے لیے تم آج بھی زینیا صفدر ہو۔" اس نے پر یقین سانس بھری تھی۔ "کل پھر آؤں گا اور مجھے اب مزید بس اتنا ہی کہنا ہے۔" "میرے آنے سے قبل آئینہ دیکھ لینا اور میرے وقت سے گم شدہ اس لڑکی کو میرا پیغام دینا۔

اسے کہنا قسم لے لو
تمہارے بعد گر ہم نے
کسی کا خواب دیکھا ہو
کسی کو ہم نے چاہا ہو
کسی کو ہم نے سوچا ہو
کسی کی آرزو کی ہو
کسی کی جستجو کی ہو
کسی کی راہ دیکھی ہو
کسی کا قرب مانگا ہو
کسی کا ساتھ رکھا ہو
کسی سے آس رکھی ہو
کوئی امید باندھی ہو
کوئی دل میں اتارا ہو
کوئی تم سا پیارا ہو
کوئی دل میں بسایا ہو
کسی کو اپنا بنایا ہو

اس نے تیزی سے وہ بزم چھوڑی اور تیز قدموں کے ساتھ ہی وہ صحن عبور کر گیا۔ چھوٹا گیٹ ہلکے سے بند ہوا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی، وہ گلیاں پیچھے رہ گئیں۔ وہ اسی انداز میں بیٹھی رہی۔ وہ پانی پانی ہو چکی تھی کہ اس کے الفاظ جیسے موسموں کو سورج دکھانے کی مانند تھے۔ اس نے درخت کو دیکھا۔ پکھیرو کے پر پھڑپھڑائے...... میں نے تمہارے کہنے پر بھی اس چوڑے تنے پہ جلتے چراغ کو پھونک نہیں مارا تھا۔ اس نے گول پھیری لی، محبت کو دائروں کی طلب رہتی ہے۔ وہ جیسے حواسوں میں آئی۔

"جب یہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو میں ہولتی ہوں، اگر کسی دن اس نے کاجل لگا لیا تو۔" تائی کی خوف زدہ آواز سماعتوں میں کنکر کی طرح چبھی تھی۔

"یہ کھڑکیوں کی چرچراہٹ راہ گیروں کو متوجہ کرتی ہے۔ انسان سے انسان کو خوف زدہ ہے۔" وہ حسن علیم کے سے انداز میں اٹھی تھی اور اسی تیزی کے ساتھ جا کر کھلا دروازہ بند کیا۔ اس نے آنسو پونچھے...... اور آہستہ سے واپس ہولی۔

کل اس نے عجلت اور احساس زیاں کے ساتھ

نہیں سکون اور وقار کے ساتھ حسن علیم کے لیے یہ دروازہ کھولنا تھا اور اس سے نگاہ ملا کے بات کرنا تھا۔

☆☆☆

''اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ وہ آس پڑوس کے بزرگان سے اختلافی شکایتیں...... یہ سب تمہارا ڈراما ہوتا تھا اور میری غیر موجودگی میں یوں ہی محفلیں سجتی ہوں گی۔'' عطا صاحب اور ڈاکٹر تاثیر کے جاتے ہی وہ بھناتا ہوا، عابد کے سر پہ پہنچا تھا، لفظ بزرگان، عابد نے کڑوی گولی کی طرح حلق سے اتارا۔

''خیر وہ بے چارے بڈھے تو نہیں ہیں۔'' صاحب کی کسی بھی بات کا برا مانے بغیر...... اس لفظ پہ تو وہ تڑپ ہی اٹھا تھا۔ ''اب آپ سے ملنے آتے ہیں تو کیا میں منع کر دوں۔''

''بھئی آج یہ بھی بتا ہی دو کہ آناً فاناً وہ بڈھے میری محبت میں کیوں گرفتار ہو چکے ہیں۔''

صاحب کی تلملاہٹ پہ عابد نے بتیس دانتوں کی نمائش کی۔

''محبت کا کیا ہے سر...... کبھی بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے شادی کسی بھی عمر میں کی جا سکتی ہے۔ اب دیکھیں نا عطا صاحب اور ڈاکٹر تاثیر کو بھی بالآخر آئیڈیل لڑکی مل ہی گئی۔'' وہ مسکرایا اور چاول ڈش میں ڈالے۔ ''جو شلوار قمیص پہنتی ہے، ڈوپٹا قرینے سے اوڑھتی ہے اور......''

عابد منہ میں بدبدا کے رہ گیا، سائب کا موڈ دوستانہ بالکل بھی نہیں تھا اور نگاہوں میں سختی برقرار تھی۔ وہ لوگوں سے میل ملاپ کم ہی رکھتا تھا، مگر اس بار اس کے گھر میں جیسے دیوانی ہانڈی چڑھی ہوئی تھی۔ انعام کا مسئلہ بھی جوں کا توں تھا۔

''تمہیں کیا علم نہیں کہ بوا کا شوہر زندہ ہے، وہ بیوہ نہیں ہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''آج کل رشتے کرانے کا نیا شوق چڑھا ہوا ہے۔'' اس نے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹی۔

''اففف......!'' عابد گرم قورمے میں غوطہ کھا کے ابھرا اور بل کھا کے ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھا۔

''آپ بھی حد کرتے ہیں صاحب...... بوا کی بات کون کر رہا ہے۔'' وہ نروٹھے پن سے بولا......

''تو پھر ان بزرگوں کی آئیڈیل لڑکی کھدائی سے برآمد ہوئی ہے یا آسمان سے ٹپکی ہے۔'' وہ طنزیہ ہنسا اور چمچہ بھر رائتہ لیا۔

''انعام کو کھانے کا کہہ آؤ۔'' اس نے پلیٹ سامنے رکھی۔ پھر وہ ٹھٹک کے چونکا۔ منظر واضح سا ہوا۔ ''بات چیت سلیقے سے کرتی ہے نماز کی بھی۔'' اس نے تائیدی نگاہوں سے ملازم کو گھورا، یعنی کہ......

''میرا دل چاہنے لگا ہے صاحب کہ اینا بی بی اب کبھی واپس نہ جائیں۔''

وہ ذرا سا کرسی پہ ٹکا اور لجاجت سے گویا ہوا۔ سائب کا رنگ پھیکا پڑا، جیسے عابد نہیں سامنے وہ خود بیٹھا تھا۔ دل مضطرب سا ہو کے دھڑکا۔

''عطا صاحب کے پاس جتنی دولت ہے اینا بی بی کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔'' عابد التجائیہ سا ہو کے اسے دلیلوں سے قائل کرنا چاہتا تھا۔

''عابد...... پلیز۔'' اس کا اٹھایا ہاتھ اور ساکن سا انداز، عابد سے کہیں بڑھ کے التجائیہ تھا۔ ''ایسا نہیں ہوتا اس کا گھر ہے، خاندان ہے، ایک مہمان کے لیے اس قدر آگے تک سوچنا۔'' اس نے سر جھٹکا۔ ''بے وقوف انسان۔''

عابد نے اسے اٹھتے دیکھا، اب اس کا رخ عقبی باؤنڈری کی طرف تھا۔ وہ بالکل گم صم سی تھی۔ سائب کو سامنے پا کے ہلکا سا مسکرائی۔ وہ بید کی کرسی پہ ذرا احتیاط سے بیٹھا۔ جس کا رنگ اتر چکا تھا۔ ''ذرا جو عابد کو ان چیزوں کی فکر ہو۔ دھوپ اور بارش میں بدحال ہو چکی ہیں۔'' سائب جیسے شکوہ کناں ہوا۔ وہ دوبارہ مسکرائی۔

''ہم انسان دھوپ اور بارش کے بنا مرجھا جاتے ہیں اور ان ہی سے مادی اشیاء چھپاتے

پھرتے ہیں، وہ خاصی دیر تک سوچتی رہی۔

''رمشا حاکم کے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ وہ اس کے رابطے میں نہیں ہے۔'' سائب نے اسے پوری بات نہیں بتائی تھی۔ ''اسے شک ہے کہ میں نے حاکم کو کہیں غائب کروا دیا ہے۔''

اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔ اینا نے اک ذرا حیرت سے اسے دیکھا کہ وہ ایسے کام بھی کروا سکتا ہے، وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ جب بولتی تھی تو بہت اور جب خاموش ہوتی تو...... پھر اس نے نگاہ موڑی...... اور کہیں دور تک دیکھا۔

''میرا باپ اگر بہت اچھا آدمی نہیں تھا تو بہت برا بھی نہیں تھا۔''

سائب نے اک بے سکون سانس لیا اور حاکم کو بے شمار گالیوں سے نوازا...... کہ اینا کی سوئی اس کی بات پہ اٹکی ہوئی تھی۔

''جانے کیوں وہ خود کو مکمل انسان سمجھتے تھے۔ میں الجھتی تھی، کڑھتی تھی، مگر میں سمجھ نہیں پاتی تھی، یہ تو میں نے بعد میں جانا کہ وہ اکمل کے ساتھ خود کو مکمل سمجھتے تھے، جب میرا بھائی اس دنیا سے چلا گیا۔''

اس کے دھیمے سے لہجے میں ریت کی ڈھیری سرکی تھی، سائب سیدھا ہوا۔ اس نے بوجھل سانسوں کے ساتھ اس لڑکی کو گہرے دکھ سے دیکھا۔

''اکمل کے بعد وہ ادھورے ہو گئے تھے۔ پھر نشے کی عادت نے اس ادھورے پن کے کئی حصے کر دیے۔''

وہ عجیب سا ہنسی۔ جس میں دکھ کا شور تھا۔ وہاں اب ایک اعصاب شکن خاموشی چھا چکی تھی۔

''اب انعام امیر کی کمائی کا آدھا حصہ باپ کے نشے پہ خرچ ہوتا ہے۔'' اس کا بھیگا لہجہ...... سائب پہ کچھ منکشف ہوا۔ ایک تلخ حقیقت...... وہ لڑکی کیا عجب تھی۔ اس نے حسن پہ اپنا اور زینیا کا رشتہ منکشف نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے انداز میں مزاج میں، ریت، پھول، چاند، بارش، ہر موسم رکھتی تھی۔

''سر جی آ جائیں، کھانا تو ٹھنڈا بھی ہو چکا۔'' بالآخر عابد کا ضبط جواب دے چکا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ اندر جا رہے تھے۔

''کل حسن کا ڈرائیور مجھے لینے آ رہا ہے۔'' اس نے ساتھ چلتے ہوئے ہولے سے بتایا۔

وہ بے ساختہ رکا تھا۔ اسے کوئٹہ جانا تھا۔ اس کے بعد اسے اک نامعلوم سفر پہ روانہ ہونا تھا۔ پھر اس لڑکی کے چلے جانے کا سن کر قدم آگے بڑھنے سے انکاری کیوں ہو چکے تھے...... مگر وہ نہیں رکی تھی۔

''عابد میں نے کہا تھا راحت آپا اور عطا صاحب کے گھر پلاؤ دے آنا۔'' اس کی زندگی سے بھرپور آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ وہ اداسی سے مسکرایا۔ کبھی دیلی ہاؤس میں دوبارہ آنا ممکن ہوا، تو اس گھر میں پکنے والی دیوانی ہانڈی کی خوشبو کیا وہ پہلے جیسے سکون کے ساتھ محسوس کر پائے گا۔ میں اب کبھی پوری نیند نہیں سو پاؤں گا، اس نے خود کلامی کی۔

''ان کو یہ بھی بتا دینا کل وادی میں میرا آخری دن ہوگا۔''

وہ مسکرایا اور سست قدموں کے ساتھ آگے بڑھا کہ اسے آگے بڑھنا ہی تھا۔

☆☆☆

اس کے ہاتھ میں کھجور کی چھال سے بنی ایک ٹوکری تھی جو ایک ہفتہ قبل اسے مادام راحت نے گفٹ کی تھی، جس میں وہ اب تک کافی چیزیں بھر چکی تھی، آج وہ عابد کے ساتھ پچھلے دو گھنٹوں سے وادی کے نشیب و فراز میں گھوم رہی تھی، اس نے سرخ اور زرد پتوں سے بھری ٹہنی توڑی۔

''یہ چند دنوں تک سوکھ جائے گی۔'' اسے اپنے عقب میں سائب کی آواز سنائی دی۔ اینا نے رخ بدلا۔

''تو کیا ہوا، یہ ہمیشہ میرے پاس محفوظ رہے گی۔'' سائب نے اس کی ٹوکری میں جھانکا۔

''او...... مائی گاڈ!'' اس کا قہقہہ بے ساختہ

تھا۔ اینا نے اس کا کھکھلاتا ٹوکری میں بھر لیا۔ بیجوں سمیت پھول پتوں بھری ٹہنیاں، تنوں کی چھالیں، پرندوں کے گھونسلے، رنگ برنگی تتلیوں سے بنی جھونپڑیاں، پتھروں سے بنے ننھے منے برتن۔

''ان تمام چیزوں کا کیا کرو گی؟'' اب وہ تحیر سے پوچھ رہا تھا۔

''میں دوبارہ یہاں کبھی نہیں آسکوں گی، مگر میرے پاس وادی کی تمام اچھی چیزیں محفوظ رہیں گی۔'' اس نے دھیان سے سائب کو دیکھا۔ وہ جان چکی تھی کہ اس شخص کی آنکھیں بھی وہ لمحے مقید کر رہی تھیں۔

''جو تمہاری اس ٹوکری میں نہیں سما سکتے، کیا وہ یاد نہیں آئیں گے؟'' لہجے میں آنچ سی گھلی تھی۔ وہ بے ساختہ ٹھہری، پھر آنکھوں میں شرارت بھر کے اسے دیکھا۔

''جو چاہتے ہیں، میں انہیں یاد کیا کروں، وہ اپنے نام، پتے ٹوکری میں ڈال سکتے ہیں۔''

اس نے کندھے اکڑائے۔ اور اترا کے آگے بڑھی، وہ مبہوت ہوا، اس نے وقت کو روک لینا چاہا۔ آہٹیں تھم گئیں۔ اینا نے پلٹ کے دیکھا، ان گہری آنکھوں میں کیا محبت تھی، کیا محبت جیسا احساس تھا۔

چوڑے تنے کی جڑ میں ریت کی چمکتی سی ڈھیری تھی، اینا نے چند چٹکیاں بھر کے ہتھیلی پہ رکھیں۔

''اینا بی بی یہ اس وادی کے خاص پھول ہیں جو دنیا میں اور کہیں نہیں ملتے۔'' سائب نے بڑھ کے عابد کی ہتھیلی سے پھول اٹھائے اور ٹوکری میں ڈال دیے۔

''اور یہ دو پتے، یہ نایاب ہیں۔ قیمتی ہیں، بس یہاں کے بعد جرمنی سے ملیں گے۔'' اس نے مذاق اڑاتے ہوئے عابد سے پتے اچک لیے۔

''سچ صاحب جی...... انہیں ذرا سونگھیں، یہ باس کسی قیمتی پرفیوم میں بھی نہیں ملے گی۔ بہت مشکل سے ڈھونڈے ہیں۔''

تب تک سائب انہیں ہاتھوں میں مروڑ چکا تھا۔

''اچھا...... یہ بات ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''جاؤ...... دو میرے لیے بھی ڈھونڈ لاؤ۔''

''جی!'' عابد بری سی شکل بناتا ادھر ادھر ہو گیا۔

اینا نے چرمرائے پتوں کو مایوسی سے دیکھا۔ سائب نے کندھے اچکائے کہ اب کیا ہو سکتا تھا۔ پھر یوں ہی اپنی ہتھیلی کو سونگھا۔

''واقعی باکمال' وہ مسحور ہوا۔'' عابد سچ کہہ رہا ہے۔'' ''حیران کن...... وہ مایوس ہوئی...... وہ دو قدم قریب ہوا اور اپنی ہتھیلی اس کے چہرے کے قریب لایا۔ وہ تذبذب کا شکار ہوئی، پھر جھینپ کے وہ باس محسوس کی۔

''واقعی......'' وہ براؤن آنکھیں چاند ہوئیں۔

خوشبو، وقت اور چاندنی کوئی سمیٹ سکا ہے۔ اس نگاہ نے حصار باندھا۔ اے حصار عشق نگاہ کن، میں ہوا کے ہاتھ پہ ریت سی۔ اینا نے رخ بدلنا چاہا۔ سائب نے اپنا ہاتھ نرمی سے روکا۔

''ہر چیز نہیں سمیٹی جا سکتی، جیسے میری ہتھیلی پہ ثبت یہ جنگلی خوشبو...... اس وادی کی سرگوشیاں، اس نے اینا کا گلابی چہرہ فرصت سے دیکھا۔ ''جیسے یہ لمحے اور......'' وہ خاموش ہوا۔ ''جیسے تم......''

آواز مدھم ہوئی، گمان ہوئی، اینا کی سنسان آنکھوں میں اک برف سی گھلی تھی، ان براؤن آنکھوں میں وہ چہرہ ثبت ہوا۔ وہ لمحہ فقط پتا جھڑنے کے برابر تھا۔ آنسو کے بکھرنے جتنا تھا۔ جس میں زمانے گزر گئے' سائب نے اگلے درخت کے تنے پہ ہاتھ رکھا۔

''میں اس ٹوکری میں اپنا نام پتا نہیں رکھوں گا۔'' مگر وہ لڑکی اپنے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ وہ پل اس ٹوکری میں سینت کے رکھ چکی تھی۔

سائب کے سیل فون پہ اک سگنل روشن ہوا۔ وہ الجھا...... وہ الرٹ ہوا...... اینا نے اپنی بند مٹھی کھولی، جس پہ کنکر بھری ریت تھی۔

''محبت قیام مانگتی ہے اینا۔'' اس نے ریت کو

انگلی سے چھوا۔ ''اور میں سفر ہوں۔'' اینا نے ان آنکھوں میں محبت کو دیکھا تھا، وہ وہاں رکی تھی اور اس لمحے ڈر گئی تھی۔

''مجھے افسوس ہے، میں اپنی مہمان کو سی آف نہیں کر سکوں گا۔ مجھے ابھی نکلنا ہو گا۔''

اس کی مسکراہٹ میں اداسی تھی، سنجیدگی تھی۔ وہ دونوں ساتھ چلنے لگے، اینا نے ریت کو اچھال دیا، اڑا دیا۔ جیسے وہ خود ان آنکھوں سے اڑی تھی۔ سائب نے ایک خشک سی آہ بھری۔

میرے ہم قدم یہیں ٹھہر جا۔

میرا ساتھ مثل غبار سا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کے پاس اسے جنگل میں الوداع کہنے آیا تھا، اب ان کا باغیچہ نظر آ رہا تھا، گاڑی پورچ سے باہر کھڑی تھی، وہ گھوم کے مقابل آیا۔ دو، دو قدم پیچھے۔

میرے ہم قدم ذرا دور ہی۔

میرا کانچ کا سا وجود ہے۔

''میں نہیں جانتا کبھی دوبارہ ملاقات ہو گی یا نہیں۔ مگر میں تمہیں رابطے میں رکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ عہد تھا، انتظار کا پرسہ...... ایک خواہش تھی...... وہ آگے بڑھا اور اپنے راستے پہ ہو لیا۔ ایک دو تین چار، اینا نے ان قدموں کو دس تک گنا تھا۔

میری آہٹوں کا یقین نہ کر۔

مجھے اب سپرد گمان کر......

اس نے موڑ کاٹنے سے قبل اسپیڈ ذرا کم کی اور الوداعی ہاتھ ہلایا۔ مگر وہ ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتی، یہ کیا عجب تھا کہ وادی کے مکین کو مہمان سی آف کر رہی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ سفر پہ نکلنے والے نے پتوں کے جھڑنے جیسا کوئی لمحہ اپنے زاد سفر میں رکھ لیا تھا۔

☆☆☆

حسن علیم کی دستک نے اور انعام امیر کے ادھورے سفر نے اس گھر کا موسم بدل دیا تھا۔ عطیہ چچی کی بالکونی میں رکھے بھاری گملے جو اپنی ہی مٹی کو کھا چکے تھے۔ اینا نے ان تمام میں نئی مٹی بھر کے نئے بیج لگا دیے تھے اور آج اس کام میں زینی نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا، ورنہ پہلے وہ چپ بھی کہتی۔

''ان پیڑ، پودوں کا کیا قصور ہے' چلو آؤ...... اور نہیں تو ان میں سورج مکھی ہی لگا دیتے ہیں کہ اس گھر سے دھوپ ہی کو تو انسیت ہے۔ اینا تپے چہرے کے ساتھ مسکرائی۔

رہنے دو اینا ابھی بہت کام پڑا ہے۔'' زینی ہر بار ٹال جاتی۔

''اور آج...... اینا نے طمانیت بھرا سانس لیا۔

بھلے ٹنڈ منڈ درخت ہی کسی پکھیرو کا مسکن ہو تو وہاں بھی رونق لگی رہتی ہے، پھر بہار بھی، کبھی نہ کبھی آ ہی جاتی ہے،' اس نے گیلی مٹی سے لتھڑے ہاتھ جھٹکے اور گملوں کو پانی دیتی زینیا کو غور سے دیکھا۔ جو دوسری مٹھی میں دبے بیٹھے دانے گاہے بہ گاہے جوگی کی جانب اچھال دیتی تھی۔

کل حسن۔ علیم بارات لے کر آ رہا تھا۔

''کیا زمین کے دامن میں پانی نہیں ہوتا؟'' وہ زینی کے قریب آئی۔ جس نے ایک تیقن کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''پانی ہی تو اس میں دھڑک رہا ہے۔''

''وہ پھر بھی بارش کی منتظر رہتی ہے، اسے بارش سے محبت کیوں ہے زینی؟''

''تم یہ سوال حسن سے پوچھنا۔'' زینی ڈھیر سارا شرمائی اور اسے حیرانی سے دیکھا جو اس کے چہرے پہ گیلی مٹی لگا کے بھاگ گئی تھی۔

☆☆☆

اس نے زیدا میر کے پاؤں کے ناخن تراشے، پھر پیروں کو تیل ملے، نیم پانی میں ڈبویا اور جھانوے سے ایڑیاں صاف کرنے لگی۔

''یہ زینیا والے تمام کام میں نہیں کر سکتی۔ بس بہت ہو چکا۔ اب واپس آ جائیں بابا!''

اس نے سر اٹھا کر باپ کو دیکھا۔ ''کب سے سفر کر رہے ہیں، اب بھی نہیں سمجھے۔''

اس کا لہجہ دھیما ہوا۔

''سفر میں ہی تو انسان خود پہ منکشف ہوتا ہے اپنا ضبط، حوصلہ اعتماد تب ہی تو وہ اس ہر چیز سے باخبر ہوتا ہے کہ دراصل وہ کیا ہے۔'' اس نے جھانوا ٹب میں پھینکا اور اپنے گیلے ہاتھوں میں باپ کا ہاتھ بھینچ لیا۔ وہ چند ثانیے بیٹی کا کرب آمیز چہرہ دیکھتے رہے۔

''اب واپسی کی ہمت نہیں ہے' مجھے اب آگے ہی سفر کرنے دو، جس نے تخت ہزارہ چھوڑا، وہ رانجھا، کب واپس گیا۔'' ان کے لب کپکپا کے رہ گئے۔

وہ باپ کی اس گہری سی بات پہ اندر تک سن ہوئی تھی۔

''ہم تک نہ آئیں اپنے دل میں تو واپس آجائیں۔ کہ دل کسی اللہ والے کے حجرے کی مانند ہوتا ہے...... جہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں کوئی موجود ہوتا ہے کوئی اٹھ کے چلا جاتا ہے، ایک ہی دکھ پہ تاعمر نہیں رویا جا سکتا بابا!'' وہ ٹوٹ کے بولی۔

''انسان کو غموں کو بھی بھولنا پڑتا ہے' وہ بھی جان بوجھ کے پلٹ کے دیکھتا ہے دکھ تازہ کرنے کے لیے' کبھی آگے کا سفر کرتا ہے کسی اور دکھ کا بار اٹھانے کے لیے اور زخم کھانے کے لیے اور بابا! یہی تو خدا پہ توکل کہلاتا ہے' ٹھہر جانا مایوسی ہے اور مایوسی کفر ہے۔'' آخر میں اس کا لہجہ اور آنکھیں دونوں ہی بھر آئے۔

وہ پرامید نگاہوں سے باپ کو تک رہی تھی۔

''میں اب اپنی طرف بھی نہیں لوٹ سکتا' میرے حجرے کو بھی میری ضرورت نہیں' مجھ سا گناہ گار۔'' وہ مسکرائے مگر ان کا لہجہ مٹی کھائے گملے جیسا ہی تھا۔

''مجھے آپ کی ضرورت ہے بابا!'' وہ لفظوں پہ زور دے کے بولی۔ ''اب باہر جاؤں تو محلے دار زید امیر کا حال پوچھتے ہیں اور آپ کے بعد ان کے لہجے بدل جائیں گے پھر وہ مجھ سے میرا حال پوچھا کریں گے۔''

اینا کو جتنا منتیں کرنے کا ڈھنگ آتا تھا وہ کر رہی تھی۔ ''عورت کا تعلیم یافتہ ہونا اسے کسی کا محتاج نہیں ہونے دیتا، اس کا اعتماد پختہ ہوتا ہے اسے پھر دنیا برتنا آجاتا ہے مگر سچ کہوں بابا...... میں نے سفر کیا اور میں نے جانا...... عورت جس قدر بھی بااختیار ہو جائے جتنی بھی مضبوط ہو جائے مگر دینی اور دنیاوی سفر کے لیے عورت کو محرم کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ خوامخواہ حاکم جیسے اوباش اور رمشا جیسے خود پسند اسے اپنی ذمہ داری سمجھنے لگتے ہیں۔ رمشا کی کلاس میں نہ سہی مگر ہماری کلاس کی عورتوں کو ایک محرم رشتے کا ساتھ ہی معتبر رکھتا ہے بابا...... آپ ہاں تو کریں، آپ ٹھیک ہو جائیں گے' آپ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔''

اس نے باپ کا کپکپاتا ہاتھ اپنے چہرے پہ رکھ لیا تھا جو اب اینا کے آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ اس تقریب ولیمہ میں جان بوجھ کے لیٹ آئی تھی اور تقریب کے شاہانہ رنگ ڈھنگ اس کے لیے متوقع تھے کہ وہ حسن علیم کا ولیمہ تھا مگر سامنے ہی اینا کے رنگ ڈھنگ دیکھ کے وہ خاکستر ہوئی۔ جو نہایت سکون کے ساتھ اسے دیکھ کے مسکرائی تھی۔

''رمشا اور میری کوئی دشمنی نہیں تھی' اس نے جو بھی کیا وہ غلط تھا وہ حسد تھا۔ مگر اب میں نے یا تم نے اس پہ کچھ بھی نہیں جتلانا۔'' اسے زینی نے سمجھایا تھا۔ ''لوگ اندر کی بات نہیں جانتے اینا! رمشا سے ہمارا کھنچاؤ یا دوری ہر صورت احسان فراموشی ہی سمجھا جائے گا کہ جس نے برے وقت میں آسرا دیا اب قسمت بدلی ہے تو آنکھیں بدلنے میں چار دن بھی نہیں لگائے۔''

زینی نے اس قدر متانت سے بات کی تھی کہ اینا کی سمجھ میں بات آگئی۔ پھر اسے اسٹیج کی جانب آتے دیکھ کے اینا پیش قدمی کرتے ہوئے وہاں تک آئی۔

''شکر ہے رمشا آپا! آج آپ نے شرکت تو کی۔'' وہ بلیک ساڑھی میں خود بھی نایاب کندن لگ رہی تھی۔

''کیا مطلب ہے؟'' رمشا کے چہرے پہ ہلکی

سی سختی در آئی۔

''کل میں نے اور اماں نے آپ کو بہت مس کیا۔'' اس نے جلدی سے بات بدلی اور حسنین کا منہ چوما جو اس کا پلو پکڑ کے کھڑا تھا۔ ''پھر فرہاد بھائی نے بتا دیا کہ آج تمہاری آپا سفر کی تھکاوٹ اتار رہی ہیں۔''

اینا بے فکری سے مسکرائی رمشا نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا جن میں تپش تو تھی ہی اور بھی بہت کچھ تھا۔

''تمہارے فون کو کیا ہوا تھا' میں نے تمہیں سینکڑوں کالز کیں اور جواب نہ پا کر پریشان ہوتی رہی۔'' اس نے آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے صاف نگاہ چرائی تھی کہ اینا نہ چاہتے ہوئے بھی سنجیدہ ہوئی۔

''فون صحیح ہوتا تو بات ہوتی۔ مگر اللہ کا شکر ہے آپا کہ مجھے وہاں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا ارے خولہ!''

وہ مسکرائی اور دوسری جانب بڑھ گئی۔ وہ رمشا کے گھر کافی عرصہ رہی تھی اور وہ فرہاد کے پورے خاندان سے واقف تھی سوائے حسن کے جو پچھلے کچھ سالوں سے یو کے میں تھا۔ وہ کب واپس آیا اور یہ سب کیسے ہوا اس نکتے پہ رمشا کی سوچیں درہم برہم ہو جاتی تھیں۔ اسے جب فرہاد نے اس شادی کے متعلق آگاہ کیا تھا تو اس خبر کا دھچکا خاصا شدید تھا اور اب ناقابل یقین صورت حال وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اینا اب اسٹیج پہ دلہن کے عقب میں کھڑی تھی اور رمشا کو بہرصورت اسٹیج پہ جانا تھا کہ فرہاد اس کو اشارے سے بلا رہا تھا۔

''حسن کی پرسنالٹی آج دیکھنے لائق تھی اور مسز فرہاد کا شمار آج بھی بدنیتوں میں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے تو زینیا کو حسن کی طلب اور تلاش سے بھی باہر کر دیا تھا مگر حسن کی قسمت کہ وہ یوں اچانک اس کے رتجگوں میں نیند کا موسم بن کے اتر آئی تھی اور آج ان لبوں کے تبسم تک میں مہک رہی تھی۔ رمشا نے ایک تلخ آہ بھری۔

پہلے وہ برتر تھی اب برابری کی بات تھی کہ اسے دلہن کے پہلو میں ہر صورت بیٹھنا تھا وہ ایک نازک ترین صورت حال تھی جب حسن متانت سے مسکرایا اور رمشا کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا تو مسز فرہاد نے ماتھے پہ آیا پسینہ صاف کیا تھا۔

''بھئی دولہا صاحب کے عزیز ترین دوست کل بارات پہ بھی نہیں تھے اور آج بھی غائب۔''

فرہاد نے اینا کے دل کا مدعا بیان کیا تھا جو مکمل دھیان سے حسن کے جواب کی منتظر تھی۔

''وہ کہاں کسی کے رابطوں میں رہتا ہے یار...... چند دن پہلے ایک دو منٹ بات ہوئی تھی۔''

وہ ششدر ہوئی کہ حسن کا لہجہ اس قدر نارمل تھا جس میں پریشانی یا شکوے کا شائبہ تک نہیں تھا وہ مطمئن سا فرہاد کی کسی بات پہ ہنس رہا تھا۔

☆☆☆

''اب میں اداس رہنے لگا ہوں' بجھا بجھا سا بے سکون سا۔'' اینا کا دل اب کچھ ایسی سرگوشیاں کرنے لگا تھا۔ آج اس نے کافی دنوں بعد ٹوکری سے چند پھول نکال کے اپنی ہتھیلی پہ رکھے۔

''تمہارے ہاتھ میں ان چیزوں کے سوا کچھ نہیں آنے والا' سو انہیں دیکھو اور انہیں بار بار گنو مگر یاد رکھنا اس میں سینت کے رکھے لمحے اب تمہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گے۔'' دل اس پہ ہنستا۔

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا وہ لمحے بھلے کھو جائیں مگر میں اپنی ساعتوں میں وہ سرگوشی سنبھال لائی تھی۔

''میں سفر ہوں تم دیکھنا کبھی اس کی داستان سفر میں ان راستوں اور ان گلیوں کا تذکرہ بھی ہوگا'' اس کے پاس بے بہا الفاظ تھے۔ دل خاموش ہو جاتا...... وہ خود بے چین ہو جاتی۔

''میں تمہیں رابطے میں رکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ ایک خواہش کا مبہم سا انتظار تھا اس ایک جملے میں عہد کہاں تھا کہ محبت گلہ آمیز ہوتی۔

محبت کے پاس ہزاروں دیے تھے مگر کسی نے بچھڑتے لمحے پلو سے کوئی ایک وعدہ' اک ذرا انتظار کا

اشارہ تک نہیں دیا تھا کہ اینا وہ دیے طاقوں پہ جلائے کسی دستک کی منتظر رہتی' وہ محبت تھی یا کچھ اور مگر اینا بھول بھلیوں کے بجائے سیدھے راستوں پہ چلنے کی عادی تھی۔

☆☆☆

ندرت اس کی تیاری سے جان گئی تھیں کہ وہ آج پھر کراچی جارہی ہے۔ زید کراچی میں ہی علاج کے سلسلے میں ہاسپٹلائزڈ تھے اور یہ حسن کے مشورے پہ ہی ہوا تھا بقول ڈاکٹر کے اس کے پاس کسی کا ٹھہرنا ضروری نہیں تھا مگر آج کل اس کا دل عجیب سے وہموں کا شکار ہوجاتا تھا ان دنوں وہ جاب لیس بھی تھی حالانکہ حسن اور زینی نے اسے اپنی سابقہ جاب کی بحالی کا بھی مشورہ دیا تھا کہ اب تو رہائش بھی مسئلہ نہیں تھی۔ ندرت ساتھ جانے پہ رضا مند نہیں تھیں اور وہ ماں کو تنہا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آج کل اس کا آدھا دن تو مختلف دفاتر کے چکر کاٹتے گزر جاتا تھا۔ اس پہ ہمہ وقت ایک جھنجھلاہٹ اور تھکن سی غالب رہتی۔

اسے باپ کی خاموشی بھی کھائے جارہی تھی۔ جنہوں نے اس کی بات مان لی تھی مگر اینا کے پہروں بیٹھنے کے باوجود اس کی ایک بات کا جواب بھی نہیں دیتے تھے۔

''اماں! اپنا دھیان رکھنا۔'' اس نے اس تاکید کے ساتھ ماں کو ترچھی نظر سے دیکھا جو ذہنی تناؤ کے تحت بات بے بات لڑ پڑتی تھیں اب بھی ایسا ہی ہوا۔

''یہ کیا پاگل پن ہے اینا......؟'' ان کی خفگی میں آج سختی بھی تھی۔

''ایسے مریضوں کے علاج حیدرآباد میں بھی ہوتے ہیں' اب من مرضی کرلی ہے تو یوں خود کو سفر میں ہلکان مت کرو۔''

''وہاں جو ڈاکٹر بابا کا علاج کررہا ہے۔ وہ حسن کا دوست ہے اور پھر۔''

''بس میں نے کہہ دیا یہ روز کا آنا جانا چھوڑو، ندرت نے جملہ کاٹ کے قطعی لہجے میں فیصلہ سنادیا تھا اینا تھوڑی دیر خاموش کھڑی رہی تھی اس نے دوسری نگاہ دانستہ درخت پہ ڈالی۔ آج کل پکھیرو کا زیادہ وقت تنے کی کھوہ میں گزرتا تھا۔ اب لُو نے کچھ شدت پکڑ لی تھی وہ برآمدے میں چلی آئی جہاں ندرت دھلے کپڑے تہ کررہی تھیں۔ انہوں نے اینا کا سپاٹ چہرہ دیکھا۔

''کل رمشا کا فون آیا تھا۔'' اس پہ نگاہ ڈال کے ندرت اپنے کام میں دوبارہ مشغول ہوئیں۔ اینا چپ چاپ اپنے ذرا بڑھے ہوئے ناخنوں کو گھورتی رہی ندرت نے اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے خود ہی دوبارہ بات شروع کی۔

''آج اس نے کچھ عجیب سا انکشاف کیا کہ میں تو حیران رہ گئی حالانکہ اس بات کا ذکر اس نے نہ سہی مگر تمہیں تو کرنا چاہیے تھا رمشا نے حاکم کو تمہارے لیے گلگت بھیجا تھا۔''

اینا کا دل بے طرح دھڑکا کہ غم دوراں میں اس حسین وادی کی یاد کسی ہوا کی ہی نذر ہوچکی تھی۔

''ہاں اس نے یہ احسان عظیم کیا تھا اپنے آوارہ اور لفنگے کزن کو میرے لیے اتنی دور بھیجا۔''

اینا کی آواز میں ابال سا ابھرا تھا۔ ندرت اسے کچھ دیر دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

''اس نے حاکم کو بھیجا تم نے آنے سے انکار کردیا اس بات پہ اب مٹی ڈالو۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ اب کہاں ہے۔ اینا! حاکم ابھی تک گھر واپس نہیں آیا۔'' اس کی بے توجہی اور غصہ پانی کے بلبلے کی مانند ہوا۔

''کیا مطلب اماں؟'' اس نے اضطرابی پہلو بدلا۔ ''کیا واقعی......؟'' اینا بے وقوفوں کی طرح ماں سے تائید چاہ رہی تھی۔

''تو کیا ایسی بات جھوٹ ہوسکتی ہے۔'' انہوں نے تہ شدہ بیڈ شیٹس اور تکیوں کے غلاف اوپر نیچے رکھے اور کھڑی ہوئیں۔ ''اس کا کہنا ہے کہ یہ سارا کیا دھرا اس میجر صاحب کا ہے۔ ماں کی بات پہ وہ جیسے چونک کے اچھلی۔

''وہ جاننا چاہتی ہے کہ اس روز حاکم اور اس میجر کے درمیان کیا بات چیت ہوئی تھی۔'' ندرت اتنا کہہ کے اندر چلی گئی تھیں۔

اس وقت ماں کے قدم گنتی اینا کی حالت یوں تھی جیسے کسی نے اس کو منوں برف کے اوپر لٹا دیا ہو۔ وہ میجر صاحب جن کا نام سائب تھا آخر اس کی حقیقت کیا تھی۔

☆☆☆

شاید ابھی ہی اس کی آنکھ لگی تھی کہ تکیے کے ساتھ پڑے اس کے فون نے تھرتھرانا شروع کیا کہ وہ رات کو اس کی بیل بند کرکے سوتی تھی۔ حالانکہ پہلے وہ فون ہی بند کرکے سوتی تھی۔ اب باپ کی وجہ سے اسے عجیب سے خدشات ستاتے تھے وہ اگلے لمحے کال ریسیو کرچکی تھی۔

''جی کون......؟ اس نے پوچھا دوسری جانب چھائی خاموشی سے وہ جھنجھلائی۔ ''فارغ لوگوں کو رات کو بھی چین نہیں۔'' وہ بند کرنے کے موڈ میں تھی۔

''چین تو سمجھو، دن کو بھی نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بات کی۔ ''جبکہ فارغ والی بات پہ میں اتفاق نہیں کروں گا۔''

اینا نے ایک گہرا سانس لیا کہ وہ اسے پہچان چکی تھی۔

''غالباً آپ نے اس ٹوکری میں اپنا نام پتہ نہیں رکھا تھا۔'' وہ خاصے توقف کے بعد گویا ہوئی۔ انداز کچھ شکوہ کناں' کچھ خائف سا تھا جواب میں سائب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''مگر میرے کہنے کے باوجود تم نے مجھ سے چھین کے سب کچھ رکھ لیا تھا۔'' رات کے اس سمے وہ مدہم لہجہ بھاری اور ہلکا سا بوجھل تھا، اگلے چند لمحے خاموشی کی نذر ہوئے۔

''میں نے آپ کو ایک گلاس کمپنی میں دیکھا تھا آپ اس قدر الجھی ہوئی تھکی ہوئی اور پریشان کیوں ہیں؟'' وہ اچانک سنجیدگی سے بولا وہ حیرت سے سُن ہوئی۔

''آپ وہاں تھے تو سامنے کیوں نہیں آئے۔'' وہ یہ نہیں کہہ سکی کہ میرے شہر سے ہوکے چلے گئے اور۔

''میرے ساتھ چند دوست تھے جن کی وجہ سے تمہارے پاس ٹھہرنا مجھے غیر مناسب محسوس ہوا۔'' گفتگو میں بار بار آتی خاموشی اپنے من پسند لفظ چن لیتی تھی، وہ جیسے جواب کا منتظر تھا۔

''میں وہاں جاب کے سلسلے میں گئی تھی۔'' اینا کی سرسری سی وضاحت پہ اس نے ایک گہرا سانس بھرا۔

''تمہیں ایک ایڈریس سینڈ کروں گا اپنی سی وی وہاں دے آنا ان شاء اللہ جاب ہوجائے گی۔'' وہ مزید سنجیدہ ہوا...... تو اس کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ہی اسے اچانک کچھ یاد آیا۔

''حاکم ابھی تک واپس گھر نہیں لوٹا۔'' اس کا لہجہ سوالیہ کم تفتیشی زیادہ تھا۔

''اس ذرا سی فرصت میں، میں کسی حاکم یا فقیر کا ذکر نہیں سننا چاہتا۔'' اس کا تپا سا لہجہ راہ فرار اختیار کرنے جیسا تھا۔

''لیکن میری اماں کے پاس اب یہی ذکر ہوتا ہے۔'' اس نے گویا التجا کی ......دوسری جانب اک طویل سانس لیا گیا۔

''ایک تو وہ تم سے بدتمیزی کے ساتھ پیش آیا۔ دوسرا اس کی وہ کمینی سی مسکراہٹ، سال تک تو اس کی واپسی ممکن نہیں۔'' بالآخر اس نے تسلیم کر ہی لیا۔

اینا کے اندر جھکڑ چلے، اف یہ بندہ۔

''کل اس گلاس کمپنی میں بھی مجھے ایک شخص نے کمینی سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تھا، پرسوں میرا جھگڑا ایک رکشہ ڈرائیور سے ہوا تھا۔ اس سے بیشتر ایک نرس سے۔''

''اور یاد کرو اس سے بھی کہیں بیشتر، ویلی ہاؤس میں، مجھ سے وہ پہلا جھگڑا۔'' وہ اس کے ادھورے جملے میں خود کو بھی گھسیٹ لایا اور خاصی دیر

تک ہنستا رہا۔

"اس کا بدلہ آپ نے مجھے بلا کہہ کے چکا دیا تھا۔" وہ اپنے مخصوص نروٹھے پن سے گویا ہوئی اور جواباً سائب کے جان دار قہقہے پہ کتنے ہی دنوں بعد کھل کے مسکرائی۔

"وہ جھوٹ نہیں تھا اینا...... تم وہ بلا ہو جو دن کو پیچھا نہیں چھوڑتی اور راتوں کو سونے نہیں دیتی۔" اس کے دھیمے سے لہجے نے اک نیا رنگ لیا۔ اینا نے اگلا سانس لیتے ہوئے بہت احتیاط برتی تھی کہ کسی آہ سے بھی کچھ عیاں نہ ہو۔

"اچھا سنیں تو، پلیز وہ حاکم۔"

"اسٹاپ اٹ اور پلیز اس شخص کا نام آئندہ میرے سامنے کبھی مت لینا۔" اس نے ٹوک کر کہا تو اینا چپ ہوگئی۔

"چند دنوں تک آجائے گا۔" وہ خاصے توقف کے بعد بولا تھا۔

"میں آج شام تمہارے بابا کی خیریت دریافت کرنے ہاسپٹل گیا تھا۔"

وہ ایک دم سیدھی ہوئی۔ "وہاں میری مختلف ڈاکٹرز کے ساتھ ڈسکشن ہوئی تھی' ان کی حالت بہتری کی جانب مائل ہے۔" اس کا مدھم لہجہ بالکل اپنا سا، خبر لیتا ہوا۔ درد بانٹتا ہوا تھا۔ اینا کی آنکھ سے آنسو اک ستارے کی مانند ٹوٹا۔

"میں اس وقت ثمن روڈ پہ ہوں۔" وہ شخص پل پل مزاج بدل لیتا تھا۔ اینا ہڑ بڑا کے کھڑی ہوئی کہ ثمن روڈ کی پہلی گلی میں ان کا گھر دوسرے نمبر پہ تھا۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں۔" وہ کھڑکی تک آئی۔

"تم اجازت دو تو گلی میں آسکتا ہوں۔" وہ لہجہ اور وہ جملہ دونوں ہی دھڑکنوں میں شور بپا کر چکے تھے۔

"اس وقت نہیں پلیز۔" سائب کی ہنسی میں اک آس سی چمکی تھی اک دھیان سا بکھرا تھا اس نے اک سلگتا سا سانس لیا۔

"کل میں نے تمہارے گھر کی بالکونی میں اک لڑکی کو دیکھا جو کھلے بالوں کے ساتھ گملوں کو پانی دے رہی تھی۔ میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ کہ اس پہ یلو کلر بھی سوٹ کرتا ہے۔" اس نرم لہجے میں کھلتے بھید نے اینا کے چھکے چھڑائے۔

"مطلب کہ آپ۔" وہ دروازہ کھول کے برآمدے میں آئی۔ اس کی ماں گہری نیند میں تھی۔

"آپ نے حسن سے ایڈریس لیا یا زینیا سے؟" اب وہ دوسری فکر میں مبتلا ہوئی۔

"کسی سے بھی نہیں۔" وہ لہجہ قسم دینے جیسا تھا۔ "محبت ہوگئی اور محبوب کی گلیوں کی خاک چھانے بنا دعوے دار بھی بن بیٹھے کہ یہی عشق ہے یاد کرو اینا تم نے حسن سے کچھ ایسا ہی کہا تھا۔"

وہ اس کی حواس باختگی محسوس کرسکتا تھا۔ جو اب سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

"میں نے درجن بھر جوتے گھسا کے تمہاری گلیاں ڈھونڈی ہیں۔"

اس کے ایک ایک لفظ میں مسکراہٹ کی آمیزش تھی۔ وہ شخص محسوسات کی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ اس کو کیا جتا رہا تھا وہ بالکونی پہ کھڑی جیسے کوے میں اتر چکی تھی۔ ثمن روڈ پہ سڑک کے اس جانب لینڈ کروزر سے ٹیک لگائے وہ مئی کی راتوں میں جلنے والی لو جھیلتا شخص کیا واقعی سفر تھا۔ جس کی آہٹیں گمان نہیں تھیں تو یقین بھی نہیں تھیں۔ دوپٹے کا اک ذرا پلو کندھے پہ تھا وہ ننگے پاؤں تھی' اگر وہ گلی میں نکل جاتی تو سسی بن جاتی۔ گھڑا اٹھا لیتی تو سوہنی۔

"اب دل میں بھی یہ شکوہ مت کرنا کہ شہر میں آیا اور۔" سائب کی ہنسی میں خواہش کا کانچ ٹوٹا تھا وہ چند قدم آگے ریلنگ کے پاس آئی۔

"جو اپنی تمناؤں کا حال پوچھا تو جلتی ہوئی چند شمعیں بجھا دیں اب چلنا چاہوں گا۔" وہ باخبر کررہا تھا اس کے لہجے میں تمام شمعیں روشن تھیں اس کا سر اٹھا ہوا تھا۔

"تم کون ہو؟" اینا کا آنچ دیتا لہجہ راہ روکنے جیسا تھا۔

"میں!" وہ لہجہ وہ آہ، کسی زہر کے پیالے میں ڈوب کے ابھری تھی "میں خواب نہیں ہوں اینا! مگر میں کیا کروں۔ میں قیام بھی نہیں فی الحال تو میں بس نیم جاں سا ہوں۔" وہ جیسے خود پہ ہنسا۔ "نہ پہلے اپنی ذات کے لیے بھٹکتا تھا اور نہ ہی آج کہ دل لگی ہی دل لگی میں دل گیا۔" اس نے کس قدر پُر غرور قہقہہ لگایا تھا کہ وہ بوکھلا سی گئی۔

پیڑ پہ بیٹھا پکھیرو مسکرایا...... وہ پتوں پہ سرسراتی ہوا کی مانند ہنسا اور چلا گیا وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔

پکھیرو نے اک نیم جاں نگاہ اس پہ ڈالی، محبت قیام نہیں، سفر ہی محبت ہے مجھے دیکھو خواہش نیم جاں، میں وہی ہوں جو دھول اڑواتی ہے جو دھمال ڈلواتی ہے' اینا کی گلی میں محبت کھڑی تھی اس کی گلیاں ڈھونڈنے والا کہیں آگے سفر پہ جا چکا تھا۔

☆☆☆

اگرچہ وہ ابھی گھر نہیں آئے تھے مگر اس احساس کے ساتھ ہی چہل پہل کا گمان ہو رہا تھا کہ وہ اپنے گھر میں دوبارہ اک بھرپور زندگی کے ساتھ آئیں گے۔ باپ کی صحت مندی پہ اینا نے شکرانے کے نفل ادا کیے' دو چار دنوں سے زینیا بھی آئی ہوئی تھی۔

ندرت دیگ بانٹ کے فارغ ہوئیں تو ان ہی کے پاس آ بیٹھیں جو شرط لگا کے خربوزہ کھا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد زینیا باتوں کو توڑ موڑ کے اپنے اصل موضوع پہ آئی۔

"کچھ بہت اچھے رشتے میری نظر میں بھی ہیں اور ایک دو گھرانوں نے تو مجھ سے خود بات کی ہے۔"

اینا نے خربوزے کا پیس واپس پلیٹ میں رکھا اور پلیٹ میں پڑی چھری اٹھا کے زینیا کے ہاتھ پہ ماری "اف ہائے" اس نے دہائی دی پھر آنکھوں سے پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے۔

"مسز حسن توجہ فرمائیں کہ یہ وچلنوں والے کام تمہارے اسٹینڈرڈ کے نہیں۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"اینا اپنی زبان بند رکھو اور مجھے زینیا کی پوری بات سننے دو۔" ندرت کو اس کی دخل اندازی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔

"ہاں تو زینی تم کیا بتا رہی تھیں؟" اب ندرت اپنی تمام توجہ سمیت اسے دیکھ رہی تھیں۔

"آں، ہاں!" وہ چونکی کہ دھیان کہیں اینا میں ہی الجھا تھا پھر وہ ان کی جانب متوجہ ہوئی۔ اب کے اس کی آواز اس قدر مدھم تھی کہ تائی کو کان سے دوپٹہ ہٹاتے دیکھ کے اس نے اپنی ہنسی بمشکل کنٹرول کی تھی۔ اسے شک نہیں یقین تھا کہ وہ کہیں سیڑھیوں پہ کھڑی ان کی باتیں سن رہی ہوگی۔

☆☆☆

اب زید امیر کے آس پاس سگریٹ کا دھواں نہیں اٹھتا تھا البتہ ان کے اردگرد قبرستانوں کی سی خوشبو ضرور اڑتی تھی ان کے وجود میں ایک خنکی اتر آئی تھی ان کی آنکھوں میں شہر خموشاں کے حاکم پرندے اڑنے لگے تھے حالانکہ وہ جب بھی قبرستان جاتے اینا ساتھ ہی ہوتی وہ اس کے ساتھ خالی ہاتھوں واپس آتے پھر اپنی مٹھی بند کرلیتے اور اسے تکتے رہتے اور کسی بھید کی صورت اینا کے دل میں بند مٹھی کا خوف روز بروز پنپ رہا تھا۔

اب انہیں گھر آئے ایک ہفتہ ہو چلا تھا اینا نے ان کا سرخ چہرہ دیکھا تو فوری اسے چھوا وہ بالکل ٹھنڈا تھا' حالانکہ موسم کافی گرم تھا۔ زید نے اس کا ہاتھ تھام کے قریب ہی بٹھا لیا۔ وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ وہ جیسے باپ کے چہرے کا طواف کررہی تھی۔

"آپ وضو کرنا چاہتے ہیں؟"

انہوں نے بیٹی کو دیکھا اور مسکرائے۔ میرے اندر تو نماز ہو بھی چکی۔" وہ اکثر ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ اینا کا چہرہ سفید پڑا وہ اب میٹھی سی نظر سے درخت پہ بیٹھے پنچھی کو تک رہے تھے جسے وہ کبھی منحوس کہتے تھے۔

"میرے سر کو درِ تیرا مل گیا۔ مجھے اب تلاش حرم نہیں۔" انہوں نے بجھی کے بولوں کے ساتھ بول ملائے تھے۔

"اسے زینی کی نماز سے محبت تھی۔ جانتی ہو کیوں؟" اینا باپ کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ "نماز تو تم بھی پڑھتی ہو مگر اسے ہمیشہ اور ہر موسم میں اس درخت کی چھدری شاخوں تلے نماز پڑھنے والی زینو پسند تھی اور حرم کے باسیوں کو اللہ تعالیٰ انعام واکرام سے نوازتا ہے، مجھے بھی اس کی نماز سے محبت تھی وہ خالی دامن ہو کر بھی غنی ہوتی' میں نے محبت سے سجدہ کرنا اسی سے سیکھا۔ دیکھو، دیکھو اینا!" انہوں نے درخت کی طرف انگلی اٹھائی۔

"وہی جوگی ہوتا ہے جو تخت ہزارہ چھوڑ دیتا ہے۔ اب یہ مجھ میں اک سرائے نہیں حجرہ آباد کر چکا ہے۔" اینا روح تک ٹھٹھر گئی۔ "یہ اندر دھول اڑاتا ہے۔ یہ سارے پرندے اڑا دیتا ہے بس اکیلا واحد وجود کے اس ٹنڈ منڈ درخت پہ اک وہی بیٹھا ہے۔" ان کا تکلم صندلی مہک لیے تھا۔

"بابا!" اینا کے لب ہلے، اس نے باپ کے خشک ہونٹوں کو دیکھا۔ وہ کچن میں پانی لینے آئی اور جب واپس ان کے کمرے میں گئی تو وہ پرسکون ہو کر ابدی نیند سو چکے تھے۔

☆☆☆

"ایسا کیوں ہوا کہ بابا جب ٹھیک ہو گئے تو چلے گئے۔" وہ دن میں کئی بار یہ جملہ دہراتی اور جتنا اس بات کو سوچتی عجب سی وحشت اور بے سکونی کا شکار ہوتی۔

"تایا کا شمار ان خاص بندوں میں ہوتا ہے اینا جو راہ ہدایت پا کر خدا کے حضور پیش ہوتے ہیں۔"

وہ کئی بار چونکتی اور زینیا کو غور سے دیکھتی...... اسے اپنے باپ کی آخری گفتگو یاد آتی...... اسے دو تین روز سے بخار محسوس ہو رہا تھا تاہم وہ جاب پہ جا رہی تھی شام کو وہ یونہی کسل مندی سے کمرے میں پڑی تھی جب زینیا نے اندر جھانکا۔

"اینا جاگ رہی ہو تو ڈرائنگ روم میں آ جاؤ میجر سائب آئے ہیں۔"

وہ اسے مطلع کر کے پلٹ گئی تھی...... کتنے ہی عرصے بعد اس کا دل معمول سے ہٹ کے دھڑکا تھا اس واحد فون کال کے کچھ عرصہ تک بھی نہ کبھی اس کا میسج آ جاتا تھا پھر وہ سلسلہ بھی بند ہوا...... چند روز بیشتر اسے حسن نے بتایا تھا کہ سائب پچھلے کچھ ماہ سے ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ یعنی وہ خیر خبر رکھتا تھا۔ تب ہی تو تعزیت کی خاطر آ گیا تھا دل یک گونہ خوش فہم سا ہوا تھا مگر اس کی طبیعت پہ چھائی بے حسی بے حد بوجھل تھی۔ پھر بھی ڈرائنگ روم کا دروازہ پار کرتے ہوئے دل میں اترا سناٹا اک واضح شور کا شکار ہوا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹھکی۔

کیا یہ شخص وہی تھا جس سے وہ سات آٹھ ماہ قبل مل چکی تھی۔ اینا کو دیکھ کے وہ اپنی جگہ سے فوری کھڑا ہوا۔ ان دونوں نے ہی اک نظر غور سے ایک دوسرے کو دیکھا کئی دنوں کی بڑھی شیو کے ساتھ اس کا رنگ بھی خاصا سنولایا ہوا تھا...... اظہار افسوس کے بعد اس نے اینا کو سمیٹنے والی جوڑنے والی نظر سے دیکھا تھا مگر اینا کو وہ خود کسی بہت بڑی ٹوٹ پھوٹ کا شکار نظر آ رہا تھا۔

"آپ ٹھیک تو رہے ہیں۔" اک ذرا تذبذب کے بعد اس نے دریافت کیا تو وہ ذرا سا ہی مسکرایا۔

"زندگی میں پہلی بار اپنے آفیسر کو چکمہ دے کے نکلا ہوں صرف اور صرف تمہارے لیے کہ تکلیف بانٹ لینے سے ذرا کم پڑ جاتی ہے۔"

اس مہربان لہجے کی مدھم نرمی میں اینا کی تکلیف کم ہونے کے بجائے کچھ اور بڑھ گئی تھی یہ وہ تکلیف تھی جو اس کے چلے جانے کا محسوس کر کے ہو رہی تھی۔

"اب آپ کہاں ہوتے ہیں؟" وہ جو صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر لمحوں میں صدیوں کا سا ستا چکا تھا اس نے اپنی بوجھل آنکھوں کو دھیرے سے وا کیا پھر اس کا تمتماتا چہرہ، جی جان سے اور فرصت سے دیکھا۔

"پتا نہیں کہاں کہاں ہوتا ہوں۔" وہ گمان کا سا ہنسا۔ "لیکن زندگی نے ساتھ دیا تو کسی روز تمہیں بتاؤں گا۔" وہ کھڑا ہوا...... انداز اجازت لینے جیسا تھا وہ بے چین ہوئی۔

"تمہیں کچھ ہفتے جاب پہ نہیں جانا چاہیے میں ابراہیم سے تمہاری چھٹی کی بات کروں گا۔"

اس نے اینا کا تحمل۔ چہرہ دھیان سے دیکھا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود اس سے دوبارہ آنے کا کہہ نہیں پائی' بس مضطرب سی نگاہ اٹھائی، لیکن وہ اس خاموش اصرار کو محسوس کر چکا تھا۔

"نہیں جانتا کہ کب...... وقت نے مہلت دی تو ضرور آؤں گا اور اب کسی روڈ پہ نہیں گھر آؤں گا۔" وہ پاس سے گزرتے ہوئے اس کے قریب رکا۔

"کچھ عرصہ پہلے وادی میں جانا ہوا اور کیا عجب ہوا کہ پہلے کی طرح، نیند کی خواہش نے مجھے خوش آمدید کہا...... تاہی خاموشی میری جانب لپک کے آئی۔ وہاں اک اضطراب تھا...... تمہارا احساس تھا، وہاں ہر جگہ تم تھیں اور تو اور ساون نے بھی مجھے دیکھ کے اینا، اینا کہا تھا۔"

وہ ہنسا تو خاک سی اڑی۔

"پہلے صرف میں تھا تو اک پل بھی اک عمر محسوس ہوتا تھا، میں نے اب جانا کہ محبت زندگی چاہتی ہے' بے حساب زندگی اور جب کوئی منتظر ہو تو سفر قیام چاہتا ہے ایک طویل قیام۔"

وہ چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اسے الوداعی مسکراہٹ سے نوازتا دروازے کی جانب بڑھا، مگر دروازہ عبور کرتے ہی اس کے قدموں نے رفتار پکڑ لی تھی، اب وہ نگاہ کا حصار توڑ چکا تھا۔ مگر اینا نے اسے بہت دور تک دیکھا وہ کون تھا۔ وہ کیا تھا کہ جس کا سفر اک مختصر سے قیام کو اب ترس رہا تھا۔

☆☆☆

وقت ذرا سا آگے سرکا تو کچھ اس کے اندر کا موسم اور کچھ باہر کا موسم قدرے بدل سا گیا تھا۔ اس گھر کے چھوٹے سے لان اور بھاری گملوں میں اس سرگوشیاں کرتی وادی کے پھول کھل اٹھے تھے اور وہ مہک ہمہ وقت اینا کا تعاقب کرتی تھی۔

زینیا ایک پیارے سے بیٹے کی ماں بن چکی تھی وہ ایک دو ہفتے ان کے یہاں گزار کے گئی تو گھر میں پھر سے خاموشی چہل قدمی کرنے لگی تھی۔ ایسے ہی کسی خاموش سے دن میں، رمشا فرہاد اپنے تئیں ان کے لیے بہت بڑی نوید کے ہمراہ آئی تھی۔

"خالہ رشتہ بہت اچھا ہے۔ گھر بھی بہت بڑا ہے، ان کی اپنی فیکٹریاں ہیں اور انہیں رشتوں کی کمی بھی نہیں۔ بس زبیر بھائی کسی خاندانی لڑکی سے شادی کے خواہاں ہیں جسے زمانے کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ جب انہوں نے مجھ سے ذکر کیا تو جانے کیوں میرا دھیان فوری انعام کی طرف ہی گیا۔"

اس نے اپنے سامنے خاموش سی کھڑی انعام کو مسکرا کے دیکھا تو انعام آج بڑے دنوں بعد دل سے خوش ہوئی...... ندرت زید کے چلے جانے کے بعد بالکل گم صم سی ہو کے رہ گئی تھیں۔

"پہلے تم چائے وغیرہ تو پی لو پھر بات کرتے ہیں۔" انہیں بھانجی کے آنے کی خوشی ہوئی تھی مگر وہ حسن یا زینیا سے مشورہ کیے بنا، بات آگے نہیں بڑھانا چاہتی تھیں، دراصل رمشا کو جب سے خبر ہوئی تھی کہ سائب یہاں تعزیت کی غرض سے آیا تھا تب سے برے خدشات کے ساتھ اس کا حسد دن دگنی تو رات چگنی ترقی کر رہا تھا۔

وہ چونکی تھی کہ ہمیشہ سے گمشدہ سا میجر سائب خود کو کہیں بہت دور سے ڈھونڈ کے اک طویل سفر کے بعد صرف اس انعام نامی لڑکی کو پرسہ دینے کی خاطر آیا تھا...... وہ بچی نہیں تھی کہ بھلے چند گھڑیوں کے لیے سہی کوئی یونہی بلاوجہ خود کو تلاش کے واپسی کا سفر نہیں کرتا۔ اینا اسے تادیر دیکھتی رہی جو نہایت سکون کے ساتھ چائے پی رہی تھی پھر اس نے ماں کو دیکھا۔ وہ عصر کی نماز پڑھ رہی تھی۔

"آپ جن کا پروپوزل لائی ہیں' آپ کی

باتوں سے تو لگ رہا ہے کافی مال و دولت کے مالک ہوں گے۔“

اس نے بات کرتے ہوئے ٹانگ پہ ٹانگ جمائی اور رمشا پہ اپنی نگاہ کو جمایا جس نے ذرا بھنویں اچکا کے اسے دیکھا تھا۔ ”ہمارا اور ان کا بھلا کوئی جوڑ بنتا ہے اور ان کی فیکٹریاں اور میں ایک فقیر کی بیٹی۔“

وہ مسکرائی، رمشا کا رنگ فق ہوا۔ اس نے بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا۔

”ایک بات بتاؤں آپا!“ اس نے دانستہ آواز دھیمی کی اور ذرا اور اس کی طرف کھسکی۔ ”میرے بابا جب آئندہ کی بات کرتے تھے تو ان کے انداز میں تختی یقین اور قطعیت ہوتی تھی اور جب غرور آئندہ کی سلطنت پامال ہوئی اور یقین کل کا تختہ الٹ گیا تو وہ حال کے بھی نہیں رہے تھے۔ انہوں نے خود کو موجود سے بھی نکال لیا تھا پھر وہ کسی کے ہو گئے تھے اور آپ۔“ وہ تلخی کے ساتھ ہنسی...... آپ کا مسئلہ بھی قریب قریب ویسا ہی ہے۔ میں یہ نہیں ہونے دوں گی یہ یقین، یہ قطعیت کفر ہے، انسان کو یہی دو چیزیں ڈبو دیتی ہیں پھر وہ ہم یہ ثابت کر دیتا ہے کہ وہ ہوتا ہے جو میں چاہتا ہوں مگر افسوس آپ پہلے تجربے کے بعد بھی نہیں سمجھیں۔“ اینا نے اسے تاسف سے دیکھا ”آپ نے جو حسن کے ساتھ کیا۔“

”وہ میں نے صرف زید امیر کی وجہ سے کیا تھا۔ وہ ضبط کی قائل نہیں تھی وہ ایک دم مشتعل ہوئی...... مگر اینا اپنے ادھورے جملے سمیت پرسکون تھی اس نے جو کہنا تھا کہہ چکی۔

”تمہارا اکھڑ باپ شروع سے ہی زینیا کو بہو کے روپ میں دیکھتا تھا اور اگر حسن سے میں جھوٹ نہ بولتی تو مورد الزام میں ہی ٹھہرائی جاتی اس وقت غلط بیانی میں ہی بہتری تھی۔ میں یہ حقیقت حسن پہ واضح کر چکی ہوں۔“ وہ اشتعال انگیزی سے کھڑی ہوئی۔

”وہ بہت اونچی اڑان پہ ہے۔ تم اس کے پر بھی نہیں گن سکو گی انعام امیر!“ وہ پھنکار کے گویا ہوئی۔

”تمہارے پاس بے شمار پیسہ ہے بھلے زمانہ خرید لو، لیکن شادی کے لیے تمہیں ایک ویل اسٹیبلشڈ مرد چاہیے تھا وہ تم لے چکیں۔“ وہ جملہ، اینا کی وہ مسکراہٹ اسے سرتاپا سلگا گئی۔

”مجھے افسوس ہے کہ ایلیٹ کلاس کے تمام مردوں کے جوڑے بناتے ہوئے اللہ کو آپ سے مشورہ کر لینا چاہیے تھا۔“

اینا کی مسکراہٹ گہری ہوئی جبکہ رمشا کا حسین چہرہ بالکل سیاہ پڑ چکا تھا اس نے اپنا قیمتی کلچ اٹھایا، اور اپنی خالہ کو خدا حافظ کہنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا اینا اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

رمشا ستار بھی زینی اور انعام کے رشتہ داروں میں سے تھی۔ وہ کسی ولی اللہ کی بیٹی نہیں تھی، اتنی سی بات سمجھنے سے وہ قاصر تھی کہ فرہاد بھی اسے مقدر سے ملا تھا۔ اینا نے طمانیت سے بھرپور سانس لیا۔ اس نے بعد میں سائب اور رمشا کی تلخ کلامی کے تمام جملے ذہن میں دہرائے تھے اور اس نے جان لیا تھا کہ رمشا سائب کی محبت میں اب بھی گرفتار ہے...... پھر زینیا سے بھی اس نے کافی معلومات لی تھیں انعام امیر کو اپنے ساتھ چھین لے جانے کا فیصلہ رمشا کے لیے عمر بھر کا پچھتاوا ثابت ہونے والا تھا۔ چلو اگر لے جا رہی تھی تو وادی میں چھوڑ کے ہی نہ جاتی کاش۔

☆☆☆

اب سمجھنے سمجھانے سے بات بڑھ جاتی تھی وہ عجب ضد پہ اتر آئی۔

”جب نہیں کہہ دیا تو بس نہیں۔“ وہ قنوطی سی ہو چکی تھی عجیب سو زینیا اور تائی دونوں ہی نے اس کی شادی کے معاملے میں چپ سادھ لی تھی اور اسے واقعی اس کے حال پہ چھوڑ دیا۔

”وہ پکھیرو جانے کیا چیز تھا اینا اس کے مرنے کے بعد ایسی ہو گئی ہے ورنہ پہلے بحث کے بعد ہر بات مان لیتی تھی۔“ تائی کی آواز میں خنکی سی اتر آئی۔

”ایسا کچھ نہیں تائی!“ زینیا کے اندر ہول سے اٹھتے۔ اینا اس پکھیرو۔ سے کہاں اٹیچ تھی وہ تو اس کے ساتھ میری دلداریوں پہ بھی ہنستی تھی اور بسمہ کا تو مذاق تک اڑاتی تھی۔“ زینی موضوع بدلنے کی غرض سے کوئی اور قصہ چھیڑ دیتی کہ عمر بھر کو بات آئی گئی ہو جاتی۔

”اب دیکھو نا، کتنی محنت اور شوق سے وہ پھول پودے اس نے لگائے تھے پھر خود ہی ہر چیز اکھاڑ کے پھینک دیے۔“ ندرت کے لہجے میں اک انہونی سی سرسرائی، تھوڑی دیر بعد وہ بات کا رخ موڑ کے وہیں لے آتیں۔

”اف، تائی بھی نا......“ کس طرح کے خدشات پال چکی ہیں۔

”اسے دیکھیں تو تائی! میرے بیٹے کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہے۔“ وہ تین سالہ بیٹا تائی کی گود میں ڈالتی۔

”میں ابھی سوئی لے کر آتی ہوں۔“ وہ وہاں سے بھاگ لیتی اور ندرت بے چاری اگلے ایک گھنٹے تک اس ننھے تلوے سے کانٹا تلاش کرتی رہ جاتیں اینا سر جھٹک کے مسکرا دیتی تو کبھی زینیا کو گھور کے پاس سے گزر جاتی۔ زینی وہاں اپنے قیام کا ایک آدھ دن یونہی تائی کو بچے کے ساتھ الجھائے رکھتی۔

اینا کسی کو کیا بتاتی کہ سال بھر پہلے اک لمحہ اسے کیسا بے آباد کر چکا تھا وہ کراچی گئی تو اس کی کالج کے زمانے کی دوست سر راہ ملی اور اسے لنچ پہ مدعو کر لیا اور اس نے لنچ کے وقت سے کافی پہلے اسے حسن کے گھر سے پک بھی کر لیا تھا۔

”یار گھر سے نکل رہی تھی تو ماما کا فون آ گیا کہ ایئرپورٹ سے چاچو کو ریسیو کر لینا تو اب مجبوری ہے۔“ جب وہ دونوں وہاں پہنچیں تو مطلوبہ فلائیٹ آ کر چکی تھی۔ وہاں کافی سے زیادہ بھیڑ تھی۔ سندس تو آگے بڑھ گئی مگر اینا چونکتے ہوئے رکی۔“ وہ سائب ہی تھا جبکہ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ لڑکی اسٹائل اور ڈریسنگ کے لحاظ سے ماڈرن ترین تھی۔

اینا کی آنکھوں میں شدید حیرت ابھری اس کی آنکھیں گلاس وال کے پار جم سی گئیں۔ آج وہ اس قدر ڈیشنگ، ترو تازہ اور صحت سے بھرپور دکھائی دے رہا تھا کہ دیکھنے والی ہری بھری ہو گئی۔ جیسے وہ سرگوشیاں کرتی پریوں کی وادی میں کھڑی تھی اور جیسے کہ وہاں وہ سائب کے استقبال کے لیے ہی آئی تھی۔

”اف وہ مجھے یہاں سامنے پا کر کس قدر حیران ہو گا۔“ اس نے بے تحاشہ سنسنی محسوس کی وہ دھیمی چال کے ساتھ اس لڑکی کی ہمراہی میں ہنستا مسکراتا اب بالکل سیدھ میں آ رہا تھا مگر اینا کی توجہ اس لڑکی پہ کہاں تھی آج وہ اس قدر دلکش لگ رہا تھا کہ فاصلہ مزید کم ہوا وہ اپنے مخصوص اسٹائل کے ساتھ آہستگی سے مسکرایا اور ہمقدم لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ اینا کے دل میں اوس سی پڑی۔ اب وہ بالکل آمنے سامنے تھے اسے ہمیشہ شکوہ ہوتا تھا کہ تم براؤن رنگ ہی پہنتی ہو آج اس نے میرون رنگ پہنا ہوا تھا۔

اس دلکش مرد نے نگاہ اٹھائی مگر ان آنکھوں میں اجنبیت کے آثار نمودار ہوئے تھے۔ آس پاس ہجوم بھی نہیں تھے چند قدموں کا فاصلہ بھی سمٹتا جا رہا تھا۔ وہ ذرا سا پرے ہوئی اور عین سامنے ٹھہری بھی...... کہ وہ مجھے نظر کا دھوکا تو نہیں سمجھ رہا...... اور وہ متوجہ ہوئے بنا آگے بڑھ گیا۔

وہ مجھے نظر کا دھوکا ہی سمجھا ہو گا، بھلا ایئرپورٹ پہ میرا کیا کام ......“ پیچھے رہ جانے سے بہتر تھا وہ دوبارہ اس کے سامنے جاتی۔ اس نے اک لمحہ اس کی پشت کو دیکھا اور فیصلہ کر لیا۔ وہ جست بھر کے اس کے سامنے آئی تو وہ چونکا تک نہیں اس نے ڈھٹائی سے اپنا تعارف بھی کروا دیا۔

”میں واقعی انعام ہوں...... خواب نہیں ہوں۔“ وہ ذرا جھینپ کے مسکرائی۔

”کون انعام؟“ اس کی بھنویں تن سی گئی تھیں۔ پھر اس نے اپنی ساتھی لڑکی سے کچھ کہا تھا مگر وہ انگلش

نہیں کوئی اور زبان تھی۔

وہ آگے بڑھ چکا تھا۔ گویا زمانہ آگے بڑھ گیا تھا وہ وہیں کھڑی رہ گئی وہ لمحاتی صدمہ نہیں تھا۔ وہ وقت جب بھی یاد آتا تو نیند آنکھوں سے اڑ جاتی تھی۔ اس لمحے نے اینا کے اندر سے کیا کچھ اکھاڑ کے نہیں پھینکا تھا اور کس کس پنچھی نے وہاں سے اڈاری نہیں لی تھی کہ اسے خالی پنجرے کا گمان ہوتا تھا۔

اس کے ساتھ جو کوئی بھی تھی اسے جو بھی مجبوری تھی وہ اسے ایک کال یا میسج کر کے بتا سکتا تھا۔ تو کیا وہ اس کے لیے ایک گزرا وقت ہو چکی تھی۔ اس نے سائب کی فراہم کردہ جاب بھی چھوڑ دی تھی اب وہ اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ چکی تھی۔

☆☆☆

وہ اپریل کی ایک ڈھلتی سی شام تھی جب بارش شروع ہوئی ...... اس قدر تیز اور بے موسم کی بارش ندرت نے آیت الکرسی کئی بار پڑھی پھر کھلی کھڑکی کو دیکھا۔ ''اسے بند کرتی جاؤ، اب تو گرمیوں میں بھی ہوا برداشت نہیں ہوتی'' وہ کھڑکی بند کر کے باہر آئی لکڑی کا بڑا سا کاٹیج برآمدے کی سیڑھیوں پہ پڑا تھا وہ زید کا پسندیدہ کھلونا تھا اس نے اٹھا کے اندر رکھا وہ کچھ دیر برآمدے میں بیٹھنا چاہتی تھی مگر کمرے میں بجتی فون کی گھنٹی نے اسے متوجہ کیا۔

وہ انجانا نمبر تھا۔

''جی کون؟'' اس نے مخصوص اسٹائل میں دریافت کیا۔

''آج تمہارا شہر کس دکھ میں مبتلا ہے رونے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے یار!''

وہ بارش پہ چوٹ کر رہا تھا، اف ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہوگی ...... ورنہ وہ اپنے شہر کی بارش کو مات دے سکتی تھی۔

''میں تمہیں نہیں جانتی سائب مجید!'' اس کے لہجے میں ایک ٹھنڈا سا انکار تھا کہ اس شخص نے سانس تک روک لی۔

''آئندہ یہاں فون مت کرنا ...... وہ حجرہ خالی ہو چکا ہے۔ جس میں محبت دھمال ڈالتی تھی جوگی ہیر گاتا تھا۔ مجھ میں بلھے شاہ کا کلام گانے والا مسافر اب خواب ہو چکا ہے ...... پھول پرندے، پتے، ٹہنیاں وہ تمام لمحے میں اس ٹوکری سے ہر چیز اڑا چکی ہوں۔''

اس نے فون کاٹا پھر لمحے بعد بند کر دیا اس کے دماغ میں اک ہیجان برپا تھا۔

''یہ کیا سمجھتا ہے کہ اپنی داستان میں سے یہ مجھے کسی حرف کی صورت کبھی ڈھونڈ نکالتا ہے اور چاہتا ہے میں اتنے پہ خوش رہوں۔'' وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ پھر برآمدے میں ذرا دیر گزری غصہ کچھ ٹھنڈا پڑنے لگا اس نے پانی کا گلاس پیا۔ غصے کا گراف اور نیچے گرا۔

دروازے پہ دستک ہوئی، بارش تھم چکی تھی۔

دوبارہ دستک ہوئی۔

''اینا کیا سو چکی ہو ...... ندرت جیسے اونگھ سے جاگی تھیں، تیسری بار دروازہ جیسے دھڑ دھڑایا گیا۔

''آ رہے ہیں کھوجی کی اولاد۔'' اکثر اس وقت سامنے سے بچہ لسی پوچھنے آتا تھا ذہنی تناؤ کے تحت وہ جیسے دھاڑی تھی اور دروازہ کھٹاک سے کھولا، گلی میں جلنے والے بلب کی زرد روشنی میں، بھی اس کے اندر بلھے شاہ کی (کافیاں) گانے والا مسافر صاف نظر آ رہا تھا۔ اینا کو ایک ہولناک سی حیرت نے چھوا۔''

''پھول پرندے، پتے ٹہنیاں وہ تمام لمحے تم نے بس یہ سب گنا تھا۔ مگر میں اب بھی اس ٹوکری کے اندر ہوں۔

وہ سنجیدگی سے کہتا اندر چلا آیا تھا۔ اب اس کا رخ ڈرائنگ روم کی طرف تھا جو بھی تھا اینا پہ اس شخص کے کچھ احسان تھے۔

''محبت نہ سہی ...... مروت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔'' جگنو آیا ہے تو لسی کچن میں رکھی ہوگی۔'' ندرت نے قدموں کی آہٹ سے اندازہ لگایا تھا۔

''جگنو نہیں آیا، اماں منیجر سائب آیا ہے۔'' اس نے ماں کو بھی پھولے منہ کے ساتھ ہی بتایا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا تھا۔ اگلے دو تین منٹوں بعد وہ ندرت کی معیت میں ہی ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔

ماں نے خیر خیریت پوچھنے کے بعد ادھر ادھر کی پھر ملکی حالات پہ بھی کافی بات چیت کر لی مگر اینا کمرے سے نہیں آئی تھی ...... تو وہ شرمندگی محسوس کرتے ہوئے معذرت کے ساتھ اٹھ کر بیٹی کے پاس آئیں۔

''وہ ہمارا مہمان ہی نہیں محسن بھی ہے اور تمہاری مہمان داری بس چائے کا یہ ایک کپ ہے۔'' ندرت نے اسے ہلکی آواز میں ڈانٹا جو برآمدے کے وسط تک آ چکی تھی۔

''اماں ٹائم بھی تو دیکھیے۔ دس بجنے والے ہیں میں اس وقت کیا خاطر مدارت کر سکتی ہوں۔'' اس نے جان بوجھ کے آواز نیچی رکھنے کی زحمت نہیں کی تھی جس پہ ماں کو مزید تاؤ آیا۔

''اچھا اچھا، وہ تمہارا پوچھ رہا ہے بات کر لو۔ کہہ رہا ہے تھوڑی دیر کے لیے آیا ہوں۔''

اور اس خبر پہ اینا کے دل میں اک لاوا سا ابلا تھا۔ اس کا بس چلتا تو کپ ٹیبل پہ اچھال دیتی وہ اس سے قریبی صوفے پہ احسان جتاتے انداز میں اکڑ کے بیٹھی تھی سائب نے پہلے چائے کو پھر اسے دیکھا۔

''وہ تو میں نے یونہی آنٹی سے تھوڑی دیر کا کہا ہے تم چاہو تو قیام بھی کر سکتا ہوں۔'' اس کے لہجے کی شرارت سننے لائق تھی۔ اینا نے جزبز سا ہو کے پہلو بدلا تھا۔

''میری تمام فون کالز ریکارڈ ہوتی ہیں، اب بندہ کیا کرے۔ کوئی رومینٹک بات تو کر نہیں سکتا، اس لیے اب میں جس قدر بھی رومانس جھاڑوں بس آرام سے سنتی رہو۔''

وہ نظر کترائی اپنے ہی ہاتھوں پہ ٹکی۔

''اس روز ایئرپورٹ پہ تم نے میرون رنگ پہنا ہوا تھا۔'' تمہارے ہاتھ میں صرف ایک ہی انگوٹھی تھی۔ جس پہ ہرا سا پتا بنا ہوا تھا ...... تمہارے شوز سلور کلر کے تھے۔ اور تم نے ہلکی سی لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی۔ تمہارے کان جیولری سے خالی تھے تمہارے آنکھوں میں کاجل نہیں تھا لیکن پلکوں پہ وہ لڑکیاں کیا لگاتی ہیں۔'' وہ گفتگو میں پہلی بار اٹکا۔

''پلیز سائب۔'' اس نے حیران کن احساس کے ساتھ اسے بے ساختہ ٹوکا۔

''ہم نے آنکھوں میں اس کی صورت کو ایسے رکھا جیسے بینائی ہو۔'' اس نے مبہم سی آواز میں ان الفاظ کو خوب صورتی سے بیان کیا تھا کہ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

''اس دن تمہارے ساتھ کون تھی؟'' چند ثانیے بعد اینا نے اسے نظر کے حصار میں رکھ کے سوال کیا تھا ...... تو وہ بھی جواباً اسے دیکھتا رہ گیا۔

''کئی ماہ اس کے پیچھے خوار ہونے کے بعد اسے ساتھ لانے میں کامیاب ہوا تھا اور بعد کا تمام وقت اس کامیابی پہ تڑپتے ہوئے گزارا ...... وہ لمحہ جاں گسل تھا تم سامنے آئیں اور میں۔''

اس نے لب بھینچ کے نگاہ ہٹائی۔

''بہت چاہنے کے باوجود بھی تمہیں ایک میسج تک نہیں کر سکا، میری جاب کی نوعیت ہی ایسی ہے اپنے اور دوسروں کے حال سے بے خبری میری جاب کا حصہ سمجھو اور کیا کہہ دینے سے کچھ ختم ہو جاتا ہے۔'' اس نے اینا پہ ایک تادیبی سی نگاہ ڈالی جو صاف نظر چرا گئی تھی، ''کہہ دینے سے احساسات مٹ نہیں جاتے نہ ہی وہ خوب صورت لمحے گم ہوتے ہیں جن میں محبتوں کا موسم سانس لے چکا ہوتا ہے، کہیں دھمال رکتی ہے نہ جوگی ہیر گاتے ہوئے پلک جھپکتا ہے دلوں کے اندر کافیاں پڑھتا عشق اس دو گھڑی کے مسافر کا ہمیشہ منتظر رہتا ہے بس وقت ظالم ہوتا ہے جو ہمارے لیے ٹھہرتا نہیں'' وہ اینا کے چہرے کو جیسے آخری بار دیکھ رہا تھا وہ ایک لمحے میں ہری بھری ہوئی۔ اس کے اندر پھوٹنے والا انکشاف خوش کن تھا۔ اس نے سائب کو آسمان کی مانند دیکھا جس کے تاروں سے پھوٹنے والی روشنی، سائب جیسے مسافروں کی ایڑیوں سے اڑتی دھول چومتی ہو

گی۔ وہ پہلے کیوں نہیں سمجھی کہ وہ کون تھا وہ یوں دیوانوں کی طرح اسے تک رہی تھی، اس کی آنکھیں بھیگیں، وہ کس فریب میں تھی وہ تو واقعی سفر تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ وہ کون سا راز پا چکی ہے۔ ''ہم جب سفر پہ نکلتے ہیں تو صرف انتظار ہی رہ جاتے ہیں۔ واپسی ہو تو ہو۔'' اللہ کی مرضی۔ پھر ہمیں تلاش بھی نہیں کیا جاتا، بس سپرد اللہ کر دیا جاتا ہے۔'' وہ شاید مسکرایا تھا۔'' اس لیے میں تمہارے ہاتھ پہ کبھی انتظار رکھ کے نہیں جا سکا اور نہ آج ایسا کر پاؤں گا۔''

اس لمحے اس لڑکی کے آنسو اس کے شہر کی بارش کو مات دے رہے تھے اس نے ایک بے بس سی آہ بھرتے ہوئے اینا کے ٹھنڈے ہاتھ پہ اپنا بھاری اور پرتپش ہاتھ نرمی سے رکھا۔'' ہم بے وفا نہیں ہوتے ہیں ہمیں دائروں کی چاہ کب ہوتی ہے۔ مگر میں اب کیا کروں کہ محبت بھاگ کر تمہاری گلیوں میں لے آتی ہے۔'' وہ لہجہ ہلکی سی تپش لیے تھا۔''وقت کچھ سازگار ہوا ہے اینا......اور میں اس سے موسم وصال کے لیے کچھ مہلت ادھار لایا ہوں اب فیصلہ تم پہ چھوڑتا ہوں''اس نے اپنا ہاتھ آہستگی سے سمیٹا۔

''رونے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے یار......!'' وہ افسردگی سے ہنسا......اور تیزی سے اٹھا، پھر اپنا سیل فون آن کیا اور قدم دروازے کی سمت بڑھائے۔

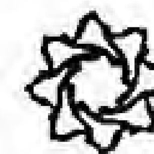
اینا کی سماعتوں میں باپ کا جملہ ابھرا......''جو تخت ہزارہ چھوڑ دیتا ہے، وہی جوگی ہوتا ہے''اینا نے اس تخت و تاج کے مالک کی پشت کو حسرت و رشک سے دیکھا۔اس کے محل نما گھر میں کیا کیا آسائش نہیں ہوگی، وہ آنسو صاف کرتی کھڑی ہوئی، تخت و تاج ٹھکرانے کے بعد دیس بدیس کی خاک چھاننے والے، نیندوں کی قحط زدگی کا شکار......یہ سپاہی جن کی آنکھوں کی خشک سالی میں آرام کا 'محبت کا ہرا موسم مرجھا جاتا ہے کیا پھر ان ہستیوں کا انتظار عبادت نہیں بن جاتا ہوگا جو بنا تلاش کے انتظار ہی رہ جاتے ہیں پھر جو مٹی انہیں پا لیتی ہے وہ خوشبو زدہ ہو جاتی ہے وہ فلک سا کوئی مقام پا لیتی ہے۔

''سائب !'' مدہم سی بے قرار سی پکار پہ دہلیز کے پاس ہی رک گیا تھا۔''اپنے سازگار وقت سے کہہ دو کہ موسم وصال سے آشنائی بڑی بات ہوا کرتی ہے پھر مہلت کی مدت کون دیکھتا ہے۔'' وہ اس کے پہلو میں آئی اور گردن اکڑا کے اک شاہانہ انداز سے بولی وہ ان نم آنکھوں میں دیکھتا رہ گیا ''پھر آہ'' پہ بھی ضبط رکھنا ہوگا کہ تمہارے پہلو سے کبھی اٹھ کے گیا تو تمہارے حصے میں آنے والے انتظار کی مدت قیامت تک'' وہ لب بھینچ کے خاموش ہوا کہ ان آنکھوں میں نمی پھر سے نمودار ہوئی تھی۔

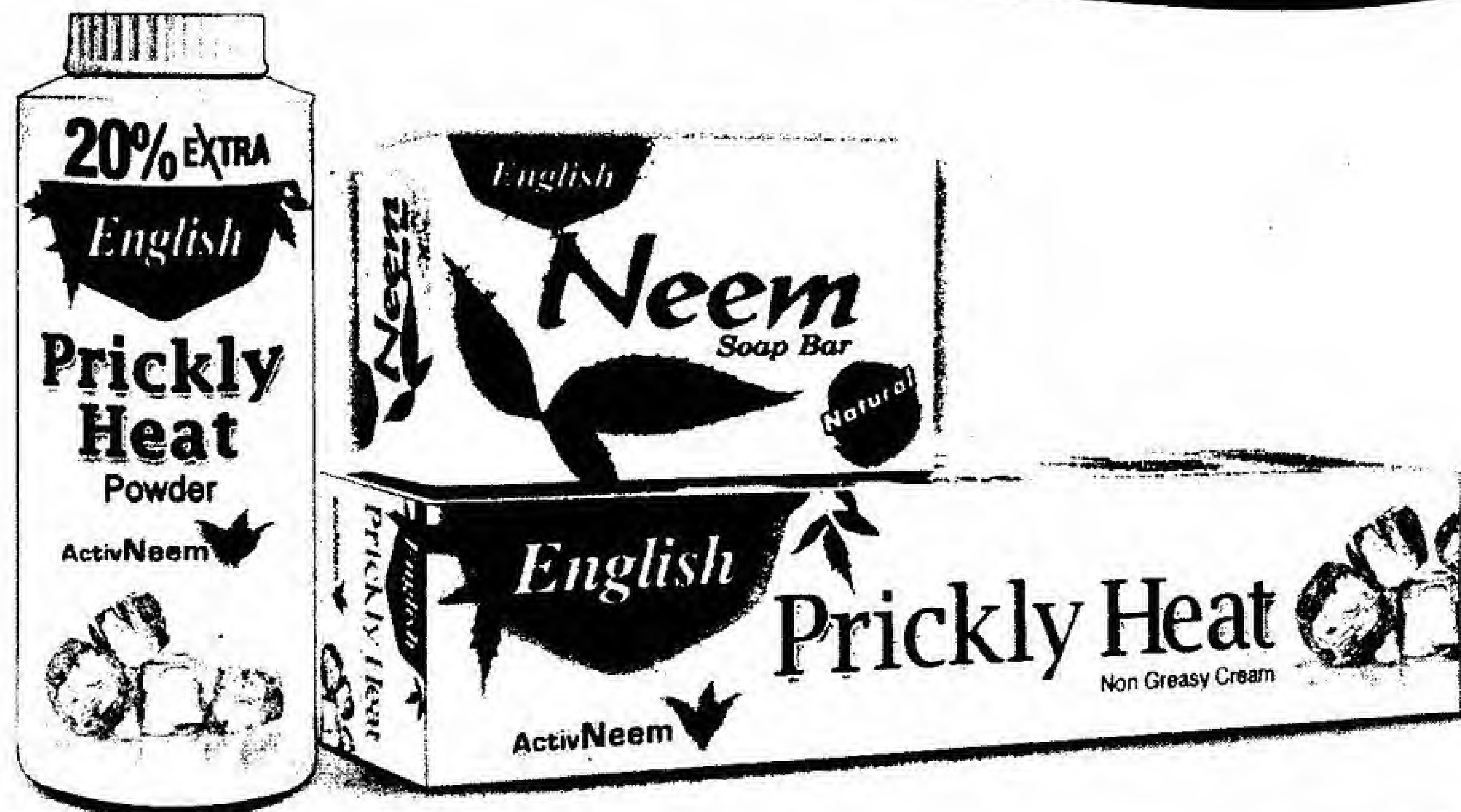
''جانتی ہوں تم سفر ہو۔ میں بھی سفر ہوں ڈراؤ مت۔''اس کی نم آنکھوں میں خفگی چمکی ......اور سائب نے اگلے لمحے رخ بدلا تو وہ پیچھے سرکتی ہوئی سمٹ گئی''تو پھر میں کل قاضی اور گواہوں کے ساتھ آ جاؤں'' ......مدتوں کی تھکن پہ فرصت کا اک شوخ سایہ غالب ہوا۔

''جی نہیں۔''اس کی ہلکی آواز پہ سائب بے یقین ہوا۔

''مجھے قاضی اور گواہوں کے ساتھ بینڈ باجے اور باراتی بھی چاہئیں ......''ایسا کہتے ہوئے اس کی گلابی سی نگاہ جھکی''میں دنیا کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے بہت اونچی پرواز پہ اڑنے والے پنچھی کے پر بھی گن لیے ہیں۔'' اس نے رخ موڑنا چاہا تو وہ اسی جانب ہوا......'' اور اگر اس تمام ارینجمنٹ کے دوران بلاوا آ گیا تو؟''......اس نے محظوظ ہوتے لہجے میں اسے پھر سے ڈرانا چاہا......تو اینا نے اسے نروٹھے پن سے گھورا، اوں، پھر لحہ بھر کو سوچا......''دلوں کے اندر، ہیر گاتا، دھمال ڈالتا، کافیاں پڑھتا عشق اس دو گھڑی کے مسافر کا ہمیشہ منتظر رہے گا'' ......اس نے چمکتے لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیا ......اس لڑکی کے چہرے پہ لکھا انتظار پڑھ کے اس نے خدا سے التجا سی کی تھی اور وہ ابھی سے اپنے گھر کے دروازے پہ اپنی دستکیں محسوس کرنے لگا تھا۔







سلویٰ سیف اللہ بٹ

سنہری دھوپ

بارہویں اور آخری قسط

''احسن کی سوفٹ نیچر سے تم اچھی طرح آگاہ ہو، پھر بھی مجھ پر الزام دھر رہی ہو۔ وہ خود ہی میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔''اس نے اپنی کمزور سی صفائی دی۔

''جب تم تکلیف کا ڈراما کروگی تو وہ......''

''میں کوئی ڈراما نہیں کرتی انعم! میں خود نہیں جانتی ـــــ کیوں میری طبیعت اتنی بگڑ جاتی ہے۔''

اس کی غلط فہمی دور کرتے اس کا لہجہ بھیگ گیا۔

''تم اپنی تکلیف مجھ سے شیئر کرلیا کرو۔ کیا ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ ختم ہو چکا ہے۔''

دعا سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ منہ پھاڑ کے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ میرا شوہر ہے۔ میں اس کے بچے کی ماں بننے جارہی ہوں، تو خیال بھی تو وہی رکھے گا۔

جسم میں سرائیت کرتے درد نے اس کے



مکمل ناول



اعصاب کمزور کردیے تھے۔ وہ خود میں انعم سے الجھنے یا پھر اسے سمجھانے کی ہمت نہیں پاتی تھی یوں بھی اسے بات بے بات رونا آنے لگا تھا۔

"اپنی حرکات پر غور اور کنٹرول کرو دعا، ورنہ تمہیں یہ سب بہت مہنگا پڑے گا۔"

اس نے تنبیہ کی اور پیر پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

اس کی ڈیوٹی ختم ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے جبکہ اس کے حواس معطل اور اعصاب پر بھاری بوجھ آ گرا تھا۔ اس کے لیے ایک ایک پل کاٹنا عذاب ہو رہا تھا۔ پھر ڈیوٹی ختم ہوتے ہی وہ پارکنگ کی طرف دوڑی۔ اسے جلد از جلد گھر پہنچ کر یہ خبر سنانا تھی۔

گھر میں گھستے ہی وہ تیز تیز قدموں سے چلتی لاؤنج تک آئی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔

رابعہ احمد چائے کے خالی برتن اکٹھے کر رہی تھیں۔ عمر سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ ریاض احمد اور عمیر آپس میں محو گفتگو تھے۔

"السلام علیکم!" اس کی آواز بمشکل نکل پائی۔

"وعلیکم السلام" سب نے بیک وقت سلامتی بھیجی۔

"مجھے آپ سب کو کچھ بتانا ہے۔"

نوال کے ہوائیاں اڑتے چہرے اور لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ سب ساکت ہو کے اسے دیکھنے لگے۔

"وہ میں...... میں نے آج دعا کو دیکھا۔" اس کی سانس پھول رہی تھی۔

لاؤنج میں یک دم سکوت طاری ہو گیا۔ سب سے پہلے ہوش میں ریاض احمد آئے تھے۔

"دعا...... دعا کو دیکھا، کہاں دیکھا اسے؟ کس کے ساتھ تھی وہ۔"

ریاض احمد کانپتے ہوئے لہجے میں بولے۔ عمر ایک ہی جست میں سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے آ گیا۔ نوال نے مڑ کر دیکھا۔

ریاض احمد کو کندھوں سے تھامے عمر اور اس کے پیچھے سے جھانکتی زرد رنگت لیے رابعہ احمد جبکہ عمیر کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"وہ اپنی فرینڈ انعم کے ساتھ تھی۔" وہ اس سے آگے نہ کہہ پائی۔

انعم اس کی واحد اور پرانی دوست تھی۔ اس سے ہر کوئی واقف تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ جنید آفندی کی بیٹی ہے جن کا شمار نامی گرامی بزنس ٹائیکون میں ہوتا ہے۔

"وہ جنید آفندی کے گھر پر ہے۔" ریاض احمد بڑبڑائے۔

"جنید آفندی تو کینیڈا میں مقیم ہیں" عمر نے اطلاع دی۔

"تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے خدایا کہ میری بیٹی حفظ و امان میں ہے۔"

رابعہ احمد شکر ادا کرتے ہوئے رو دیں۔ انہیں مزید کچھ نہیں سننا تھا۔ وہ شکرانے کے نوافل پڑھنے چل دیں۔

"شٹ......!" عمیر نے زور سے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

اتنے عرصے میں ایک بار بھی اس کا دھیان انعم کی طرف نہیں گیا تھا۔ جنید آفندی کی فیملی کو ڈھونڈنا کون سا مشکل کام تھا۔ انعم کی شادی بی ایس سی کے بعد ہو گئی تھی۔ جبکہ دعا اپنے ایم اے میں مصروف بہت کم اس کا ذکر کرتی تھی۔ ان کا آپس میں ٹیلی فونک رابطہ تھا۔ پڑھائی کے بعد وہ ماں کے ساتھ گھر داری میں الجھ گئی۔ ماں کے مرنے کے بعد حالات نے اسے اس قدر الجھایا کہ وہ انعم سے رابطہ ہی نہ رکھ پائی ورنہ وہ انعم کے ساتھ ہونے والی بات چیت کا ذکر اکثر نوال اور عمیر سے کیا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عمیر کے ذہن سے بھی نکل گئی ورنہ اسے اتنا عرصہ تکلیف میں نہ گزارنا پڑتا۔

☆☆☆

وہ کوٹ اتار کے الماری کی طرف بڑھے۔ ایک ہینگر نکال کے اس میں کوٹ ڈالنے لگے، کوٹ ڈال کے پھر لٹکا دیا اور اوپری جیب میں سے دو لفافے نکالے۔

"السلام علیکم!" تب ہی دروازہ کھول کے دل آرا داخل ہوئیں۔

"وعلیکم السلام!" ان کا موڈ خوش گوار تھا۔

"آپ کدھر تھیں؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے بیوی کے سرخ پڑتے گالوں کو دیکھا۔ انہیں کینیڈا کی سردی سے بہت سی شکایات تھیں۔

وہ کاؤچ پر بیٹھ کے کوٹ شوز اتارنے لگیں۔

"میں آپ کی میڈیسن لینے گئی تھی، آپ بہت کیئرلیس ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے تھوڑی سی گروسری بھی چاہیے تھی اسی لیے ٹائم لگ گیا۔"

وہ جوتے اٹھا کے ریک میں رکھنے لگیں

"میرے پاس آپ کے لیے سرپرائز ہے۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑے لفافے لہرائے۔

"یہ کیا ہے؟" انہوں نے مڑ کر دیکھا تو ٹھٹک گئیں۔

ان کا دل مٹھی میں جکڑا گیا۔ وہ لمحے کے ہزاروں حصے میں جان گئیں۔ ریک بند کر کے اٹھتے انہوں نے اللہ کو صدق دل سے یاد کیا۔

"پاکستان کے ٹکٹس، صبح ہماری روانگی ہے۔"

دل آرا کا سانس سینے میں ہی اٹک گیا۔ ان کے دماغ میں تیز تیز جھکڑ چلنے لگے، اب تو انہوں نے بھی بھولے سے بھی پاکستان جانے کا ذکر نہیں چھیڑا تھا۔

"کیا ہوا؟ تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔"

انہوں نے دل آرا کی متغیر ہوتی رنگت کو نوٹ کیا تھا۔

"کتنے عرصے بعد ہم اکٹھے پاکستان جائیں گے۔ انو اور احسن ہم دونوں کو یوں اچانک دیکھ کے بہت خوش اور حیران ہوں گے۔" دل آرا ہونقوں کی طرح منہ کھولے سن رہی تھیں۔

"وہ...... وہ اتنی جلدی بھلا تیاری کیسے ہو گی۔" انہوں نے اپنی حالت پر قابو پا کے، بودا سا جواز پیش کیا۔ جو فوراً رد کر دیا گیا۔

"آپ نے کیا تیاری کرنی ہے۔ ہم کون سا کسی جزیرے پر جا رہے ہیں۔ اپنے گھر ہی جانا ہے۔ میں اپنا سوٹ کیس پیک کر لیتا ہوں، آپ اپنا کر لیں۔" وہ کہتے ہوئے الماری کی طرف بڑھے۔

"اتنی سی ہیلپ کافی ہے ناں۔"

انہوں نے مڑ کر شرارت سے ساکت کھڑی بیوی کو دیکھا۔

"جج...... جی......" انہوں نے چونک کر سر زور زور سے ہلایا۔ جنید آفندی الماری میں سے اپنے کپڑے نکالنے لگے۔

☆☆☆

ہر ایک اپنی جگہ بے چین اور سوچوں میں غلطاں تھا۔ رابعہ احمد کچن میں گم صم اور جامد تھیں۔ عمر اپنے کمرے میں مقید تھا۔

"مجھے سب سے پہلے جانا چاہیے۔ اس کی تباہی کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔ پہلی معافی بھی مجھے ہی مانگنی چاہیے تاکہ اس کا دل باقی سب کے لیے بھی صاف اور کشادہ ہو۔"

اس نے اچھی طرح سوچ و بچار کے بعد پختہ ارادہ باندھ لیا۔ کچوکے لگاتے ضمیر کو بھی تو مطمئن کرنا تھا۔

"مجھے عمیر بھائی سے بھی مشورہ کر لینا چاہیے۔" اچانک سے اسے خیال آیا۔

عمیر کے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اس نے — اندر — جھانکا۔ وہ میز پر سر رکھے ہوئے تھا۔ لیپ ٹاپ آن تھا۔ وہ بنا آواز پیدا کیے اندر آ گیا۔

لیپ ٹاپ اسکرین پر جھلکتے الفاظ اس کے دل کی ترجمانی کر رہے تھے۔

شاید وہ خود بھی ماضی کے دشوار رستوں پر دوڑتا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوا تھا۔

ان جان رستوں پہ چل رہے ہو، تھک چکو تو لوٹ آنا
یہ بے وفائی جو کر رہے ہو احساس ہو تو لوٹ آنا
جب تمہیں بھی یاد آئے اور بے بسی سے رو پڑو
کسی کے کندھے پر سر رکھ کے رونا چاہو تو لوٹ آنا
زندگی کے اس سفر میں، بہارت کی چاہتوں میں
اداس رت میں، ویران رستوں پر بکھرنے لگو تو لوٹ آنا
اپنے جب سراب ٹھہریں، درد جب عذاب ٹھہریں
بے بسی سے کبھی جو تم بھی دعائیں مانگو تو لوٹ آنا
کوئی دل ویران عنبر منتظر ہے اس جگہ پر
بچھڑتے وقت کی آواز کو جو تم سنو تو لوٹ آنا

چمکتے سنہری الفاظ میں جگمگاتا وہ کسی کا نام تھا یا واقعی صدق دل سے نکلی دعا۔

عمر نے نفی میں سر ہلایا، اس کا برسوں پرانا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ اس نے واپسی کی راہ لی، اب جو بھی کرنا تھا اسے فوری کرنا تھا۔

☆☆☆

''ٹیسٹس کی رپورٹس کب آئیں گی؟''

بالوں کو تولیے سے رگڑتا، وہ شاور لے کر باہر نکلا تھا۔

''رپورٹس مل گئی ہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ خون کی تھوڑی کمی آئی ہے، ڈاکٹر مائرہ کا کہنا ہے کہ وہ فروٹس اور جوسز کے ریگولر استعمال سے بھی پوری ہوسکتی ہے۔''

انعم نے ہینگر سے شرٹ نکال کر اسے پکڑائی اور تولیہ لے لیا۔

''تم اس کا خیال رکھا کرو انو! اس بچے کا صحت مند اور تندرست پیدا ہونا ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔ تم خود اسے فروٹس اور جوسز دیا کرو، اب تھوڑا سا تو، ٹائم رہ گیا ہے۔ ہمیں کوئی کوتاہی نہیں کرنی۔''

اس نے شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے اسے بڑی ملائمت سے باور کروایا۔

''ویسے تو ناہید ہر وقت اسی سے چپکی رہتی ہے۔ مگر آپ کی تسلی کے لیے میں بھی اسے ٹائم دیا کروں گی۔'' انعم خود دیکھ رہی تھی کہ دعا دن بہ دن کمزور ہوتی جارہی ہے۔ پہلے جو ایک آدھ بات کرلیتی تھی۔ اب بالکل خاموش رہتی تھی۔

وہ بالوں میں برش کرنے لگا تو پیچھے کھڑی آئینے میں اس کا عکس دیکھتی انعم نے بڑے خوشامدی لہجے میں فرمائش کر ڈالی۔

''احسن! آج کا ڈنر باہر کریں۔''

''ہرگز نہیں انعم......'' اس نے فوراً قطعیت سے رد کردیا۔

''ابھی میں تمہیں یہی سمجھا رہا تھا۔ جب تک ڈلیوری نہیں ہوجاتی، ہم نے اسے تنہا نہیں چھوڑنا، یہ چند دن بہت اہم ہیں۔ اتنے سالوں بعد ہم مکمل ہونے جارہے ہیں۔ خدانخواستہ ہماری ذرا سی غلطی بھی کہیں ہمارے لیے بڑے نقصان کا باعث نہ بن جائے۔ بس تھوڑا سا ویٹ، پھر ہم ڈنر بھی باہر کریں گے، ڈھیر ساری شاپنگ اور مووی پر بھی لے جاؤں گا۔ پکا والا پرامس۔''

احسن نے نرمی سے سمجھایا اور خلاف توقع وہ فوراً مان گئی۔

''انعم میں سوچ رہا تھا کہ ماما جان کو بلالیتے ہیں۔ تم اکیلی کیسے سب کرپاؤ گی۔ وہ بڑی ہیں، ان کا موجود ہونا بہت ضروری ہے۔''

اس نے والٹ اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

''جیسے آپ کو بہتر لگے۔ رات کو انہیں کہہ دیں۔ دعا کو بھی ڈھارس رہے گی اور ان کی موجودگی سے مجھے بھی حوصلہ ملے گا۔''

وہ اس کے برابر چلتی بڑے مدبرانہ لہجہ اپنائے ہوئے تھی۔

لاؤنج میں ناہید اور دعا الجھ رہی تھیں۔

''دعا بی بی، یہ آدھا گلاس اور پی لیں۔ میں

ابھی تازہ بنا کے لائی ہوں، آپ کے دل و دماغ کو تقویت ملے گی۔''

ناہید بڑے ادب سے اسے سمجھاتی، گلاس میں اسٹرابری شیک لیے کھڑی تھی۔

''مجھے نہیں کچھ بھی پینا۔ تم خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

وہ روہانسی ہوکر بولی، سر دونوں ہاتھوں میں گرالیا، احسن تیز تیز قدم اٹھاتا ان کے قریب آیا۔

''کیا بات ہے ناہید؟ دعا! آر یو آل رائٹ؟''

''احسن صاحب! ان کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ میں زبردستی انہیں باہر—— لائی ہوں۔ میں نے ان کے لیے اسٹرابری شیک بنایا ہے۔ اب وہ بھی پینے سے انکاری ہیں۔ طبیعت کیسے سنبھلے گی۔''

ناہید نے گلاس اور جگ ٹیبل پر دھرتے ہوئے معاملہ اس کے شوہر کے سپرد کردیا۔

''اوپر منہ کرو دعا، کیا مسئلہ ہے۔ اگر زیادہ آکورڈ فیل کررہی تو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔''

احسن نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چہرے سے ہٹائے۔

''میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ میں باہر لان کی تازہ ہوا میں بیٹھنا چاہتی ہوں، پلیز مجھے کچھ بھی کھانے پینے پر فورس نہ کریں۔''

اس کی رنگت زردی مائل اور آواز بھیگی ہوئی تھی۔

''اچھا کول ڈاؤن، جیسا تمہیں بہتر لگتا ہے اٹھو......''

احسن نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھنے میں مدد دی، اس کے جسم میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

''ایسا کرتے ہیں کہیں باہر چلتے ہیں۔ انو تم بھی آجاؤ۔ تمہارا دل بھی باہر جانے کو چاہ رہا تھا۔''

وہ جو بہت ضبط سے برداشت کررہی تھی، جلدی سے نفی میں سر ہلادیا۔

''نہیں اب میرا موڈ نہیں ہے۔ آپ دعا کو لے جائیں۔'' احسن سمجھ گیا تھا کہ دعا کو ساتھ لے جانا اسے ناگوار گزر رہا ہے لیکن اس وقت دعا کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ اسے اس ماحول سے دور لے جانا چاہتا تھا۔

وہ دونوں پہلی بار گھر سے باہر جارہے تھے۔

''انو اگر تم......''

''پلیز آپ لوگ جائیں احسن! فی الحال میرا موڈ بدل ہوگیا ہے اور دعا کو بھی شاید صرف آپ ہی کی کمپنی کی ضرورت ہے۔''

اس نے دوسرا جملہ خاصا چبا کر ادا کیا۔ احسن نے سر جھٹکا اور دعا کو تھام کے آہستگی سے باہر کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

عمیر نے چپ سادھ لی تھی لیکن اس کے دل و دماغ میں ہیجان برپا تھا۔ دعا اسی شہر میں تھی۔ جنید آفندی کی بیٹی اس کی واحد دوست تھی۔ وہ اس کے ساتھ دیکھی گئی تھی تو یقیناً اس کے گھر پر ہی پناہ گزین ہوگی یعنی وہ حفظ و امان میں تھی۔

اسے دعا سے بہت سے شکوے شکایات تھیں۔

اس کے پاس دعا کا اتا پتا نہیں تھا مگر وہ تو عمیر سے رابطہ کرسکتی تھی۔ اس نے کیسے اپنے باپ جیسے ماموں، نوال اور عمیر کو بھی فراموش کردیا۔ حالانکہ وہ اس کی مضبوط ڈھال بنا تھا، اس کی خاطر سب سے لڑا تھا۔

وہ کس اذیت سے گزر رہا تھا، کہاں کہاں اس کو تلاش نہیں کیا تھا۔

ایک رات بھی سکون سے سو نہیں پایا تھا۔ اس کی بے سکونی کی ذمہ دار دعا رہی تھی۔ عمیر نے اس سے دل میں خود ساختہ لاتعداد شکوے شکایات جمع کرلی تھیں۔

☆☆☆

انعم دعا کے جانے کے بعد لاؤنج کے صوفے

پر ہی ڈھیر ہو کے رونے لگی تھی۔ اس کے دل کو دھچکا لگا تھا۔ وہ دل کو لاکھ سمجھا لیتی مگر وہ اس نکتے پر ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔ اسے دعا کے ساتھ لڑ جھگڑ کر، ہر بار احساس ہوتا تھا کہ اس نے غلط کیا ہے۔ مگر دعا اور احسن کو ایک ساتھ دیکھ کے اس کی برداشت جواب دے جاتی۔ اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ اب بھی اس نے رو رو کے خود کو ہلکان کر لیا تھا۔

تب ہی لاؤنج کا دروازہ کھلا، وہ دونوں بہت محتاط سے اندر داخل ہوئے۔ وہ — جنید آفندی کے لیے حیران کن حالات تھے۔

انعم لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی ہچکیاں لے رہی تھی۔

دل آرا لمحے کے ہزارویں حصے میں معاملہ بھانپ گئیں۔

جنید آفندی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے الجھن بھری نگاہوں سے بیوی کو دیکھا جو نظریں چرا گئیں۔

''انعم......'' ان کی پکار میں دبدبہ اور سنجیدگی تھی۔

انعم جھٹکے سے اٹھی۔ اگر وہ گہری نیند میں بھی ہوتی تو اسے یوں ہی کرنٹ لگتا۔ اس پر حیرت و غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ جنید آفندی کا تصور حقیقت میں ڈھلا اس کے سامنے مجسم موجود تھا۔ انعم کا چہرہ آنسوؤں سے تر، آنکھیں اور ناک سرخی مائل تھا۔

''تم کیوں رو رہی ہو انعم اور احسن کدھر ہے؟''

انہوں نے سارے میں نظر دوڑائی۔ دل آرا کا سر جھک گیا۔ جس ''ہونی'' سے وہ ڈرتی تھیں، وہ ہو گئی تھی۔ وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھیں۔

انعم نے ماں کے جھکے سر کو دیکھا اور جان گئی جو سچ تھا وہی بولنا تھا۔ وہ زار و زار روتی ہوئی اپنے غم گسار باپ کے سینے سے آ لگی۔

☆☆☆

وہ دعا کو سیدھا ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس کا بی پی کافی لو تھا۔ انجکشن اور میڈیسن کھا کے اس کی طبیعت قدرے سنبھلی تو اس نے آئس کریم کھانے کی فرمائش کر دی۔ گھر سے نزدیکی پارک میں چہل قدمی کرتے انہوں نے آئس کریم ختم کی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر قہقہہ لگاتے اور معمولی سی بات پر پریشان ہوتے انہیں علم نہیں تھا کہ ان دونوں کا یہ ساتھ صرف یہیں تک تھا۔

انعم نے شاید پہلی بار اپنی کل عقل کو بروئے کار لاتے ہوئے سارا ملبہ خود پر ڈال کے، دل آرا کو بری الذمہ قرار دے دیا تھا۔

اس نے باپ سے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ یہ رشتہ سراسر اس کی خواہش پر جڑا تھا۔ دل آرا اس کی ضد کے آگے مجبور ہو گئی تھیں اور باپ سے یہ راز بھی اس نے خود چھپایا تھا۔

جنید آفندی مطمئن ہوئے تھے یا نہیں لیکن انہوں نے چپ سادھ لی تھی نہ کوئی تفتیش نہ ہی تشویش ظاہر کی۔

تب ہی لاؤنج کا دروازہ کھلا، احسن دعا کے کندھے کے گرد بازو لپیٹے اسے اندر لا رہا تھا۔ دل آرا جھکا سر اٹھا نہیں پائی تھیں۔ انعم کے دل کا ایک کونہ خوشی سے بھرا تھا۔ وہ جنید آفندی کی لاڈلی بیٹی تھی۔ باپ اس کے لیے مضبوط قلعہ اب وہ اپنی مرضی سے کھیل سکتی تھی۔ دل آرا کا سر بھی اس کے شکریے کے احسان تلے جھکا تھا۔ اب احسن اور دعا کا معاملہ جنید آفندی کے سپرد ہو گیا تھا۔ دل آرا کا دل بہت سے خدشات میں گھر گیا۔ کہیں وہ بیٹی کی محبت میں کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں۔

باپ پر نگاہ پڑتے ہی احسن کے قدم تھم گئے۔ اس کا دعا کے گرد لپٹا بازو بے جان ہو کر پہلو میں جھول گیا۔ اس کے دماغ میں بہت تیزی سے سب گڈمڈ ہونے لگا۔

تین عورتوں کے بیچ وہ اکیلا قصوروار تھا۔ ایک

عورت ماں تھی، اسے وہ کیسے موردِ الزام ٹھہرا کے، باپ کے عتاب کا نشانہ بناتا۔ دوسری عورت محبت تھی اور ہٹ دھرم بھی اور تیسری حقیقتاً بے قصور اور چوتھا بے قصور یا شاید سب سے بڑا قصوروار وہ خود۔

''آ جاؤ احسن! رک کیوں گئے؟ میں پچھلے ایک گھنٹے سے تمہارا ہی منتظر ہوں۔ انعم نے بتایا ہے کہ آج تم پہلی بار اپنی بیوی کے ساتھ سیر کو نکلے ہو۔ تاخیر ہونا لازمی ہے۔''

وہ طنز کر رہے تھے یا گلہ، وہ سمجھ نہیں پایا۔

دعا بنا پوچھے ہی جان گئی کہ یہ جنید آفندی ہیں۔ ان کی بارعب شخصیت اور چہرے پر گہری سنجیدگی دیکھ کر اس کا رنگ بھی اڑ گیا تھا۔

''بیوی تو خوبصورت ہے تمہاری۔'' ان کا لہجہ سپاٹ تھا ''السلام علیکم!'' دعا نے دو قدم آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! جیتی رہو۔ ہمیشہ خوش اور آباد رہو۔''

انہوں نے خلوص دل سے دعائیں دیتے ہوئے اس کے سر پر بھی ہاتھ پھیرا۔ انعم کی دوست کی حیثیت سے وہ پہلے بھی دو تین بار اس سے مختصر ملاقات کر چکے تھے۔

''احسن تم میرے ساتھ اسٹڈی میں آؤ۔''

وہ ان کا جوان اور اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اس سے یوں سب کے سامنے باز پرس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ بھی اس صورت کہ یہ شادی ان کی بیٹی کے ہی ایما پر ہوئی تھی۔

☆☆☆

رات کو سب لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ عمر نے بڑی ہمت کر کے موضوع چھیڑ دیا۔

''بابا جان! آپ نے دعا کے متعلق کیا سوچا ہے؟''

''کیوں، کیا تم نے پھر سے کوئی پلان کرنا شروع کر دیا ہے۔''

ریاض احمد نے تیکھے چتونوں سے اسے گھورا۔ انہیں اس کی زبان پر بھانجی کا نام بہت کھلا تھا۔

''نہیں پاپا جان! میں اپنے گناہ پر بہت نادم ہوں میں آپ کی اجازت سے دعا کے پاس جانا چاہتا ہوں تاکہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے اس سے معافی مانگ لوں۔ میرے ضمیر پر بہت بوجھ ہے۔''

''عمر بالکل صحیح کہہ رہا ہے۔ غلطی اس کی تھی جو بھی ہوا اس کی وجہ سے ہوا — اسے دعا سے معافی مانگنا چاہیے۔'' عمیر نے سنجیدگی سے کہا۔

ریاض احمد بغور عمیر کے جواز کو سنتے اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات کو پڑھا۔

''تم نے جھوٹ کیوں بولا تھا عمیر؟''

یہ سوال وہ کل سے پوچھنا چاہ رہے تھے۔

''میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

عمیر نے دھیمے لہجے میں وضاحت کی۔ عمر موضوع بدل جانے پر خاموشی سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

جنید آفندی نے اسٹڈی کا دروازہ اندر سے مقفل کر لیا تھا۔ احسن ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''میں نے بیٹے کے رشتے سے زیادہ دوستی کے تعلق کو ترجیح دی تاکہ بغیر کسی جھجک کے مجھ سے اپنے احساسات اور مسائل شیئر کر سکو۔ مگر تم نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا اور مجھ سے مشورہ لینا تو درکنار مجھے بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی میں تمہارا باپ تھا دشمن تو نہیں۔''

انہیں اپنے بیٹے پر بہت غصہ آ رہا تھا۔

انعم کے منہ سے سب سن کے اور دعا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کے بھی یہ سب انہیں خواب کی صورت لگ رہا تھا۔ احسن انعم سے بے حد بے حساب محبت کرتا تھا۔ اس نے اتنا بڑا قدم کیسے

اٹھالیا؟

”آنسٹلی اسپیکنگ پاپا جان! میں کبھی بھی ایسا نہیں چاہتا تھا، یہ ان لوگوں کی پلاننگ تھی۔ انعم اس قدر بضد تھی کہ......“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

”تو پھر اب انعم کو کیا پرابلم ہے؟“

”کک...... کچھ بھی تو نہیں......“ وہ ہچکچایا۔

”کچھ کیوں نہیں...... یونہی تو وہ نہیں روتی رہتی۔ شاید تم نے اسے محبت اور توجہ دینا چھوڑ دی ہے۔“

”سیریسلی ایسا کچھ بھی نہیں پاپا جان۔“ اسے باپ کے شک پر دکھ ہوا۔

”کیا تمہیں اس کی گرتی ہوئی صحت نہیں دکھتی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے پڑے سیاہ حلقے، خشک ویران آنکھیں۔ کیا وہ کبھی ایسی تھی۔“

انہیں تعجب کے ساتھ ساتھ احسن پر غصہ آنے لگا۔

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں پاپا جان!“

وہ خود اندرونی اضطراب کا شکار تھا۔

”تو پھر جو صحیح ہے وہ بتاؤ۔“

وہ اسے یونہی نہیں چھوڑنے والے تھے۔

”میری کیا ویلیو، آپ کی اور ماما جان کی سگی تو صرف انعم ہے ناں تقسیم اس کی محبت کی نہیں، بلکہ ایک جیتے جاگتے انسان کی ہوئی ہے۔“

وہ روہانسا ہو گیا۔ باپ کی طرف داری نے اسے تکلیف پہنچائی تھی۔

”تو کیوں ہونے دی اس جیتے جاگتے انسان نے اپنی تقسیم۔“ وہ دوبدو بولے۔

بیٹے کی بے بسی انہیں کمزور کرنے والی نہیں تھی۔

”میں تو بچہ ایڈاپٹ کرنے پر راضی ہو جاتا مگر امی کو خالص اور نسلی بچہ چاہیے تھا اور مجھے یہاں تک دھکیل کے لانے والی انعم ہی ہے۔ پاپا جان! آپ پلیز اس کے ساتھ اتنی ہمدردی نہ رکھیں۔“ وہ نروٹھے پن سے بولا۔

”تو تمہیں اس سے ہمدردی نہیں۔“ انہوں نے اس کی ٹانگ کھینچی۔

”ہمدردی اور محبت گئی بھاڑ میں، میں تو انصاف قائم کرنے کے چکر میں ادھ موا ہو گیا ہوں۔ کبھی انعم کی دل جوئی اور اعتراف محبت، کبھی دعا کو دلاسے اور وضاحتیں۔ آئی سوئیر پاپا جان، میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ سکون میری زندگی سے رخصت ہو گیا ہے۔ کیا آپ کو میرے وجود سے لپٹی اداسی اور آنکھوں میں ٹھہری فکر نظر نہیں آئی، میرا حال دل کوئی نہیں پوچھتا۔“ وہ رو دینے کو تھا۔

”کون ہے اس سب کا ذمہ دار اور تمہارا ذہنی سکون کس نے تباہ کیا ہے؟“ ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”انعم نے......“ اس نے صاف اور واشگاف الفاظ میں نام لے دیا پھر وہ شروع سے لے کر دعا کی کہانی، دل آرا اور انعم کی پلاننگ، ان کا دونوں پر دباؤ ڈالنا، انعم کا عدم اعتماد، ذہنی کیفیت، دعا کی فطرت، انعم کا ترش رویہ، جھوٹ، لڑائی جھگڑے سب ایک ایک کر کے بتاتا چلا گیا۔

جنید آفندی دم بخود سب سنے جا رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

☆☆☆

جنید آفندی کو کون نہیں جانتا تھا۔ وہ اس شہر کی معزز اور کاروباری فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔ چند سال پاکستان کا کاروبار احسن کو سونپ کے کینیڈا سدھار گئے تھے۔ وہاں بھی انہوں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑے تھے۔

عمر نے اگلے آدھے گھنٹے میں ان کا سارا بائیو ڈیٹا حاصل کر لیا تھا۔

”آفندی ہاؤس“ میں صبح تب ہوئی جب جنید آفندی ناشتے کی میز پر آئے، باقی سب افراد ان

ے گرم مزاج کے پیش نظر اپنے اپنے کمروں میں ہی ے۔ انہوں نے ناہید کو باری باری سب کو بلانے بھیجا۔

ایک ایک کر کے سب کمرے سے نکلتے آ رہے تھے، تب ہی ملازم پیغام لیے آیا۔

”سر جی! کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔“ اس نے مؤدب سا ان کی کرسی کے قریب رک کر اطلاع دی۔

”کون سا مہمان، وہ بھی اتنے سویرے۔“ جنید آفریدی کو حیرت ہوئی۔

”نام نہیں بتایا، کہہ رہا ہے کہ دعا بی بی سے ملنا ہے۔“ انعم، احسن اور دل آرا نے بیک وقت چونک کے دعا کو دیکھا جس کا جوس کی طرف بڑھتا ہاتھ میز پر آ گرا تھا۔

”اسے اندر بٹھاؤ......“ انہوں نے ملازم سے کہا۔

”جاؤ احسن! دیکھو کون ہے؟“ انہوں نے نرمی سے اسے اجازت دی۔

دل آرا اس کی حالت بھانپ گئیں۔ اس کے آخری دن چل رہے تھے۔

”میں بھی دیکھتی ہوں۔“ وہ بھی آہستگی سے کہتی اٹھ گئیں۔

دعا بھی لڑکھڑاتی ٹانگوں پر بمشکل بوجھ ڈالتی ان کے پیچھے ڈرائنگ روم کے دروازے تک آئی تھی۔ اسے لگا کہ سینے میں سانس کہیں گم ہو گئی ہے۔ اس نے لرزتی پلکوں کے بیچوں بیچ کھڑے عمر احمد کو دیکھا، گرتے وجود کو سہارا دینے کے لیے چوکھٹ کو تھاما۔ زمین آسمان اس کی آنکھوں میں گھوم گئے۔

”کون ہو تم؟ اور دعا سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“ احسن سے پوچھا۔

عمر کی نگاہیں دعا کے وجود سے لپٹ گئیں۔ کتنا کرب اور اجنبیت تھی۔ اس نے آخری بار یہ چہرہ زرد اور سوجن زدہ دیکھا تھا۔ اب بھی وہاں حزن ملال کھنڈا تھا۔

”میں عمر احمد ہوں، دعا کا ماموں زاد۔“

وہ اپنی نگاہیں دعا سے ہٹا نہیں پا رہا تھا۔ گزری رتوں کے آثار معدوم نہیں ہوئے تھے۔ یا پھر زندگی اسی نقطہ پر رکی ہوئی تھی۔

”وہی عمر احمد جس کی وجہ سے دعا کو ذلیل و خوار ہونا پڑا۔“

دل آرا کی تیز چبھتی آواز اس کی تھکی سماعت سے ٹکرائی۔ اس کے سامنے کھڑے عمر احمد کی شبیہہ دھندلی ہونے لگی۔

دل آرا کے تیور بگڑ گئے تھے۔ وہ عمر احمد کو اونچی آواز میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ مدھم آوازوں کی بھنبھناہٹ وہ ٹھیک سے الفاظ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بند ہوتی آنکھوں کو زیادہ زور دے کے کھولنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

”آں...... آں......“ وہ چوکھٹ کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔

”دعا...... دعا......“ دل آرا کے زور زور سے چیخنے پر سب کی کرسیاں گھسٹتی چلی گئیں۔ دعا کے حواس سلب ہو گئے تھے۔ عمر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

”وہیں رک جاؤ۔“ دل آرا کے حواس قدرے قائم تھے۔ انہوں نے بازو لمبا کر کے، اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

”دعا...... دعا...... آنکھیں کھولو دعا۔“ احسن اس پر جھکا، سر اپنی گود میں ڈال کے، گال تھپتھپا رہا تھا۔

”ظفر...... ظفر گاڑی نکالو۔“ دل آرا نے مرکزی دروازے کا رخ کرتے آواز لگائی۔

”اسے جلد ہاسپٹل لے جانا ہو گا احسن۔“

انعم کی جان بھی کانپ گئی۔ وہ دعا —— برا نہیں چاہتی تھی۔ جنید آفندی اور احسن نے مل کر اسے اٹھایا۔

”انعم! ڈاکٹر مائرہ کو کال کرو، ایمرجنسی ہے۔“

دل آرا کی رنگت بھی اڑ گئی تھی۔ کوئی بھی عمر کی طرف

متوجہ نہیں تھا۔

☆☆☆

”نوال تم کہاں ہو؟“ گاڑی میں مرکزی سڑک پہ ڈال کے اس نے نوال کو کال ملائی۔

”میں گھر پر ہوں بھائی جان، کیوں خیریت؟“ وہ ناشتہ کر کے پھر سے نیند لینے کے لیے لیٹی تھی کہ عمر کی کال آگئی۔

”نوال! تمہیں ڈاکٹر مائرہ کے پرائیویٹ ہاسپٹل کا ایڈریس معلوم ہے۔“ آگے کا سارا کام وہ اکیلا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اب سب کی مدد درکار تھی۔

”جی..... جی معلوم ہے۔“ نوال کا دل بیٹھ گیا۔ اسے عمر کا لہجہ گڑبڑ لگ رہا تھا۔

”نوال! تم فوراً وہاں پہنچو، دعا بے ہوش ہوگئی ہے۔ اسے وہیں لے جایا گیا ہے۔“

اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کا رخ آفس کی طرف تھا۔ اسے باپ اور بھائی کو بھی مطلع کرنا تھا۔ وہ ان سے مزید چھپا کے دوسری بڑی غلطی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔

نوال کے دل کی دھڑکن انتہائی تیز ہوگئی تھی وہ گھر میں سب کو آدھا سچ بتا پائی، دعا کی پریگنینسی کا بتانے کی اس نے خود میں ہمت نہیں پائی تھی۔ اب اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو دوسری بار پھر سارا ملبہ عمر پر آ گرتا تھا۔

وہ سیڑھیاں پھلانگتی سیدھی باہر کو بھاگی۔

”نوال..... نوال.....“

رابعہ احمد کسی انہونی کو بھانپ گئیں۔ وہ کبھی بھی بغیر بتائے اور کام کے گھر سے نہیں نکلی تھی۔ اس کی شفٹ رات کی تھی۔

”جی.....“ وہ پھولی سانس لیے مڑی۔

”کہاں جا رہی ہو؟ مجھے تو بتاتی جاؤ۔“ وہ بولتی ہوئی اس تک آگئیں۔

”عمر کی کال تھی، دعا کی طبیعت خراب ہے، وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے، وہیں جا رہی ہوں۔“

وہ بات پوری کر کے تیزی سے باہر کی جانب بڑھی۔

”مجھے بھی ساتھ لے لو نوال، میں گھر پر نہیں رکوں گی۔“

وہ بھی لمحہ ضائع کیے بغیر، اس کے پیچھے لپکیں۔

نوال نے بنا اعتراض کیے ان کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا۔

☆☆☆

ایمرجنسی کے کوریڈور میں عمر، عمیر، رابعہ اور ریاض احمد، الیاس احمد اور مریم سمیت موجود تھے۔

”یہ سب اچانک کہاں سے وارد ہو گئے ہیں ماما! اور کس رشتے، ناتے سے دعا ہماری عزت اور آپ کی بہو ہے۔ آپ ان سب کو یہاں سے جانے کو کہہ دیں۔“ انعم کے ماتھے پر لاتعداد بل پڑ چکے تھے۔

وہ ان کا دعا پر سایہ بھی نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔ ان سب نے اسے دربدر کیا تھا۔

”بی کوائٹ انعم۔ ان سب کو نکالنے کا، تم اپنے پاپا کو کیا ریزن دو گی، خدا کا لاکھ شکر ادا کرو، وہ جو کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔ اب خاموش رہ کے، دعا اور بچے کی صحت وسلامتی کی دعا مانگو۔“

انہوں نے دھیمی آواز میں ڈانٹتے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش کروا دیا۔

تب ہی ڈاکٹر مائرہ اور نوال ایمرجنسی سے باہر نکلیں۔ سب نے انہیں گول دائرے میں گھیر لیا۔

”مسز جنید آفندی! دعا کا بی پی بہت ہائی ہے۔ جس کی وجہ سے کیس کمپلیکیٹڈ ہو سکتا ہے۔ جیسے ہی بی پی کنٹرول ہوگا ہم اس کا آپریشن کر دیں گے۔“

ڈاکٹر مائرہ نے دل آرا کو مطلع کیا۔

ان کی جان نکل سی گئی۔ کتنی مشکلوں سے وہ یہاں تک پہنچ پائے تھے۔ باقی سب ناسمجھی سے آپریشن والی بات پہ ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ نوال کا چہرہ ذرا جھکا اور خفت زدہ سا تھا۔

”کچھ بھی ہو ڈاکٹر مائرہ! پلیز آپ دعا کے

ساتھ میرے بچے کو بھی بچا لیں۔“ احسن رو دینے کو تھا۔

اس سفر میں بہت سی اذیت اس کے حصے میں بھی آئی تھی۔

”ڈونٹ وری مسٹر احسن! میں پوری کوشش کروں گی۔ آپ کی مسز کے تھرٹی فور ویکس پورے ہیں، آئی ہوپ سب بہتر ہوگا۔“ وہ خاصی پُرامید تھیں۔

سب ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

”اگر دعا یا میرے بچے کو کچھ ہوا ناں تو..... میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، جان سے مار دوں گا۔ تمہیں کس نے بھیجا ہے، ہماری زندگی میں زہر گھولنے کو۔“ اس نے عمر کا گریبان دبوچ لیا۔

”چھوڑو..... چھوڑو احسن۔“ جنید آفندی نے احسن کو زور سے پکڑ کر پیچھے کو کھینچا۔

”اس کی وجہ سے میری دعا کی یہ حالت ہوئی ہے۔ نجانے وہ کتنی اذیت میں ہے۔“ احسن کو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا تھا۔

”کول ڈاؤن احسن بیٹا، لڑنے جھگڑنے سے کچھ ٹھیک نہیں ہونے والا۔“ دل آرا نے بھی اسے پیار سے منانا چاہا۔

انعم یک ٹک اسے گھورتی جا رہی تھی۔ احسن کی فکر نے اس کے اندر بہت کچھ توڑ دیا تھا۔

جنید آفندی ریاض احمد کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ریاض احمد ...... اٹھنے لگے تو جنید آفندی نے ہاتھ دبا کے روک دیا۔

”لگے رہنے دو انہیں، سب کی اپنی من مرضیاں ہیں۔ ہماری اس جنریشن میں کیا حیثیت۔“ جنید آفندی کا دل بھی بھرا ہوا تھا۔ ریاض احمد ناسمجھی سے انہیں دیکھتے ہوئے ناچار بیٹھ گئے۔

”اب کوئی ہنگامہ نہ کرے، سکون سے بیٹھ کے سب اس کی صحت وسلامتی کی دعا مانگو۔“ دل آرا نے سختی سے سب سے کہا۔

عمر شرٹ سیدھی کرتا بیٹھ گیا۔ عمیر کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر، سست روی سے چلتا کوریڈور سے نکل گیا۔ ریاض احمد کی نگاہوں نے اس کی بے بس چال کو بڑی یاسیت سے دور تک جاتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

دو گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد، آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا تھا۔ سب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کانگریچولیشن ایوری ون، بیٹا پیدا ہوا ہے۔“

ڈاکٹر مائرہ نے گلوز اتارتے خوش خبری سنائی، ان کے پیچھے نوال بھی کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔

”خدایا تیرا شکر ہے۔“ کچھ نے بہ آواز بلند اور کچھ نے دل میں شکر کا کلمہ پڑھا۔

”کیا ہم دعا اور بچے کو دیکھ سکتے ہیں۔“

انعم انہیں دیکھنے کو تاؤلی ہوئی۔ اس نے دل میں اللہ سے ہزاروں بار توبہ کر لی تھی۔

”فی الحال نرس آپ کو بے بی لا کر دکھا دیتی ہے۔ مسٹر احسن! آپ فارم فل کر کے، سائن کر دیں۔ بے بی کا چیک اپ کر کے، چوبیس گھنٹے بعد وہ آپ کی کسٹڈی میں دیا جائے گا۔“

ڈاکٹر مائرہ انہیں آگے کی ساری تفصیل بتا کے اپنے آفس کی طرف بڑھ گئیں۔

”مبارک ہو سب کو.....“ خوشی سے بھرپور پہلی مبارک باد ریاض احمد کی طرف سے آئی تھی۔

وہ جنید آفندی کے گلے سے جا لگے۔ گو کہ دعا کا ملنا، اس کی شادی اور بچے کی خبر ان کے اعصاب پر گراں گزری تھی مگر جو قسمت میں لکھا تھا۔ وہ ہو چکا تھا۔ واویلا کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔ نہ ہی وہ حق رکھتے تھے۔ ان کے لیے یہی سجدہ شکر کا مقام تھا کہ دربدر ہوئی بیٹی ایک باعزت خاندان کی بہو اور ان کی چھت تلے محفوظ رہی تھی۔

”مبارک ہو، مبارک.....“ ہر سو مبارک

سلامت کا شور گونجنے لگا۔

''تمہیں بیٹا بہت ...... بہت مبارک ہو احسن۔'' انعم نم آواز میں اس کے کان کے قریب منمنائی۔

احسن نے مسکراتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ اس کی آنکھوں میں ٹھہری چمک ہر روشنی کو ماند کر رہی تھی۔

★ ★ ★

ریاض احمد اسپتال سے نکل آئے۔ انہوں نے آفس کال کر کے عمیر کا پوچھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ انہوں نے گاڑی کا رخ گھر کی طرف کر دیا۔ وہ اپنے کمرے میں اندھیرا کیے صوفے پر شکست خوردہ سا پڑا تھا۔ اس کے سر میں شدید درد تھا۔ وہ کنپٹیوں پر زور دے دے کر دباتے، درد میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ کاش وہ اسپتال نہ گیا ہوتا۔ اس کا احسن سے سامنا نہ ہوتا مگر کیا اس سب کے ہو جانے سے قسمت بدل جاتی۔

دعا کے ملنے کی دعائیں سب سے زیادہ اسی نے مانگی تھیں۔ اس شہر کے ہر بازار، سڑک اور موڑ پر اسے ڈھونڈا تھا۔ اس کے سارے خواب گھروندے چکنا چور ہو گئے۔

انہوں نے سوئچ بورڈ پہ انگلی رکھ کے بتی جلائی۔ اندھیرا اچھٹ گیا۔ اس نے بوجھل پلکیں اور دکھن سے بھرا سر اٹھا کے باپ کو دیکھا اور پھر سے سر گرا لیا۔

ریاض احمد اس کے برابر جا بیٹھے۔ اس نے کبھی زبان سے کچھ شیئر نہیں کیا تھا مگر وہ اس کا حال دل جانتے تھے، آج تو روز روشن کی طرح سب عیاں ہو گیا تھا۔

''جوان اور فرماں بردار بیٹے کو یوں ٹوٹتے دیکھنا بہت تکلیف دہ ہے عمیر۔'' انہوں نے اس کے کندھے پر دلاسے کے طور پر ہاتھ رکھا۔

''تمہاری پھپھو کی اولین روز سے یہی خواہش تھی کہ تم ان کے بیٹے بنو، مجھے بھی کبھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ پھر وہ کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہم سب ہی اپنی اپنی جگہ گناہ گار ہیں خیر جو بیت گیا۔ وہ کل تھا اور آج کا سچ بہت مضبوط ہے۔ وہ ایک باعزت اور شریف انسان کے نکاح میں ہے۔ اللہ نے بہت بہتر فیصلہ کیا ہے۔ اگر تم دونوں کے بیچ کچھ تھا جو......''

اس نے فوراً باپ کو ٹوک دیا۔

''ہمارے بیچ کچھ بھی نہیں تھا۔ جو زیر گرفت آئے، اظہار نہ ہی عہد و پیمان، بس میری فیلنگز تھیں۔'' اس کا چہرہ ضبط سے سرخ پڑ رہا تھا۔

''شکر ہے خدایا تیرا۔'' انہوں نے لمبی سانس خارج کی۔

''اب وہ ایک باعزت خاندان کی بہو بیٹی ہے۔ اب خیر سے ایک بچے کی ماں بھی بن گئی ہے۔ تم بس اس کے کزن ہو اور اس کے بعد دوست، اس سے زیادہ تمہارا اور اس کا کوئی تعلق نہیں، اس سے اتنی خوش اخلاقی سے ملو کہ اگر اس کے دل میں کوئی دبی ہوئی فیلنگز ہو بھی تو وہ اسے غلط فہمی کے کھاتے میں ڈال دے۔ کوئی بھی شک میں مبتلا نہ ہو عمیر۔''

وہ باپ تھے نہ صرف عمیر کے بلکہ دعا کے بھی۔ انہیں بیٹی کے گھر، رشتے اور عزت کی فکر دامن گیر تھی۔

عمیر کو لگ رہا تھا کہ وہ پہلی بار باپ کی حکم عدولی کرے گا کیونکہ خوش اخلاقی سے ملنا اس کے ضبط سے آگے کی چیز تھی۔ اسے دعا کی عزت عزیز تھی، وہ پہلے بھی اس کی مدد نہ کر پایا تھا، وہ مداوا باقی تھا، اسے تکلیف تھی کہ دعا کے پکو سے پہلا بھی اور آخری وعدہ باندھا جو ایفا نہ ہو پایا۔

''چلو اٹھو آفس چلیں۔''

☆☆☆

انعم کا ارادہ رات دعا کے پاس ٹھہرنے کا تھا مگر احسن نہیں مانا، وہ دعا کو ایک پل بھی تنہا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا اور انعم کے بھروسے پر تو بالکل نہیں، دعا کچھ بھی سننے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ وہ دل آرا کے ساتھ خود وہاں رکا اور انعم کو زبردستی ڈرائیور کے

ساتھ گھر بھیج دیا۔

احسن نے پانچ کالے بکروں کا صدقہ دیا۔ پورے اسپتال میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ اسپتال کے عملے میں ہزاروں روپے بانٹے۔ یہ سب کرتے ہوئے اس نے ایک بار بھی انعم سے مشورہ نہیں کیا۔ خوشی اس کے روم روم سے چھلکتی تھی، یہ بات اسے رہ رہ کر چبھتی تھی۔

اس کا بی پی ہائی تھا مگر اس نے دوا نہ لی، اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا، دل کی بے چینی حد سے سوا تھی۔ اسے کوئی سہارا چاہیے تھا، وہ بے اختیاری کیفیت میں جنید آفندی کے دروازے پر دستک دے بیٹھی۔

وہ اپنے پرسنل منیجر سے ضروری معلومات لے رہے تھے۔ انعم کو باہر پا کر حیران رہ گئے۔

''پاپا جی......'' وہ ان سے لپٹ کر رونے لگی۔ ان کا دل مٹھی میں جکڑا گیا۔ وہ ان کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔

''ادھر آ جاؤ، میرے پاس۔'' وہ اسے بیڈ پہ لے گئے۔

''یہاں بیٹھو اور خاموش ہو جاؤ۔ تمہارا رونا مجھے بھی اذیت دے رہا ہے۔'' انہوں نے اسے بٹھا کر اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔

''اب رونے سے کیا حاصل، جو بھی ہوا، تمہاری ایما پر ہی ہوا۔ افسوس کہ تم نے ایک بار بھی اپنے باپ کو بتانا گوارا نہیں کیا۔'' انہوں نے بھی فٹ سے شکوہ کر ڈالا۔

''یہ سب کرنا وقت و حالات کی ضرورت تھی پاپا جی، ورنہ کسی روز وہ خود سے یہ سب کر لیتا تب ہم اور آپ کیا کرتے۔'' اس نے اپنی ہچکیوں پر بمشکل ضبط کیا۔

''اب تمہیں کون سا احساس اور وجہ رلاتی ہے۔'' انہوں نے بیٹی کے گال ہتھیلیوں کے پیالے میں لیے۔

''ایم سوری مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا۔ میں خود کو ہزار دفعہ سمجھاتی ہوں، ہر روز خود سے عہد باندھتی ہوں مگر کچھ بھی ایفا نہیں ہو پاتا۔ مجھے احسن سے کوئی شکوہ نہیں۔ وہ بہت کوشش کرتا ہے کہ دونوں رشتوں میں توازن برقرار رہے۔ دعا بھی بہت اچھی ہے۔ وہ بہت معصوم اور بے ضرر سی لڑکی ہے۔ رشتوں کو نبھانے اور انہیں جوڑ کے رکھنے والی، صرف ایک میں ہی بدبخت ہوں۔ جو اپنے دل میں گنجائش ہی نہیں نکال پا رہی۔

میں بھی کیا کروں، جب ہوش سنبھالا تب سے لے کر آج اس لمحے تک، میں نے صرف محبت پائی ہے۔ محبت وصولنے کی میں اس قدر عادی ہو گئی ہوں کہ مجھے کسی کو محبت دینا ہی نہیں آتی۔ زندگی میں خواہشوں، رشتوں اور ضد کے ساتھ کیسے سمجھوتا کیا جاتا ہے۔ میں بھلا کیا جانوں۔

احسن کی زندگی میں محبت کا خانہ صرف میرے لیے مخصوص ہے۔ مگر آج مجھے لگتا ہے میں ہار گئی ہوں۔ آج اس کی محبت کا بٹوارہ ہو گیا ہے۔ اولاد سے محبت ہے تو اس کی ماں سے بھی تو ہو گی ناں۔ میں کیا ہوں ایک بنجر زمین۔''

اس کا چہرہ آنسوؤں سے دھلتا جا رہا تھا۔ شکوے نوک زبان پر تھے۔

''اس نے تمہیں محروم رکھ کے آزمایا ہے، تمہارے صبر کی آزمائش کی ہے۔ اس نے تم سے ماں باپ چھینے تو ان کے نعم البدل کے طور پر بہتر ماں باپ سے نوازا۔ زندگی میں ہر سہولت و آسائش مہیا کی۔ جب اتنے سب کے لیے تم نے کبھی اللہ کا احسان مانا نہ شکر ادا کیا تو اب تمہیں کوئی حق حاصل نہیں کہ صرف ایک کمی پہ اتنا شور اور اس کی ناشکری کرو۔ اس نے تمہیں آزمائش میں ڈالا ہے۔ تمہیں اس امتحان پر پورا اترنا ہے۔'' وہ سانس لینے کو رکے۔

''کیسی آزمائش پاپا جی......'' وہ اٹکی۔

باپ کا لفظ بہ لفظ اس کے سینے میں اترتا جا رہا تھا۔ عطا اور بخشش کرنے والا کون تھا اس نے کبھی اس

پہلو پر غور نہیں کیا تھا۔

"تمہارے صبر اور نوازنے کی آزمائش۔ کشادہ دلی اور حسن اخلاق کی آزمائش تمہاری زندگی کا پہلا موقع ہے۔ جہاں تمہیں صبر کرنا پڑ رہا ہے اور تم سے ہو نہیں پا رہا۔ کیونکہ تم نے ہمیشہ لیا ہی لیا ہے۔ دعا کا دل کتنا کشادہ ہے۔ کتنے اعلاظرف والی ہے وہ بچی، جس نے تمہاری سونی گود اور ویران زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے اپنی جوانی اور زندگی داؤ پر لگا دی اور کتنا برا ہے تمہارا دل کہ جو تمہارا بھلا کرے، تم اسی کا بُرا سوچتی ہو۔ تم کسی بھی امتحان پر پوری نہیں اُتریں پھر بھی یہ چاہتی ہو کہ وہ تم پر مزید مہربان ہو۔ اپنی نعمتوں میں سے مزید تمہارا حصہ نکالے، تم کیا......"

"بس پاپا جی......بس کر دیں ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا، مزید ایک لفظ نہ کہیے گا۔"

وہ باپ کے ہاتھ کو زور سے دبوچ کر رونے لگی۔ اپنے فہم کا بھی استعمال کیا جا سکتا تھا مگر اسے تو صرف اور ہمیشہ رونا دھونا ہی آتا تھا۔ اپنی ناقص عقل کا استعمال کر کے، خود سے وابستہ اوروں کی زندگیاں بھی اجیرن کیے رکھیں۔ اپنی ماں سے جھوٹ بولا۔

بلاوجہ سب سے بدگمان ہوئی۔

"مجھے اس امتحان میں پورا اترنا ہے۔ اس آزمائش سے سرخ رو ہو کر نکلنا ہے۔" فیصلہ ہو گیا تھا۔

اس نے اپنی ہمت سے بڑھ کر ارادہ باندھ لیا، اب اس پر مضبوطی سے قائم رہنا تھا۔

☆☆☆

"السلام علیکم!" اس نے با آواز بلند سلام کیا۔

دل آرا جو دعا کو سلائس کھلا رہی تھیں، مڑ کر دیکھا۔ احسن بیٹے کو گود میں بھرے چوم رہا تھا۔ وہ کل سے کوئی سینکڑوں بار اسے چوم چکا تھا۔

"وعلیکم السلام!"

احسن نے فٹ سے بیٹے کو کاٹ میں ڈال دیا۔ انعم نے اس کی یہ حالت نوٹ کی، اب وہ جان گئی کہ احسن نے ایسا کیوں کیا ہے۔ وہ بیٹے کو گود میں بھر کے، انعم کو بدظن یا خودترسی کا شکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"آ جاؤ انو! میں تمہارا ہی ویٹ کر رہی تھی۔" دعا کی آواز نقاہت زدہ مگر چہرہ مسکراتا ہوا تھا۔

"کیوں بھئی، میرا کیوں انتظار ہو رہا تھا؟" وہ خوش دلی سے مسکراتے ہوئے بیڈ پر جا بیٹھی۔

"تمہارا بیٹا تمہاری گود میں دیکھنے کے لیے۔"

دعا کا لہجہ خالص اور شیریں تھا۔

"ہاں اپنے بیٹے کو ضرور گود میں لوں گی۔ اسی لیے تو آئی ہوں، ویسے بھی مجھے کل جانا ہے۔"

"کہاں جا رہی ہو تم؟" دعا نے چونک کر دیکھا۔

احسن اور دل آرا بھی حیرانی اسے دیکھ رہے تھے۔

"میں کل کی فلائٹ سے کینیڈا جا رہی ہوں۔ پاپا جی کے ساتھ۔" اس نے سب کی سماعتوں میں دھماکا کیا۔

"کینیڈا......" دل آرا کا لفظ منہ میں تھا کہ احسن بول پڑا۔

"کینیڈا کیوں؟ اب کیا ہو گیا ہے۔"

احسن کو اس کا اعلان مضطرب کر گیا۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتا تھا کہ اس کام یا بات سے اجتناب کرے جو انعم کو کھٹکے یا برا لگے۔

"کیا بتایا ہے تم نے جنید کو، کیا وہ ناراض ہو گئے ہیں۔" دل آرا کی جان پہ بن گئی۔

"کچھ بھی نہیں ہوا احسن! ہم کسی سے ناراض نہیں ہو کے جا رہے ماما جی، آپ اور پاپا جی وہاں اکیلے ہوتے ہیں، میرے ہونے سے آپ لوگوں کا دھیان بٹ جائے گا۔" اس نے بودا سا جواز دیا۔

"تم یہ شوشا کیوں چھوڑ رہی ہو انعم، ہمیں تمہاری کمپنی کی قطعاً ضرورت نہیں۔ تم اپنے گھر میں، شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی۔۔۔ ہمارے پاس پاکستانی میڈ ہے۔" دل آرا نے صاف انکار کرتے ہوئے اس کا جواز رد کر دیا۔

"ایسا مت کرو یار! اب تو ہمارا بیٹا بھی آ گیا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی کمپلین ہے تو میں معافی مانگ لیتی ہوں۔" دعا نے کہتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

وہ انعم کی ذہنی کیفیت سمجھ گئی تھی۔ وہ دل کی بری نہیں تھی۔

"تم جو کہو گی، میں ویسا ہی کروں گی، تم چاہو تو بیٹا اپنے پاس رکھ لو، میں کبھی پلٹ کر سوال نہیں کروں گی۔"

"مجھے شرمندہ مت کرو دعا۔" انعم نے اس کے ہاتھ پکڑ کر کھول دیے۔

"میں ہمیشہ سب کے لیے ذہنی اذیت کا باعث بنی رہی۔ تم دونوں کو فورس کر کے یہ شادی کروائی اور پھر زندگی اجیرن کر دی، میں دیر سے سہی مگر اتنا سمجھ گئی ہوں دعا کہ دل میں بدگمانی کو جگہ دیتے ہیں تو ذہنی سکون خلجان میں بدل جاتا ہے۔ اور احسن......" وہ شوہر کی طرف مڑی۔

"میں جانتی ہوں کہ میں آپ کے دل کی سب سے اونچی مسند پر براجمان ہوں، اس کے باوجود بھی میں نے اس معتبر اور پاکیزہ رشتے کو پامال کیا، اپنے دل میں شک کو جگہ دی، آپ نے میری جذباتی حرکتوں کی وجہ سے ڈسٹرب ہونے کے باوجود بھی مجھ سے جھگڑا نہیں کیا، میرے روڈلی ہویئر کو صبر سے برداشت کرتے رہے اور دعا تم......تم بھی بہت اچھی ہو۔ تم نے بیچ میں دوستی کا حق ادا کر دیا۔ یونو میں کالج میں بھی کبھار تمہیں پگلی کہا کرتی تھی، تم واقعی پگلی ہو۔ ذرا بھی نہیں بدلیں، میں جیسا کہتی گئی، تم ویسا ہی کرتی چلی گئیں۔ اچھا تھا یا برا۔ کیوں......دعا......کیوں۔" وہ پوچھتے ہوئے رو دی۔ دل آرا اس معجزے پر حیران و پریشان تھیں۔

"تمہارا احسان جو تھا مجھ پر، اپنے گھر میں پناہ دی تھی جب میں بے یار و مددگار تھی۔ کیسے بھول جاتی اس احسان کو۔" دعا نے اس کا ہاتھ تھام کے چوم لیا۔

آج وہ پہلے والی انعم لگ رہی تھی۔ منہ پھٹ، کھری اور جلد ہی اپنی غلطی کا اعتراف کر لینے والی۔

"تم نے بیٹا دے کر، اس خاندان کو مکمل کر کے حساب برابر کر دیا۔ اب میں تمہیں اپنی سب سے قیمتی چیز امانتاً سونپ کر جا رہی ہوں، اس کا بے حد خیال رکھنا، احسن کو کبھی میری کمی نا محسوس ہونے دینا۔"

"جسٹ شٹ اپ انو، تم کہیں بھی نہیں......" احسن کو غصہ آنے لگا۔

"پلیز احسن......" اس نے انگلی اٹھا کے اسے ٹوک دیا۔

"تمہیں میری قسم، مجھے مت روکنا۔ میرے ضمیر پر جو غلطیوں کا بوجھ ہے اس کا ازالہ کرنے دو۔ شاید تم سے دور رہ کر ہی، مجھ میں حوصلہ اور عقل آ جائے۔ ورنہ جو میری حرکات ہیں یقیناً ایک دن میں نظروں کے ساتھ سب کے دلوں سے بھی گر جاؤں گی۔ مجھے اپنی اصلاح اور خود کو سدھارنے کے لیے وقت چاہیے۔

خوب صورت مجھے خدا نے بنایا ہے۔ خود کو خوب سیرت بنانے کے لیے، مجھے محنت کرنا پڑے گی۔ پھر میں دور تھوڑی جا رہی ہوں۔ روز ہماری چیٹ ہو گی، جب دل چاہا تم کینیڈا مجھ سے ملنے آ جانا، بلکہ دعا کو بھی ساتھ لانا، وہ تو کہیں ہنی مون پر بھی نہیں گئی۔"

وہ بڑی ہمت پکڑ کر دھیما سا مسکرائی۔

"انو ایسا نہیں کرو، میں تمہارے بغیر......"

"احسن! انعم نے جو فیصلہ کیا ہے۔ شاید یہ ہم سب کے لیے بہتر ثابت ہو۔" دل آرا پہلی بار بیچ میں بول پڑیں۔

"مگر ماں میں جانتا ہوں کہ وہ میرے بغیر نہیں جی سکتی۔" وہ انعم کو دکھ سے تکتا، ٹوٹے بکھرے لہجے میں وثوق سے کہہ رہا تھا۔

"مر جائے گی، ٹوٹ جائے گی اس سارے

پروسس میں سب سے زیادہ تکلیف مجھے ہوگی۔تم اچھی ہو یا بری، میری محبت ہو، میری آنکھوں کے سامنے تو ہو۔تم جیسا چاہو گی سب ویسا ہی ہوگا، یہ بچہ بھی تمہارا ہی ہے۔ دعا کبھی تم سے کوئی سوال و جواب نہیں کرے گی۔''

دعا نے تڑپ کر شوہر کے حکم کو سنا، اس نے ابھی جی بھر کے نہ بچے کے خدوخال کو دیکھا تھا نہ ہی اسے گود میں لیا تھا۔

وہ منت وسماجت پر اُترا انعم سے محبت کی بھیک مانگ رہا تھا۔''میں تمہارے بغیر ایک پل بھی خوش نہیں رہ پاؤں گا۔ میری زندگی کا ہر فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے تو کیا میری محبت ڈھونگ ہے۔ میں جھوٹ بولتا ہوں۔'' وہ روہانسا ہوگیا۔

دعا اسے یک ٹک دیکھے جارہی تھی۔

جانے کیوں اسے ایک آدھ بار گمان گزرا تھا کہ احسن کی محبت میں وہ بھی حصے دار بننے لگی ہے۔ شاید وہ اس کے دل تک پہنچ گئی مگر انعم کی حقیقت مسلم تھی۔

''میں نے تمہیں ہمیشہ دعا سے دور رکھنے کی سعی کی مگر اب تمہیں، تمہارے بیٹے کی ماں سے دور کرنے کا گناہ نہیں کرنا چاہتی، صرف تھوڑے عرصے کے لیے......''

''ایک لمحے کو بھی نہیں......اور رہی دعا تو وہ میرے سات بیٹوں کی ماں بھی بن جائے تب بھی وہ تمہاری محبت اور چاہت کو چیلنج نہیں کرسکتی۔اب بھی اگر مجھ سے دور جانے کا ذکر کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

وہ دھمکی دے کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ــــ ہے۔

''اچھا انسان وہ ہے جو کسی کے دیے ہوئے دکھ کو بھول جائے مگر کسی کی دی ہوئی عزت اور محبت کبھی بھی نہ بھولے۔''

اسی فرمان ــ پر عمل کرکے، اس کی ماں نے دوسرے شوہر اور سوتیلے بیٹے کے ساتھ ایک خوش باش اور پُرسکون زندگی گزاری تھی۔ وہ اسے بھی یہی ذہن نشین کروایا کرتی تھیں۔

احسن واپس نہیں آیا تھا، اس کا سیل فون بھی بند جارہا تھا۔ انعم کو پیکنگ کرنا تھی۔ دل آرا کو جنید آفندی نے بلایا تھا۔ اسے بھی کل ڈسچارج کیا جانا تھا۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی اللہ سے اپنی بہتری اور بھلائی کے لیے دعا گو تھی۔

''دعا......'' اسے بڑے ہی مٹھاس بھرے لہجے میں پکارا گیا۔ اس نے آنکھوں پر رکھا بازو ہٹایا۔

''کیسی ہو دعا؟''

کمرہ......رابعہ، مریم احمد، نوال اور عمر سے بھر سا گیا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں ممانی جان، آپ کیسی ہیں؟'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹی رہو دعا، بے احتیاطی مناسب نہیں۔'' نوال نے اسے پھر سے پکڑ کر دو تکیوں کے سہارے بیٹھنے میں مدد دی۔

''کہاں گئے ہیں سب؟'' نوال اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

''گھر گئے ہیں، تھوڑی دیر میں لوٹ آئیں گے۔'' مریم نے رابعہ احمد کو ٹہوکا دیا کہ وہ بات کا آغاز کریں۔

''دعا بیٹی! ہم سب تم سے معافی مانگنے آئے ہیں۔''

''پلیز ممانی جان آپ معافی تلافی یا گزرے وقت کا ذکر نہ چھیڑیں، میرے ساتھ آپ لوگوں نے جو کیا مجھے اس کا شکوہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میری عزت کی حفاظت کی مجھے اچھے لوگوں کا ساتھ ملا۔'' اس نے بات ختم کردی۔ مزید بولنے کی گنجائش نہیں تھی، اس کی آنکھیں اور چہرہ سب بول رہا تھا۔

''تم خوش ہو ناں اپنی زندگی میں دعا......'' مریم نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

''ہاں، میں مطمئن ہوں۔''

دعا! تم کچھ دن کے لیے ہمارے ساتھ چل کر رہو۔'' رابعہ بیگم نے بہت ہمت کرکے کہا۔ وہ خاموش رہی۔

☆☆☆

انعم کے ہاتھوں میں دعا کا خط تھا، اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ دعا ایسا کوئی قدم اٹھا سکتی ہے۔

میری مخلص دوست انعم! تم ہمیشہ ہی مجھے بہت پیاری اور عزیز رہی ہو۔ تم بہت بہادر، جلد باز، غیر مستقل مزاج، ہٹ دھرم اور اس سب کے باوجود دل کی بہت ہی اچھی اور جلد ہی اپنی غلطی کا اعتراف کرلینے والی ہو۔ تم نے جس چیز کی تمنا کی وہی پالی۔

میرا کیا ہے؟ ہوش سنبھالا تو باپ چل بسا، باپ کی جگہ ماموں نے لے لی۔ ان کا احترام واجب تھا۔ انہوں نے جو دیا رکھ لیا کبھی نقص بینی یا انکار نہ کیا۔ پھر میں ماں کے ساتھ اس کے دوسرے شوہر کے گھر میں چلی گئی۔ فہیم بعد میں آیا، ماں نے سینکڑوں نصیحتیں پلو سے باندھ دیں۔ ساری زندگی ایک کے بعد ایک نصیحت کھلتی چلی گئی۔ غرضیکہ ساری زندگی احتیاط، گریز اور برداشت سے ہی عبارت رہی۔ تمہارے گھر میں جو کچھ بھی ہوا وہ میرے لیے نیا یا انوکھا نہیں تھا۔ اللہ شاہد ہے کہ مجھے کوئی صدمہ نہیں کہ تم نے میری مجبوری کا فائدہ کیوں اٹھایا؟

یہاں ہر انسان غرض کا مارا ہے۔ ایک محفوظ چھت، ایک محافظ شوہر اور عزت و احترام یہ سب میری غرض تھی۔ آنٹی جی نے مجھے اپنی بہو تسلیم کیا ان کا بھی شکریہ۔ تم جو بھی غصے میں برا بھلا کہتی رہیں، میں نے سب کے لیے تمہیں معاف کرکے اپنا دل صاف کرلیا ہے۔ شاید میں بھی تمہاری جگہ ہوتی تو یہی کرتی، ہم دونوں کی کوئی ذاتی لڑائی نہیں تھی اس بدسلوکی کی وجہ احسن تھا جو میرا شوہر اور تمہاری محبت تھا آج میں نے اس وجہ کو ختم کردیا ہے، مجھے میری دوست انعم چاہیے، سوتن نہیں۔

اللہ نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کا وسیلہ بنا دیا، تم نے میری عزت و آبرو کی حفاظت کی اور میں نے اس خاندان کو بیٹا دیا، تم نے مجھے اس وقت سہارا دیا، پناہ دی جب میرے لیے زمین تنگ اور آسمان سخت تھا۔ تمہارا بہت بڑا احسان تھا۔ تم نے میرے کردار پر شک نہیں کیا، میرا یقین کرلیا دوسرا احسان تم نے مجھ پر، میرے کردار کا آدھا سچ چھپا کے کیا۔

مجھ پر اعتماد کیا۔ اس وقت جب میرے اپنے مجھے دھتکار چکے تھے اور میرے پاس کہیں سر چھپانے کی جگہ بھی نہیں تھی میں تمہارے احسان کا بدلہ نہیں اتار سکتی۔

احسن سچ کہتے ہیں، تم ان کے بغیر جی نہیں پاؤں گی۔ میں یہ بھی جانتی ہوں اس گھر میں رہ کر ہم دونوں خوش نہیں رہ سکتیں۔ محبت بٹوارہ برداشت نہیں کرسکتی اور پھر ایک مکمل مرد اور اس کی پوری محبت پر میرا بھی حق ہے۔ جو ان شاء اللہ مجھے ضرور ملے گا......تمہارے اتنے سارے احسانوں کے بدلے، چھوٹے سے شکریے کے طور پر اپنا لخت جگر تمہیں دیے جارہی ہوں۔ اسے اپنے جیسا ہی بہادر بنانا۔

میرے سامنے ایک لمبی زندگی پڑی ہے، میں شروعات نئے سرے سے کرلوں گی......احسن کو سمجھانا کہ میں نے پہلی بار اپنی زندگی کا فیصلہ خود کیا ہے۔ مجھے اس پہ قائم رہنے دے، کیونکہ اس میں میری خوشی اور ذہنی سکون پوشیدہ ہے۔

اور ہاں......آئندہ کبھی خود کو بدنصیب نہ کہنا۔

اللہ ہم سب کا حامی وناصر رہے۔ (آمین)

تمہاری دوست دعا

یہ خط اسے نرس نے دیا تھا۔ جب وہ آخری بار دعا سے ملنے اسپتال گئی۔ اسے وہیں سے سیدھا ایئرپورٹ کے لیے نکل جانا تھا۔ مگر وہ جا نہیں پائی تھی۔ اب جانے کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا تھا۔ انعم کی آنکھوں سے سیل رواں ہو رہا تھا۔

وہ اس خط کو الٹا سیدھا کرکے بار بار چومتی تھی۔ وہ کتنی عظیم قربانی دے گئی تھی۔ تب ہی بچے کی

رونے کی آواز اسے ہوش کی دنیا میں لے آئی۔ وہ کاٹ میں لیٹا زور زور سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، وہ پھرتی سے اس کی طرف لپکی۔ اس مچلتے وجود کو بانہوں میں بھر کے سینے سے لگا لیا اور چٹاچٹ چومنے لگی۔ اس کے دل میں ٹھنڈک اترتی جا رہی تھی۔

احسن نے اسے طلاق نہیں دی تھی نہ ہی اس نے طلاق مانگی تھی۔ وہ اپنا فیصلہ وقت کے ہاتھوں میں سونپ چکی تھی۔ اس گھر میں اس کو سب نے یہی بتایا تھا کہ وہ گھر وہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی ہے۔ کسی نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ شاید وہ جانتے تھے کہ اس مسئلے کا یہی حل تھا۔ سب اس کی دل جوئی میں لگے رہتے۔ رابعہ احمد اسے کچن چیئر پر بٹھاتیں، ادھر ادھر کی باتیں کرتیں، کھانا بنائے جاتیں۔ مریم بھی اس کا دھیان بٹانے کو زیادہ تر وہیں پائی جاتی۔ ریاض احمد اس کا ہمیشہ کی طرح خیال رکھتے۔ عمر نے مرغا بن کر معافی مانگی تھی۔ سچے دل سے اسے بہن تسلیم کر لیا تھا۔

عمیر بہت بدل گیا تھا۔ زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ پہلے کی طرح اس سے بے تکلفی سے بات نہیں کرتا تھا۔ دعا خود بھی بہت کم اس سے مخاطب ہوتی۔

☆☆☆

بہار رت عروج پر تھی، درختوں پر نئے پھول اور پتے نکل آئے تھے۔ اس شام وہ سب لان میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''رابعہ بیگم اب میرا بھی دل چاہنے لگا ہے کہ ہمارے گھر میں بچوں کی شادی کا رونق کا میلہ لگے۔''

ریاض احمد نے دل کی کہہ ڈالی۔

''واہ بھائی جان، آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔ میں بھی چند روز سے کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوں۔''

الیاس احمد پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔

''عمیر! تمہارے پاپا جان کیا کہہ رہے ہیں۔''

رابعہ احمد نے انجان بنے بیٹے کو چھیڑا۔

''جی... وہ پوئنکا'' ٹھیک ہے۔'' وہ یہی کہہ سکتا تھا۔ دعا فیس بک سرچ کر رہی تھی۔ اس نے سر اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی۔

''عمیر! تمہیں کوئی پسند ہے تو بتا دو۔'' ریاض احمد نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ شپٹا گیا۔

''نن... نہیں تو...'' اس نے گلا کھنکھارتے ہوئے جواب دیا۔

''عمیر بھائی آپ شرما رہے ہیں یا گھبرا رہے ہیں۔'' عمر نے ٹانگ کھینچی۔

''عمر، میرے بیٹے کو تنگ نہ کیا جائے۔''

''پاپا جان، کیا مجھ سے بھی، میری پسند پوچھی جائے گی۔'' عمر بڑے بھولپن سے باپ سے پوچھ رہا تھا۔ ''نہیں بیٹا جانی، مجھے آپ کی عقل پر قطعاً بھروسا نہیں۔ اس لیے آپ اپنے طور پر کوئی بھی کوشش نہ کریں۔'' ریاض احمد نے اسے صاف ہری جھنڈی دکھا دی یعنی یہ آفر صرف عمیر تک محدود تھی۔

''تو پھر میں اگلے ویک اینڈ پر عمیر اور دعا کا رشتہ طے کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔'' ریاض احمد نے دعا کی سماعت پر دھماکہ کر دیا۔

ریاض احمد، عمیر کی رضامندی لے چکے تھے۔ دعا کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ وہ ان کے فیصلے پر اعتراض نہیں کرے گی۔ رابعہ احمد کو بھی اعتماد میں لیا گیا تھا۔

''مگر مجھے عمیر سے شادی نہیں کرنی ماموں جان آئی ایم سوری۔'' دعا نے موبائل سے سر اٹھا کر سنجیدگی سے کہا۔

عمیر اسے حیرانی سے تکتا رہ گیا۔

مریم اور الیاس احمد کے حیرت سے کھلے منہ سے مبارک باد نہ نکل سکی۔

عمر خوشی سے بھنگڑا ڈالنے کو آدھا اٹھ بھی گیا تھا۔

''مگر کیوں؟'' رابعہ احمد عمیر کا خفت زدہ چہرہ پڑھ چکی تھیں۔

''اس کیوں کا جواب مجھ سے نہ لیا جائے تو بہتر ہے۔''

''نہیں دعا! تم ایسے نہیں جا سکتیں تمہیں وجہ بتانا ہو گی۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہوا تم نے اس کے لیے ہمیں معاف نہیں کیا ہے۔''

''میں آپ سب کو معاف کر چکی ہوں لیکن آپ لوگوں پر اعتماد زندگی بھر نہیں کر پاؤں گی۔''

''دعا بیٹا! وہ سب کچھ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا۔ تم آج بھی ہماری بیٹی ہو۔'' ریاض صاحب نے آہستہ سے کہا۔ ''غلط فہمی کیسی؟ کیا آپ سب لوگ مجھے نہیں جانتے تھے؟ میرا بچپن، جوانی سب آپ کی نظروں کے سامنے تھی۔ الیاس ماموں نے لالچ میں آ کر سازش کی اور عمران کا آلہ کار بن گیا۔ یہ سودا عمر، نوال کے لیے کر سکتا تھا یا الیاس ماموں اپنی بیٹیوں کے لیے کر سکتے تھے؟ ہرگز نہیں، آپ لوگ ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اور ماموں جان! آپ نے فوراً یقین کر لیا۔ اگر نوال سے کوئی غلطی ہو جاتی تو کیا آپ اس کے لیے یہی سزا تجویز کر کے اسے اسی طرح صفائی کا موقع دیے بغیر گھر سے نکال دیتے؟

''لیکن دعا! میرا کیا قصور ہے؟ میں نے تو تمہیں بچانے کے لیے اپنے گھر والوں کی ناراضی مول لی۔'' عمیر نے اس کی بات کاٹی۔

''تمہارا قصور......؟'' وہ ہنسی ''تمہارا قصور یہ ہے کہ تم بزدل ہو۔ تم بااختیار تھے۔ اس گھر کے بڑے بیٹے تھے۔ تم چاہتے تو میرے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو جاتے۔ تم نے مجھے الیاس ماموں کے چنگل اور عمر کی سازش سے ضرور بچایا لیکن تحفظ نہ دے سکے۔ اس رات جب تم مجھے حماد کے گھر کے باہر چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔ تم نے ایک لمحہ کے لیے نہیں سوچا۔ حماد سے میرا رشتہ کیا ہے۔ تم مجھے ایک نامحرم شخص کے پاس چھوڑ کر چلے گئے؟

اس کی کیا ضمانت تھی کہ میری عزت وہاں محفوظ رہتی؟ تم نے تو اس بات کی تصدیق بھی نہیں کی کہ وہ گھر پر بھی ہے یا نہیں آج بھی یہ سوچ کر میں کانپ اٹھتی ہوں کہ اگر مجھے انعم کا گھر نہ ملتا تو میں اس رات کہاں جاتی۔ اگر غلط ہاتھوں میں پڑ جاتی تو میرا ٹھکانا کہاں ہوتا۔ میں انعم کا احسان کبھی نہیں اتار سکتی۔ اس نے اس وقت مجھ پر اعتماد کیا جب میرے اپنے خونی رشتہ دار میرے بدکردار ہونے پر ایمان لا چکے تھے۔''

ریاض احمد اور الیاس احمد کا سر جھک گیا تھا۔ مریم اور رابعہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مریم نے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میرا آپ سے کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ پھر بھی انسانیت کے ناتے آپ ایک بار میری بات تو سنتیں۔ آپ نے تو میری بات سننے کی بھی زحمت نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ آپ جانتی تھیں کہ میں بدکردار نہیں ہوں۔ اگر آپ مجھے بدکردار سمجھتیں تو اپنے بھائی سے میری شادی کیوں طے کرتیں۔'' وہ مریم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہی تھیں۔

مریم نے دل سے تسلیم کیا۔ وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ اس کے دل میں واقعی کھوٹ آ گئی تھی۔

''لیکن میں نے تم سے وعدہ کیا تھا دعا! تمہیں مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں شرعی اور قانونی حقوق کے ساتھ لے جاؤں گا۔'' عمیر نے کمزور آواز میں یاد دلایا۔

''مجھے بس ایک بات کا جواب دے دو عمیر! کیا تم نوال کو اس طرح کسی نامحرم مرد کے دروازے پر آدھی رات کو چھوڑ کر آ سکتے ہو؟''

وہ تمہاری مجبوری تھی۔ لیکن میری عزت کا سوال تھا۔ عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔

''تم نے پلٹ کر خبر نہ لی۔ میرے پاس تمہارا ایڈریس نہیں تھا مگر تم تو رابطہ کر سکتی تھیں، کیا میں نہ آتا، تمہیں اس مجبوری سے نکالنے کے لیے چاہے زبان سے اعتراف نہ کیا ہو مگر ہمارے بیچ ان کہا

بہت کچھ تھا دعا۔'' وہ چلا پڑا......اس کا ضبط ٹوٹ گیا تھا۔

''میں نے کال کی تھی......'' اس کے دل کی بھڑاس باقی تھی۔

''کب کی تھی......'' وہ حیران رہ گیا۔

''جب تمہیں عمر نے گولی ماری تھی۔ پھر میں نے دوسری بار بھی کال کی۔ اسی وعدے کو یاد دلانے کے لیے جب میرا نصیب احسن سے زبردستی جوڑا جا رہا تھا۔ تب میں اذیت میں تھی اور تم میرے سارے مجرموں کو معافی نامہ دلوا رہے تھے۔''

وہ رو دی اس کی برداشت یہیں تک تھی۔

ایک بار پھر اسے ماضی میں دھکیلا گیا تھا۔ اس کی عدالت لگ گئی تھی۔ سوال وجواب کیے جا رہے تھے۔

''پلیز دعا......روؤ مت......'' وہ نرم پڑ گیا۔ تمہارے آنسو مجھے کمزور کر رہے ہیں۔''

''ہمارے بیچ کیا تھا عمیر......''

اس کا نم چہرہ سراپا سوال تھا۔

اس برسوں پرانی محبت سے پردہ اٹھ جاتا تھا۔

''محبت تھی دعا......'' وہ بھی روہانسا ہو گیا۔

کبھی یہ احساس کتنا خوبصورت انوکھا سا لگتا تھا۔

''محبت اتنی کمزور نہیں ہوتی۔ محبوب تو خدا کو بھی نہیں سونپا جاتا۔ تم نے مجھے کس کو سونپا تھا، جس سے میرا کوئی رشتہ ہی نہیں بنتا تھا۔'' وہ پھڑ پھڑاتے دل کے ساتھ یک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔

میں کل یہاں سے جا رہی ہوں۔ کینیڈا کی یونیورسٹی میں میرا ایڈمیشن ہو چکا ہے۔ میں اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرنا چاہتی ہوں۔ اب میں سوچ سمجھ کر اپنے دل کے مطابق اپنی مرضی کے فیصلے کروں گی۔ میری زندگی پر اب صرف میرا حق ہے۔ ماما جان نے میرے اکاؤنٹ میں دس کروڑ روپے جمع کرا دیے ہیں۔ مجھے اب پیسوں کی کمی نہیں ہے۔ میں اپنا مکان الیاس ماموں اور عمیر کے نام کر رہی ہوں۔

الیاس کے سر پر جیسے جوتا پڑا تھا۔ وہ بلبلا اٹھا۔

''بس کرو دعا......اب اور ذلیل نہ کرو۔''

''دعا! میں نے جو کچھ کیا۔ وہ میری جذباتی حرکت تھی۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا تم میری بے وقوفی معاف نہیں کر سکتیں؟'' عمیر نے ملتجی لہجے میں کہا۔

''میرے دل پر اتنے زخم ہیں کہ انہیں بھرنے میں بہت وقت لگے گا۔'' دعا نے صفائی سے کہا۔

''میں ساری عمر تمہارا انتظار کر سکتا ہوں۔''

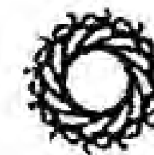
''ساری عمر کس نے دیکھی ہے عمیر! میں نے تو ایک پل میں ہی دنیا بدلتی دیکھ لی تھی۔'' وہ اداسی سے مسکرائی۔

''تم اپنا ارادہ بدل نہیں سکتیں۔'' ریاض احمد نے بڑی دیر بعد زبان کھولی۔

''فی الحال تو یہ ممکن نہیں ہے ماموں جان! شاید زندگی میں کبھی ایسا ہو کہ میرے دل میں زندگی کی آہٹ سنائی دے۔ مجھے اپنوں کی ضرورت محسوس ہو۔ تب میں لوٹ کر آپ لوگوں کے پاس آؤں گی۔ لیکن ابھی میرے لیے کچھ بھی قبول کرنا ممکن نہیں ہو گا۔

وہ ان کے درمیان سے خاموشی سے اٹھ گئی تھی۔ وہ سب ایسے ساکت بیٹھے تھے جیسے کسی جادوگر نے انہیں پتھر بنا دیا ہو۔ انہیں اب باقی زندگی ایک کسک کے ساتھ ہی جینا تھا۔

دعا نے کینیڈا کی سرزمین پر دھڑکتے دل کے ساتھ قدم رکھا تھا۔ ماما جانی کا سہارا نہ ہوتا تو شاید وہ اتنا بڑا فیصلہ نہ کر پاتی۔ وہ ڈری سہمی سی لڑکی ایک نئی سرزمین پر ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہوئے بہت پراعتماد تھی۔ وقت نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ بڑے بڑے فیصلے کرنا بھی۔ اور شاید وقت کو ہی یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ کبھی محبت کی پکار پر واپس لوٹ پائے گی یا نہیں۔



احساس

قرۃ العین خرم ہاشمی

''آپ کسی کے ساتھ کتنے سال بھی گزار لیں مگر جب آپ سے اس کی قدر و قیمت پوچھی جائے گی تو آپ ان گزرے ماہ و سال کے کسی ایک خاص لمحے، پل کی بات یاد کر کے اس کا حوالہ ضرور دیں گے کیوں کہ وہ ایک لمحہ ہی ہم پر کسی کی اصل قدر و قیمت کا

راز کھول دیتا ہے۔ اسی لیے تو دانشور کہتے ہیں کہ کسی کو جاننے کے لیے ایک لمحہ ہی بہت ہوتا ہے۔ جیسے کسی سے محبت اچانک ہو جاتی ہے۔ یہ جو اچانک ہے ناں یہ اسی ایک خاص پل کا نام ہے۔ جب محبت مہربان ہوتی ہے اور دل پر اپنے سب اسرار کھول دیتی ہے۔

کیسے ایک معمولی سی چیز نے مجھے احساس کے گہرے رشتے سے ہمیشہ کے لیے باندھ دیا اور۔۔!!"

☆☆☆

"کل میں ندا کے ساتھ اچھرہ جاؤں گی۔ وہاں ہر طرح کے کپڑے بہت اچھے اور مناسب دام میں مل جاتے ہیں۔ صائمہ کے سسرال میں دینے کے لیے لینا ہیں تو وہاں سے ٹھیک رہیں گے۔"

کلثوم نے خبروں میں کھوئے اپنے مجازی خدا کو مخاطب کیا۔ وقار نے فوراً ٹی۔ وی کی آواز کم کی اور بستر کی چادر جھاڑتی اپنی زوجہ محترمہ کی طرف دیکھا اور اپنی عینک کو ٹھیک کرتے ہوئے کھنکھار کر گویا ہوئے۔

"دیکھیے بیگم صاحبہ! ویسے تو اس گھر کا سارا حساب کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے اور ماشاء اللہ سے پچھلے کئی سالوں سے آپ بخوبی اپنی ذمہ داری نبھا رہی ہیں اور۔۔۔!!"

"اصل بات کی طرف آئیں!" کلثوم نے مڑ کر تیکھے لہجے میں کہا تو وقار گڑبڑا کر رہ گئے۔

"وہ بات یہ ہے کہ۔۔!" وقار نے لفظوں کو مناسب ترتیب دینے کے لیے کچھ لمحوں کا توقف کیا کہ کوئی بھی لفظ ان کے نازک مزاج پر گراں نہ گزرے۔

"گھر کی بچی کی شادی ہے۔ سب کچھ بہت اچھا ہونا چاہیے۔ اس لیے میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ آپ پیسوں کی فکر مت کریں اور سب چیزیں اپنی حیثیت کے مطابق ہی لیں اس سے کم ہرگز نہیں!"

وقار نے لیٹتے ہوئے زوجہ محترمہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جس پر ملے جلے ہی تاثرات نظر آ رہے تھے۔

"آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں گھر کی اس "معصوم بچی" (دانت پیس کر) کے ساتھ زیادتی کروں گی!"

کلثوم نے کمر پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بیگم صاحبہ تو لڑنے کے موڈ میں ہیں!" وقار ان کے انداز سے سمجھ گئے۔ اس لیے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"ایسا میں نے کب کہا؟ میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ یتیم بچی ہے۔ ساری زندگی جہاں ہم نے اتنا کچھ کیا ہے۔ اس کی یہ ذمہ داری بھی خوش اسلوبی سے ادا کرنے میں کیا برائی ہے۔"

اب کی بار وقار کا لہجہ تھوڑا سخت تھا۔ کلثوم فوراً سنبھل گئیں کہ وقار کو غصہ دلانے کا انھیں ہی نقصان ہونا تھا کیونکہ وقار کو غصہ بہت کم آتا مگر جب آ جاتا تو پھر آسانی سے جاتا نہیں تھا۔ اس لیے کلثوم اپنی من مانی اور ضد وہاں تک ہی رکھتیں، جہاں تک وقار اس کا بوجھ سہہ سکتے۔

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے کبھی صائمہ کے ساتھ کسی طرح کی کوئی زیادتی نہیں کی ہے، جو اپنے بچوں کو کھلایا، وہی نوالہ اس کے منہ میں بھی ڈالا۔ میرے دل میں بھی خدا ترسی ہے! میں تو اس لیے بچت کا کہہ رہی ہوں کہ ساتھ ہی احمد کی دلہن کی بھی بری بنانی ہے۔ سوچ سمجھ کے سب کام کریں گے تو ہی یہ وقت عزت کے ساتھ کٹے گا۔"

کلثوم نے تفصیل سے کہا تو وقار کا لہجہ بھی نرم ہو گیا۔

"میں مانتا ہوں کہ آپ نے میری بھتیجی کو ہمیشہ اپنی بیٹی سمجھ کر ہی پالا پوسا ہے۔ بس آپ کسی چیز کی فکر مت کریں۔ جس کا جو نصیب ہوگا اسے مل جائے گا۔ آپ تیاری کریں اور صائمہ کی پسند کی سب چیزیں لیں۔ وہ بچی کہتی کچھ نہیں ہے مگر ہمیں ہی خیال رکھنا چاہیے!"

وقار نے بات ختم کرتے ہوئے دوبارہ ٹی۔ وی کی آواز بلند کر دی۔ کلثوم نے منہ بنا کر "اونہہ" کہا اور دھپ سے بستر پر بیٹھ گئیں۔

"ساری زندگی گزر گئی۔ پہلے ساس صاحبہ کی خدمت اور سسرالیوں کی آؤ بھگت کرنے میں وقت گزرا۔ پھر اکلوتے دیور اور دیورانی کی حادثاتی موت کے بعد ان کی پانچ سالہ بچی کی ذمہ داری ہم پر آ پڑی۔ اللہ جانتا ہے کہ کبھی اسے غیر نہیں سمجھا مگر ہمارے یہاں تو ایسے رشتوں کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے ہی دیکھا جاتا ہے۔ جیسے میں تائی بن کر ایک عورت یا ماں نہیں ہوں۔۔۔! ارے رشتوں کو نام دینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ممتا بھرا دل تو سب بچوں کے لیے ایک سا ہی دھڑکتا ہے ناں۔۔۔!!"

کلثوم دل ہی دل میں شکوے کرتی، ایک دم ہی چونکیں۔

"کیا سچ میں میرا دل فرق نہیں کرتا؟" اس سوال نے انھیں آنکھیں چرانے پر مجبور کر دیا۔

"ہاں کہیں کہیں، تھوڑا بہت یا بعض جگہوں پر کچھ زیادہ ہی......!!"

دل نے فوراً سارا حساب پیش کیا تو کلثوم ضمیر کی چبھن سے نظر چراتی سونے کے لیے لیٹ گئیں۔

(مگر سکون کی نیند اور اچھے خواب دیکھنے کے لیے اچھی سوچوں اور نیک عمل کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔")

☆☆☆

"مہندی ہے رچنے والی، ہاتھوں میں گہری لالی
کہے سکھیاں، اب کلیاں ہاتھوں میں کھلنے والی ہیں
تیرے من کو، جیون کو نئی خوشیاں ملنے والی ہیں!
او ہریالی بنو۔۔۔!!"

بڑے سے ہال نما کمرے میں ملی جلی آوازوں کا شور تھا۔ صائمہ کی شادی کا سن کر کلثوم کی دونوں بیاہی بیٹیاں ندا اور حرا ہر روز شام کو اپنے نٹ کھٹ بچوں سمیت چلی آتیں اور آس پاس پڑوس کی لڑکیوں کو جمع کر کے ڈھولکی بجانے کا شوق پورا کرتیں اور رات کو مزے داری دعوت اڑا کر اپنے گھر چلی جاتیں۔

"ارے جس کی شادی ہے۔ اسے تو بلا لو! کہاں رہ گئی ہے وہ!" پڑوس میں رہنے والی عالیہ نے متلاشی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔

"آتی ہو گی صائمہ اس نے کہاں جانا ہے! تم لوگ گانا گاؤ۔ ندا! اپنی بھابی کو بھی بلا لینا تھا۔ نہیں تو وہ پھر شکوہ کرے گی کہ مجھے کسی نے نہیں پوچھا۔"

کلثوم نے اپنی بڑی بہو زارا کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"امی کئی بار بلایا ہے بھابی کو مگر ڈھولکی کی آواز سے ان کے سر میں درد ہو جاتا ہے۔ ابھی بھی صائمہ انھیں چائے دینے ہی گئی ہے۔"

ندا نے منہ بناتے ہوئے کہا تو کلثوم منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئیں۔ یہ سچ تھا کہ سارے گھر کی ذمہ داری صائمہ نے بہ خوبی اٹھائی ہوئی تھی۔

اب جب کہ اس کی شادی میں بھی زیادہ وقت باقی نہیں رہا تھا وہ پھر بھی اپنے حصے کی سب ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھا رہی تھی۔ کلثوم نے ایک دن بھی اس کے چہرے پر اکتاہٹ یا بےزاری نہیں دیکھی۔ کلثوم کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب ندا اور حرا کی شادی ہونے والی تھی تو ان دونوں کے نخرے اور لاڈ ہی ختم نہیں ہو رہے تھے۔ وہ کئی مہینے پہلے ہی "پرائی" بن کر بیٹھ گئی تھیں اور اسی بات کو لے کر ماں باپ اور بھائیوں سے لاڈ اٹھواتی تھیں۔ ایک صائمہ تھی جو چپ چاپ سر جھکائے ایسے کاموں میں گم تھی جیسے شادی اس کی نہیں کسی اور کی ہو رہی ہو۔

"آئے ہائے! کہیں لڑکی اس شادی سے ناخوش تو نہیں!" کلثوم کے دل میں ایک خیال ابھرا اور وہ بےچین ہو گئیں۔

''یہ نہ ہو کہ ساری زندگی کے کیے کرائے پر، ایک غلط فیصلے کی وجہ سے پانی پھر جائے۔'' کلثوم کو عجیب عجیب خیالات تنگ کرنے لگے۔

''ندا! یہ اٹکھیلیاں چھوڑ اور میری بات سن!''

سب کھا پی کے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ ندا اپنے شوہر کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ جب کلثوم نے اسے پکارا۔

''جی امی!'' ندا نے تخت پر ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے، ہاتھ میں پکڑی پیالی میں سے چمچ بھر کے منہ میں ڈالا۔

''واہ کیا زبردست ٹرائفل بنایا ہے اپنی صائمہ نے۔ قسم سے اس کے سسرال والوں کے تو مزے ہوں گے۔ روز مزے مزے کے کھانے جو ملا کریں گے!'' ندا نے کھلے دل سے سراہا تو کلثوم چڑ گئیں۔

''یہ سب میں نے ہی اسے سکھایا ہے۔ تیری ماں کے ہاتھ کا ذائقہ ہے اس کے کھانوں میں۔'' کلثوم نے کہا۔

''اچھا۔۔! مگر امی یہ ماں کے ہاتھ کا ذائقہ میرے یا حرا کے ہاتھ میں کیوں منتقل نہیں ہوا؟''

ندا نے اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں کہا تو کلثوم نے ایک ہاتھ اس کے نازک کندھے پر مارا۔

''ہائے اللہ امی! کچھ تو خیال کریں! خیر سے شادی شدہ اور دو عدد پیارے پیارے بچوں کی ماں ہوں اب۔''

ندا نے اپنا کندھا سہلاتے ہوئے دہائی دی۔

''خیر سے دس بچوں کی ماں بھی بن جاؤ گی، تب بھی رہو گی میری بیٹی ہی۔'' کلثوم نے اطمینان سے جواب دیا۔

''اللہ معاف کرے، دس بچے!!'' ندا نے دہل کر دل پر ہاتھ رکھا۔

''اچھا یہ ڈرامے چھوڑ! تیری تو صائمہ سے بہت دوستی ہے۔ ذرا اس کے دل کا حال تو پتا کر۔ کیوں اتنی گم صم سی ہے؟ کہیں اس رشتے سے ناخوش تو نہیں وہ! ساری زندگی میں نے کبھی اس میں اور تم لوگوں میں کوئی فرق نہیں کیا۔ مگر پھر بھی ان رشتوں میں خوش کون ہوتا ہے! ضرور کہیں نہ کہیں تو شکوہ رہ ہی جاتا ہے ناں! اب سب کے دل ہماری طرح صاف اور بڑے تو نہیں ہوتے۔''

کلثوم نے کہا تو ندا نے کھنکھار کر انھیں ٹوکا۔

کلثوم نے گھورا تو ندا فوراً بولی۔

''دیکھیں امی! میں صاف اور سیدھی بات کہوں گی! اب چاہے آپ کو برا لگے۔ اگر سننی ہے تو ٹھیک مگر پلیز دوبارہ میرے کندھے پر ڈرون حملہ مت کیجیے گا۔'' ندا نے حفاظتی تدابیر اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''ہے تو تُو میری اولاد مگر مجھے پتا ہے کرنی تُو نے بکواس ہی ہے چل ابھی میری مجبوری ہے! بول کیا کہنا ہے۔ کچھ نہیں کہتی میں تجھے۔''

کلثوم نے دانت پیستے ہوئے اسے اجازت دی۔

''یہ ہوئی نا بات۔ اچھا تو اب آپ سنیں!'' ندا نے آرام سے پہلے ٹرائفل ختم کیا اور پھر ماں کی طرف متوجہ ہوئی۔

''امی اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ اور ابو نے صائمہ کے سر پر اس وقت دست شفقت رکھا، جب پورے خاندان میں سے کوئی بھی یہ ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔ یہ آپ لوگوں کو بڑا پن ہے۔ مگر امی جب بات اپنے یا پرائے بچے کی ہوتی ہے تو شاید فطری طور پر تھوڑا فرق آ جاتا ہے۔ اب دیکھیے ناں آپ جس طرح مجھ سے یا حرا سے لاڈ پیار کرتی ہیں، اپنا حق جتاتی ہیں، اس طرح کبھی صائمہ سے نہیں کرتیں۔ میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہی کہ آپ ظالم ہیں یا آپ نے اس پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے ہیں مگر امی ایک واضح فرق اور جھجک آپ کی طرف سے ہمیشہ رہی ہے۔ اس لیے تو جب ہارون بھائی کی شادی

کی بات ہو رہی تھی تو ابو چاہتے تھے کہ ان کی شادی صائمہ سے ہو جائے مگر آپ نہیں مانیں۔ نہ ہارون بھائی کے لیے اور نہ احمد بھائی کے لیے! اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ زارا بھابھی کا مزاج۔ اب جو دوسری بہو آپ لا رہی ہیں، وہ بھی غیر خاندان سے۔ جس کے مزاج کے بارے میں آپ کچھ نہیں جانتیں مگر پھر بھی آپ کی ضد تھی کہ صائمہ نہیں۔۔۔! مگر دوسری طرف آپ نے اپنی دونوں بیٹیوں کے رشتے خاندان میں کیے کہ باہر کے لوگوں سے بہتر اپنے ہوتے ہیں! اور صائمہ کو آپ ایک انجان شخص کے ساتھ بخوشی رخصت کرنے پر راضی ہیں۔ کیا یہ فرق نہیں ہے؟

امی یہ بہت چھوٹی چھوٹی مثالیں ہیں۔ اب صائمہ کی چوبیس سالہ زندگی میں نجانے اور کتنی ایسی چھوٹی بڑی بے شمار باتیں جمع ہوں گی۔ اس لیے اس بات کو چھوڑیں اور اسے اچھی طرح سے رخصت کرنے کی تیاری کریں! ایک سچ تو آپ بھی دل سے مان لیں کہ آپ چاہے کتنی بھی اچھی ہوں مگر آپ اس کی ماں نہیں بن سکیں جبکہ اس نے شاید آپ کی بیٹیوں سے کہیں زیادہ آپ کی خدمت ضرور کی ہے!''

ندا کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ کلثوم کی نظر اچانک لاؤنج کے دروازے کے پاس لہراتے نیلے آنچل پر پڑی۔ تو وہ چونک گئیں۔ صائمہ نے ان کی سب باتیں سن لی تھیں۔

''اف میرے ربا! یہ لڑکی بھی بولتے ہوئے کچھ نہیں سوچتی ہے۔ اب بھلا وہ کیا سوچ رہی ہوگی ہمارے بارے میں۔''

کلثوم کے دل کی چبھن تیز ہوئی تھی۔

☆☆☆

یہ شاید اس دن کی باتوں کا اثر تھا کہ کلثوم نے صائمہ کو مایوں بٹھا دیا اور کوئی بھی کام کرنے سے سختی سے منع کیا مگر صائمہ کے بیٹھنے سے سارے گھر میں عجیب افراتفری پھیل گئی۔ پہلے تو صائمہ خاموشی سے دیکھتی رہی پھر مجبوراً اسے سامنے آنا پڑا۔ اس نے وقار کو چائے بنا کر دی تو وہ خوشی سے کھل اٹھے۔

''قسم سے صائمہ بیٹی! آج صبح سے تمہارے ہاتھ کی چائے نہیں پی تھی تو ایسا لگ رہا تھا جیسے سورج طلوع ہی نہیں ہوا ہے! کیا مزیدار اور خوشبو بھری چائے بناتی ہو۔ اللہ تمہیں خوشیاں دے!''

وقار نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو پیلے دوپٹے سے جھانکتا اس کا چہرہ حیا کی لالی سے چمکا مگر ساتھ ہی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔

''حد ہے بھئی! لڑکی کو کچھ دن آرام بھی کرنے دو۔ کل کو رخصت ہو کر چلی جائے گی تو تب بھی تو گھر کے سب کام ہوں گے ناں!''

کلثوم بیگم نے چڑ کر کہا اور بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ صائمہ نے مسکرا کر تایا ابو کی طرف دیکھا۔

''میں دیکھتی ہوں انھیں!'' وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''تائی امی!'' صائمہ نے تخت پر بیٹھی کلثوم کو پکارا تو انھوں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ پیلے جوڑے میں ملبوس، پریشان اور گھبرائی سے کھڑی وہ انھیں ندا اور حرا جیسی ہی لگی تھی۔

''بیٹی چاہے کسی کی بھی ہو مگر لگتی ایک جیسی ہی ہیں۔'' کلثوم کی آنکھوں میں نمی پھیلی۔ جسے چھپانے کے لیے انھوں نے منہ پھیر لیا۔

''تائی امی!'' صائمہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی ان کے پاس آئی۔ کلثوم نے سر نہیں اٹھایا، بس ''ہوں'' کر کے رہ گئیں۔

''تائی امی! کوئی کچھ بھی کہے مگر سچ یہ ہے کہ آپ کا دل بہت بڑا ہے! آپ نے جس طرح بچپن سے میری پرورش کی، مجھے پالا پوسا، میری اچھی تعلیم و

تربیت پر توجہ دی، مجھے زندگی کا ہر ہنر سکھایا۔ اس کے لیے میں آپ کی دل سے مشکور ہوں۔ میرے دل میں آپ کے لیے کسی طرح کا بھی کوئی شکوہ نہیں ہے ہاں اگر میری کسی بات یا نادانی سے آپ کا دل دکھا ہو تو میں معذرت چاہتی ہوں۔" صائمہ نے دونوں ہاتھ جوڑے تو کلثوم نے تڑپ کر اس کے بندھے ہوئے ہاتھ تھام لیے۔

"ارے پگلی ہے کیا! دیکھ اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی رلا دیا تو نے۔" کلثوم نے روتی ہوئی صائمہ کو گلے سے لگایا تو وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"قسم سے تائی امی! آج اپنی ماں سے گلے مل کر رونے کا بہت دل چاہ رہا تھا اور آپ نے یہ کمی بھی پوری کر دی۔" صائمہ کے منہ سے نکلے لفظ کلثوم کے دل کو چیر گئے۔

"میں بھی تمہاری ماں ہوں صائمہ!" کلثوم نے پورے یقین سے کہا۔

"یہاں تو بہت جذباتی سین چل رہا ہے!" وقار نے اپنی بھیگی آنکھیں صاف کرتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا اور روتی ہوئی صائمہ کو کلثوم سے الگ کرتے ہوئے خود سے لگا کر دلاسا دیا۔

"بس کرو میری بچی! تمہارے آنسو ہمیں تکلیف دے رہے ہیں!" وقار کے کہنے پر صائمہ سوں سوں کرتی چپ ہو گئی۔

"ایسا کر صائمہ بچی! مجھے بھی ایک کپ چائے پلا ہی دے! سر میں درد ہو رہا ہے!" کلثوم کے کہنے پر صائمہ نے فوراً سر ہلایا۔

"واہ یہ اچھا طریقہ ہے بچی کو ایموشنل بلیک میل کرنے کا! مگر میں یہ ناانصافی نہیں ہونے دوں گا۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ صائمہ تم تین کپ چائے بنا کر لاؤ۔ ہم تینوں ساتھ بیٹھ کر پئیں گے!" وقار نے ایسے کہا جیسے بہت بڑا فیصلہ سنایا ہو۔ کلثوم منہ بنا کر رہ گئیں۔

"اپنے مطلب کی بات ہمیشہ یاد رہتی ہے تمہارے تایا کو!" صائمہ دونوں کی نوک جھونک پر مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تو کلثوم اور وقار نے اطمینان بھری نظروں سے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

صائمہ گھر سے کیا رخصت ہوئی سارے گھر کا نظام کچھ وقت کے لیے الٹ پلٹ کر رہ گیا۔ کلثوم بیگم نے انصاف سے سارے گھر کی ذمہ داری بڑی بہو زارا اور نئی بیاہ کر آئی فروا کو سونپ دی۔ دونوں نے بہت تیزی سے اپنے اپنے مطلب کی سب ذمہ داریاں اٹھالی تھیں مگر ان ذمہ داریوں میں وہ اکثر بوڑھے ساس سسر اور اب بھی کبھار کی مہمان بن کر آئی نندوں کو نظرانداز کر دیتی تھیں۔

صائمہ اپنے سسرال میں بہت آسانی سے گھل مل گئی کیونکہ وہ میکے میں بھی سارے گھر کی ذمہ داری بہت سمجھ داری سے اٹھاتی تھی۔ یہ چیز بعد میں بھی اس کے بہت کام آئی۔ برداشت اور صبر کی عادت ہونے کی وجہ سے اس کے مزاج کا ٹھہراؤ، سب کی نظروں میں قابل ستائش تھا۔ کلثوم کو اکثر صائمہ کی ساس فون کرتیں تو بار بار ان کا شکریہ ادا کرتیں کہ آپ کی اچھی تربیت کی وجہ سے آج میرا گھر جنت بن گیا ہے۔ وہ صائمہ کی خوبیوں کا ذکر اتنی تفصیل سے کرتیں کہ اب اکثر کلثوم کو ملال ہونے لگتا کہ ایسا ہیرا اپنے ہاتھ سے کیوں جانے دیا مگر پھر خود کو یہ سوچ کر تسلی دے دیتیں کہ اس کی قسمت جہاں لکھی ہوئی تھی، وہ اسے وہاں لے گئی۔

☆☆☆

رمضان کی آمد قریب تھی۔ کلثوم بیگم نے حسب عادت سارے گھر میں ایک طوفان برپا کیا ہوا تھا۔ کام والی سے سارے گھر کی تفصیلی صفائی ستھرائی کروانے کے علاوہ، رمضان میں بننے والی چھوٹی بڑی کئی چیزوں کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ اور

صائمہ ہمیشہ سب چیزیں گھر میں بناتی تھیں۔ رمضان سے پہلے بہت سی چیزیں بنا کر فریزر میں ترتیب اور سلیقے سے رکھ دی جاتیں تاکہ رمضان میں عبادت کا وقت ضائع نہ ہو۔ اس طرح سب کو سہولت رہتی مگر اس بار ان کا ساتھ دینے کے لیے صائمہ نہیں تھی۔ دونوں بہوویں ایسی باتیں سن کر صرف منہ بناتی یا مذاق اڑاتیں۔

"اب ان چیزوں کی فکر کون کرتا ہے! سب کچھ ایک کال پر ہوم ڈلیوری ہو جاتا ہے!"

وہ بے فکری سے جواب دیتیں۔

"ایک عورت جس محبت اور صفائی سے اپنے گھر کے افراد کے لیے مختلف چیزیں بناتی ہے۔ اس کا نعم البدل بازار کے پکوان کبھی بھی نہیں ہو سکتے!"

کلثوم چڑ کر جواب دیتیں مگر ان کی سنتا کون تھا۔

دوسری طرف صائمہ کی ساس روز فون کر کے کلثوم کو بتاتیں کہ صائمہ کس طرح رمضان کی تیاریوں میں لگی ہوئی ہے۔ وہ حیران ہوتیں کہ آج کل کی لڑکی میں اتنا سلیقہ اور سمجھ داری ہے۔ وہ اپنے وقت کا کتنا بہترین استعمال کر رہی تھی۔ سسرال میں اپنے سلیقے کی دھاک بھی بٹھا رہی تھی اور اپنی سہولت کا بندوبست بھی کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ رمضان میں معمولات بہت مشکل ہو جاتے ہیں۔ گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ سحری اور افطاری کی تیاری کرنا، پھر گرمی کے روزے رکھنا کہاں آسان تھا۔ اس لیے وہ کئی چیزیں جو کافی عرصہ چل سکتی تھیں، بنا کر فریز کر رہی تھی۔ رمضان کا چاند نظر آتے ہی پہلی بابرکت سحری کی تیاری کا آغاز ہو گیا۔

کلثوم ہمیشہ کی طرح بہت پرجوش تھیں۔ وہ اس مہینے کا خاص اہتمام کرتیں مگر پہلی سحری پر جس خاموشی اور بے دلی سے دونوں بہوؤں نے میز پر سجائی۔ اسے دیکھ کر کلثوم کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آ گئے مگر انہوں نے کوئی بھی شکوہ کیے بغیر خاموشی سے سحری کی۔ وہ سادہ روٹی کھاتی تھیں مگر انہوں نے سب کے لیے صرف پراٹھے بنائے۔ کلثوم دہی کے ساتھ تھوڑا سالن لیتی تھیں۔ آج سالن تو تھا مگر ان کے حصے میں دہی نہیں آیا۔ چائے ملی تو وہ بھی بدمزہ اور ٹھنڈی۔۔۔!

"سوری آنٹی! دہی بس اتنا ہی تھا۔ جو ہارون کو دیا ہے۔ دراصل رات کو چاول کے ساتھ رائتہ بنا لیا تھا' اس لیے سحری کے لیے تھوڑا بچا!" زارا نے جلدی سے عذر پیش کیا۔

"اوہ! پہلے بتا دیتیں تو میں امی کے لیے رکھ دیتا۔ میرا تو ویسے بھی دل نہیں کر رہا تھا دہی کھانے کو۔ تم نے زبردستی دیا مجھے!" ہارون نے پشیمانی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں!" کلثوم نے تحمل سے کہا۔

"آنٹی کے لیے دہی ضروری نہیں ہے مگر احمد تو دہی کے بغیر سحری ہی نہیں کرتے ہیں!" فروا نے ایسے کہا جیسے پچھلے کئی سالوں سے وہ احمد کی روٹین سے واقف ہو۔ احمد منہ بنا کر رہ گیا۔

"تمہیں کس پاگل نے یہ کہا ہے؟ مجھے تو صائمہ یا امی زبردستی دہی کھلاتی تھیں۔ ہاں میں میٹھی لسی شوق سے پی لیتا ہوں۔ صائمہ میرے لیے سحری میں ضرور لسی بناتی تھی۔" احمد کے کہنے پر فروا کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔

"ارے سب بے کار کی باتیں چھوڑو! چلیں بیگم صاحبہ۔ بسم اللہ کریں!"

وقار نے اپنی دہی والی پیالی درمیان میں رکھتے ہوئے محبت سے کہا تو کلثوم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"سچ ہے کہ عمر کے آخری حصے میں، اپنے جیون ساتھی کے ساتھ سے زیادہ خوبصورت اور پیاری کوئی اور چیز نہیں ہوتی!"

کلثوم نے دل میں سوچا۔ جبکہ ان کی دونوں بہوویں یہ دیکھ کر کلس کر رہ گئیں۔

"بھئی مان گئے! انکل آنٹی میں بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ ایک ہمارے شوہر ہیں!" زارا نے

سب سے پہلے اپنے دل کی جلن نکالی۔ فروا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ جبکہ ہارون اور احمد وہاں سے اٹھ کر جا چکے تھے۔ پہلی سحری کی طرح پہلی افطاری بھی اسی طرح افراتفری کا شکار رہی۔ کلثوم صرف صبر کے گھونٹ بھر کر رہ گئیں۔

☆☆☆

کلثوم کو دہی بھلے بہت پسند تھے۔ ان کے ہاتھ کے دہی بھلے پورے خاندان میں مشہور تھے۔ یہ ذائقہ ہی صائمہ کے ہاتھ میں منتقل ہوا۔ اس کے بنائے دہی بھلوں کی بھی سسرال میں واہ واہ ہوگئی۔ شروع کی افطار میں زارا اور فروا نے اپنے اپنے طریقے سے دہی بھلے بنائے مگر وہ کسی کام کے نہ ہونے کے باوجود سب نے شکر کا کلمہ ادا کر کے کھا لیے مگر ایک دن جب کلثوم سے برداشت نہیں ہوا تو انہوں نے خود دہی بھلے بنانے کی ٹھانی۔ ایک تو شدید گرمی اور پھر بڑھتی عمر کا تقاضا۔ دہی بھلے بنا تو لیے مگر افطار تک کلثوم کی طبیعت خراب ہوگئی۔ انہوں نے بمشکل روزہ کھولا اور ہائی بی۔ پی کی دوائی لے کر لیٹ گئی۔

"میرے لیے دہی بھلے رکھ دینا! میں بعد میں کھا لوں گی!" کلثوم نے ہدایت دی اور سو گئیں۔ گھر کے سب مرد تراویح پڑھنے گئے ہوئے تھے جب کلثوم کی آنکھ کھلی۔ طبیعت بہتر تھی۔ اس لیے انہیں بھوک ستانے لگی۔ وہ دہی بھلوں کے شوق میں فریج تک گئیں مگر جب فریج کھولا تو وہاں کچھ نہیں تھا! کلثوم نے اچھی طرح دیکھا مگر انہیں کچھ نہیں ملا۔

"آنٹی! آپ کو کچھ چاہیے؟" اسی وقت زارا کچن میں داخل ہوئی تو کلثوم کو فریج کے پاس کھڑا دیکھ کر بولی۔

"ہاں مجھے بھوک لگی تھی۔ میں نے سوچا کہ دہی بھلے رکھے ہوں گے مگر!" کلثوم نے افسردگی سے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"آنٹی! دہی بھلے بہت مزے کے تھے۔ میں [illegible] نے کہا بھی تھا کہ آپ کا حصہ بھی رکھ دیں مگر تب تک ختم ہو گئے! فروٹ چاٹ ہے۔ آپ وہ لے لیں!" زارا کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ کلثوم بے دلی سے لاؤنج میں چلی آئیں اور اپنے تخت پر بیٹھ گئیں۔

انہیں بے ساختہ صائمہ یاد آئی۔۔۔!

صائمہ کو پتا تھا کہ انہیں دہی بھلے بہت پسند ہیں۔ وہ دہی بھلے بناتے ہی سب سے پہلے ان کا حصہ نکال کر رکھتی حالانکہ اس وقت سب کچھ کلثوم کے ہاتھ میں تھا۔ صائمہ ایسا نہ بھی کرتی تو کلثوم کو فرق نہیں پڑتا مگر بات یہ ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ کسی کے دل میں آپ کی کتنی قدر ہے!

اور آج اسی چھوٹی سی بات سے کلثوم کو شدت سے احساس ہوا کہ صائمہ کی اصل اہمیت اور قدر کیا ہے۔ اس ایک لمحے نے احساس دلایا کہ صائمہ کا دل اور اس کی محبت کتنی خالص تھی! کلثوم کو کچھ کھونے کا احساس شدت سے ہوا!

"ہک ہا!" کلثوم نے گہری سانس لے کر اوپر کی طرف دیکھا۔

"یہ میری ہی کوتاہی ہے مولا کہ اپنا انمول ہیرا، اپنے ہی ہاتھوں گنوا کر، غیروں کے کنکروں سے اپنا دامن اور گھر بھر لیا ہے! ہم بے عقل عورتیں! جو اپنے ناقص فیصلوں کی فصل بو کر آخری عمر میں خالی ہاتھ ملتی رہ جاتی ہیں۔" کلثوم اداسی سے کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر نماز پڑھنے کے لیے چلی گئیں۔

☆☆☆

"تم اور اس وقت؟" زارا نے ندا کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو ناگواری سے وال کلاک کی طرف اشارہ کیا۔ روزے کھلنے میں تھوڑی دیر ہی باقی تھی۔

"ہاں زارا بھابی! آج میں شاپنگ کرنے نکلی تھی۔ صائمہ کا گھر وہاں سے قریب ہی تھا۔ میں کچھ

دیر کے لیے اس کی طرف گئی۔ پھر وہاں سے یہاں آ گئی۔" ندا نے پنکھے کے نیچے بیٹھ کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ دونوں بچے نانو نانو کرتے ہوئے اندر کی طرف بھاگ گئے۔

"خیر ویسے ہمیں یہ عادت نہیں ہے کسی کے گھر افطار پر بن بلائے جانے کی!" زارا نے طنزیہ کہا تو فروا نے بھی ہنس کر ہاں میں ہاں ملائی۔

"جی بھابی بجا فرمایا آپ نے! کسی کے گھر بن بلائے جانا تو سچ میں بہت بری بات ہے مگر اپنے والدین کے گھر ہرگز نہیں! ویسے آپ فکر مت کریں۔ میں اپنی افطاری کا بندوبست کر کے آئی ہوں!"

ندا نے حساب برابر کرتے ہوئے شاپر میں سے ڈبے نکالے۔

"یہ تم گھر سے لے کر چلی تھیں!" فروا نے حیرت سے سوال کیا۔ تو کچن کی طرف جاتی ندا نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

"نہیں! یہ صائمہ نے خاص طور پر امی کے لیے بھیجا ہے!" ندا نے مسکرا کر کہا۔ پھر چند منٹوں میں ہی ندا سب چیزیں نکال کر ڈائننگ میز پر لے آئی۔

"یہ صائمہ نے بھیجا ہے؟" کلثوم نے دہی بھلے کے پیالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں امی! وہ اور اس کی ساس تو مجھے افطار پر روک رہے تھے مگر میں نہیں مانی۔ بن بلائے اچھا نہیں لگتا۔ پھر اس کی ساس نے صائمہ کو خاص طور پر ہدایت کی کہ ندا کو افطار کے لیے کچھ پیک کر دو تاکہ اگر راستے میں روزہ کھل جائے تو اسے پریشانی نہ ہو!

بس پھر کیا تھا۔ صائمہ کو تو موقع چاہیے تھا۔ اس نے جلدی سے یہ ڈبہ بھرا اور چپکے سے مجھے دیتے ہوئے بولی کہ پتا نہیں کیوں کل سے تائی امی بہت یاد آ رہی ہیں! آج بھی دہی بھلے بنائے تو ان کا خیال میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا۔ انہیں میرے ہاتھ کے دہی بھلے بہت پسند ہیں! انہیں ضرور دے دینا!"

ندا نے کہا۔ اس وقت ہی روزہ کھلنے کا اعلان ہوا تو سب روزہ کھولنے میں مصروف ہو گئے۔ کلثوم کا ہاتھ آگے بڑھا اور انہوں نے اپنی پلیٹ میں دہی بھلے ڈالے اور ایک ایک چمچ منہ میں ڈالتی ہوئی، ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگیں۔ کون کہتا ہے کہ رشتے صرف خون کے ہوتے ہیں! احساس سے بنے رشتے بہت گہرے اور سب سے زیادہ اپنے ہوتے ہیں!

ہاں تو میں بتا رہی تھی کسی کی قدر و قیمت جاننے کے لیے ایک لمحہ ہی بہت ہوتا ہے مگر اکثر وہ لمحہ ہم اپنی کوتاہی سے گنوا کر بہت آگے نکل جاتے ہیں۔

اس لمحے افطار کے پہلے نوالے کے ساتھ مجھے ایک بات بہت اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی اور یہ بات مجھے سمجھائی بھی تو کس نے؟ کسی کے ہاتھ کے بنے عام سے دہی بھلوں نے۔۔! مگر اس عام سی چیز میں کسی کی محبت اور خیال کے سب ذائقے گھلے ہوئے تھے۔

پہلی بار جس کا ذائقہ صرف میری زبان ہی نہیں روح نے بھی محسوس کیا تھا!

☆

مہوش افتخار



پیر سید نظر حسین شاہ سے سکبیر سنگھ بہت متاثر ہوتا ہے ان کے دربار میں روز جھاڑو لگاتا ہے اور اپنے خاندان اور بیوی کی ناراضی سہتا ہے۔ وہ اسلام قبول کر لیتا ہے اس کا نام عبداللہ رکھا جاتا ہے۔ خاندان والے اس کا اور اس کے بیٹے کا بائیکاٹ کر دیتے ہیں، بیوی صدمے سے مر جاتی ہے۔

عبداللہ، نظر حسین شاہ کے دربار پر آجاتا ہے اور سب انتظامات سنبھال لیتا ہے۔

پیر نظر حسین کے بھائی کا بیٹا ہاشم خاندان کے دیگر لڑکوں کی طرح شہر پڑھنے جاتا ہے اور عیاشیوں میں لگ جاتا ہے۔ بھائی کی بیٹی معصومہ ان کی بڑی بہو ہے۔ پیر نظر حسین بھتیجے کی حرکتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ بھاوج اور بہو کے ان کی بیٹی زرناب کا رشتہ مانگنے پر انکار کر دیتے ہیں، دلوں میں فرق آجاتا ہے۔



مکمل ناول



پیر صاحب اپنے بعد پیری مریدی کے سلسلے کو باقاعدہ ختم کر دیتے ہیں کیوں کہ وہ کسی کو اس ذمہ داری کا اہل نہیں سمجھتے۔

علاقے میں ایک نیا پولیس افسر آتا ہے، وہ دربار میں فاتحہ پڑھنے آتا ہے، جہاں اسے زرناب نظر آتی ہے۔

معصومہ سب کے بیچ میں بیٹھ کر زرناب پر الزام لگاتی ہے کہ وہ مصطفیٰ (عبداللہ کے بیٹے) کو پیر صاحب کا داماد بنانا چاہتی ہے۔ بختیار شاہ یہ سن کر بیوی کو مارنے کے لیے اٹھتے ہیں۔

معصومہ کے الزام پر زرناب کے بھائی، مصطفیٰ کو خوب مارتے ہیں۔ پیر نظر حسین شاہ سچ جاننے کے باوجود مصطفیٰ اور عبداللہ کو شہر اپنے دوست عثمان جنگ کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ عثمان جنگ مصطفیٰ کو اپنا بیٹا بنا لیتے ہیں اور اسے اعلا تعلیم دلواتے ہیں۔

نظر حسین شاہ تینوں لڑکیوں کو پڑھائی کی غرض سے شہر بھیج دیتے ہیں۔ شفق کی شادی ہو جاتی ہے۔ صبور اور صدف کی بات طے ہو جاتی ہے۔ ہاشم کی شادی ناکام ہو جاتی ہے۔ معصومہ زرناب کو پورے گاؤں میں بدنام کر دیتی ہے اور اس کے لیے آنے والے ہر رشتے کی راہ میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ پیر صاحب اور عبداللہ وفات پا جاتے ہیں۔ مصطفیٰ، سیف جنگ کی نئی شخصیت کے ساتھ گاؤں آتا ہے۔ جہاں زرناب کے بھائیوں کی غیر قانونی حرکتوں پر ایکشن لیتا ہے۔ مگر الیکشن کی وجہ سے وہ اس سے جھگڑا نہیں کرتے۔

اماں حوراں کی ٹانگ میں فریکچر ہو جاتا ہے۔ زرناب اور شاہ بی بی، سیف جنگ کی مدد سے انہیں ہسپتال پہنچاتی ہیں۔ شاہ بی بی کا فون سیف جنگ کو ملتا ہے وہ اس سے کال کر کے زرناب کو اپنی حقیقت بتاتا ہے۔

تیسری قسط

تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر شاہ بی بی معمول کے مطابق اپنے لیے چائے بنانے کے ارادے سے کمرے سے باہر آئی تھیں۔ وہ اپنے دھیان میں آگے بڑھی تھیں، جب زرناب کے کمرے کی دہلیز سے آتی روشنی نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ وہ متفکر سی اس کے کمرے کی طرف آئیں۔

"زری! بیٹا خیر......" دروازہ کھول کر وہ جوں ہی اندر داخل ہوئیں، بیڈ پر پڑے آڑے ترچھے وجود کو دیکھ کر ان کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ وہ متوحش سی اس کی طرف بڑھیں۔

"زری!" اس کے ایک طرف کو ڈھلکے چہرے کو چھوتے ہی ان کا دل تیزی سے ڈوب گیا۔ اس کا پورا وجود برف کی طرح ٹھنڈا اور ہلدی میں نہایا ہوا تھا۔ گھبرا کر اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے انھوں نے بے اختیار اسے پکارا مگر زرناب کو مکمل طور پہ ہوش و حواس سے بیگانہ پا کے ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑے جگ سے انھوں نے پانی کے ایک دو چھینٹے اس کے چہرے پر مارے لیکن اسے یوں ہی ساکت پڑا دیکھ کر ان کی جان نکل گئی تھی۔

وہ پلٹ کر بختیار اور صبور کے کمروں کی جانب بھاگیں اور اگلے پانچ منٹ میں پورا گھر زرناب کے کمرے میں جمع ہو گیا تھا۔ چھوٹی موٹی سب تدبیریں بے سود دیکھ کر صبور نے بہن کو اٹھایا اور باہر کی جانب بھاگا، اس کے پیچھے روتی ہوئی بی بی نور بانو اور شاہ بی تھیں۔ پوری حویلی میں رات کے اس پہر اک ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ شفق اور صدف بچوں اور بی بی حوراں کی وجہ سے گھر پہ رکنے پر مجبور تھیں لیکن معصومہ کسی بھی چیز کی پرواہ کیے بنا، لپک جھپک شوہر کے ساتھ دوسری گاڑی میں سوار ہو گئی تھیں۔ وہ اس نئی اور چٹخارے دار صورتحال کے کسی بھی لمحے سے محروم نہیں رہنا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

"صاحب جی!" دھاڑ سے دروازہ کھول کے اندر آتے چوکیدار کے قدم جیسے زمین میں جکڑ گئے۔

سیف کے خون سے بھرے کپڑے دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گیا۔ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اس نے ایک طرف پڑا تولیہ اٹھا کر اس کے ہاتھ پر لپیٹ دیا۔

"تسی ٹھیک تے او صاحب جی؟" اس نے پریشانی سے سیف کا چہرہ دیکھا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا صوفے پہ گر سا گیا۔ چوکیدار نے پریشان نظروں سے کمرے میں بکھرے کانچ کو دیکھا۔

"اے سب کس طرح ہویا جی؟"

"پتا نہیں یار! تم تھوڑی برف لے کر آؤ۔" درد کی لہروں کو برداشت کرتے، وہ ضبط سے بولا تو چوکیدار فوراً اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ سیف ہمت کر کے اٹھا اور باتھ روم میں چلا آیا۔

زخم دھو کے اس نے چوکیدار سے برف لے کر ہتھیلی پر رکھی لیکن جب خون بند نہیں ہوا تو چوکیدار گھبرا گیا۔

"خون نئیں بند ہو ریا صاحب جی! میں رفاقت نوں کینا آں گڈی کڈے۔" وہ اس کے کچھ بولنے سے پہلے پریشان سا باہر نکل گیا تو سیف زخم خوردہ نگاہوں سے اپنے ہاتھ کو دیکھتا لب بھینچ گیا۔

☆☆☆

"پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے، لیکن ہم نے انھیں نیند کا انجیکشن لگا کر سلا دیا ہے۔ وہ اس وقت شدید ذہنی دباؤ میں ہیں۔ آپ لوگ پلیز کوشش کریں کہ انھیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔" ڈیڑھ گھنٹے کی پریشان کن صورتحال کے بعد بالآخر ڈاکٹر نے آ کر خیر کی خبر سنائی تو سوائے معصومہ کے سب نے شکر کا کلمہ پڑھا۔ وہ سب اس وقت شہر کے ایک مشہور اسپتال میں موجود تھے۔

"اب کس بات کا ذہنی دباؤ لیے بیٹھی ہے یہ؟" معصومہ نے ڈاکٹر کی پرواہ کیے بنا، تنے ابرو کے ساتھ شوہر اور دیور کی طرف دیکھا تو بختیار شاہ شرمندہ سے ہو گئے۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی وہ بیوی پر برس پڑے۔

"کبھی تو موقع محل دیکھ لیا کرو!"

"ہاں سارے موقعے محل میں ہی دیکھا کروں۔ اسے کوئی کچھ نہیں کہتا جو......" اور بی بی نور بانو میں مزید برداشت کا یارا نہ رہا۔ وہ ان دونوں کو یوں ہی بکتا جھکتا چھوڑ کر اندر کمرے میں چلی آئیں جہاں ابھی کچھ دیر پہلے زرناب کو ایمرجنسی سے شفٹ کیا گیا تھا۔

بے آواز قدموں سے چلتی وہ اس کے سرہانے آ کھڑی ہوئیں۔ زرناب کا زرد چہرہ دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انھوں نے بے اختیار جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

اپنے شانے پہ کسی کے ہاتھ کا نرم دباؤ محسوس کر کے وہ دھیرے سے پلٹیں اور کوثر شاہ کے مہربان وجود کو دیکھ کر وہ خود پہ سے اختیار کھو بیٹھیں۔

"پتا نئیں آپا! اینے خودنوں کیڑے روگ لا لیے نے؟" (پتا نہیں آپا اس نے خود کو کون سے روگ لگا لیے ہیں؟) ان کی بات پہ شاہ بی بی نے بھاوج کی پشت سہلاتے ہوئے ایک بوجھل سانس لی۔

"انسان ہی ہے ناں نور بانو۔ پتا نہیں کون کون سے وہم ستاتے رہتے ہیں۔"

"بس میں نے سوچ لیا اے۔ میں اپنی بچی کو مزید اس گھٹے ہوئے، ماحول میں نہیں رہنے دوں گی۔ صبور، زوہیب کے بارے میں کج پتا کرواتا ہے یا نئیں، میں لڑکے والوں کو اپنی رضامندی دے دوں گی۔" آنسو صاف کرتی وہ دھیرے سے بولیں تو شاہ بی بی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں یہی ٹھیک رہے گا۔" ان کے جواب پہ بی بی نور بانو کی نظریں ایک بار پھر اپنی لاڈلی کے کملائے ہوئے چہرے پہ جا ٹھہریں۔

"زری اس رشتے سے خوش تے ہے ناں آپا؟" اچانک ایک خیال نے ان کا دامن تھاما تو وہ گھبرا کر شاہ بی بی کی طرف پلٹیں۔ اور سیدہ کوثر شاہ اپنی جگہ پہ خاموش کھڑی رہ گئیں۔

مناسب رشتہ مل جانے اور پھر بات ٹھہر جانے کی خوشی میں وہ سب اس قدر خود غرض ہو گئے تھے کہ ان میں سے کسی نے زرناب کی پسند ناپسند، اس کی رائے جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اور وہ، جو

ہمیشہ سے صرف اپنوں کے غم میں گھلنے کی عادی تھی، خود سے کچھ بولی ہی نہ تھی۔

"بڑی غلطی ہو گئی نور بانو۔" وہ پریشانی سے بولیں تو بی بی نور بانو کی آنکھوں میں پھیلا اضطراب بڑھ گیا۔

"ہم نے تو ایک بار بھی زرناب سے اس کی مرضی نہیں پوچھی۔" انھوں نے دل گرفتہ نظروں سے بھاوج کو دیکھا تو مارے تاسف کے بی بی نور بانو کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

☆☆☆

سیف جس وقت سو کر اٹھا، دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ رات شہر میں واقع اسپتال تک جانے اور آنے میں انھیں صبح کے پانچ بج گئے تھے۔ اس کی انگلیوں میں پیوست کانچ کو نکال کر ڈاکٹر نے ہتھیلی میں ٹانکے لگائے تھے۔ اس ساری جسمانی اور ذہنی اذیت نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ وہ گھر آتے آتے نڈھال ہو گیا اور اپنے بستر پہ گرتے ہی لمحوں میں غافل ہو گیا۔

لیکن اب آنکھ کھلنے پر درد کا سلسلہ جیسے پھر سے جڑ گیا تھا۔ جسم کو لگنے والا زخم تو اس کے نزدیک بے معنی تھا لیکن زرناب نظر حسین شاہ سے متعلق ہر سوچ سیف کے لیے بے حد اذیت کا باعث تھی۔ وہ ہر حال میں اس سے مل کر اس درجہ سرد مہری کی وجہ جاننا چاہتا تھا جب ہی ہاتھ کی تکلیف اور سوجن نظر انداز کیے نیچے چلا آیا تھا۔ اسے لاؤنج میں آتا دیکھ کر شمیم بھاگی آئی۔

"آپ کیوں آ گئے صاحب جی! مجھے آواز دے لیتے۔"

"نہیں میں اب ٹھیک ہوں۔" وہ چلتا ہوا صوفے پہ آ بیٹھا۔

"شکر ہے رب سوہنے کا کہ اس نے دونوں پاسے (دونوں طرف) خیر کر دی، ورنہ کل کی رات تو پتا نہیں کیسی چڑھی تھی۔" شمیم اسے دیکھتے ہوئے بولی تو سیف چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"دوسری طرف؟ کس کی بات کر رہی ہو؟"

"سفید حویلی کی جی۔ وہ اپنی زرناب بی بی ہیں نا، وہ راتی (رات کو) بے ہوش ہو گئی تھیں۔"

"کیا؟" سیف کے اعصاب کو جھٹکا سا لگا۔

"تمھیں کس نے بتایا؟" اندر ہی اندر پریشان ہوتے ہوئے اس نے بظاہر سنبھل کر پوچھا۔

"حق نواز نے امجد کو بتایا تھا۔" اس نے سفید حویلی کے ڈرائیور کا نام لیا جس نے یہ بات اس کے شوہر کو بتائی تھی۔

"وہ تو جی کہیں شاہ بی بی، ان کے کمرے میں گئیں تو اگے (آگے) بی بی کو بے ہوش دیکھ لیا۔ اسی وقت ساری حویلی میں شور مچ گیا۔ سب ان کو لے کر شہر بھاگے۔ کہیں دو گھنٹے بعد جا کر تو انھیں اسپتال میں ہوش آیا ہے۔" اس نے ساری تفصیل اس کے گوش گزار کی تو سیف کے لیے ایک لمحے کو سانس لینا مشکل ہو گیا۔

اس کا انکشاف زرناب کے لیے اتنا کڑا ثابت ہوا تھا تب ہی اسے یقین نہیں آ رہا تھا اور وہ یہاں یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید زرناب مزید اس کی کوئی بات نہیں سننا چاہتی جب ہی اس کی کالز ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ اپنی اس درجہ نادانی و بدگمانی پہ اس کا دل چاہا تھا کہ اپنا سر پیٹ لے۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو؟؟ اضطراب سے سیدھے ہوتے ہوئے اس نے بہ مشکل خود پہ قابو پایا۔

"اب کیسی ہیں وہ؟"

"ٹھیک ہیں۔ امجد بتا رہا تھا کہ آج شام کو انھیں اسپتال سے چھٹی ملے گی۔" اور سیف سنسناتے ہوئے دماغ کے ساتھ لب بھینچ گیا۔

شمیم کے جانے کے بعد اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اسے رہ رہ کر خود پہ غصہ آ رہا تھا۔ کیا تھا اگر وہ رات اس سے بات کرتے ہوئے خود پہ قابو پا لیتا؟ کم از کم اس وقت زرناب کو تکلیف سے دوچار کرنے کا ملال تو اس کے ساتھ نہ ہوتا۔

بے چینی سے لب کاٹتا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر زرناب کے پاس پہنچ جائے مگر وہ اسپتال جا کر صورت حال کو مزید گمبھیر نہیں بنانا چاہتا تھا۔ وہ زرناب کو مزید پریشان اور ہراساں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان گزرے ماہ و سال کی کلفتوں نے یقیناً زرناب کے اعصاب کو خاصا کمزور بنا ڈالا تھا ورنہ اس درجہ شدید ردعمل کی تو سیف کو کسی طور توقع نہ تھی۔

بے اختیار اس کے اندر زرناب کو ایک مضبوط سائبان دینے کی خواہش شدت سے جاگی تھی، ایک ایسا سائبان جس پہ وہ زندگی کے ہر سرد و گرم میں آنکھیں بند کر کے بھروسا کر سکتی، جسے وہ مان سے اپنا کہہ سکتی اور جس کے سائے تلے وہ ایک بار پھر وہی اعتماد اور زندگی سے بھرپور شوخ و شنگ سی لڑکی بن سکتی جسے وہ جانتا تھا۔

لیکن اس سب کے لیے اس کا زرناب سے ملنا، اسے اعتماد میں لینا اور اپنی بھرپور محبت اور ساتھ کا یقین دلانا بے حد ضروری تھا جو اب کیسے ممکن ہوگا، وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ مسئلہ بہت احتیاط کا متقاضی تھا۔ وہ زرناب کے معاملے میں اب مزید کسی غلطی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

"تم لوگ چاہے ہزار بار ہم سے رشتہ توڑو، ہم سے اپنی ہر خوشی چھپاؤ مگر اپنی دھی رانی کی تکلیف کا سن کے ہم تو پیچھے نہیں رہ سکتے۔" چہرے پہ رقت طاری کیے تائی جان انتہائی دل گرفتی سے بولیں تو بختیار شاہ کی خفا نظریں ماں اور پھپھی پہ آ ٹھہریں جو خاموش بیٹھیں، کسی بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو جانے والی نرجس بیگم کو دیکھ رہی تھیں۔

یہ بھی شکر تھا کہ جس وقت ان کی اور ہاشم کی اسپتال میں آمد ہوئی تھی اس وقت نرس، صبور کے ہمراہ زرناب کو چند ایک ضروری ٹیسٹ کے لیے کمرے سے باہر لے کر گئی ہوئی تھی ورنہ ان کی موجودگی نے ماحول پر جو ایک تناؤ بھری کیفیت طاری کر دی تھی وہ کسی طور زرناب کے لیے بہتر نہ تھی۔

"رہنے دیں بے جی! آپ کی نیک نیتی کی یہاں کوئی قدر نہیں۔" معصومہ نے مصنوعی تاسف سے سر جھٹکا تو نرجس بیگم نے پلو سے آنکھوں میں آئی نمی صاف کی۔

ان کی تو آج دلی مراد بر آئی تھی ورنہ اتنے دنوں سے بیٹی کی زبانی زرناب کے دن بہ دن آگے بڑھتے رشتے کی بابت سن سن کر ان کا نجانے کتنے کلو خون جل چکا تھا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کچھ بھی کر کے اس رشتے کو ختم کروا دیں اور زرناب کو اپنے لاڈلے کے قدموں میں لا پھینکیں، مگر وہ ایک بار پھر خود سے سوالی بن کر سفید حویلی جا کے کسی طور ہلکی نہیں پڑنا چاہتی تھیں لہٰذا گھر بیٹھ کر پیچ و تاب کھانے کے سوا ان کے پاس دوسرا کوئی چارہ نہ تھا۔ اوپر سے ہاشم کے ماں اور بہن کو، اس معاملے میں کچھ نہ کرنے کے طعنے اور تشنوں نے صحیح معنوں میں ان کا صبر آخری حد تک پہنچا دیا تھا۔

ایسے میں زرناب کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع نے انھیں نادر موقع فراہم کیا تھا۔ انھوں نے جھٹ اپنے لاڈلے کو ساتھ لیا اور اسپتال آدھمکی تھیں۔ ہاشم بھی زرناب کی دید کو ترسا ہوا تھا اور اس رشتے والے معاملے کو ہر حال میں نپٹانا چاہتا تھا اس لیے سب ہی کام چھوڑ کے ماں کے ساتھ یہاں چلا آیا تھا۔

"مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں پتر! بس افسوس اس بات کا ہے کہ میرے اپنے جوائی (داماد) نے بھی میرے خلوص کو کج (کچھ) نہ جانا، اس نے بھی میری پھیلی جھولی کی لاج نہیں رکھی۔" انھوں نے ہوشیاری سے بختیار شاہ پہ جذباتی حملہ کیا تو وہ حسب توقع تڑپ اٹھے۔

"ایسی بات نہیں تائی جی، میرے لیے ہاشم سے بڑھ کر اور کوئی نہیں۔"

بیٹے کے جواب پہ بی بی نور بانو کا چہرہ مارے دکھ اور شرمندگی کے پھیکا پڑ گیا۔ کاش اس پل اپنے سسرال والوں کے سامنے بختیار شاہ نے اپنے ماں باپ کا مان رکھتے ہوئے یہ کہا ہوتا کہ، میرے لیے زرناب سے بڑھ کر اور کوئی نہیں، تو شاید آج وہ اپنے بیٹے کی ہر کوتائی معاف کر دیتیں لیکن انھوں نے تو دنیا دکھاوے کو بھی ماں کے فیصلے میں ان کا ساتھ دینا گوارا نہیں کیا تھا۔

"تو پھر کیوں تم نے ایک غیر کو اپنے خون پہ ترجیح دی؟ کیوں میرے ہاشم کے رشتے کو ایک بار پھر ٹھکرایا؟ کبھی سوچا ہے کہ پورے گاؤں میں کیسی مٹی پلے گی تمہاری (بدنامی ہو گی تمہاری) جب لوگوں کو پتا چلے گا کہ سید بختیار حسین شاہ نے آخر کار اپنی بہن غیروں میں دے دی۔ او کیوں سارے خاندان کو اپنے خلاف کرنے پہ تل گئے ہو بختیار شاہ، کج اپنی دھیوں کا وی سوچا ہے کہ نہیں!" غصے سے بولتے ہوئے انھوں نے ایک چھچھلتی نظر نند اور دیورانی پہ ڈالی تو بختیار شاہ کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ آ ٹھہری۔

"یہاں سب کو اپنی پڑی ہے تائی جی۔ میری بچیوں کا کیا ہو گا، کسی کو کوئی فکر نہیں!" ان کی بات بی بی نور بانو کے دل پہ تیر بن کے لگی، انھوں نے تڑپ کر بیٹے کو دیکھا۔

"وہ صرف تمہاری نہیں میری بھی بیٹیاں ہیں بختیار۔" تاسف ان کی آنکھوں میں ہی نہیں لہجے میں بھی اتر آیا تھا۔

"رہنے دیں اماں جان۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ آپ کو اگر نوشین اور سبین کی ذرا سی بھی فکر ہوتی تو زرناب کو لے کر آپ اتنی خود غرضی کا مظاہرہ کبھی نہ کرتیں۔ اس لڑکی نے سارے جہاں کی خاک آپ کے بیٹوں کے سر میں ڈال دی مگر پھر بھی آپ کے نزدیک ہم ہمیشہ برے رہے اور وہ اچھی۔ کیا ہم آپ کی اولاد، آپ کا خون نہیں؟" تنفر سے کہتے ہوئے انھوں نے ماں کی آنکھوں میں دیکھا تو اپنی بچی کے دشمنوں کے سامنے اس کے کردار کو یوں نشانہ بنانا بی بی نور بانو کا چہرہ سرخ کر گیا۔

"ایک بات یاد رکھنا بختیار! نہ تو زرناب گناہ گار ہے اور نہ ہی اس نے تم لوگوں کے سر میں کوئی خاک ڈالی ہے۔ یہ صرف ایک جھوٹ، ایک تہمت ہے جو میری پاک دامن بچی پہ لگائی گئی ہے!" خشمگیں نظروں سے انھیں گھورتے ہوئے وہ سخت لہجے میں بولیں تو معصومہ یوں اچھلیں جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"یہ نہ تو کوئی جھوٹ ہے اور نہ ہی تہمت۔ آپ کے کہنے سے آپ کی لاڈلی دودھ کی دھلی نہیں بن جائے گی۔ میں نے اسے خود کتنی دفعہ مصطفیٰ کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے دیکھا تھا۔" انھوں نے خوف خدا کیے بغیر وہی جھوٹ فراٹے سے دہرایا جو وہ نجانے کتنے سالوں سے بولتی چلی آ رہی تھیں، تو اب تک خاموش بیٹھی شاہ بی بی کے لیے مزید چپ رہنا ممکن نہ رہا۔

"آج ایک بات بتاؤ معصومہ!" انھوں نے ٹھنڈے لہجے میں انھیں مخاطب کیا۔

"یہ زرناب کی مصطفیٰ کے ساتھ تمام اٹکھیلیوں کی گواہ صرف تم کیوں ہو؟ اس بھری پُری حویلی میں کبھی کسی اور نے یہ تماشا کیوں نہیں دیکھا؟" اور ان کی آنکھوں میں دیکھتی معصومہ شاہ بری طرح گڑبڑا گئیں۔

"مم...... مجھے کیا پتا کس نے کیا کچھ دیکھا اور کیوں چپ رہا؟" وہ گڑبڑا کے بولیں تو بی بی نرجس چیل کی طرح بیٹی کے دفاع میں نند پہ جھپٹیں۔

"بات سنو میری کوثر شاہ! میری دھی کو جھوٹا کرنے کے بجائے بہتر ہو گا کہ تم باقی سب سے یہ پوچھو کہ انھوں نے اس کھیل پہ کیوں اور کس لیے پردہ ڈالا؟ کیوں تم سارے وڈے لمی تان کے سوتے رہے اور وہ کمی کمین تمہاری عزت کا جنازہ نکال کر چلتا بنا؟" وہ غصے سے پھنکاریں تو ماں کی مدد پاتے ہی معصومہ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر لائیں۔

"میں کہہ رہی تھی ناں بے جی۔ آپ کی نیک نیتی کی یہاں کوئی قدر نہیں۔ کیوں آ جاتی ہیں آپ یہاں بار بار بے عزت ہونے؟ لعنت کیوں نہیں بھیجتیں آپ اس رشتے پہ۔" وہ پلو میں منہ دیے چھکوں پھکوں رونے لگیں تو بختیار حسین کے لیے "یہ درد" برداشت کرنا ممکن نہ رہا۔

"کیا چاہتی ہیں آپ شاہ بی بی؟ کیوں آپ ہر وقت معصومہ کے پیچھے پڑی رہتی ہیں؟" وہ پھپھی کو غصے سے دیکھتے ہوئے بولے تو کوثر شاہ کے چہرے پہ ملال ہی ملال بکھر گیا۔

"کاش کہ تم جان سکتے کہ کون کس کے پیچھے پڑا ہے بختیار شاہ!" انھوں نے دکھ سے بھتیجے کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ لب بھینچے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بس بہت ہو گیا، اب ہم مزید ایک منٹ یہاں نہیں رکیں گے۔ اٹھو معصومہ۔" انھوں نے آگے بڑھ کر بیوی کا بازو پکڑا تو وہ سوں سوں کرتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ایک منٹ بھاجی!" ہاشم شاہ کی سرد آواز اچانک کمرے میں ابھری تو بختیار شاہ سمیت سب ہی نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا جو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"اس رشتے کو لے کر آج تک جتنی تذلیل سفید حویلی میں میری اور میرے گھر والوں کی ہوئی ہے، اس سلوک کا دسواں حصہ بھی اگر خاندان میں کسی اور نے ہمارے ساتھ کیا ہوتا ناں تو میں ان کا برا حشر کر دیتا، لیکن یہ میری آپ لوگوں کے لیے عزت اور شرافت ہی تھی جو میں اب تک سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتا رہا مگر اب اور نہیں۔" قطعیت سے نفی میں سر ہلاتا وہ بی بی نور بانو اور شاہ بی بی کی طرف پلٹا۔

"آج اس رشتے کے خلاف بولنے والا ہر شخص میری بات کان کھول کر سن لے، کہ زرناب نظر حسین شاہ اب ہاشم شاہ کی خواہش نہیں بلکہ اس کی ضد بن گئی ہے اور اپنی ضد میں کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔ اب چاہے کوئی کچھ بھی کر لے، میں اب زرناب سے دست بردار ہونے والا نہیں!"

سرخ نظروں سے انھیں گھورتا وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا تو ساکت بیٹھی بی بی نور بانو کی بے یقین نظریں اپنے بے حمیت بیٹے پر جا ٹھہریں جس کے سامنے انھیں وہ کل کا بچہ دھمکی دے کر چلا گیا تھا اور وہ کچھ نہیں بولا تھا۔

"چلیں تائی جی۔" نظریں چراتے بختیار شاہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئے تو بی بی نرجس ایک تنفر بھری نگاہ دونوں خواتین پر ڈالتی، بیٹی اور داماد کے ساتھ باہر نکل گئیں۔ ان کے جاتے ہی کمرے میں گہرا سناٹا چھا گیا۔

"آپا!" بی بی نور بانو کی لرزیدہ آواز کمرے کے ساکت در و دیوار کے درمیان ابھری تو شاہ بی بی کے خاموش آنسو ان کے گالوں پہ بہہ نکلے۔

"تسی...... تسی ویکھیا؟" وہ پتھرائے ہوئے

لہجے میں کوثر شاہ سے مخاطب ہوئیں تو انھوں نے اپنی سسکی کا گلا گھونٹتے ہوئے بی بی نور بانو کو خود سے لگا لیا۔ ان کے سینے سے لگتے ہی بی بی نور بانو اس طرح بلک بلک کر رو دیں جیسے آج ہی بے آسرا ہوئی ہوں۔ ایک ماں کا یوں بکھرنا کوثر شاہ کے دل کے ٹکڑے کر گیا۔ ان کے اندر سے اک ہوک سی اٹھی جو ظالموں کے لیے بد دعا بن کر آسمان کی جانب پرواز کر گئی۔

☆☆☆

اپنے بیڈ پہ دراز صدف، ننھے عمر کو تھپکتے ہوئے گہری سوچ میں گم تھی۔ اسے جب سے زرناب کی اس اچانک بے ہوشی کا سبب پتا چلا تھا، وہ پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ بری طرح الجھ گئی تھی۔ وہ اور زرناب بچپن سے ایک دوسرے کی سہیلیاں، ایک دوسرے کے دکھ سکھ کی ساتھی تھیں۔ پھر بھلا یہ کب اور کیسے ہوا کہ زرناب کو کوئی پریشانی اس حد تک اندر ہی اندر کھا گئی تھی کہ اس کے اعصاب ہی جواب دے گئے تھے؟ افسردگی سے سوچتی وہ دھیرے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

کتنی شرمندگی محسوس ہوئی تھی اسے جب صبور سمیت، سب ہی نے اس سے وقتاً فوقتاً ایک ہی سوال پوچھا تھا۔ وہ سب زرناب کے اس درجہ ذہنی دباؤ کی وجہ جاننا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ واحد ہستی تھی جو اس بارے میں کچھ نہ کچھ علم ضرور رکھتی تھی، مگر جب وہ کسی کو کچھ بھی نہ بتا پائی تو سب کی حیرت نے اسے بری طرح خفیف کر ڈالا تھا۔ اپنی لاعلمی کا سوچ کے اسے نئے سرے سے خود پہ غصہ آنے لگا تھا۔

بے چینی سے لب کاٹتے ہوئے وہ گزری رات کے متعلق سوچنے لگی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اسے کل رات زرناب خاصی چپ چپ اور الجھی ہوئی سی لگی تھی۔ خاص کر تب جب وہ تینوں کچن میں اس اے ایس پی کی آمد پر کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

اس کی اس کیفیت کو شفق نے بھی محسوس کیا تھا مگر زرناب سر درد کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی پھر بعد میں کھانے پہ فضلی نے سب کو آ کر یہی بتایا تھا کہ بی بی سو چکی ہیں۔ ایسے میں رات کے کسی پہر ایسا کیا ہوا تھا جو اس کی طبیعت اچانک اس حد تک بگڑ گئی کہ وہ اپنے حواس ہی کھو بیٹھی؟ صدف مضطرب سی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

تب ہی کمرے کا دروازہ دھکیل کر پانچ سالہ بلال بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی اور اس شیطان کے ہاتھ میں زرناب کا موبائل دیکھ کر اس نے لپک کر اس سے فون لے لیا۔ موبائل لینے کی دیر تھی کہ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔ صدف اسے زبردستی گود میں لیے باہر آئی۔ اسے فضلی کے حوالے کر کے وہ جوں ہی پلٹی، اس کی نظر اپنے ہاتھ میں پکڑے فون کی اسکرین پہ جا ٹھہری جو اس زور زبردستی میں روشن ہو گئی تھی اور اس روشن اسکرین پہ مس کالز دیکھ کر وہ بے اختیار ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ زرناب کا فون لاک نہیں ہوتا اس لیے اس نے فوراً کال لاگ کھولا اور ایک انجانے نمبر سے رات کے تین بجے مس کالز دیکھ کر وہ بری طرح چونکی۔ مگر اصل جھٹکا تو اسے تب لگا جب اسی نمبر پہ اس نے زرناب کی ملائی ہوئی کال دیکھی جو دوسری طرف سے ریسیو نہیں کی گئی تھی، جبکہ اس سے بھی پہلے اسی نمبر سے ایک کال آئی ہوئی تھی اور زرناب نے اسے ریسیو بھی کیا ہوا تھا۔

ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ اس نے اس ریسیو شدہ کال کو چیک کیا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بات ہوئی تھی۔ صدف ہک دک سی اس تفصیل کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ پریشانی سے سوچتے ہوئے اس نے ارد گرد دیکھا، اور تیز قدموں سے زرناب کے کمرے میں چلی آئی۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے وہ بیڈ پہ آ بیٹھی تھی۔

نئے سرے سے ان ساری کالز کی تفصیل دیکھنے کے بعد اس نے اپنی پیشانی مسلی۔ ایک بات تو طے تھی کہ جب تک اس نمبر پہ کال نہیں کی جاتی اس کے

ہاتھ کوئی سرا نہیں آتا لیکن کیا اسے یہ کال زرناب کے نمبر سے کرنی چاہیے یا اپنا فون استعمال کرنا چاہیے؟ لب کاٹتے ہوئے اس نے مضطرب انداز میں سوچا۔

اگر وہ زرناب کے نمبر سے کال کرتی تو ہو سکتا تھا کہ مقابل ایک انجانی آواز سن کر کوئی جواب نہ دیتا لیکن اگر وہ اپنے نمبر سے کال کرتی تو اس کا بات کرنے کا امکان زیادہ تھا۔ یہی سوچ کر وہ تیزی سے اٹھی اور اپنے کمرے سے جا کر اپنا موبائل لے آئی۔

نمبر ملاتے ہوئے اس کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا اتر آیا تھا۔ اس نے اک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی گھبراہٹ پہ قابو پایا اور فون کان سے لگا لیا۔

☆☆☆

لان میں بیٹھا سیف، ارد گرد سے بے نیاز، مسلسل زرناب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی بے چینی و پریشانی حد سے سوا تھی۔

نجانے وہ کون سی گھڑی ہوگی جب اسے زرناب کو دیکھنا، اس سے ملنا اور بات کرنا نصیب ہوگا اور پتا نہیں اب ایسا ممکن بھی تھا یا نہیں؟ کیونکہ وہ تو اپنے سارے راستے اپنے ہاتھوں مسدود کر بیٹھا تھا۔

"صاحب جی آپ کا فون۔" امجد کی آواز پہ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ اس کا موبائل لیے کھڑا تھا۔ سیف نے اک گہری سانس لیتے ہوئے فون تھام لیا۔ اسکرین پہ اجنبی نمبر دیکھ کر اس نے بے دلی سے فون کان سے لگا لیا۔

"ہیلو!" اور دوسری طرف موجود صدف ایک مرد کی آواز سن کے بری طرح چکرا گئی۔

"کک...... کون بول رہا ہے؟" اسے اپنا حلق خشک پڑتا محسوس ہوا۔

"اے ایس پی سیف علی جنگ بات کر رہا ہوں۔ آپ کو کس سے بات کرنی ہے محترمہ؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولا تو صدف کی آنکھیں مارے بے یقینی کے پھٹنے کو آ گئیں۔ بے اختیار ہی اس کا ہاتھ اپنے نیم وا لبوں پہ آ ٹھہرا۔

"ہیلو!" مسلسل خاموشی پہ سیف بے زاری سے دوبارہ بولا تو صدف نے بہ مشکل تھوک نگلا۔ شاک کے مارے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ بات کرے یا کال کاٹ دے؟

"میں۔" وہ لحظہ بھر کو اٹکی۔ "میں مسز صبور بات کر رہی ہوں۔" آن کی آن میں وہ اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولی تو سیف ایک جھٹکے سے سیدھا ہو کے بیٹھا۔

"زرناب...... زرناب تو ٹھیک ہے ناں؟" اس کے ذہن میں پہلا خیال زرناب کی طبیعت کے حوالے سے آیا تھا۔ اس کی یہ بے چینی، یہ پریشانی صدف کو ساکت کر گئی۔

"پوچھ سکتی ہوں آپ زرناب کو کیسے جانتے ہیں؟"

"پہلے آپ مجھے یہ بتائیں، وہ ٹھیک تو ہے ناں؟" سیف نے جھنجلا کر استفسار کیا۔

"ٹھیک ہے وہ۔" اس کے جواب پہ دوسری طرف سے ابھرنے والی گہری سانس صدف کی پیشانی پہ شکنیں نمودار کر گئی۔ سیف کے کردار کا جو مشکوک خاکہ ان لڑکیوں کے ذہن میں تھا، وہ رہ رہ کر اس کی پریشانی میں اضافہ کر رہا تھا۔

"کیا اب آپ بتانا پسند کریں گے کہ زرناب کو کیسے جانتے ہیں؟" اس نے سخت لہجے میں سوال کیا تو سیف لحظہ بھر کو خاموش ہو گیا۔

"بہتر ہوتا اگر آپ کچھ عرصہ انتظار کر لیتیں۔ بعض حقیقتیں وقت کے ساتھ از خود واضح ہو جاتی ہیں۔" وہ لمحے بھر کے توقف کے بعد دھیرے سے گویا ہوا تو صدف کی بھنویں تن گئیں۔

"مجھے الجھانے کی کوشش مت کریں اے ایس پی صاحب! صاف صاف بتائیں، آپ نے کہاں سے زرناب کا نمبر لیا؟ کیوں اس سے رابطہ کیا؟" وہ کڑے لہجے میں بولی تو سیف اک گہری سانس لیتا آسمان پہ نگاہیں جما گیا۔

"محبت کرتا ہوں آپ کی دوست سے، شادی کرنا چاہتا ہوں ان سے۔" وہ دھیمے لیکن واشگاف الفاظ میں بولا تو صدف کے سامنے پورا کمرہ گھوم گیا۔

"کیا؟ یہ آپ کیسی فضول باتیں کر رہے ہیں؟ جانتے بھی ہیں، کس طرف نگاہ ڈالنے کی جرأت کی ہے آپ نے؟"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" سیف زہرخند سا مسکرایا۔ "میں نے وہاں نگاہ ڈالی ہے جہاں بے قصور لوگوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا ہے۔" وہ تلخ لہجے میں بولا تو صدف لب بھینچ گئی۔

"میں ان کڑوی حقیقتوں سے پردہ نہیں اٹھانا چاہتا مسز صبور۔ لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ زرناب شاہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ ان کی عزت میری عزت ہے اور میری وجہ سے میری عزت پر حرف آئے یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" وہ مضبوط اور نڈر لہجے میں بولا تو صدف دھیمی پڑ گئی۔

"کیا...... کیا زرناب اس بارے میں جانتی ہے؟" اس نے اٹکتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں۔"

یہ سن کر صدف بے اختیار خاموش ہو گئی۔ اتنا کچھ ہو گیا تھا اور زرناب نے اس سے ذکر بھی نہ کیا تھا۔ کیا وہ اس کے نزدیک اب قابل اعتبار نہیں رہی تھی؟ دکھ سے سوچتے ہوئے اس نے اک گہری سانس لی۔

"اس کا جواب جان سکتی ہوں؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے کمزور سے لہجے میں استفسار کیا۔

"وہ تو میں بھی نہیں جانتا۔" وہ لحظہ بھر کو رکا۔ "کل رات ہمارے درمیان بات کسی اور رخ پر مڑ گئی تھی اور میں نے فون بند کر دیا تھا۔ سیف قصداً اصل بات چھپا گیا تو صدف مضمحل سی لب دبا کے خاموش ہو گئی۔

"صدف بی بی!" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس کی آواز ابھری۔ "مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں زرناب بی بی سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔"

"یہ ناممکن ہے۔" صدف نے آہستگی سے انکار کیا۔

"دیکھیں، اس معاملے کو کسی منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے میرا ان سے ایک بار ملنا بہت ضروری ہے۔ خدارا میرا اعتبار کیجیے، میں آپ لوگوں کو کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" سیف نے بکھرے ہوئے لہجے میں التجا کی تو صدف الجھ سی گئی۔ یہ وہ کس مشکل میں پھنس گئی تھی؟

"آپ پہ اعتبار کرنا نہ کرنا زرناب کا ذاتی فیصلہ ہے۔ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی۔" اس نے دامن بچانا چاہا۔

"اور اگر میں ان کے نزدیک قابل اعتبار ٹھہرا تو؟" سیف کے اچانک سوال پہ وہ یک لخت چپ ہو گئی۔

"تو میں اپنی دوست کے ساتھ کھڑی ہوں گی۔" لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بلا جھجک گویا ہوئی تو اس تمام عرصے میں پہلی بار سیف کے اندر اطمینان در آیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ ان کی طبیعت سنبھلنے کے بعد مناسب وقت دیکھ کر میرا مطالبہ ان کے سامنے رکھیے گا اور اگر انھوں نے فیصلہ میرے حق میں دے دیا تو آپ کو میرا ساتھ دینا پڑے گا۔ بصورت دیگر میں دوبارہ کبھی زرناب شاہ کی راہ میں نہیں آؤں گا اور یہ میرا قول ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا تو صدف نہ چاہتے ہوئے بھی مرعوب ہو گئی۔

"منظور ہے۔"

"چلیں پھر اپنا خیال رکھیے گا، اللہ حافظ۔" الوداعی کلمات کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا تو صدف نے اک ٹرانس کی کیفیت میں فون بند کر دیا۔

کتنی عجیب بات تھی، زرناب کی پریشانی کی وجہ سیف علی جنگ نکلے گا اس نے گمان بھی نہیں کیا تھا۔ ان چند لمحوں میں کیسے حیران کن انکشافات ہوئے تھے اس پر۔ وہ تو اب تک جیسے بے یقینی کی کیفیت میں تھی بلکہ اسے تو خود پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کیسے ایک انجان شخص کی باتوں میں آ کر اس کی مدد کرنے کو تیار ہو گئی؟ کیا اس کی عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی؟ یا وہ اپنے گھر کے اصول و ضوابط کو نہیں جانتی تھی؟

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ سیف کی گفتگو میں

اسے کہیں بھی عامیانہ پن یا غلط بیانی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس کے لب و لہجے سے ایک عجیب سی یاسیت اور سچائی چھلک رہی تھی۔ ایک ایسا احساس جسے صدف الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر تھی۔ اور شاید اسی کیفیت کے زیر اثر وہ ہاں آ کر بیٹھی تھی مگر اب جب فون بند ہوا تھا اور ذہن میں ساری باتیں نئے سرے سے گھومنے لگی تھیں تو بہت سے خدشات نے اس پہ گھبراہٹ طاری کر دی تھی۔ پتا نہیں یہ آدمی کون تھا اور کون نہیں؟ اور نجانے زرناب اس کی اس بے وقوفی کا احوال سن کر کیا ردعمل ظاہر کرنے والی تھی اور اگر اس سارے معاملے کی صبور شاہ کو ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو......" وہ بے اختیار کانپ اٹھی۔

"اف میرے اللہ، کس مشکل میں پھنس گئی ہوں میں۔" مضطرب سی انگلیاں چٹخاتی وہ بے چینی سے کمرے کا طول و عرض ناپنے لگی۔

☆☆☆

"زری میری جان! ادھر دیکھو۔" شاہ بی بی نے پیار سے اپنے بیڈ پہ دراز زرناب کے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو اس نے دھیرے سے ان کی طرف چہرہ کیا۔ اسپتال سے آنے کے بعد وہ سب ہی کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ہلکی پھلکی باتیں، عمر اور بلال کی شرارتیں، وہ سب سے محظوظ ہوتی مسکرا رہی تھی مگر آنکھوں میں تحریر پریشانی اور چہرے پہ پھیلی زردی اس کے دل کا حال واضح طور بیان کر رہی تھی جب ہی سب کے ادھر ادھر ہوتے ہی شاہ بی بی نے اسے محبت سے گھیر لیا تھا۔

"کچھ کہو گی نہیں؟" انھوں نے شفقت سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "مانا کہ تم بہت اچھی بیٹی ہو۔ لیکن میرے بچے! میں تمہاری ہی ماں نہیں بلکہ تمہارے بابا صاحب کی بھی ماں ہوں۔ میں اس کی آنکھوں کے دکھ بھی پڑھ لیا کرتی تھی اور تمہارے چہرے کی پریشانی بھی دیکھ سکتی ہوں، کیا تم مجھے نہیں بتاؤ گی کہ تمھیں کیا بات پریشان کر رہی ہے؟" انھوں نے نرمی سے اس کا گال سہلایا تو زرناب کے لیے خود پہ مزید قابو رکھنا ممکن نہ رہا۔

وہ بے اختیار ان کی گود میں منہ چھپائے سسک اٹھی۔ شاہ بی بی نے محبت سے اس کے وجود کو خود میں سمیٹ لیا۔ انھوں نے اسے کھل کر رونے دیا یہاں تک کہ وہ روتے روتے خود ہی چپ ہو گئی۔ انھوں نے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔

"اب مجھے سچ سچ بتاؤ۔ تمھیں زوہیب کے رشتے پر تو کوئی اعتراض نہیں؟ وہ اور اس کی فیملی تمھیں پسند تو ہے ناں بیٹا؟" وہ نرمی سے بولیں تو زرناب ایک پل کو خاموش ہو گئی۔ وہ ان کے سوال سے ہی ان کی بات کا مفہوم سمجھ گئی تھی۔ وہ اور اس کی اماں جان یقیناً یہی سمجھ رہی تھیں کہ وہ اپنے رشتے کی وجہ سے پریشان ہے۔

ان کی اس درجہ سادگی اور محبت پہ اسے جی بھر کے پیار آیا۔ کاش کہ اس کی پریشانی کی وجہ اتنی ہی سادہ اور بے ضرر سی ہوتی تو وہ لمحے میں اپنی ماں جیسی پھپھی کے سامنے اپنا درد بیان کر دیتی۔ مگر یہاں تو جیسے قیامت نئے سرے سے برپا ہونے کو تیار تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی بھاپ بھی کیسے اور کس کے سامنے منہ سے نکالے۔ اس کی مسلسل خاموشی نے کوثر شاہ کے تفکر کو بڑھا دیا۔

"بولو ناں میری جان۔" انھوں نے بے چینی سے اس کا چہرہ دیکھا تو زرناب نے اک گہری سانس لی۔

"مجھے ہر وہ شخص قبول ہے بی بی جسے آپ اور اماں جان میرے لیے پسند کریں گی مگر مجھے وقت پہ بھروسہ نہیں رہا، یہ کب اور کہاں میری آزمائش کا سامان کر دے، میں نہیں جانتی۔" وہ دل گرفتی سے بولی تو کوثر شاہ کو کل سے اپنے دل پہ دھرا بوجھ سرکتا ہوا محسوس ہوا۔

"وقت پہ تو کسی کو بھی بھروسہ نہیں میرے بچے! یہ کب بدل جائے، کون جانتا ہے۔ لیکن تمہارے واہمے بھی بے جا نہیں، جو کچھ تم نے دیکھا اور سہا ہے، اس کے بعد تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا، تو خوشیوں کی آہٹ پہ یونہی سہم جاتا لیکن بیٹا تم اپنے رب پہ

بھروسہ رکھو، بے شک ہر تنگی کے بعد آسانی ہے۔ شاء اللہ میری بیٹی کے نصیب میں بھی آسانیاں اور راحت ضرور آئے گی۔ بس ایک مخلص اور چاہنے والے ساتھی کی ضرورت ہے۔'' اس کی آنکھوں میں دیکھتی، وہ یقین سے مسکرائیں تو زرناب کے کانوں میں کسی کا بھاری لہجہ گونجنے لگا۔

''اتنا جان لیں کہ اب میں مزید کوئی دکھ آپ کا مقدر نہیں بننے دوں گا۔'' الفاظ کی مضبوطی بازگشت میں بھی واضح ہو کر اس کے اردگرد پھیل گئی تو زرناب کا دل اس مضبوطی پہ کانپ کر رہ گیا۔

''شاہ بی بی!'' اس نے سہم کر اپنے ٹھنڈے ہاتھ میں ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''آپ...... آپ میرے لیے دعا کریں گی ناں؟''

''کیوں نہیں میری جان۔ میری ساری دعائیں میرے بچوں کے لیے ہی تو ہیں۔'' مسکراتے ہوئے انھوں نے جھک کر اسے پیار کیا تو زرناب نے بے ساختہ اپنی پلکیں موند لیں۔ اس گود میں جو آسودگی تھی وہ بھلا کسی اور گوشے میں کہاں ملنے والی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح بی بی نور بانو کے لیے گزشتہ روز کے برعکس خاصی روشن طلوع ہوئی تھی۔ انھیں جب سے شاہ بی بی نے زرناب سے ہونے والی گفتگو کا احوال سنایا تھا' ان کا دل مطمئن اور ہلکا ہو گیا تھا۔ وگرنہ ہاشم شاہ کی دھمکی کے بعد سے تو ان کی پریشانی جیسے دوچند ہو گئی تھی۔ ہر لمحہ بس یہی خیال کھائے جا رہا تھا کہ اگر زرناب، زوہیب کے لیے راضی نہ ہوئی تو وہ اپنی بیٹی کی حفاظت کیسے کریں گی۔

مگر اللہ نے ان کی عزت رکھ لی تھی۔ زرناب کو اس رشتے پہ کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس شام اتفاق سے بختیار اور صبور بھی حویلی میں تھے۔ معصومہ بھی کل اسپتال سے گھر آنے کے بجائے ماں کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ بی بی نور بانو نے موقعے کو غنیمت جانا تھا اور دونوں بیٹوں کے سامنے شفق سے رشتے کی بات چھیڑ دی۔

''میں بھی کب سے یہ بات کرنا چاہ رہی تھی تائی بی! آپ لوگوں نے پھر کیا سوچا ہے؟'' اس کی نظریں بی بی سے ہوتیں بختیار اور صبور شاہ پہ جا ٹھہریں۔

''سوچنا کیا ہے۔ جب تم عورتیں اس معاملے کو یہاں تک پہنچا سکتی ہو تو باقی کی بات بھی خود ہی طے کر لو۔'' بختیار شاہ استہزائیہ انداز میں مسکرائے تو شفق نے گھبرا کر بہنوئی کو مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

''ایسی بات نہیں بھاجی! یہ سلسلہ ہم سے پوچھ کر ہی شروع کیا گیا تھا۔'' صبور گلا کھنکھارتے ہوئے بولا تو بختیار شاہ نے تیز نظروں سے بھائی کو دیکھا۔

''تم سے پوچھا گیا ہوگا۔ مجھے تو صرف بتایا گیا تھا۔'' ان کے جواب پہ صبور شاہ لب دبائے خاموش ہو گیا۔

''اچھا چلیں اس بحث کو رہنے دیں۔'' صدف نے گڑبڑا کر بات سنبھالی۔ ''یہ بتائیں میں ان لوگوں کو کیا جواب دوں؟ وہ لوگ اس اتوار امی کو پوچھنے کے لیے آنا چاہ رہے ہیں۔''

''مجھے تو وہ لوگ بہت اچھے لگے ہیں پتر، بس یہ صبور اپنی تسلی کرنا چاہ رہا تھا۔'' انھوں نے سبھاؤ سے صبور شاہ کو اس کی بات یاد دلائی تو وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گیا۔

''سو دفعہ کروائے تائی جی! لیکن کیا آپ لوگوں کو میری بات پہ یقین نہیں؟ یہ گھرانہ میرے لیے ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی اپنا ہو۔ اس پرائے شہر میں میرے لیے ان ہی لوگوں کا دم تو غنیمت ہے۔''

''سلمان کیا کہتا ہے اس بارے میں؟'' صبور نے سوال کیا۔

''انھیں بھی زوہیب اور اس کی فیملی بہت پسند ہے۔ بس ایک یہی اعتراض ہے کہ اپنے نہیں۔'' اس کی بات پہ صبور نے بھائی کی طرف دیکھا۔

''پھر کیا کہتے ہیں بھاجی، ہاں کر دیں؟''

''مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ میں بھر

پایا!'' تلخی سے کہتے ہوئے وہ اٹھ کر باہر نکل گئے تو شفق تاسف سے انھیں دیکھتی ہوئی صبور کی طرف پلٹی۔

''ایک بات یاد رکھنا صبور! اگر یہ رشتہ ہاتھ سے نکل گیا نا تو بہت پچھتاؤ گے۔'' اور صبور شاہ ایک گہری سانس لیتا سوچ میں پڑ گیا۔

''ٹھیک ہے پھر انھیں ہاں کر دیتے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کے توقف کے بعد بولا۔ اس کی بات سن کر شفق اور بی بی نور بانو کا چہرہ کھل اٹھا۔

''اور اس اتوار کو چھوٹی سی رسم بھی کر لیتے ہیں۔ کیا خیال ہے تائی جی؟'' شفق خوشی سے بولتی' بی بی نور بانو کی طرف پلٹی۔

''پہلے ان لوگوں سے تو پوچھ لیجے۔''

''وہ تو میں پوچھ ہی لوں گی۔ آپ اپنی کہیں؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' صدف یک لخت پرجوش ہوئی۔ ''میں ابھی یہ خوش خبری آنٹی کو دیتی ہوں پھر ہم سب مل کر تیاری کا بھی سوچتے ہیں۔''

''ایک منٹ۔'' بی بی نور بانو کی پکار پہ شفق اور صبور نے ان کی طرف دیکھا۔

''فی الحال صرف انھیں فون کرو اور بس۔ گھر میں ابھی رسم وغیرہ کی بات چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔''

''کیوں تائی جی؟''

''میں نہیں چاہتی پتر کہ کوئی شور ہو اور رنگ میں بھنگ ڈلے۔ یہ بات اگر آخری وقت تک معصومہ سے چھپی رہے تو بہتر ہے۔'' ان کا مطلب سمجھ کر شفق بھی دھیمی پڑ گئی۔

''پھر؟''

''پھر یہ کہ ابھی تم دونوں اس بات کو اپنے تک رکھو۔ میں آپا اور حوراں کو خود بتا دوں گی اور ایک دو دن تک زرناب سے بھی بات کر لوں گی۔''

''اور بھاجی؟'' صبور شاہ نے ماں کو دیکھا۔

''اسے بھی رہنے دو۔ یہ معاملہ نہ کبھی اس کا تھا اور نہ ہوگا۔'' وہ دکھ سے مسکرائیں تو صبور بھی اک گہری سانس لیتا ہوا خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

اگلے دن صبور شاہ مردان خانے کے بڑے سے ہال میں چکر لگاتے ہوئے بری طرح کوفت میں مبتلا تھا۔ پونا گھنٹہ ہونے کو تھا مگر ابھی تک اس کا مطلوبہ شخص نہیں آیا تھا۔ سینٹر ٹیبل پہ دھرا موبائل اٹھاتے ہوئے اس نے اسے کال کرنے کا ابھی ارادہ باندھا ہی تھا کہ دروازے پہ دستک کے ساتھ ہی ایس ایچ او جمیل کا چہرہ نظر آیا۔

''او کدھر مر گیا تھا تو؟'' اسے سلام کا موقع دیے بنا وہ غصے سے بولا تو ایس ایچ او اندر چلا آیا۔

''کیا کرتا سرکار! وہ اے ایس پی جان چھوڑتا تو آتا ناں۔'' وہ بےزاری سے بولا۔ ''اچھا خاصا ہتھ (ہاتھ) زخمی ہوا ہے اس کا، فیر وی پتا نئیں کیوں گھر نئیں بیٹھا۔'' اس نے بدمزگی سے سر جھٹکا۔ اس کی بات پہ صبور شاہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاتھ کیسے زخمی ہوا اس کا؟''

''اللہ جانے۔ ہمیں تو یہی پتا چلا کہ پرسوں رات گھر میں چوٹ لگی ہے مگر اج دیکھا ہے تو اچھا خاصا ہتھ کٹا ہوا ہے، چوکیدار بتا رہا تھا کہ کھڑکی کا پورا شیشہ ٹوٹ کر ہتھیلی میں گھس گیا تھا وہ بھی رات کے کوئی تین وجے۔'' اس نے ساری تفصیل بیان کی تو صبور کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

''پرسوں رات؟''

''ہاں جی۔''

''کمال ہے۔'' وہ اس عجیب سے اتفاق پہ حیران ہوتا صوفے پر جا بیٹھا۔ ''اچھا چھڈ اسے، اور میری بات دھیان سے سن۔'' وہ سر جھٹکتا اپنے مطلب پر آیا۔ ''لاہور میں ایک بندے کا کچا چٹھا نکلوانا ہے۔ بتا کر سکے گا یہ کام؟''

''کیوں نئیں جی، مگر اس کے لیے مجھے خود لہور (لاہور) جانا پڑے گا۔''

''تو بس پھر تیاری پکڑ۔ کل نہیں تو پرسوں لازماً

نکل جا۔'' ٹانگ پر ٹانگ جماتے ہوئے اس نے مزے سے حکم دیا تو ایس ایچ او گھبرا گیا۔

''مگر سرکار! مجھے اتنی جلدی چھٹی کیسے ملے گی؟''

''یہ میزا درد سر نہیں۔ چاچا مار، ماسے کو بیمار کر یا کوئی بھی اور بہانہ بنا، تجھے پرسوں تک ہر حال میں لاہور پہنچنا ہے۔'' وہ قطعیت سے گویا ہوا تو جمیل کی آنکھوں میں الجھن در آئی۔

''ایسا کون سا بندہ ہے جناب جسے آپ مہلت نہیں دینا چاہتے؟''

''اے ایس پی سیف علی جنگ۔'' وہ سرد لہجے میں بولا تو جمیل بے اختیار ٹھٹک گیا۔

''او خیر۔'' اس کے لبوں پہ بھرپور مسکراہٹ در آئی۔ ''یعنی اس مصیبت سے سرکار ہماری جان چھڑانے والے ہیں۔'' اس کی بات پہ صبور شاہ مسکرا دیا۔

''وہ بھی چھوٹ جائے گی لیکن اس سے پہلے اس کے خاندان کا پوسٹ مارٹم کروانا ہے۔ اس کا گھر گھرانہ، ماں باپ، بہن بھائی، اسکول، تعلیم تجھے ہر چیز پتا کروانی ہے۔''

''حاضر جناب! مگر یہ اوکھا کم (مشکل کام) ہے۔ مجھے بڑا اعتبار والا بندہ ڈھونڈنا پڑے گا، جو ہمارے لیے وہاں بیٹھ کر ساری معلومات اکٹھی کر سکے۔''

''ہوں......'' صبور شاہ نے ہنکارا بھرا۔ ''کوئی ہے تیری نظر میں؟''

''ایک دو ہیں لیکن وہ اتنے تگڑے نہیں۔ سوچ رہا ہوں اس کام پر اپنے بھائی کو لگا دوں۔ بڑی پہنچ ہے جی اس کی، مگر پھر......'' اس نے قصداً مسکراتے ہوئے ہتھیلی کھجائی تو صبور شاہ اس کا مطلب سمجھ گیا۔ جھک کر ٹیبل پر پڑی چیک بک اٹھا کر اس نے چیک کاٹ کر اپنے اس پالتو کی طرف بڑھایا تو اس میں لکھی رقم دیکھ کر ایس ایچ او کی باچھیں کھل گئیں۔

''اب تو سمجھیں کم ہو گیا سرکار۔'' اس نے چمکتی آنکھوں سے کروفر سے براجمان صبور شاہ کو دیکھا تو وہ بے اختیار سیدھا ہو بیٹھا۔

''ایک بات یاد رکھنا!'' اس نے تنبیہی انداز میں انگلی اٹھائی۔ ''اگر اس کام میں ذرا سی بھی غلطی ہوئی تو میں نے تیری کھال کھنچوا لینی ہے۔ مجھے الیکشنوں سے پہلے کوئی گڑبڑ نہیں چاہیے جمیل!''

''آپ فکر نہیں کریں جی! مجھے اگر اپنی جان پر کھیل کر وی اس سب کو خفیہ رکھنا پڑا تو رکھوں گا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا تو صبور شاہ مطمئن سا صوفے کی پشت پہ بازو پھیلا گیا۔ سیف علی جنگ کے متعلق ان کا خدشہ محض خدشہ تھا یا پھر کوئی حقیقت، اس بات کا اسرار بھی اب جلد کھلنے والا تھا۔

☆☆☆

اس نے سن رکھا تھا کہ جب رب تعالیٰ کسی کی مدد کرنے پر آتا ہے تو ان جانی سمت سے آسانی کے در وا کر دیتا ہے اور ان نامساعد حالات میں سیف کو صدف شاہ کی کال پہ ایسی ہی کسی غیبی مدد کا گمان ہوا تھا جس کے ذریعے اور کچھ نہ سہی لیکن زرناب تک اس کی بات پہنچنے کا وسیلہ تو بنا تھا۔

مگر اب زرناب کا فیصلہ آنے تک وہ جیسے ایک نئی سولی پہ لٹک گیا تھا۔ کبھی لگتا تھا کہ زرناب اس سے ملنے کی ہامی بھر کر اسے کچھ کہنے سننے کا ایک موقع ضرور دے گی۔ اور کبھی سیف کو، اپنی زندگی کے اس اہم ترین محاذ پر لڑے بنا، ہار اپنا مقدر بنتی محسوس ہوتی تھی۔ اس ذہنی کشمکش نے اس کے اعصاب کو بری طرح تھکا دیا تھا۔

اس وقت بھی وہ بیڈ پہ نیم دراز، آنکھوں پر بازو رکھے، خالی الذہنی کے عالم میں لیٹا ہوا تھا، جب موبائل کی بیل پہ اس نے چونک کر بازو ہٹایا تھا۔ عثمان صاحب کی کال دیکھ کر وہ لب کاٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ انھیں کسی طور پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا تب ہی اس نے ان سے دو دن سے رابطہ بھی نہیں کیا تھا مگر اب اس کے پاس ان سے بات کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

''السلام علیکم بابا!'' خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف موجود عثمان علی کے چہرے پر اس کی آواز سن کر اطمینان پھیل گیا۔

''وعلیکم السلام! کہاں غائب ہو یار؟ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔'' وہ محبت بھری خفگی سے بولے۔

''آئی ایم سوری بابا! بس کچھ مصروفیت اتنی رہی کہ چاہ کر بھی کال نہیں کر سکا۔'' اپنے جھوٹ پہ شرمندگی محسوس کرتے ہوئے وہ نادم سا بولا تو اس کے لہجے کا بوجھل پن عثمان صاحب کو بری طرح محسوس ہوا۔

''تمھاری آواز کی تھکاوٹ تو کچھ اور کہہ رہی ہے۔ کیا بات ہے، سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' ان کے نرمی سے پوچھنے پر سیف ان کی محبت پہ ایمان لے آیا۔ وہ واقعی اس کے لیے اس کے والد کا نعم البدل تھے۔

''سیف؟'' لائن پہ چھائی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے شفقت سے اسے پکارا۔ ''کیا تم مجھ سے بھی اپنی پریشانی شیئر نہیں کرو گے بیٹا؟'' انھوں نے دھیرے سے سوال کیا تو سیف کے لیے مزید اس بوجھ کو تنہا اٹھانا ممکن نہ رہا۔ وہ انھیں تین دن پیشتر کے تمام حالات سنانے لگا۔ عثمان علی جنگ چپ چاپ اس کی ساری بات سنتے رہے۔

''آپ میری اس نادانی پہ مجھے کچھ کہیں گے نہیں؟'' ان کی جانب سے کوئی ردعمل نہ پا کے وہ ملول سا بولا تو عثمان صاحب نے ایک گہری سانس لی۔

''میں یہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ جو ہوا اچھا ہوا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ایک نہ ایک دن اس حقیقت کو کھلنا ہی تھا اور وہ دن زرناب کے لیے اتنا ہی کڑا اور شاکنگ ثابت ہونا تھا، ہاں لیکن اگر اسے یہ بات کسی اور انداز میں پتا چلتی تو شاید اس کے اعصاب اس دھچکے کو سہار جاتے۔ مگر پھر وہی بات کہ انسان قسمت کے آگے بے بس ہے۔ یہ سب یقیناً یوں ہی لکھا تھا اس لیے تم خود کو قصوروار نہ سمجھو۔'' ان کے رسان سے کہنے پر سیف کی نظریں اپنے ہاتھ کی لکیروں سے جا الجھیں۔

''رہی بات تمھارے صدف کو دیے وعدے کی تو مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے اپنے دل کی تمام تر بے چینی اور پریشانی کے باوجود آخری فیصلے کا حق زرناب کو سونپا ہے۔'' وہ لحظہ بھر کو رکے تو سیف کے لب بھنچ سے گئے۔

''دیکھو بیٹا! اپنے کسی بھی جذبے کو، چاہے وہ محبت ہی کیوں نہ ہو، کسی عورت پہ مسلط کرنا ایک مرد کی شان کے خلاف ہے۔ اور مجھے فخر ہے کہ تم نے خود سے زیادہ اس کے احساسات، اس کی رائے کا احترام کیا ہے۔'' ان کی بات پہ سیف نے اک بوجھل سانس لی۔

''اور اگر وہ مجھ سے ملنے تو آئی بابا! لیکن اس نے میرے جذبوں کو پذیرائی نہ بخشی تو؟'' اس کے لہجے میں اپنی قیمتی متاع چھن جانے کا خوف تھا۔

''تو تم کوئی سوال نہیں کرو گے۔'' وہ دلگرفتہ سے بولے تو سیف کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔

''تو کیا میں اپنی مراد پا کر بھی بے مراد رہوں گا بابا؟'' یاسیت اس کے ایک ایک لفظ سے ٹپک رہی تھی۔ عثمان علی جنگ کا دل بیٹے کے دکھ پہ درد سے بھر گیا۔

''جس عشق میں پانے کی شرط رکھ دی جائے، وہ عشق کیسا میری جان۔'' وہ مضمحل سے بولے تو سیف کے لیے مزید کچھ کہنا ممکن نہ رہا۔

☆☆☆

بعض معاملات میں لاعلمی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے، اس حقیقت کا ادراک زرناب کو آج ہوا تھا جب آگہی کا بار اس سے اٹھائے نہ اٹھ رہا تھا۔ مصطفیٰ لوٹ آیا تھا، اس کے آس پاس تھا، اس بات کو وہ جتنا سوچتی، اتنی ہی خوفزدہ اور بے یقین ہوتی چلی جاتی۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہوا تھا؟ کیونکر ممکن ہوا تھا اور اگر ہو گیا تھا تو اب آگے کیا ہونے والا تھا؟

اس نے زرناب سے کہا تھا کہ اگر وہ اس کی

ہمت کے بارے میں جان جائے تو پلکیں جھپکنا بھول جائے اور زرناب سچ میں، پلکیں جھپکنا تو کیا سانس لینا بھی بھول گئی تھی۔ اتنی ہمت آخر اس میں کہاں سے آگئی تھی جو وہ تنِ تنہا اپنے دشمنوں کے درمیان لوٹ آیا تھا۔ کیا وہ اس قیامت کو بھول چکا تھا جوان پہ بیت چکی تھی یا اس حشر میں کوئی کمی رہ گئی تھی جو وہ ایک بار پھر سینہ تانے ان کے سامنے آکھڑا ہوا تھا؟

''چلے جاؤ، خدا کا واسطہ ہے مصطفیٰ! یہاں سے چلے جاؤ۔'' وحشت ناک سوچوں کے درمیان بھٹکتے بھٹکتے اس کی سراسیمگی حد سے سوا ہونے لگی تو وہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''ابھی تو تمہاری ذات کی وجہ سے گزرا ملال کم نہیں ہوا تھا کہ تم نیا بوجھ میرے شانوں پہ ڈالنے آگئے ہو۔ کیوں مجھے مارنے پہ تلے ہو؟ رحم کرو میرے حال پہ۔ خدارا رحم کرو!'' اردگرد سے بے نیاز وہ تڑپتے ہوئے بولی تو کمرے میں داخل ہوتی صدف بے اختیار ٹھٹک کر رک گئی۔

''زری! کیا ہوا میری جان؟'' تیز قدموں سے اس کی طرف آتے ہوئے اس نے زرناب کا بازو تھاما تو وہ کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح اس سے آلپٹی۔

''اس سے کہو صدف کہ وہ یہاں سے چلا جائے...... چلا جائے۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔'' ہوش و حواس سے بیگانہ وہ بری طرح سسکتے ہوئے بولی تو صدف کا دل دھک سے رہ گیا۔

''تو کیا زرناب بھی سیف علی جنگ سے؟'' پریشان نظروں سے اس کے بکھرتے وجود کو دیکھتے ہوئے اس نے زرناب کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

''ٹھیک ہے میں کہہ دوں گی۔ تم روؤ مت۔'' اس کی پشت سہلاتے ہوئے اس نے پیار سے اسے تسلی دی مگر زرناب کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح اس کے سینے سے لگی روتی رہی۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے اس کے آنسو خود ہی تھم گئے اور حواس بحال ہونے لگے۔ اردگرد کا ہوش آتے ہی وہ خفیف سی ہو کر صدف سے علیحدہ ہوتی نظریں چرا گئی۔

صدف نے اک گہری نظر اس کے سرخ متورم چہرے پہ ڈالی اور سائیڈ ٹیبل پہ رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

''میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ تم نے مجھ سے رازداری برت کر اچھا نہیں کیا، لیکن میں اتنا ضرور کہوں گی کہ تم نے مجھے خود سے الگ کر کے بہت تکلیف پہنچائی ہے۔'' اس کی بھیگی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے صدف دھیرے دھیرے سے بولی تو زرناب ایک لمحے کو ساکت رہ گئی۔

''میں...... میں سمجھی نہیں۔'' وہ گڑبڑا کر بولی۔

اس کے یوں انجان بننے پہ صدف نے خفگی سے اسے دیکھا۔ اگر یوں تھا تو یوں ہی سہی مگر وہ مزید اس چھپن چھپائی کو برداشت کرنے والی نہیں تھی۔

''سیف علی جنگ کی بات کر رہی ہوں میں۔ کیوں تم نے مجھے اس کی فون کالز کے بارے میں نہیں بتایا؟ کیوں مجھ سے یہ بات چھپائی کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے؟ کیا تمہیں مجھ پہ ذرا سا بھی اعتبار نہیں رہا تھا یا تم مجھے بھی اپنا دشمن سمجھنے لگی ہو؟'' وہ تیز لہجے میں بولی تو زرناب کا دل دھک سے رہ گیا۔

اسے یہ ساری باتیں کہاں سے پتا چلی تھیں؟ گھبرائی ہوئی نظروں سے صدف کو دیکھتے ہوئے اس نے بمشکل تھوک نگلا۔

''تت...... تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا؟''

''بے فکر رہو۔ جاسوسی نہیں کی ہے تمہاری۔'' صدف نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا تو زرناب کے چہرے پہ درد میں ڈوبی بے بسی پھیل گئی۔

''پلیز صدف! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ خدارا مجھے مزید تکلیف نہ پہنچاؤ۔'' اس نے ملتجی انداز میں صدف کا ہاتھ تھاما تو وہ اس کی آنکھوں میں پھیلتی نمی دیکھ کر خاموش ہوگئی۔

''بلال تمہارے کمرے سے تمہارا موبائل اٹھا

لایا تھا۔'' وہ لمحے کے توقف کے بعد بولی تو انداز میں پہلے سی خفگی نہ تھی۔ ''میں نے جب اس سے موبائل لیا تو تمہارے نمبر پہ رات کے تین بجے ایک انجان نمبر سے مس کالز دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ میں نے اس نمبر پہ اپنے فون سے رنگ کیا تو دوسری طرف سیف علی جنگ نے فون اٹھا لیا۔'' اس نے مختصراً ساری بات سنائی تو زرناب ایک لمحے کو خاموش ہوگئی۔

''اس۔ اس نے تم سے کیا کہا؟'' اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا تو صدف نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔

''یہی کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے اور......'' وہ قصداً رکی تو زرناب کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''اور......'' زرناب نے بے چینی سے دہرایا۔ صدف نے اس کی بے چینی کو شدت سے محسوس کیا۔

''اور یہ کہ وہ تم سے ایک بار ملنا چاہتا ہے۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی تو زرناب نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے سر بیڈ کی پشت سے ٹکا دیا۔ صدف نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔

''دیکھو زری! اگر تمہارے دل میں بھی اس کے لیے پسندیدگی ہے تو مجھے بتاؤ۔ ہم دونوں مل کے کوئی راہ نکال لیں گے۔'' اس نے نرمی سے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا تو زرناب کی نظریں صدف کے چہرے پہ جا ٹھہریں۔

''تم جانتی ہو وہ کون ہے؟'' زرناب کے اچانک سوال پہ صدف نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''کیوں نہیں۔''

''کون ہے وہ؟'' صدف کی آنکھوں میں اب کے واضح طور پہ الجھن اتر آئی۔

''اے ایس پی سیف علی جنگ۔''

''نہیں۔'' زرناب کے دھیرے سے کہنے پہ صدف نے چونک کر اسے دیکھا۔

''وہ مصطفیٰ ہے۔ عبداللہ چاچا کا بیٹا، مصطفیٰ عبداللہ!''

صدف کو یوں لگا جیسے کمرے کے در و دیوار اس پہ آگرے ہوں۔ اس نے پھٹی پھٹی بے یقین آنکھوں سے زرناب کو دیکھا۔

''کیا! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے بھلا؟''

''کیوں نہیں ہوسکتا؟ مت بھولو کہ وہ یہاں سے زندہ گیا تھا صدف شاہ!'' وہ پھیکا سا مسکرائی تو صدف سُن رہ گئی۔ زرناب نے ایک نظر اس کے پتھرائے ہوئے چہرے پہ ڈالی۔

''فضلی نے تمہیں بتایا تھا کہ میری اس سے پہلی ملاقات قبرستان میں ہوئی تھی۔ میں بابا صاحب کے مزار پہ بیٹھی تھی جب فضلی کی آواز پہ میں نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ ایک غیر مرد کو دروازے میں کھڑا دیکھ کر میں نے سُرعت سے اپنا چہرہ چھپایا تھا مگر آنے والا تو جیسے اپنی جگہ پہ ساکت رہ گیا تھا۔ بنا پلکیں جھپکائے وہ یک ٹک مجھے دیکھے چلا گیا تھا۔ اس کا انداز مجھے بے حد ناگوار گزرا تھا۔ میں مزید رکنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر اس کی نیلی نگاہیں مجھ پر سے ہٹنے کو انکاری ہوگئی تھیں۔

سختی سے اسے اپنے راستے سے ہٹنے کا کہہ کر میں مزار سے باہر نکل آئی تھی لیکن اس کی نظروں کی تپش مجھے دور تک اپنے وجود پہ محسوس ہوتی رہی تھی۔

وہ کون تھا کون نہیں، میں کچھ نہیں جانتی تھی مگر اس کی اس عامیانہ حرکت نے مجھے ازحد غصے میں مبتلا کر دیا تھا۔

پھر کچھ ہی دنوں بعد نئے اے ایس پی کی بدولت، اس گاؤں کو اس کا اسکول لوٹا دیا گیا۔ ہر طرف اس دلیر آفیسر کے ڈنکے بجنے لگے۔ تمہاری طرح میں بھی اس انجان اے ایس پی کی شجاعت اور ایمانداری سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ لیکن فضلی سے یہ جان کر کہ یہ اے ایس پی دراصل وہی شخص تھا جو مزار پہ مجھے ملا تھا، میں حیران رہ گئی تھی۔ بظاہر ہمارے مردوں کی زیادتی کے خلاف قدم اٹھاتا یہ باہمت آفیسر، رات کی تاریکی میں ان ہی کی محفلوں میں شریک ہوتا رہا تھا، اس حقیقت نے مجھے اس

دو غلے انسان سے اچھا خاصا متنفر کر دیا تھا۔ اس بے ضمیر شخص کے سامنے میں اب دوبارہ کبھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن اگلے ہی روز بی بی حوراں کی چوٹ کے باعث مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے مدد مانگنے کے لیے جانا پڑ گیا۔

رت جگے کے خمار سے بھری اس کی آنکھیں، مجھے اپنے سامنے پا کے چمک اٹھی تھیں۔ اس کی توجہ اور ارتکاز سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی مگر جوں ہی اس نے بی بی کی تکلیف کا سنا، وہ جیسے ہر بات بھول گیا تھا۔ شاہ بی بی اور بی بی حوراں کے لیے اس کی سعادت مندی اور پریشانی دیکھ کر مجھے کوفت ہونے لگی تھی۔ میرے نزدیک وہ اچھا بننے کا صرف ڈھونگ رچا رہا تھا۔ لیکن پھر اسپتال میں اس کی بھاگ دوڑ نے مجھے عجیب سی الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

اس کا کون سا روپ سچا تھا، قابل اعتبار تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھی اور پھر اس رات جب میں سونے کی تیاری کر رہی تھی اس کی کال نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

''مگر اس کے پاس تمہارا نمبر کہاں سے آیا؟'' خاموشی سے ساری بات سنتی صدف نے زرناب کی طرف دیکھا۔

''اس نے مجھے شاہ بی بی کے نمبر سے کال کیا تھا۔ ان کا فون اس کی گاڑی میں رہ گیا تھا۔'' وہ دھیرے سے بولی تو صدف نے اک گہری سانس لی۔

''اور اتنا تو وہ تمہیں جانتا ہی تھا کہ تم کوئی انجان نمبر نہیں اٹھاؤ گی۔''

''ہاں۔'' دل گرفتی سے کہتے ہوئے زرناب نے سر بیڈ کی پشت سے ٹکا دیا۔ ''مگر میں اسے جان کر بھی نہ جان پائی۔ مصطفیٰ کبھی نور والا لوٹ کر بھی آ سکتا ہے میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔''

''تم کیا' کسی نے بھی نہیں سوچا تھا۔ پتا نہیں کیوں لیکن اس کا لوٹ آنا ہمارے ذہنوں سے یوں نکلا ہوا تھا جیسے یہ ناممکنات میں سے ہو۔'' صدف یاسیت سے بولی۔

''ٹھیک کہا۔ شاید اسی لیے اس کے لوٹ آنے پہ میں ایسی بے یقین ہوئی جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ اس نے میری ذات کو ہلا کر رکھ دیا ہے صدف!'' زرناب کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ ''اس کی آمد آنے والی قیامت کا پیش خیمہ ہے، جو مجھے زندہ درگور کیے جا رہی ہے۔''

''لیکن تم نے اسے پہچانا کیسے؟ کیا اس نے تم سے خود کہا کہ وہ مصطفیٰ ہے؟'' صدف نے پریشانی سے سوال کیا۔

''نہیں۔''

''تو پھر؟'' وہ چونکی۔

''پھر یہ کہ وہ حلیہ تو بدل سکتا ہے لیکن اپنا انداز نہیں اور اس کا انداز مجھے جانا پہچانا سا لگا تھا جس کی تصدیق بعد میں اس کی باتوں نے کر دی۔''

''تم نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟''

''ہاں مگر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔'' اس کی بات پر صدف متفکر سی خاموش ہو گئی۔

''میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کیسا گورکھ دھندہ ہے؟'' اس نے پیشانی مسلی۔ ''اگر وہ سچ میں مصطفیٰ ہی ہے تو اسے حویلی کے مردوں پہ اپنی اصلیت کھلنے کا ذرا سا بھی ڈر نہیں؟ وہ کیسے ان سب کے درمیان اتنی جی داری سے اٹھ بیٹھ رہا ہے؟'' اس نے حیرت سے زرناب کی طرف دیکھا۔

''شاید حق پہ ہونے والے اتنے ہی نڈر ہوتے ہیں۔'' زرناب پژمردہ سی مسکرائی۔ صدف نے اک گہری سانس لی۔

''کس نے سوچا تھا کہ غریب سے عبداللہ چاچا کا بیٹا اس عہدے تک پہنچ جائے گا۔''

''صحیح کہا۔ نجانے اس کامیابی کے پیچھے محنت اور تگ و دو کی کتنی لمبی داستان ہے۔'' زرناب ملول ہوئی۔ ''یہاں سے جانے کے بعد ان باپ بیٹے پہ کیا گزری، کون جانتا ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔ مگر اب ہو گا کیا؟'' صدف نے پریشانی سے اسے دیکھا۔ ''وہ تو تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

''اور اگر میں نہ ملوں تو؟''

''تو اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ دوبارہ تمہاری راہ میں کبھی نہیں آئے گا۔'' زرناب لب بھینچے خاموش ہو گئی۔

اس کے اندر پھیلا اضطراب شدت اختیار کرنے لگا۔ وہ تو راہ میں نہیں آئے گا مگر کیا وہ اس بوجھ کے ساتھ جی سکے گی جو ایک عرصے سے اس کے دل، اس کی روح پہ دھرا ہے؟ کیا وہ معذرت کا یہ پہلا اور آخری موقع بھی گنوا دے گی؟؟ اس نے بے قراری سے لب کاٹے۔

''میں۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں صدف۔'' وہ سرگوشی کی صورت بولی تو صدف نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''ہم پہ اس کا بہت قرض ہے اور میں اس قرض کو اپنی جان پر رکھ کر مرنا نہیں چاہتی!'' اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

''اور اس کی محبت؟'' صدف کے استفسار پہ زرناب کے اندر ویرانی سی اتر آئی۔

''اس کی محبت کو قبول کرنے کا مطلب ہے مصطفیٰ کی جان کو نہ ختم ہونے والی دشمنی میں جھونک دینا، اور میں اتنی خود غرضی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی۔'' مضمحل لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنی جلتی آنکھیں موند لیں تو صدف اس کی پلکوں کے کنارے بھیگتے دیکھ کر خود بھی آزردہ ہو گئی۔

☆☆☆

سیف تھانے میں آئے — لوگوں کی شکایات سن رہا تھا جب موبائل کی بیل پہ اس نے ایک نظر فون پر ڈالی تھی۔ اسکرین پہ جگمگاتا صدف کا نمبر دیکھ کر اس کا رواں رواں بے چین ہو گیا مگر فرض کو اپنی ذات پہ ترجیح دیتے ہوئے اس نے پہلے پورے اطمینان سے گاؤں کے مجبور لوگوں کی شنوائی کی تھی اور پھر صدف شاہ کو فون کیا تھا۔

''بہت معذرت کہ آپ کی کال ریسیو نہیں کر سکا۔'' سلام دعا کے بعد وہ اپنے مخصوص سلجھے ہوئے لیکن بارعب لہجے میں بولا تو صدف کا حلق خشک ہونے لگا۔ جب تک اس کی پہچان کے بارے میں علم نہ ہوا تھا صدف کا اعتماد بھی بحال تھا۔ لیکن اب یہ جاننے کے بعد کہ وہ کون ہے، صدف کا اس سے بات کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

''کک..... کوئی بات نہیں۔'' وہ اٹکتے ہوئے بولی تو سیف اس کی گھبراہٹ پر چونک سا گیا۔

''سب ٹھیک تو ہے ناں مسز صبور؟''

''جی..... جی سب ٹھیک ہے۔'' زرناب کو دیکھتے ہوئے اس نے خود کو سنبھالا۔ ''ایسا ہے سیف صاحب کہ میں نے آپ کا پیغام زرناب کو دیا تھا۔ وہ..... وہ آپ سے ملنے کے لیے تیار ہے۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولی تو سیف علی جنگ کے لیے اپنی سماعت پہ یقین کرنا مشکل ہو گیا۔

''کیا.....؟'' وہ بے یقینی بھری خوش گواری سے بولا۔ اس کی آواز میں در آنے والی خوشی پہ صدف کے دل میں ملال اتر آیا۔

''کہاں اور کب ملنا چاہتی ہیں وہ؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''کل شام پانچ بجے..... ہمارے نہر کے پاس والے باغ میں۔'' اس نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں پہنچ جاؤں گا۔'' سیف نے اس جگہ کا نقشہ ذہن میں دہرایا۔ وہ ملنے کے لیے واقعی ایک محفوظ مقام تھا۔ دل کی خواہش اپنی جگہ لیکن زرناب اور صدف کی حفاظت اس کی اولین ترجیح تھی۔

''لیکن پلیز آپ اپنی گاڑی......''

''آپ بے فکر رہیں مسز صبور! ایسی کوئی بات نہیں ہو گی جس سے آپ دونوں کو کسی قسم کی مشکل کا سامنا کرنا پڑے۔'' وہ شائستگی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا تو صدف کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہ

رہی۔

''اپنا خیال رکھیے گا۔'' اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے سیف نے رابطہ منقطع کر دیا تو صدف نے فون بند کرتے ہوئے اک گہری سانس لی۔

''کیا ہوا؟'' زرناب نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

''وہ بہت بدل گیا ہے زری!'' وہ کھوئی کھوئی سی بولی تو زرناب اس کی بات سمجھ کر پھیکا سا مسکرا دی۔

''بدل تو وہ واقعی بہت گیا ہے۔'' اس کی نظروں کے سامنے سنہری روشنیوں کے درمیان جگمگاتا سیف علی جنگ کا وجیہہ سراپا لہرا گیا تو وہ خود سے بھی نظریں چُرا گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح دسترخوان پہ صدف نے سب کے سامنے زرناب کو باہر لے جانے کا ذکر کیا تو اس کی بات سے سب ہی نے اتفاق کیا۔

اس نے صبور سے کہہ کر شام پانچ بجے تک نہر والے باغ پہ سے تمام ملازمین کو ہٹوا دیا تھا۔ یوں جب وہ دونوں، گاڑی میں چاچا کرم دین کے ساتھ، وہاں پہنچیں تو دور تک کوئی نہ تھا۔

''میں اوس پاسے چلاں کڑیو...... جے کوئی گل ہوئے تے فون کر لینا مینوں۔'' (میں اس طرف جا رہا ہوں لڑکیو۔ اگر کوئی بات ہوئی تو مجھے فون کر لینا۔) انھوں نے ملازمین کے ڈیرے کی طرف اشارہ کیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی باغ کے اندر چل دیں۔

''ہم نے یہاں آ کر کوئی غلطی تو نہیں کی زری؟'' دزدیدہ نگاہوں سے اردگرد دیکھتے ہوئے صدف نے گھبرائی ہوئی آواز میں زرناب سے استفسار کیا تو اس نے اک بھینچی ہوئی سانس لی۔ وہ دونوں اس وقت باغ کے وسط میں پہنچ چکی تھیں۔

''اگر آج میرا مصطفیٰ سے ملنا کوئی غلطی ثابت ہوا صدف، تو میرا نیکی اور شرافت پر سے ہمیشہ کے لیے یقین اٹھ جائے گا۔''

''اور آپ کا یقین ٹوٹ جائے، ایسا مصطفیٰ کبھی ہونے نہیں دے گا۔'' اچانک ایک بھاری گمبھیر آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تو زرناب کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا جبکہ صدف نے گھبرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا کیونکہ یہ صدف کی سیف علی جنگ سے پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے دونوں کا ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

اچانک درختوں کے درمیان سے، ایک لمبا چوڑا، پُروقار اور وجیہہ مرد نکل کر آگے آیا تو صدف ایک لمحے کو مبہوت رہ گئی جبکہ زرناب کی نظریں اس کی آنکھوں پر جا ٹھہریں جو آج نیلے رنگ سے بے نیاز، اپنی سیاہی میں مصطفیٰ کی پہچان لیے ہوئے تھیں۔ وہ سانس روک کے اسے دیکھنے لگی، یہاں تک کہ وہ چلتا ہوا اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

''السلام علیکم بی بی!'' سیف نے گمبھیر آواز میں زرناب کو گم گشتہ انداز میں مخاطب کیا تو اس کا دل جیسے پانی بن کر بہنے لگا۔ اس کی آنکھیں تیزی سے نم ہونے لگیں جنھیں چھپانے کو وہ سُرعت سے پلکیں جھکا گئی۔

''وعلیکم السلام! کیسے ہیں آپ؟'' وہ حلق میں اٹکے آنسوؤں کے درمیان بہ مشکل بولی تو سیف اس طرزِ تخاطب پہ مسکرا دیا۔

''یہ آپ جناب کا تکلف آپ پہ جچتا نہیں بی بی۔'' وہ پیاسی نظروں سے اس کے چہرے کو چھوتا ہوا بولا۔

سولہ سال کی طویل دوری کے بعد وہ آج صحیح معنوں میں زرناب شاہ سے مل رہا تھا ورنہ اس سے پہلے تو جتنی بھی ملاقاتیں ہوئی تھیں، اجنبیت کے پردے تلے ہوئی تھیں۔ جہاں نہ زرناب کی آنکھوں میں پہچان کے رنگ تھے اور نہ ہی خود اس کی آنکھوں میں مصطفیٰ کی جھلک۔

''اور آپ پر اب یہ لفظ ''بی بی'' نہیں جچتا مصطفیٰ صاحب۔'' وہ ملول سا مسکرائی تو سیف کے

انداز میں اداسی اتر آئی۔

''سیف علی جنگ تو صاحب ہو سکتا ہے لیکن مصطفیٰ نہ کبھی صاحب تھا اور نہ کبھی آپ کے لیے صاحب بن سکتا ہے۔'' اس کی بات پہ زرناب نے آہستگی سے پلکیں اٹھائیں۔ ''میں اپنی اس روز کی بے اختیاری کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ میں کبھی بھی آپ پر اپنی پہچان اس طرح سے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپ کو تکلیف دینے کے بارے میں، میں سوچ بھی نہیں سکتا زرناب بی بی۔'' اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ نادم سا گویا ہوا۔

''مگر تکلیف تو آپ مجھے دے چکے۔'' وہ اچانک دل گرفتہ سی بولی تو سیف پل بھر کو ساکت ہو گیا۔ ''آپ یہاں کیوں لوٹ کر آئے ہیں مصطفیٰ؟ کیا آپ جانتے نہیں یہاں آپ کے لیے کتنا خطرہ ہے؟''

اس کی بات پہ سیف تلخی سے مسکرا دیا۔ ''جانتا ہوں جب ہی تو لوٹ کر آیا ہوں۔''

''پلیز مصطفیٰ!'' زرناب بے قرار سی آگے بڑھی۔ ''میں آج آپ سے ہر اس زیادتی کی معافی مانگنے آئی ہوں جو میرے گھر والوں کی طرف سے آپ کے ساتھ ہوئی، عبداللہ چاچا کے ساتھ ہوئی، خدارا! ہمیں معاف کر دیں۔ ہم سچ میں آپ کے بہت گناہ گار ہیں۔'' اچانک اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ سسک اٹھی تو سیف کو جھٹکا سا لگا۔

''یہ...... یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' تڑپ کر آگے بڑھتے ہوئے اس نے زرناب کے بندھے ہاتھ تھام لیے۔

''یہاں سے چلے جائیں۔ پلیز مصطفیٰ یہاں سے چلے جائیں۔ نہیں تو یہاں ایک بار پھر قیامت برپا ہو جائے گی۔'' اس نے بے بسی سے روتے ہوئے التجا کی۔ سیف اس کی برستی آنکھوں میں دیکھتا لب بھینچ گیا۔

''نہیں، یہ اب ممکن نہیں۔'' نفی میں سر ہلاتا ہوا وہ دھیرے سے بولا تو زرناب نے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا لیے۔

''کیوں ممکن نہیں؟ کیا آپ کو اپنی جان کی ذرا سی بھی پروا نہیں؟'' وہ جھنجلا اٹھی۔

''کون سی جان؟ کیا میں آپ کو زندہ نظر آتا ہوں زرناب شاہ؟'' وہ یک لخت تلخی سے بولا تو زرناب بے اختیار خاموش ہو گئی۔

''ملازموں سے بھرے صحن میں جب صبور شاہ کی پہلی ضرب میرے چہرے پر پڑی تھی ناں، تو میرے وقار کے ساتھ ساتھ میرے جینے کی ہر امنگ بھی وہیں اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی تھی۔'' سرخ چہرہ لیے وہ ستے ہوئے لہجے میں بولا تو زرناب کی آنکھیں جیسے برسنا بھول گئیں۔

''کچھ کہنے کی کوشش میں، میں اس کی ٹھوکروں کی زد میں آ گیا تھا لیکن اس کا ہاتھ نہیں رکا تھا۔ میں وہ لمحہ آج بھی نہیں بھول سکتا جب چکراتے سر اور ناک منہ سے بہتے خون کے ساتھ، میں نے بھری حویلی میں شاہ صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ محض انھیں اپنا یقین دلانے کو اور صد شکر کہ ان جیسی فرشتہ صفت ہستی کو سچائی تک پہنچنے کے لیے کسی گواہی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ سب جان گئے تھے مگر پھر بھی مجھے سرخرو نہ کروا سکے تھے۔

جلاوطنی میرا اور میرے باپ کا مقدر ٹھہری تھی اور جس شام میں یہاں سے بدنامی سمیٹے، اپنے باپ کے پیچھے خود کو گھسیٹتا، بڑی سڑک تک پہنچا تھا تو میرے دونوں ہاتھ خالی ہو گئے تھے۔ میری شرافت میرا کردار، میری مٹی، میرے سنگی ساتھی سب خاک میں مل گئے تھے مگر مجھے اس پل میرے کسی نقصان نے نہیں رُلایا تھا۔ جانتی ہیں کیوں؟'' زخم خوردہ سا اسے تکتا وہ اچانک رک کر بولا تو زرناب کو اپنا پورا وجود کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپتا محسوس ہوا۔

''کیونکہ میں نے آپ کو کھو دیا تھا اور میرے لیے اس سے بڑھ کر دوسرا کوئی نقصان نہ تھا۔'' سرخ آنکھیں لیے وہ بے اختیار لب بھینچ گیا تو زرناب کو لگا

جیسے وقت کی نبض تھم گئی ہو۔ جو محبت وہ سولہ سال پہلے محسوس نہ کر سکی تھی اس کی شدت آج اس نے لمحوں میں محسوس کر لی تھی اور اب جیسے کچھ اور محسوس کرنے کی تمنا نہیں رہی تھی۔

"میں نے تو اپنی دانست میں آپ کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ صبر کر لیا تھا اپنی قسمت پر لیکن شاید میرے رب کو یہ منظور نہ تھا۔ میں جب یہاں لوٹا تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ آپ میری زندگی میں واپس چلی آئیں گی مگر میرے اللہ نے یہ معجزہ بھی کر دکھایا۔ اس نے آپ کو مجھے تب لوٹایا جب میں خود کو آپ کے قابل محسوس کرتا ہوں۔ آپ میری تکلیفوں کا اجر ہیں زرناب شاہ! آپ کو دوبارہ کھونے کے بارے میں، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔

میں آپ کی راہ کا ایک ایک کانٹا اپنے ہاتھوں سے چنوں گا پھر چاہے اس کوشش میں میری انگلیاں کیوں نہ فگار ہو جائیں۔ مگر میں آپ کو اب تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جانے والا!" وہ چٹانوں سے مضبوط لہجے میں بولا تو زرناب کا دل چاہا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر اپنی مجبوریوں کا ماتم کرے۔

کوئی اس جیسا حرماں نصیب بھی تھا؟

اپنے آنسو پیتے ہوئے اس نے بہ مشکل تمام خود کو سنبھالا۔

"اگر میں کہوں تب بھی نہیں؟" وہ دھیرے سے بولی تو اسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

"نہیں!" اس کے دوٹوک جواب پہ زرناب کے اندر برسوں کی تھکن اتر آئی۔ خود پہ سچی محبت اور خوشی کے دروازے بند کرنا کوئی آسان کام تو نہ تھا۔

"آپ کی محبت کو قبول کرنا میرے لیے ممکن نہیں مصطفیٰ۔" وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولی تو سیف نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔

"کیوں، کیا آپ بھی اونچ نیچ اور ذات پات کی قائل ہو چکی ہیں؟" وہ استہزائیہ انداز میں بولا تو زرناب نے مارے ضبط کے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔

"میری بات طے ہو چکی ہے۔" وہ نگاہیں جھکائے بے جان آواز میں بولی تو جہاں خاموشی سے آنسو بہاتی صدف نے چونک کر اسے دیکھا وہیں سیف کے اعصاب کو بھی زبردست جھٹکا لگا۔

"کیا؟" اس کے چہرے پہ بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔

"مجھ سے غلط بیانی مت کریں زرناب!" اس نے کڑے لہجے میں تنبیہہ کی۔

"میں غلط بیانی نہیں کر رہی۔ آپ چاہیں تو میری بات کی تصدیق شاہ بی بی سے کر سکتے ہیں۔" مدہم آواز میں کہتے ہوئے اس نے قصداً اپنی نظریں اٹھاتے ہوئے سیف کی آنکھوں میں دیکھا تو اسے لگا جیسے اس کی پوری ہستی زلزلے کی زد میں آ گئی ہو۔

"کون ہے وہ؟" وہ بہ مشکل بولنے کی ہمت کر سکا تھا۔

"جو بھی ہے۔ بس اتنا جان لیں کہ میری ماں اور پھپھی کی پسند ہے، اور میں انھیں شرمسار نہیں کر سکتی۔" زرناب کوشش کے باوجود اپنی آواز کو بھر آنے سے روک نہ سکی تھی۔ اس کی بات پہ سیف علی جنگ یوں لب بستہ کھڑا رہ گیا تھا جیسے منزل کے پاس پہنچ کر اسے سرِ راہ لوٹ لیا گیا ہو۔ اس کی خاموشی پر زرناب نے آنسو بھری آنکھیں اٹھائی تھیں اور اس کا سفید پڑتا چہرہ دیکھ کر وہ بے چین ہو گئی تھی۔

"مصطفیٰ!" لیکن اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اسے مزید کچھ بھی کہنے سے روک دیا تھا۔

"جہاں رہیں، خوش اور آباد رہیں۔ میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔" پژمردگی سے کہتا ہوا وہ اچانک پلٹ کر واپسی کے راستے پہ چل دیا تو زرناب کی آنکھیں بھل بھل بہنے لگیں۔

"ہو سکے تو میرے بھائیوں کو معاف کر دینا مصطفیٰ!" اور اس کی آنسوؤں میں ڈوبی استدعا سیف کے پیروں کی زنجیر بن گئی۔

"یہ شادی کا تحفہ مانگ رہی ہیں کیا؟" اس نے بنا پلٹے ضبط سے استفسار کیا تو زرناب نظر حسین شاہ کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے اس شدت سے روئی کہ صدف بھی اسے سنبھالتے سنبھالتے زاروقطار رو پڑی۔

اس کا رونا سیف کے اندر حشر برپا کرنے لگا لیکن وہ پیچھے دیکھے بنا، اپنی آنکھوں سے گرتے خاموش اشکوں کو بے رحمی سے صاف کرتا، آگے بڑھ گیا۔

اپنی مجبوری بتا تا رہا رو کر مجھ کو
وہ ملا بھی تو کسی اور کا ہو کر مجھ کو
میں خدا تو نہیں جو اس کو دکھائی نہ دیا
ڈھونڈتا میرا پجاری بھی کھو کر مجھ کو
پالیا جس نے تہہ آب بھی اپنا ساحل
مطمئن تھا میرا طوفان ڈبو کر مجھ کو

☆☆☆

شام کب کی ڈھل کر رات میں بدل چکی تھی مگر زرناب کے وجود پہ چھایا سکوت نہیں ٹوٹا تھا۔ اور شاید اب کبھی ٹوٹتا بھی نہیں۔ اس نے کسی کے انتظار کو ہمیشہ کے انتظار کا روپ دے ڈالا تھا۔ اس کی زندگی میں ہونے والے معجزے کو آزمائش میں بدل دیا تھا، پھر بھلا چین آتا بھی تو آتا کیسے؟

آج نقصان صرف مصطفیٰ عبداللہ کا نہیں ہوا تھا، زرناب نظر حسین شاہ بھی اتنے ہی گھاٹے میں رہی تھی۔ زندگی کے اس طویل سفر میں اسے ہاتھ تھامنے والا تو شاید کوئی مل جاتا مگر راہ کے خار چننے والا دوبارہ کہیں ملنے والا نہ تھا اور یہ کوئی کم بدنصیبی، کم ملال نہ تھا۔

"زری کھانا کھا لو۔" صدف اس کے لیے کھانا لے کر آئی تو اسے کھڑکی میں کھڑا دیکھ کر بوجھل قدموں سے اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

مصطفیٰ کے جانے کے بعد زرناب کتنی ہی دیر روتی رہی تھی اور صدف کے پاس اسے دلاسا دینے کو کوئی لفظ نہ تھا۔ بالآخر وہ شکستہ حال زرناب کو لیے گھر چلی آئی تھی جہاں اتفاق سے ان کا سامنا کسی سے نہیں ہوا تھا۔ ہر کوئی اپنے کمرے میں تھا اور مرد حویلی میں موجود نہ تھے۔

اس بچت پہ صدف نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

اس نے زرناب کو سکون آور دوا دینے کی بہت کوشش کی تھی مگر اس کے انکار پر وہ خاموشی سے کمرے سے باہر چلی آئی تھی۔ کچھ پل تنہائی کے متقاضی ہوتے ہیں اور وہ زرناب کو ایسی ہی چند گھڑیاں دینا چاہتی تھی۔

مگر بھیگتی رات صدف کی پریشانی میں اضافہ کر گئی تھی۔ اس نے باقی سب کو تو اس کی تھکاوٹ کا کہہ کر مطمئن کر دیا تھا لیکن خود کو اس کی فکر میں گھلنے سے روک نہ سکی تھی۔

"مجھے بھوک نہیں۔" وہ دھیرے سے بولی تو صدف نے دکھ سے اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

"اگر یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے تو خود کو مضبوط بھی کرو زری۔" وہ دلگرفتہ سی بولی تو زرناب کی نگاہیں باہر چھائے اندھیرے سے ہٹ کر اس کے چہرے پر آ ٹھہریں۔

"مضبوط کرنے کو تو ایک عمر پڑی ہے صدف! کم از کم آج کی رات تو یہ پابندی نہ لگاؤ۔" اس کے لہجے کی شکستگی صدف کا دل رنجیدہ کر گئی۔

"تم نے کیوں جھوٹ بولا کہ تمھاری بات طے ہو چکی ہے؟" اس کی آواز میں ملال ہی ملال تھا۔

"میں یہ نہ کہتی تو وہ کبھی بھی نہ جاتا۔" زرناب کی آنکھوں میں یک لخت آنسو بھر آئے تو صدف جھلا اٹھی۔

"اور اب جو اپنا نقصان کر بیٹھی ہو اس کا کیا؟ اس قلق کے ساتھ کیسے جیوگی زرناب شاہ کہ وہ آیا بھی تھا لیکن تم نے اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔"

"پتا نہیں...... پتا نہیں میں کیسے جیوں گی۔" وہ اچانک دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تو صدف اسے دیکھتی، دکھ سے مصطفیٰ کے بارے میں سوچنے لگی۔

''محبت سے آگاہی نے اگر محض چند ہی گھنٹوں میں زرناب کی یہ حالت کردی تھی تو پتا نہیں اس پہ کیا گزر رہی ہوگی جس کے دل کی تڑپ اور آرزو کو آج ہمیشہ کے لیے ہجر کا فیصلہ سنا دیا گیا تھا۔''

☆☆☆

''میں ہار گیا بابا! ایک بار پھر ہار گیا! میں تب اس سے ملا جب وہ کسی اور کے نام پہ سر جھکا چکی تھی۔'' سیف کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

''وہ کہتی ہے کہ میں اس کے بھائیوں کو معاف کردوں۔ کیوں معاف کردوں؟ میں کوئی فرشتہ ہوں کیا؟'' اس کی آنکھوں سے آگ کی لپٹیں سی نکلنے لگی تھیں۔ ساکت کھڑے عثمان صاحب نے بہ مشکل اپنے آنسوؤں پہ ضبط کیا تھا۔ ان کا سیف آج حقیقتاً بہت بری طرح ٹوٹ کر بکھرا تھا۔

''صبر اور اعلا ظرفی کا ٹھیکہ کیا صرف میں نے اٹھا رکھا ہے؟'' غصے سے بولتے ہوئے وہ چلایا۔

''نہیں کروں گا، بالکل نہیں کروں گا صبر!'' اس نے سختی سے اشک صاف کیے۔ ''کیا ملا مجھے اب تک صبر کرکے؟ اللہ نے مجھ پہ ترس کھایا کیا؟ الٹا میری...... میری آرزو میرے سامنے رکھ کر مجھے پھر سے تہی دامن کردیا۔ کوئی ہوگا اس جیسا بھی بے رحم!'' اپنے رب سے شکوہ کرتا وہ اچانک بکھر کر رو دیا تو عثمان صاحب کی ہمت بھی جواب دے گئی۔ ان کے آنسو جو بہے تو پھر بہتے چلے گئے۔

''ایسے نہیں کہتے بیٹا! ایسے نہیں کہتے۔ تم...... بس واپس آجاؤ۔'' ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر اسے جا کے سینے سے لگالیں۔

''کہاں جاؤں؟ کہاں پناہ لوں؟ یہ اذیت تو میرے اندر گڑی ہے بابا۔'' اس کے الفاظ ان کی بے بسی میں اضافہ کر گئے تھے۔ ''ایسا کیوں ہوتا ہے بابا کہ انسان کا بدترین خدشہ ہی مجسم ہو کر اس کے سامنے آجاتا ہے۔ کیوں کوئی خوش گمانی کسی جیتی جاگتی حقیقت کا روپ نہیں دھارتی بابا؟ کیوں؟'' وہ یاسیت سے بولا تو عثمان صاحب نے دل میں اٹھتی ٹیسوں کو دبایا۔

''صبر...... صبر میرے بچے!''

''نہیں ہوتا۔ سچ میں بابا! اب نہیں ہوتا۔ یہ درد مجھ سے نہیں سہا جارہا۔ بالکل بھی نہیں۔'' اس کی کراہیں بے اختیار تھیں۔ عثمان علی جنگ نے اپنی برستی آنکھیں سختی سے میچ لی تھیں۔ ان کا روم روم اپنے بچے کے درد میں ڈوبا ہوا تھا۔

☆☆☆

اماں جان کے بلاوے پہ صبح سے اپنے کمرے میں بند زرناب، بی بی حوراں کے کمرے میں آئی تو وہاں شفق اور صدف کے ساتھ ساتھ شاہ بی بی کو دیکھ کر وہ سیدھا پھپھی کے پاس چلی آئی۔

''کل سے کہاں گم ہے میری بیٹی؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' اس کی پیشانی چومتے ہوئے انھوں نے اسے اپنے پاس بٹھالیا تو وہ بے اختیار ان سے نگاہیں چرا گئی۔

''جی۔'' مختصراً کہتے ہوئے وہ سب کا دھیان بٹانے کو صدف کی طرف پلٹی۔ ''یہ دونوں شیطان کہاں......'' بات کرتے ہوئے جوں ہی اس کی نظر صدف کے چہرے سے ٹکرائی وہ بے اختیار خاموش ہوگئی۔ اس کے تاثرات بے حد عجیب اور ناقابل فہم سے تھے۔

''کیا بات ہے؟ سب خیر تو ہے نا؟'' اس نے پلٹ کر باقی چاروں کو دیکھا تو شفق مسکرا دی۔

''بالکل خیر ہے میری جان، بلکہ یوں کہو کہ ستے خیراں ہے۔'' اس کی بات پہ تینوں خواتین ہنس پڑیں۔

''ایسا ہے بچے کہ ہم نے زوہیب کی فیملی کو ہاں کردی ہے۔'' بی بی نور بانو مسکراتے ہوئے بولیں تو زرناب کا دل دھک سے رہ گیا۔

''اس اتوار کو وہ لوگ حوراں کی عیادت کے لیے آرہے تھے تو ہم نے سوچا کہ لگے ہاتھوں ایک چھوٹی سی رسم بھی کرلیتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟'' انھوں نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا تو زرناب کی بے جان نگاہیں اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں پہ آٹھہریں۔

یہ وقت تو آنا ہی تھا لیکن اتنی جلدی!! اس کی آنکھیں تیزی سے بھیگنے لگیں۔ اس کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھ کر صدف نے بہ مشکل اپنے آنسوؤں کو اندر دھکیلا تھا۔

''جی ٹھیک ہے۔'' اس کی بے جان سی آواز ابھری تو سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

''جیوندی رے پتر۔'' بی بی نور بانو نے جھٹ سے اسے خود سے لگالیا تھا۔ ''اللہ پاک میری دھی کو کوئی غم نہ دکھائے۔ تجھے ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔'' اسے آباد رہنے کی دعائیں دیتے وہ زرناب کا ضبط بکھیر گئی تھیں۔ ان کے سینے سے لگی وہ اس شدت سے روئی تھی کہ سب کی آنکھیں اشک بار ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

اگلے دن سیف بنا کچھ کھائے پیے یوں ہی تھانے چلا آیا تھا۔ وہ خود کو اس حد تک مصروف کرلینا چاہتا تھا کہ ہر احساس اس مصروفیت تلے دب کر ختم ہوجائے پھر چاہے وہ درد کا احساس تھا، تہی دامنی کا یا اپنی بدنصیبی کا۔ وہ بس خود کو فنا کردینا چاہتا تھا۔

ایسے میں تھانے میں بختیار شاہ کی آمد کی اطلاع نے اسے اپنے ضبط کی حد پہ پہنچا دیا تھا۔ وہ اس دنیا میں آخری شخص تھے جن سے وہ اس وقت ملنا چاہتا تھا۔

سپاہی کو سختی سے کسی کو بھی اندر نہ بھیجنے کی ہدایت کرکے وہ اپنے سامنے رکھی فائل کی جانب متوجہ ہوگیا تھا۔ لیکن ابھی محض چند لمحے ہی گزرے تھے کہ بختیار شاہ، ایک آدمی کو ساتھ لیے، اس کے کمرے کا دروازہ دھکیل کر دندناتے ہوئے اندر چلے آئے۔

انھیں یوں بنا اجازت اپنے کمرے میں گھستا دیکھ کر سیف کے تنے ہوئے اعصاب کچھ اور تن گئے تھے۔

''یہ میرا آفس ہے شاہ صاحب! یہاں اگر آپ میری اجازت سے اندر آتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔'' وہ پیشانی پہ بل لیے سپاٹ لہجے میں گویا ہوا تو بختیار شاہ کی بھنویں تن گئیں۔

''اور یہ میرا دوست اور یہاں کا ڈاکٹر ہے۔ اس کے خلاف پرچا کاٹنے سے پہلے اگر تم مجھ سے اجازت لے لیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔'' وہ سرد لہجے میں بولے تو ان کے اس تحکمانہ انداز پہ سیف کا خون کھول اٹھا۔

''اوہ! تو یہ بات ہے۔'' اس نے بختیار شاہ کے ساتھ کھڑے شخص کو کڑی نظروں سے گھورا تو وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سیف کی نگاہیں اس حرام خور سے ہوتی، بختیار شاہ پہ آٹھہریں۔

''مجھے میری ڈیوٹی کرنے کے لیے کسی کی اجازت درکار نہیں!'' ان کی آنکھوں میں دیکھتا، وہ سرد مہری سے بولا تو بختیار شاہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''مت بھولو جنگ کہ یہ ہمارا علاقہ ہے اور تم نے ہمارے ساتھ مل کر چلنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''صرف اس صورت میں جب بات اس علاقے کے لوگوں کی فلاح و بہبود کی ہوگی۔ جبکہ آپ اس وقت جس انسان کی حمایت کررہے ہیں وہ ایک بے ایمان شخص ہے جو مہینے میں صرف ایک یا دو بار یہاں اپنی ڈیوٹی پہ آنے کی زحمت کرتا ہے۔ کیوں؟ گاؤں دیہاتوں میں انسان نہیں بستے یا پھر اس پہ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں؟'' اس نے سختی سے سوال کیا تو بختیار شاہ خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے۔

''آپ کے لیے بہتر یہی ہوگا شاہ جی کہ آپ اپنے ووٹروں کی فکر کریں اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔ اسی میں آپ کی کامیابی اور ہماری دوستی چھپی ہے۔'' سرد لہجے میں انھیں باور کرواتا وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا گیا تو بختیار شاہ کھا جانے والی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے اور پھر ایک جھٹکے سے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے پیچھے ڈاکٹر صاحب نے بھی بوکھلا کر لپکنا چاہا مگر سیف کی انگلی کی ایک جنبش نے ان کی یہ کوشش ناکام بنادی تھی۔ سپاہی اندر آیا اور ڈاکٹر فضل اپنی جگہ پہ جمے رہ گئے۔ ان کی

حالت اس صیاد کی سی تھی جو آپ اپنے دام میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

''صبور!''

بختیار شاہ کی سخت آواز پہ لاؤنج میں بیٹھا صبور شاہ گھبرا کر ڈرائنگ روم میں آیا تھا، جہاں سید بختیار کو شدید غصے کے عالم میں کمرے کا طول و عرض ناپتے دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔

''خیر تو ہے بھاجی؟''

''او سوا (خاک) خیر ہونی ہے جب تک یہ نامرادا ایس پی ہمارے سر پہ سوار ہے۔'' وہ غصے سے بولے تو صبور نے چونک کر انھیں دیکھا۔

''کیوں کیا ہوا ہے؟''

''منہ کو آنے لگا ہے یہ کتا! ہمارے علاقے میں بیٹھ کے ہمیں ہی رعب دکھا رہا ہے ....'' انھوں نے موٹی سی گالی دی۔ ''ابھی کے ابھی فون ملاؤ اس کمینے جمیل کو۔ پتا کرو، کچھ کیا بھی ہے اس نے یا یوں ہی شغل میلہ کرتا پھر رہا ہے۔'' ان کی بات پہ صبور اثبات میں سر ہلاتا ایس ایچ او کا نمبر ملانے لگا۔ دوسری ہی بیل پہ اس کا فون اٹھا لیا گیا۔

''سلام سر جی! میں ابھی آپ کو ہی فون کرنے والا تھا۔'' وہ چھوٹتے ساتھ ہی بولا تو صبور نے اسے کچھ کہنے کا ارادہ موقوف کر دیا۔

''کیا خبر ہے؟''

''اوہو......کوئی اک خبر ہو تو بتاؤں سرکار! یہاں تو قصہ ہی کج ہو را ہے۔'' وہ سنسنی خیز انداز میں بولا تو صبور شاہ بری طرح چونک گیا۔

''کیا مطلب؟

''مطلب یہ سرکار کہ یہ کسی پروفیسر کا بیٹا نہیں بلکہ یہ اس پروفیسر کے کسی ملازم کا بیٹا ہے۔''

''کیا؟ ملازم کا؟'' صبور نے حیرت سے بھائی کی طرف دیکھا جو خود بھی پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھے۔

''ہاں جی۔ لیکن اس پروفیسر نے اسے اپنی سگی اولاد کی طرح پالا ہے۔ اس کا اپنا شاید ایک ہی بیٹا تھا جو بچپن میں ہی مر گیا تھا۔ اب جو کچھ ہے یہی ہے۔'' وہ مزید بولا تو صبور شاہ اپنی حیرت سے نکلتے ہوئے بولا۔

''اس کے اپنے کتنے بہن بھائی ہیں؟''

''اکلوتا ہے جی!'' اس کے جواب پہ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''سگا باپ زندہ ہے؟''

''نہیں جی......لیکن سنا ہے کہ کسی گاؤں سے آیا تھا اس پروفیسر کے پاس۔'' وہ بے نیازی سے بولا تو صبور شاہ بے اختیار ٹھٹک گیا۔

''کس گاؤں سے؟''

''اب یہ نہیں پتا سرکار!'' وہ جھجک کے بولا تو صبور بر طرح جھنجلا گیا۔

''یہی تو پتا کرنے کی بات تھی کھوتے۔''

''اب یہ کہاں سے پتا کرواؤں جی؟'' اس کا منہ لٹک گیا۔ وہ تو شاہ جی کی طرف سے داد کا منتظر تھا لیکن یہاں تو......

''اچھا ٹھیک ہے۔'' اس نے کوفت سے سر جھٹکا۔ ''یہ بتا نام کیا تھا اس کے باپ کا؟''

''منور تھا شاید......اصل میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں پتا چل سکا۔ سوائے اس کے کہ سیدھا سادہ سا گاؤں کا آدمی تھا جو زیادہ تر گھر میں ہی رہتا تھا۔'' اس نے حاصل کی گئی معلومات جوں کی توں صبور شاہ کے گوش گزاریں تو وہ الجھا الجھا سا کچھ سوچنے لگا۔

نجانے کیوں لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے اس آدھی ادھوری داستان میں ہی پوری داستان چھپی ہے۔ سیف سے مل کر وہ جانا پہچانا سا احساس یوں ہی نہیں تھا۔ کچھ تھا جو ابھی بھی پوشیدہ تھا۔

''جمیل۔'' اس نے اپنی پیشانی مسلی۔

''جی سرکار۔''

''کچھ کر یار۔ اس کے گاؤں کا اتا پتا کروا۔ پتا نہیں کیوں لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں اسے جانتا ہوں۔'' وہ الجھا الجھا سا بولا تو جمیل کی ''پولیسانہ'' حس بیدار ہو گئی۔

''آپ کا مطلب ہے کہ اس کا تعلق ہمارے علاقے سے ہے؟''

''ہو سکتا ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو اس کا باپ گاؤں سے اٹھ کر شہر میں کسی انجان آدمی کے پاس تو گیا نہیں ہو گا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ پروفیسر بھی یہاں آتا جاتا رہا ہو گا سرکار۔'' اس نے کڑی سے کڑی ملائی تو بغور سنتے صبور شاہ نے شانوں کو خفیف سی جنبش دی۔

''ضروری تو نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور کی معرفت سے پروفیسر کے گھر ملازم ہوا ہو۔''

''ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔'' جمیل نے سر ہلایا۔ اچانک ایک خیال اس کے شاطر ذہن میں کوندے کی مانند لپکا تو وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

''ایک طریقہ آیا ہے ذہن میں سرکار۔''

''کیا؟''

''میں آپ کو ایک دو دن تک اس پروفیسر کی کوئی تصویر نکلوا کر بھیجتا ہوں۔ آپ دیکھیں، شاید کوئی جان پہچان کا بندہ نکل آئے۔'' وہ جوش سے بولا تو اس کی بات پہ صبور کے اندر پھیلی بے چینی تھم سی گئی۔

''ہاں۔ یہ ترکیب اچھی ہے، شاباش!'' وہ یک لخت خوش ہو گیا تو ایس ایچ او جمیل کی باچھیں کھل گئیں۔

''تو بس اب اس کی تصویر بھیجنے والی بات کر۔'' اس نے بختیار شاہ کی طرف دیکھا۔

''آپ فکر ہی نہیں کریں جی۔ اک ادھے دن میں آپ کو تصویر مل جائے گی۔''

''چل پھر رب راکھا۔'' وہ فون بند کرتا بے تاب بیٹھے بھائی کی طرف پلٹا۔

''میں نہ کہتا تھا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔'' وہ پرجوش سا بولا تو بختیار شاہ کا صبر جواب دے گیا۔

''اب کچھ بتاؤ بھی کہ ہوا کیا ہے؟'' وہ بے چینی سے بولے تو صبور انھیں ساری بات بتانے لگا۔ تفصیل سن کر انھوں نے پُرسوچ انداز میں سانس لی۔

''چلو دیکھتے ہیں، کس کی تصویر آتی ہے؟''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن بھاجی آپ تھوڑا اپنے غصے پہ قابو رکھیں۔ ہمیں فی الحال اس سے بنا کر رکھنی ہے۔'' صبور رسان سے بولا تو بختیار شاہ چڑ گئے۔

''او یار! اس کی حرکتیں ہی آگ لگانے والی ہیں۔ ہر چیز میں ٹانگ اڑا رہا ہے۔''

''اڑانے دیں۔ بہت جلد اس کی یہ ٹانگ توڑ دیں گے۔ میں بس اسے الرٹ ہونے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا تو بختیار شاہ اثبات میں ہنکارا بھرتے خاموش ہو گئے۔

☆☆☆

اتوار کا دن سفید حویلی میں کیا اترا، ماحول میں نہ چاہتے ہوئے بھی خوشگوار سی ہلچل مچ گئی۔ اس غیر معمولی پن کو معصومہ نے محسوس تو کیا لیکن کہا کچھ نہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ زوہیب کے گھر والے آج بی بی حوراں کی عیادت کے لیے آ رہے ہیں سو اس ہلچل کو بھی انھوں نے اسی آمد کا حصہ جان کر نظر انداز کر دیا تھا۔

لیکن جب شام میں شفق کے شوہر سلمان کے ہمراہ زوہیب اور اس کے گھر والوں کی، شگن کے سامان کے ساتھ آمد ہوئی تھی تو وہ بھونچکا رہ گئی تھیں لیکن چونکہ اس وقت پوچھ گچھ کا کوئی موقع نہ تھا اس لیے وہ اپنی بے چینی چھپائے مہمانوں کے درمیان آ بیٹھی تھیں۔ ان کے بکھرتے اطمینان کو ابھی یہ بات کافی تھی کہ انھوں نے گھر میں نہ تو کوئی خاص قسم کی تیاری دیکھی تھی اور نہ ہی زرناب سمیت کسی کو کوئی زرق برق کپڑے یا زیور پہنے دیکھا تھا۔

لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ بی بی نور بانو نے ان لوگوں کو اپنی طرف سے سادہ سے اہتمام کا پہلے ہی بتا دیا تھا۔ ویسے بھی ان کے ہاں نکاح سے پہلے لڑکا اور لڑکی کو ساتھ بٹھانے کا کوئی رواج نہ تھا۔ لڑکی کی رسم خواتین میں کی جاتی تھی اور لڑکے کو انگوٹھی مردوں

میں پہنائی جاتی تھی۔

زوہیب کی انگوٹھی اور اس کے گھر والوں کے لیے شگن کے تحائف صبور شاہ اور شفق جمعے کے روز جا کے خاموشی سے لے آئے تھے۔

باقی کھانے پینے کا انتظام تو گھر آئے سب ہی مہمانوں کے لیے ہوتا ہی تھا۔ رہے بختیار شاہ تو انھیں بھی آج صبح ہی بی بی نور بانو نے اس بارے میں بتا دیا تھا اور چونکہ اس روز، وہ فیصلے کی گھڑی پہ، ماں اور بھائی پہ سب کچھ چھوڑ کر چلتے بنے تھے، اس لیے آج جب انھیں وقت کے وقت بتایا گیا تھا تو وہ احتجاجاً کوئی گلہ بھی نہ کر سکے تھے حتیٰ کے معصومہ کو نہ بتانے کی درخواست پر بھی انھوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ ان کی اس خاموشی پہ بی بی نور بانو نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ یوں معصومہ اور ان کی بیٹیوں کو بھنک بھی نہیں پڑی تھی اور چھوٹی سی اس رسم کی ساری تیاری مکمل ہو گئی تھی۔

لیکن اب صدف کے ہمراہ زرناب کو آتا دیکھ کر بی بی نور بانو کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا اتر آیا تھا۔ انھوں نے چور نظروں سے معصومہ کو دیکھا تھا جو بغور زرناب کی ہلکی پھلکی تیاری کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بے اختیار ان کے دل سے سب کچھ بخیر و عافیت نپٹ جانے کی دعا نکلی تھی۔

زرناب سے زوہیب کی فیملی بہت محبت سے ملی تھی۔ اس کی والدہ نے زرناب کی پیشانی چومتے ہوئے اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

''اجازت ہے بہن؟'' انھوں نے مسکراتے ہوئے بی بی نور بانو کی طرف دیکھا تو معصومہ کا رہا سہا اطمینان بھی رخصت ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئیں۔

کیا جو وہ سمجھ رہی تھیں وہی ہونے جا رہا تھا؟ انھوں نے بے یقین نظروں سے ساس اور پھپھی کی جانب دیکھا جو خود بھی مسکرا دی تھیں۔

''کیوں نہیں، آپ کی اپنی بیٹی ہے۔'' بی بی نور بانو محبت سے بولیں تو زوہیب کی امی نے اللہ کا نام لے کر زرناب کے سر پہ زرتار آنچل پھیلا دیا۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ معصومہ ہک دک سی سارا منظر دیکھے گئیں۔

''امی! یہ تو پھپھو کی منگنی ہو رہی ہے!'' حیرت زدہ سی سبین ماں کے کان میں بدبدائی تو معصومہ کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

زرناب کی ساس نے مسکراتے ہوئے اس کی انگلی میں بے حد خوب صورت اور جگمگاتی ہوئی ہیرے کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ ہر طرف مبارک سلامت کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں اور معصومہ کے اندر باہر جیسے اک آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ اہانت کے احساس سے ان کا چہرہ تپنے لگا تھا۔ انھوں نے ایک کھا جانے والی نظر اپنے مکار سسرالیوں پہ ڈالی اور ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''امی کہاں جا رہی ہیں؟'' سبین نے گھبرا کر انھیں پکڑا مگر وہ اس کا ہاتھ جھٹکتی زرناب کی طرف بڑھیں جو اپنے ہاتھوں پہ نگاہیں جمائے کسی موی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔

اس کے بے آواز آنسو قطرہ قطرہ اس کی جھکی پلکوں سے گرتے اس کے دوپٹے میں جذب ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ جگر جگر کرتی انگوٹھی کی چمک بھی اس دھند میں ماند پڑ گئی تھی۔

اچانک اسے اپنے شانے پہ کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے جھکی پلکیں اٹھاتے ہوئے اوپر دیکھا اور اپنے مقابل معصومہ شاہ کو دیکھ کر اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں ساکت ہو گئیں۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

ناولٹ

سائرہ رضا

سلیقہ مند

بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر لیپ ٹاپ پر کام کرتے عدیل نے نظریں اٹھا کر مسکراتے ہوئے نزدیک بیٹھی سیمی کو دیکھا۔ پھر اس پلیٹ کو دیکھا۔ جو سیمی نے بہت محبت، احترام سے عدیل کے نزدیک رکھی تھی۔

دونوں کی نگاہیں ملیں تب وہ اتنی لگاوٹ سے مسکرائی کہ عدیل کو تھوک نگل کر حلق تر کرنا پڑا......

''خطرہ!'' عدیل کی چھٹی حس نے الارم دیا۔

چوکور سفید پلیٹ میں چائے کا بڑا مگ...... پوٹیٹو چکن بالز ود مایونیز...... اس نے تو فقط چائے کی چاہ کی تھی، وہ بھی دل ہی دل میں......

تو کیا محبت میں وہ مقام آ گیا تھا جب دل سے نکلے بلکہ نکلے نہیں فقط سوچے الفاظ...... دوسرے تک پہنچنے لگے؟؟؟ سیمی کے لبوں پر ہنوز دھیمی مسکان تھی۔

''خطرہ......!'' عدیل کے اندر کوئی بولا۔

''بلکہ نہیں خطرہ نہیں...... خرچا کوئی نیا خرچا...... آہ......'' اس نے کراہ دبائی۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔ چائے لیں ناں...... ٹھنڈی نہ ہو جائے۔'' سیمی کے اپنے ہاتھ میں بھی ایک مگ تھا۔

''کیا کوئی نئی فرمائش ہے؟'' عدیل اتنی دیر تک گومگو کیفیت میں رہ نہیں سکتا تھا۔

''فرمائش......؟'' سیمی حیران ہوئی (اور یہ سراسر اداکاری تھی۔ شادی کے سولہ سال بعد اتنا چہرہ شناسی کا دعویٰ تو عدیل کر سکتا تھا)۔

''نہیں تو...... اور آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ میں آپ کو ایسے ہی چائے نہیں دے سکتی۔''

عدیل جواب دے سکتا تھا باقاعدہ مثالوں...... بلکہ دن تاریخ کے لیکن...... اس وقت اگر چائے ہی کو انجوائے کر لے تو...... ہونا تو وہی ہے جو سیمی سوچ کر آئی تھی۔

''بچے کہاں ہیں؟''

''بچے......!'' علی اور عمر باہر گئے ہیں کھیلنے...... عینی اور سحر اپنا باربی ہاؤس سجائے بیٹھی ہیں۔ ماہیر سو رہا ہے۔''

''اوہ......!'' عدیل نے ہونٹ سکوڑے۔

''اس کا مطلب ہے، میدان صاف ہے۔''

''میدان!'' سیمی چونکی پھر عدیل کا انداز سمجھ



کر شرمائی۔

''آپ بھی نا......'' اور اس نامکمل الزام نما جملے پر عدیل کا یقین پختہ ہو گیا کہ بات فرمائش سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ کیونکہ دو چار سالوں سے عدیل کے اس طرح کے معنی خیز انداز پر سیمی بڑی سنگ دلی سے ٹوک دیا کرتی تھی۔

''بس کریں عدیل...... بچے بڑے ہو رہے ہیں، سب سمجھتے ہیں۔ انٹرنیٹ کی پیداوار ہیں انٹرنیٹ کی...... بچیاں تک آپ کے ایسے جملوں پر منہ چھپا کر کھی کھی کرتی ہیں۔ بیٹے اتنے پکے ہو گئے ہیں یوں پوز کرتے ہیں جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ مگر آپ کچھ سمجھتے نہیں۔''

اور عدیل سوچتا رہ جاتا اس نے کیا کہا ہے۔

مگر اس وقت سیمی مسکرائی تھی بلکہ لجائی بھی تھی، شادی کے سولہ سال بعد وہ مسکراہٹ جو شادی کے سولہ گھنٹوں بعد آتی تھی یعنی...... یعنی کہ خطرہ...... خرچا۔

لیکن خیر اب جو سیمی کے دماغ میں سما گئی وہ تو وہ کہے گی ہی تو اچھا نہ ہو کہ وہ چائے انجوائے کرے۔

چائے پینے کے دوران سیمی ادھر ادھر کی ہلکی ہلکی باتیں کرتی رہی۔ عدیل شکم سیری کے بعد دوبارہ لیپ ٹاپ کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ آفس کے کام بعض اوقات گھر لے آتا تھا۔

سیمی نے اسے دوبارہ کام میں منہمک ہوتا دیکھا۔

''دراصل......!'' وہ شاید جملہ موزوں کر رہی تھی۔ عدیل نے نگاہیں اٹھائیں۔

''دراصل آپا کی نند کی شادی کا کارڈ آ گیا ہے۔ منڈے سے فنکشن شروع ہیں۔''

''دیکھا......!'' عدیل اچھل پڑا۔ ''میں نے کہا تھا ناں کہ مجھ پر ایسی مہربانیاں تم بلاوجہ کر ہی نہیں سکتیں۔''

''لو خواہ مخواہ...... آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے میں آپ کو بھوکا مارتی ہوں۔''

''نہیں نہیں...... کھلا کر مارتی ہو۔ ابھی ہی دیکھ لو...... پہلے کھلایا ہے پیٹ بھر کے اور اب چھریاں دکھا رہی ہو جیسے قربانی کے جانور کا کھانا پانی چیک کرتے ہیں ساتھ ساتھ چھری کو دھار بھی دکھاتے ہیں۔''

''عدیل......!'' سیمی غرائی۔ ''آپ سیریس ہوں گے یا نہیں؟''

''ارے بابا! میں یہ سب باتیں انتہائی سیریس موڈ میں کر رہا ہوں۔''

''میں آپ سے کہہ رہی ہوں...... آپا کی نند کی شادی طے پائی گئی ہے۔''

''یقین کرو، میرا کیٹرنگ کا بزنس نہیں ہے اور نہ میں نکاح خواں ہوں اور نہ میں......''

''عدیل......!''

''سیمی......!''

''آپ میری پوری بات تو سن لیں۔'' سیمی دھیمی ہوئی، باوجود اس کے کہ دونوں کی گفتگو میں جھگڑے کا شائبہ نہیں تھا۔ مگر اس گفتگو کے انجام پر جھگڑا ہو بھی سکتا تھا۔

''تو تم ہی میری پوری بات سن لو۔ میں فی الوقت کوئی نیا خرچا نہیں کر سکتا۔ ابھی عید پر ہی تو تم نے ڈھیروں کے حساب سے شاپنگ کی ہے۔ اس کو استعمال کرو۔''

''عدیل! چار تو ان کے فنکشنز ہیں۔'' سیمی گڑبڑائی۔

''سب میں شرکت ضروری تو نہیں۔''

''آپا ناراض ہو جائیں گی۔''

''میں ناراض ہو رہا ہوں۔'' عدیل نے زور دے کر کہا۔

''میں ایک ساڑھی ہی تو لینا چاہ رہی تھی۔'' صاف بات کرنی چاہیے اس نے سوچا اب جبکہ بات کھل گئی ہے۔

''ساڑھی ہزار پانچ سو کی آتی ہے ناں......؟''

''وہی تو......'' سیمی کے انداز میں بے بسی آمیز پریشانی گھل گئی۔ ''صرف ساڑھے سات ہزار کی ہے۔'' اس نے بم پھوڑ ہی دیا۔

''ساڑھے سات ہزار......'' وہ یوں اچھلا کہ لیپ ٹاپ گود سے بیڈ پر گرا اور بند ہو گیا۔

''شٹ......'' عدیل نے دونوں کو گھورا، پہلے لیپ ٹاپ پھر سیمی کو۔

''آں ہاں...... ساڑھی کا تو میں خود ارینج کر لوں گی مگر......''

''یعنی ابھی کچھ اور بھی باقی ہے؟''

☆☆☆

وہ گفٹ...... گفٹ کا سمجھ میں نہیں آ رہا۔

اب گفٹ بھی ضروری ہے۔ جیسی دعوت ویسا گفٹ۔

''سیمی!'' عدیل نے انگلی اٹھائی۔ ''ایک تمہاری ضرورتیں پھر خواہش اور آخر میں یہ فرمائشیں...... میں کس کس چیز پر پورا اتروں؟''

''کیا فرمائشیں فرمائشیں کیے جا رہے ہیں۔'' سیمی کھڑی ہو گئی۔

''دنیا کی ساری عورتیں اپنے شوہروں ہی سے فرمائش کرتی ہیں۔ ان ہی سے کریں گی ناں...... اب کیا میں جا کر یہ سامنے والے پڑوسی سے فرمائش کروں...... ہیں بولیں، عورتوں کا کام ہے فرمائش کرنا اور مردوں کا کام ہے پورا کرنا۔''

''اچھا......!'' عدیل کی آنکھیں اس انکشاف پہ کھلیں۔

''اور صرف شوہر ہی کیوں...... بیٹی باپ سے...... بہن بھائی سے اور مائیں بیٹوں ہی سے فرمائش کرتی ہیں اور آج سے نہیں کرتیں ہمیشہ سے کرتی ہیں۔''

''تمہیں یہ سب باتیں کس نے بتائیں؟'' عدیل نے معصومیت سے پوچھا۔ ''اور کیا تمہارا یہ کہنے کا مطلب ہے کہ مرد دنیا میں صرف عورتوں کی فرمائشیں پوری کرنے آئے ہیں۔''

''جی ہاں...... مرد اسی لیے آئے ہیں کسی غلط فہمی میں مت رہیے گا سمجھے آپ......'' سیمی صحیح والا بھڑکی تھی۔

''اور آج سے نہیں ہمیشہ سے...... تاریخ گواہ ہے برطانیہ کے شہزادے نے عورت کے لیے تخت چھوڑ دیا۔''

''اور تم میرا تختہ تک بکوانے کے چکر میں ہو۔'' عدیل تیزی سے بولا۔ مگر سیمی کے اندر کا مقرر بیدار ہو چکا تھا۔

''شرابی فلم میں جیا پرادا امیتابھ بچن سے گا گا کر کہتی رہی۔ مجھے نولکھا منگوا دے رے او سیاں دیوانے۔'' سیمی نے گا کر سنایا۔

عدیل کی آنکھیں کھل گئیں۔

''ادھر پشاور میں صدیوں سے پٹھانیاں گا رہی ہیں۔

پشاور سے میری خاطر دنداسہ لانا

او میرے گل خاناں۔'' سیمی نے اونچی تان لگائی۔

حلق تر کرتا عدیل...... سیدھا ہو بیٹھا۔

''اور ان سب کو بھی چھوڑیے۔'' سیمی کے پاس دلائل کی کمی نہیں تھی۔ عدیل کو یاد آیا۔ وہ یونی ورسٹی میں فی البدیہہ تقریر کی ماہر تھی۔

''آج بھی آپ کی وہ چہیتی...... جیکو لین فرنینڈس...... گلی گلی گاتی پھر رہی ہے۔

چٹیاں کلائیاں وے...... او بے بی میری وائٹ کلائیاں وے۔

لا دے رے...... مینوں شاپنگ کرا دے

ریکوستاں پالیاں وے

سیمی نے جوش خطابت میں الماری پر مکا مار دیا۔ جبکہ عدیل کے چودہ طبق روشن ہو چکے تھے۔ (روشن ہو کر بجھ بھی گئے تھے) سیمی نے تو گویا ابھی اسٹارٹ لیا تھا۔

''یہ ایک یونیورسٹل ٹروتھ ہے مسٹر عدیل کہ عورتیں فرمائش کرتی ہیں اور مرد سر دھڑ کی بازی لگا کر اسے پورا کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ عورت کی محبت میں رانجھے نے ہیر کی بھینسوں کا گوبر صاف کیا۔ فرہاد نے دودھ کی نہر نکالی۔ اس کو آپ کیا کہیں گے؟''

سیمی نے یکدم اسے مخاطب کیا۔ عدیل سٹپٹایا۔

''آں...... ہاں، ہاں۔'' اسے بروقت یاد آیا۔

''مہینوال نے بھی تو اپنی ران کی بوٹی مچھلی کہہ کر سوہنی کو کھلا دی تھی اور وہ بھی چٹ کر گئی۔''

عدیل کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس کی یہ مثال سب مثالوں پر بھاری رہی تھی۔

''اس میں اتنا خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔'' سیمی نے میں نہ مانوں والے تاثرات سجائے۔ وہی مرد کی دھوکا دینے والی فطرت...... بے چاری معصوم کو

مکروہ گوشت کھلا کر جیسے بڑا تیر مارا۔ ہونہہ......!"

"ہیں......!" عدیل اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ سیمی نے اس میں بھی مرد کو قصوروار ٹھہرا دیا۔

"تمہیں کتنے پیسے چاہئیں؟" عدیل نے سوچا وہ شکست تسلیم کرلے۔ بحث میں تو وہ جیت نہیں سکتا اور پیسے تو دینے ہی ہوں گے۔

"ہاں!" سیمی واپس بیڈ کی پائنتی پر اس کے پیروں کے پاس آ بیٹھی۔ "یہی کوئی پانچ ہزار......"

اس کے لہجے میں لگاوٹ اور آنکھوں سے پیار چھلکنے لگا تھا۔ عدیل نے نگاہ پھیر لی۔

اس سے پہلے کہ وہ پھر ڈوب جائے۔ سو وجہ احتیاط۔

☆☆☆

سیمی کپڑوں کا ڈھیر کھولے بیٹھی تھی۔ کبھی مطمئن ہو جاتی۔ کبھی بے کل...... عدیل نے صحیح کہا تھا ابھی عید پر ہی تو جوتا کپڑا ہر شے خریدی گئی تھی۔ سو لباس مسئلہ نہیں تھا مگر پھر بھی لباس ہی مسئلہ تھا۔

چار دن کے چار فنکشنز...... اسکول کھلے ہوتے تو وہ صبح اسکول جانا ہے کا بہانہ بنا کر ایک آدھ دن گھر میں ہی بچوں کو چھوڑ جاتی۔ مگر اسکول بند تھے اور بچے متوقع شادی میں شرکت کی غرض سے بہت پرجوش تھے۔

خاص طور پر بیٹیاں...... دونوں بچیوں کو شراروں غراروں میں بے انتہا دلچسپی تھی۔ سیمی نے بے فکری سے کاہی سبز اور زرد شرارے نکالے۔ یہ ابھی سات آٹھ ماہ بیشتر ہی بنے تھے اور ان کا نیا پن اور نفاست ہنوز برقرار تھی مگر یہ کیا...... سیمی دھک رہ گئی۔ اسے دونوں بہت چھوٹے چھوٹے لگ رہے تھے۔

بیٹوں کے سفید کرتے شلوار اور پیلے چنری والے دوپٹے...... ہائے اللہ...... وہ بھی چھوٹے، ٹنگے اب بچیوں کے شراروں میں تو بیلٹ ڈال دیتی۔ کیا لڑکوں کے کپڑوں میں بھی نیفے ڈالے۔ اونچی قمیصوں کی تو چلو خیر تھی۔ لیکن یہ کیا جب اس نے قمیص علی کو پہنائی تو وہ سینے کے پاس سے یوں کھنچی جیسے...... سینے اور شانوں میں کسی نے ہوا بھر دی ہو۔

جہاں سیمی ہک دک بیٹھی تھی۔ وہیں علی اپنی باڈی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ عمر سحر زدہ سا بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ علی بڑھوتی کی عمر میں تھا۔ چوڑائی اور لمبائی دونوں میں پھیل رہا تھا جبکہ عمر کچھ دبلا تھا۔

لہٰذا علی نے اپنے مسلز اور باڈی کی مزید نمائش کے لیے مزید سانس پھلایا اور ساتھ ہی چڑ چڑ کر کے بٹن ٹوٹ گئے۔

"اللہ......!" سیمی اور عمر دونوں کو اللہ ایک ساتھ یاد آیا۔ عمر کی پکار میں ستائش تھی۔ جبکہ سیمی کو ہول اٹھا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر علی کا ہاتھ جھپٹا اور بازو مروڑ کے دے کے پہ مکا......" لے کر کام بڑھا دیا۔

"اور یہ درزی نامعقول مردانہ کپڑوں کی سلائی میں آخر اندر جگہ کیوں نہیں چھوڑتے۔" اسے نیا شکوہ سوجھا۔

ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کے پریشان بیٹھ گئی۔ اب اتنے بڑے لمبے چوڑے لڑکے کو کیا پہنا کر لے جائے۔

"ایسا کرتی ہوں۔" ہلکے پیلے رنگ کا کرتا سلائی کروا دیتی ہوں۔ مہندی میں گزارا کر لوں گی۔ مگر شلوار بھی تو اونچی ہو گئی ہے اس کا کیا...... اچھا خیر ہے، سفید ہی تو ہے۔ اوپر اندر کو کر کے نیفا ڈال دیتی ہوں اور کچھ اونچی بندھوا لوں گی کسی کو کیا پتا چلے گا۔ اب نئے سوٹ کے لیے ہزار پندرہ سو کہاں سے خرچ کروں؟" مگر علی نے مسئلہ حل کر دیا۔

"آپ بس کرتا بنوا دیں۔ میں کسی بھی جینز کے ساتھ پہن لوں گا۔ زیادہ اچھا لگے گا۔"

"ہیں علی! سچ......!"

"جی مما سچ......!" وہ مسکرایا۔ پندرھویں برس میں لگ گیا تھا۔ نیا نیا بڑا ہونے کا خمار...... سیمی نظر بھر کے دیکھتی نہ تھی مگر یہ جو ابھی الماری کھلی تھی تب اندازہ ہوا علی تو ہر منٹ بڑھ رہا تھا گویا۔

اب کوٹ پینٹ کی باری آئی۔ علی، عمر لاکھ چیخے یہ تو آئیں گے ہی نہیں۔ مگر سیمی بھی ضد کی پکی تھی۔ پہنا کر دم لیا۔ کم از کم چیک تو کرے عمر کا سوٹ تو فٹ آ گیا۔ مگر علی...... اف میرے خدا......

عینی اور سحر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

"بھائی تو چارلی چپلن لگ رہے ہیں۔"

علی منہ پھلا کر سخت ناراضی سے ماں کی ہٹ دھرمی کو دیکھ رہا تھا۔ جس نے لاکھ منع کرنے پر بھی "پہن کر تو دیکھ لو۔" کہہ کہہ کر اسے جوکر بنا دیا۔

اوہ...... جوکر علی کا دماغ بھی چلتا تھا۔ اسٹور سے بلیک کلر کی ٹیپ لے آیا۔ ڈیڑھ انچ کا ٹکڑا کاٹا۔ ناک کے نیچے اور ہونٹوں کے اوپر جوڑ لی۔ سیمی ہک دک رہ گئی۔ جب اس نے ہونٹوں پر پنک لپ اسٹک رگڑی۔ آنکھیں پہلے ہی سبزی مائل تھیں۔ ہونٹ رنگنے کے بعد تو بالکل راج کپور لگنے لگا۔

"میرا جوتا ہے جاپانی" یہ پتلون انگلستانی سر پر لال ٹوپی روسی پھر بھی دل ہے ہندوستانی۔"

خوب شغل لگا۔ کوٹ پینٹ کا چھوٹا ہو جانا سیمی کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ مگر علی نے اپنی حرکتوں سے اسے پریشان ہونے کا موقع نہیں دیا۔ گلی میں نکل گیا اور سیمی کی پکار پر...... درخت کے تنے اور پلرز سے لپٹ لپٹ کر گاتا پھرا۔

"آوارہ ہوں...... آوارہ...... گردش میں ہوں آسمان کا تارا ہوں۔ آوارہ ہوں۔"

"اتار دو علی...... رکھ دو۔ عمر کے کام آ جائے گا۔" سیمی واقعی سمجھ دار تھی۔ مگر عمر اچھل پڑا۔

"میں آخر کب تک بھائی کے اترے کپڑے پہنوں گا۔"

علی نے اسے دھپ لگائی۔ "او بے وقوف، جب کل کو میں ایک بڑا سنگر بنوں گا تب تو فخر سے بتائے گا۔ ہم بھائیوں میں کتنی محبت تھی۔ ایک دوسرے کے کپڑے بدل بدل کر پہنتے تھے۔" علی کو گانے گانے کا شوق تھا۔

"غلط بالکل غلط...... ایک دوسرے کے نہیں...... صرف تمہارے کپڑے مجھے پہننے پڑ جاتے تھے۔" عمر سے غلط بیانی برداشت نہ ہوئی۔

"اوگھامڑ انسان...... تبرک سمجھ کر پہنا کر تبرک۔"

"رہنے دو...... پاپا کہتے ہیں۔ اپنی چیز اپنی ہوتی ہے۔ بھلے پھٹی پرانی ہو۔ انسان کی سیلف

رسپکٹ برقرار رہنی چاہیے۔"
"او...... "علی متاثر ہوا فوراً عمر کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "میں بھی تیرا اپنا بھائی ہوں۔"
"ہوں گے...... مگر بنیان اور انڈرویئر اپنی اپنی ہی اچھی ہوتی ہے۔" عمر نے جیسے کسی بڑے کا قول دہرایا۔
دونوں پھر جی بھر کے ہنسے۔
سیمی البتہ ہنس نہ سکی۔ وہ بڑی سلیقہ شعار تھی۔ حساب کتاب سے چلنے والی...... نہ فضول خرچ تھی نہ کنجوس...... مگر دنیا میں رہنے کو دنیا کے حساب ہی سے تو چلنا پڑتا ہے ناں اور اسی حساب کتاب سے بے چاری پاگل رہتی، اب بھی سوچیں یہیں اٹکی تھیں اور شکوہ کناں نگاہیں پینٹوں پر آخر ان میں نیفے کیوں نہیں لگ سکتے۔

☆☆☆

"میری پینٹس کاٹ کاٹ کے بیٹوں کو پہنا دو۔" عدیل سارا دکھڑا سن کر یہی کہہ سکتا تھا۔
"تو پھر آپ کیا پہنیں گے۔" یعنی سیمی اس آپشن کو بھی مدنظر رکھے ہوئے تھی۔
عدیل سٹپٹایا۔ "میں لنگی باندھ کر چلا جاؤں گا اور گاتا پھروں گا۔ لنگی ڈانس...... لنگی ڈانس...... لنگی ڈانس۔ عزت بھی رہ جائے گی اور چار پیسے بھی کما لاؤں گا۔" وہ جل کر کہہ رہا تھا۔
سیمی کی آنکھیں چمکیں۔ اس نے ایک نظر عدیل کو دیکھا پھر آنکھیں مایوسی سے جھک گئیں۔ عدیل میں کہاں وہ گٹس...... جو وہ ایسے کام سرانجام دے، نری باتیں۔
اور اب وہ عدیل سے بھی ڈو مور کی فرمائش کرتی نہ تو اچھی لگتی نہ اس کا ضمیر اجازت دیتا تھا۔ وہ دن رات محنت کر کے بلکہ ڈبل ڈبل ملازمتیں بھگتا کر ان سب کو بہترین زندگی مہیا کرنے کی فکر میں کوشاں رہتا تھا۔ اور بہت حد تک کامیاب بھی تھا۔
دوسری طرف سیمی عدیل کے شانہ بشانہ کام کرتی تھی۔ وہ عدیل کی آمدنی کو سنبھال کر رکھتی تھی اور خوب دیکھ بھال اور سوچ بچار کے بعد خرچ کرتی تھی۔
صرف یہی نہیں وہ میٹرک کی کچھ لڑکیوں کو سائنس، میتھس اور انگلش مضامین پڑھا کر بھاری فیس بھی لیتی تھی۔ اور اس رقم کو اپنی مرضی سے گھر میں خرچ کرتی تھی۔ نہ حرص میں مبتلا تھی نہ کمینگی یا شاہ خرچی کے الزام سے جیتی تھی۔ توکل، تحمل اس کی زندگی کا سب سے اہم حصہ تھے۔
اور اب بھی بے گانی شادی میں عبداللہ دیوانہ والی مثال نہیں تھی۔ مگر یہ تو تھا ناں کہ اندر سے وہ بھی ایک جوان عورت تھی اور چار لوگوں میں اچھا لگنا اور عزت سے رہنا اس کی ضرورت بھی تھی۔
اور کتنا عرصہ ہوگیا۔ خاندان کی ایسی کوئی بھرپور تقریب منعقد ہوئے۔
عدیل کا اور خود اس کا سارا خاندان پنڈی میں آباد تھا اور وہاں کی شادیاں بھگتنا سیمی کو بہت آسان لگا کرتا تھا کہ سارے سال بھر کے اچھے لباس و جوتے اور دیگر چیزیں وہاں بڑے آرام اور بے فکری سے پہن لی جاتی تھیں کہ کون سی کسی نے دیکھی تھیں۔ بچے بھی اعتراض نہ کرتے تھے۔ مگر ادھر جو چند ایک اپنے آباد تھے۔ وہ حیثیت میں سیمی سے کچھ بڑھ کر تھے۔ یا شو آف کرتے تھے۔
یہاں سیمی کی سلیقہ مندی کی دال گلنا مشکل ہوتا تھا۔ اور پھر یہ جو ایک دفعہ کا پہنا سوٹ دوبارہ پہننا گناہ کبیرہ کا سا درجہ اختیار کر گیا تھا۔ اصل جان اس سے جاتی تھی۔
سیمی تو اب بھی اپنے پیارے کپڑوں میں سے کچھ بھی چلا لیتی۔ مگر آپا ڈانٹ کر گئی تھیں۔ "اپنی اصول پسندی اپنے پاس رکھنا اور سلیقے سے آنا میری سسرال کو جانتی ہوناں۔"
اور سیمی ایسی دھمکیوں میں آنے والی نہیں تھی مگر کیا کرتی کہ بچے بڑے اور کپڑے چھوٹے نکلے۔ اور پھر اس کا اپنا دل جو بہت عرصے سے ایک ساڑھی پر اٹکا تھا۔ تو دل کے ہاتھوں اتنا مجبور ہو جانا تو پھر فطری ہے ہی۔
عدیل سے پیسوں کا مطالبہ ظلم ہی ہوتا کیونکہ وہ اس کی جیب کی تمام حقیقتوں سے واقف تھی۔ ہاں خود

اس کے اپنے پاس ارمان پورے کرنے کے رقم موجود تھی۔ مگر وہ کیا ہے کہ دل کے ساتھ رہنے والا پاسبان عقل اسے پل بھر کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑتا تھا۔
سیمی اللہ پر بھروسا رکھتی تھی مگر اسے ناگہانیوں سے خوف آتا تھا۔ وہ اللہ سے پناہ مانگتی تھی کہ اسے کسی بھی قسم کی ناگہانی آفت سے بچا کر رکھے۔ کوئی بیماری، کوئی مصیبت، کوئی بڑا خرچا...... سو اس کے پاس ایک خفیہ خانہ تھا جہاں وہ اچھی خاصی رقم چھپا کر رکھتی تھی کہ بوقت ضرورت کام آئے اور خانے میں اس وقت بھی ٹھیک ٹھاک رقم موجود تھی مگر وہی سیمی کا دل...... جو جانتا تھا کہ چند گھنٹے کی تقریب کی خوشی حاصل کر لینے کے بعد سیمی کے دماغ کے طعنوں نے اس کا جینا حرام کر دینا ہے۔ اور یہ خرچے...... اف...... مہنگائی، مہنگائی، مہنگائی۔
سال کا آغاز خرچوں کا نیا آغاز ہوتا تھا۔ اور خرچا بھی ایسا کہ آٹے روٹی سے ضروری ہے بھوکے مر جاؤ...... مگر جنوری کے ساتھ جون کی فیس...... اور فروری کے ساتھ جولائی...... نہ دی گئی تو اسکول والے آپ کے ساتھ وہ کر سکتے ہیں جو آپ کی سوچ سے پرے ہوگا۔ بس تاریخ آخری......
وہ ان فیسوں کے لیے بجٹ بنا کر فارغ ہوتی تو اسکول وین والا بیس تاریخ کا الٹی میٹم دے دیتا۔ وین والے سے وہ تھوڑا آگے پیچھے ہونے کی درخواست کر لیتی اور اکثر وہ مان بھی جاتا۔ (ویسے سیمی ان انسانوں میں سے تھی۔ جو چادر دیکھ کر پیر پھیلاتے ہیں اور خوش رہتے ہیں اور سیمی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ادھار سے بے حد خوف کھاتی تھی۔ آندھی طوفان...... وہ بھوکوں بیٹھ جانے کو ترجیح دیتی مگر ادھار نہیں......)
سال کے بھیانک آغاز کے بعد مارچ کا پر بہار مہینہ چڑھ آتا۔ درختوں پر نئے پھول پتے اور ساتھ ہی نیا خرچا...... ماہوار فیس کے ہمراہ امتحانی فیس...... اور ساتھ یہ دھمکی بھرا جلی حروف کا نوٹس۔
اگر واجبات ادا نہ کیے گئے تو بچوں کو امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا جائے گا۔"
یا طریقہ نمبر دو۔ "رزلٹ روک دیا جائے گا۔"
سیمی کو لگا اسکول والوں کا ایک علیحدہ ڈپارٹمنٹ اس کام کے لیے ہوگا کہ والدین کا دل ہلانے کے لیے کون کون سے حربے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔
اور سیمی چونکہ کسی بھی قسم کے ادھار سے خوف کھاتی تھی سو فیس تو ایسے وقت پر ادا کرتی جیسے کے الیکٹرک والے پورے ٹائم پر لائٹ آف کرتے ہیں۔
"ٹھک...... ٹھاہ۔" گھپ اندھیرا۔
اسکول میں بھاری رقم ادا کر کے وہ خالی پرس جھلاتی گھر لوٹ آتی مگر یہ کیا؟ دل خوشی یا طمانیت سے خالی ہوتا ایک مایوسی...... بجھی بجھی سی...... حسرت بھری سانسیں بھرتی سیمی...... ایک دھواں سینے سے اٹھتا ایک دردلا علاج سا۔
وہ ہوکے بھر بھر کے کیبل کے چینل کے نیچے چلنے والی سلائیڈز کو پڑھتی اور عدیل کو دیکھتی جو صاف نظریں چرا جاتا۔ (یا بعض اوقات صرف نیوز چینل لگا لیتا) مگر وہاں بھی یہی مصیبت پڑ جاتی۔ تب عدیل ٹی وی بند کرنے یا کم از کم منظر سے ہٹ جانے کو ترجیح دیتا۔ اخبار اٹھا لیتا...... پر سکون کہاں...... اخبار میں بھی آدھے آدھے صفحہ کے اشتہارات۔
جی ہاں...... لان کے نئے اور پرانے پرنٹس کے اشتہارات پیکج...... بائے ون گیٹ ون، تین ڈیزائنر سوٹ لینے پر ایک ڈیزائنر کرتی فری (بجٹ اتنا کہ گھر کا مہینہ بھر کا راشن آ جائے)
نئے پرنٹس پر اسپیشل آفر...... اور پرانے پرنٹس پر لوٹ آفر...... سیمی دل مسوس کر رہ جاتی۔ اسے کپڑوں کی تمام ورائٹی میں لان سب سے زیادہ بھاتی تھی اور پھر کراچی کے موسمی تغیرات...... لگتا تھا اب کہ برس دسمبر جنوری میں لان ہی پہننا پڑے گی۔ خواب ہوئے پشمینے اور بریزے کے گرم سوٹ یا ویلوٹ کے شوخ رنگ۔
لان...... لان...... اور بس لان۔ بے چاری ڈر کی ماری مارننگ شو نہ لگاتی ادھر بھی لان۔
ٹیڑھے میڑھے منہ بنا کر پنڈلی ننگی، آستین ندارد، دوپٹا تو بقول اکبر اللہ آبادی عقل پہ مردوں کی پڑ

گیا...... کی مصداق غائب ہو چکا تھا۔

اور حیرت و افسوس کا مقام یہ تھا کہ کسی کو یاد نہ تھا۔ مشرقی عورت کے لباس کا سب سے اہم جز واب غائب ہو رہا ہے۔ (اپرکلاس میں سے...... ایک بے چارہ متوسط طبقہ ہی ہے جو اپنی زندگی کا بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہو اور ساتھ اقدار و روایات کا بھی پاسبان ہے)

سیمی کا دل چاہتا۔ وہ گلی گلی گاتی پھرے" ان ہی لوگوں نے لے لیا دوپٹا میرا"۔ خیر سیمی کو قوم کی بیٹیوں کا درد تھا۔ خود تو وہ اپنے سوٹوں کے دوپٹوں کو خوب اچھی طرح پھیلا کا سارے جسم پر پیٹ کر نکلتی تھی۔

سیمی کو عبایا بھی پسند نہیں تھا۔

وہ گھر سے باہر نکلتی تو جہاں بغیر دوپٹے اور آستین کے عورتوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں سخت برافروختہ ہوتی۔

وہیں اسے عبایا بھی نہیں بھاتے تھے۔ اسے لگتا وہ عراق یا ایران میں گھوم رہی ہے۔

اسے تو بس چادر کی بکل مار کے نکلنا ہی پسند تھا۔ اور پھر کچھ وہ عورتیں جنہوں نے عبایا کے نام پر فٹنگ کر کے اسے مردوں کے لیے زیادہ پرکشش کر دیا تھا۔ سیمی کا دل چاہتا وہ جوتے سے ان عورتوں کی باقاعدہ ٹھکائی کر دے۔

اور کچھ وہ...... جو سر سے پیر تک ڈھکی مگر سارا زور آنکھوں اور ہاتھوں کے سنگھار پر لگا دیتی تھیں۔ سیمی کو باقاعدہ دعوت دیتی، کرپٹ عورتیں لگتیں۔

خیر اس وقت تو مسئلہ مارچ کا تھا۔ اونہوں مارچ نہیں لان...... لان کی سیل...... اور سیمی کا خالی پرس۔

سیمی مایوسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتی، کیونکہ اپریل میں لان کی خریداری کا تو وہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ عدیل کا سارا بجٹ اور سیمی کی ساری ذاتی بچت...... سب کی سب بچوں کی نئی کلاسوں پر لگ جاتیں اور یہ اتنا بڑا خرچا ہوتا تھا کہ بے چاری سوچتی۔

یہ بچے پاس ہی کیوں ہوئے۔

نئے بیگ، یونی فارم، جوتے، کتابیں اور سب سے بڑھ کر نئی فیسیں آہ...... ٹی وی سروے والے

کہتے ہیں سب سے زیادہ خرچا پاکستانی عوام —— رمضان اور عید کے موقع پر کرتے ہیں۔ سیمی کہتی غلط بالکل غلط۔ سب سے زیادہ خرچا اپریل کے مہینے میں کیا جاتا ہے۔

اپریل میں تو خیر سیمی کو سر کھجانے کی فرصت نہ ملتی مگر جیسے ہی بچے نئی کلاسوں میں جانا شروع کرتے اور دوبارہ سے روٹین الف شروع ہوتی۔ سیمی چائے کا مگ لے کر ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتی۔ بھولے زخم پھر سے کسک دینے لگتے۔ وہی لان پرنٹس...... جو اب تک سیمی خرید نہیں سکی تھی۔ اور نہ دور دور تک امکان نظر آتا تھا۔

ان دنوں سیمی عجیب مایوسی کا شکار نظر آنے لگتی۔ چڑچڑی ہو جاتی۔ ٹی وی پر بن کر بولتی یا بولتے ڈیزائنر کا منہ بند کرنا تو اس کے بس میں نہیں تھا۔ مگر وہ اپنے ٹی وی کی آواز تو بند کر سکتی تھی۔ سو یہی کرتی اور ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کے بیٹھ جاتی اور اپنے بچپن و جوانی کو سوچتی۔

اسے تو یاد نہیں کہ اس کی امی یا نانی، دادی نے آج کی عورتوں جیسی چنتا پالی ہو۔ گرمی آنے سے پہلے ہی ابو اور بھائیوں کے کرتوں پر کڑھائی کروالی جاتی۔ رنگ برنگے دھاگے لڑکیوں کو بھی لا کر دیے جاتے وہ بھی بیل بوٹے کاڑھ لیتیں۔

ابو امی کو پیسے تھما دیتے۔ امی ان سب کو رکشے میں بھر کے بازار لے جاتیں۔ سالوں سے بھگتائی چند مخصوص دکانوں پر پہنچ کر امی سب کو ان کی پسند کے دو دو یا کبھی تین سوٹ دلوا دیتیں۔ وہیں سے لیس، فیتہ بھی خریدا اور ہفتے بھر میں کپڑے تیار ہو کر اس مسئلے سے جان چھوٹ جاتی۔

سیمی سوچتی ابو کوئی لینڈ لارڈ نہیں تھے مگر وہ ماں بیوی اور چار بیٹے بیٹیوں کے لیے اتنی رقم ضرور ہی دے دیتے جس سے وہ ضرورت بھی پوری کرتیں اور سب سے بڑھ کر خوش اور مطمئن بھی ہو جاتیں۔

اور آج...... آج سب سے بڑا فقدان طمانیت کا تھا۔ یا بے برکتی تھی یا بے صبرا پن۔

الماریاں بھری ہوئی تھیں مگر اور...... اور...... اور کا بڑکا جاتا ہی نہیں۔ وائل، لان جو غریب عورتوں کا پہناوا تھی۔ جب ڈیزائنرز کے ہاتھ چڑھی تب متوسط طبقے کی پہنچ سے یوں دور ہوئی جیسے کٹی پتنگ دکھائی تو دیتی ہے مگر ہاتھ نہیں آتی۔ آسمان سے باتیں کرتی قیمتیں......

سیمی ہر بار سوچتی کیا کبھی وہ کسی اچھی برانڈ کا لان (سات آٹھ ہزار روپے کا) کا سوٹ خرید سکے گی۔ جواب ہر بار نفی میں آتا۔

وہ بہت دولت مند ہو کر بھی لان پر اتنا پیسہ خرچ نہیں کر سکتی۔ (ہو سکتا ہے دولت مند ہو کر خیالات بدل جاتے)

دراصل صرف لان ہی کیوں...... سیمی مختلف اشیاء کی خریداری کے لیے پہلے اپنے دل کو سمجھاتی تھی کہ ٹھیک ہے میں خرید لوں گی۔ مگر شامت یہ آتی جب تک وہ دل اور جیب کو راضی کرتی قیمت ڈبل ہو جاتی۔ سیمی بے چاری بس پیچھا ہی کرتی رہ جاتی۔

آہ......

اور اس سال تو سیمی کے ساتھ زیادہ ہی برا ہوا تھا۔ اپریل کے خرچوں نے مئی کو بھی لپیٹ میں لے لیا اور مئی کے بعد رمضان...... جون، جولائی، رمضان اور عید میں گھر کے اتنے بھیانک ہو گئے کہ سیمی ان دنوں کو سوچتی تو باقاعدہ لاحول پڑھتی۔

قیامت خیز گرمی...... اوپر سے روزے اور مرے پر سو درے...... لوڈ شیڈنگ۔ یو پی ایس بھی چارج مانگتا ہے۔ بجلی اتنی دیر بھی نہ رہتی۔ فریج میں رمضان کے حوالے سے اسٹاک کیا گیا ڈھیروں سامان خراب ہو کر ڈسٹ بن کے اندر چلا گیا باہر سے برف ہر روز خریدنی پڑتی۔

سیمی بہت پرانی لان کی قمیص چڑھا کر فرش دھو لیتی اور خود پر پانی کے ڈونگے ڈال ڈال کر منہ پر گیلا دوپٹا لیے بے دم سی پڑی رہتی۔

خدا سے توبہ کرتی یہاں تک کہ رو پڑتی۔ اللہ تیرا شکر مجھے چھت میسر ہے۔ ان پر رحم فرما جو بے گھر ہیں۔ بارش کی دعا مانگتی۔ اللہ کی ناراضی کے خوف سے سجدے میں جھک جھک جاتی۔

گھروں میں سناٹے...... راستے خاموش، بازار ویران...... پھر بارش کے قطروں نے اس خاموشی کو توڑا۔ لوگ جینے لگے۔ سانسیں بحال ہوئیں، دکانوں کے شٹر کھل گئے اور شہر جاگ گیا جیسے۔

دکان داروں نے بھی شکر ادا کرنے کے بجائے اتنے دنوں کے مندے کا سارا بوجھ خریداروں پر ڈالا۔ قیمتیں دگنی نہیں تگنی چگنی کر کے بتائی جانے لگیں اور خریدار سر جھکا کر دیتے رہے۔

سیمی بھی ان ہی خریداروں میں شامل تھی۔ دکاندار قیمت بتاتا تو وہ منہ کھول کر اس کی شکل دیکھنے لگتی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے چہرے کے آگے ہاتھ لہرا کر اسے متوجہ کرتا۔

"آں...... ہاں!" سیمی چونک کر ہوش کی دنیا میں واپس آتی۔ اور بازاروں کے چکر لگانے پر سیمی ہر بار نئے صدمات کا شکار ہوتی تھی۔ نئی حیرتیں نئے جہان، دراصل نئے خرچے۔

اسے ہر بار اپنا آپ ڈار سے بچھڑی کونج یا ریوڑ سے جدا بکری لگتا یا پھر وہ پینڈو جو پہلی بار شہر آ کر حیران ہے لب بستہ ہے۔

بلکہ اسے اپنا آپ پی۔ کے لگنے لگا تھا۔ حیران، ہونق اجنبی جب وہ حیرت سے تکتی تب شکر کسی نے زبان سے یہ نہ کہا۔ (پی کے ہو) آنکھوں سے البتہ کہا گیا۔ بار بار...... ہر بار......

اور صرف کپڑوں کا خرچا تو نہیں ہوتا دیگر لوازمات جو اصل سے زیادہ ضروری لگتے ہیں۔ بیٹیاں اوپر تلے کی تھیں اور بندے چوڑی کی دکان پر پہنچ کر سحر زدہ آنکھوں کے ساتھ اسٹیچو بن جاتی تھیں۔ جیتی جاگتی سیمی بھی بت بن جاتی تھی، قیمتیں سن کر۔ دس دس پندرہ والا مال پچاس پچاس کا ملنے لگتا۔ پھر اس پر میچنگ کا ٹنٹنا...... ستم بالائے ستم یہ کہ دکان دار کے اندر سے مروت ختم ہو چکی، لینا ہے تو لو ورنہ جاؤ۔ وہ زمانے گئے جب دکان داروں گاہک کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔

سیمی نہ چاہتے ہوئے بھی بچیوں کی فرمائش پر چیزیں خرید لیتی۔ سب سے زیادہ شامت جوتے

خریدتے وقت آتی۔ ہائی ہیل کا شوق...... سیمی پائیداری چاہتی، بچیاں شوخ رنگ برنگے تنگ، تلے اور ہیل جتنی چاہے لمبی مل جائے۔ سیمی دبی زبان سے اشاروں میں پھر گھور کے اور آخیر میں بھری دکان میں دھاڑ لگا کر منع کرتی کہ ہیل کی طرف دیکھنا بھی مت مگر پھر بچیوں کی آنکھوں کی حسرت اور آنسو...... ہیلز لے لی جاتیں۔

ریڈی میڈ کپڑوں کی خریداری بھی ایک شامت...... پینٹس کے ساتھ شرٹس وہ دی جاتیں جو کھینچ کھینچ کر ناف تک بمشکل پہنچ جاتیں آپ زیادہ بڑی لینا چاہتی ہیں تو رقم زیادہ۔

اور ٹائٹس...... اف سیمی کی دکھتی رگ...... سیمی نے ٹائٹس کی تلاش میں شہر کا چپا چپا چھان مارا۔ ریڑھیوں تک میں گھس جاتی۔

امتیاز سے لے کر زینب مارکیٹ...... چیس سے لے کر حیدری طارق روڈ سے لالوکھیت...... ہر جگہ کی ٹائٹس خرید کر چیک کرلیں۔ مگر بس پہلی بار ہی پہنی جاتیں اور آسن سے کپڑا اپھٹ جاتا۔

ٹائٹس نے سیمی کی زندگی کو گھن لگا دیا تھا۔ وہ روڈ پر جاتی، لڑکیوں عورتوں کی فقط ٹانگیں دیکھتی۔ یا اللہ انہوں نے کہاں سے خریدیں۔ اتنی موٹی موٹی عورتیں چڑھائے پھرتی ہیں۔ مگر بس اس کی سوکھی بچیاں ہی ہیں جو ادھر پہنی اور ادھر چرر چررر......

کیوں...... کیوں آخر کیوں......

وہ اس معاملے میں اتنی جنونی ہو گئی کہ اکثر لڑکیوں سے پوچھ بھی لیا۔ آپ نے کہاں سے خریدی آپ کی ٹائٹس پھٹتی نہیں (کیوں نہیں پھٹتی آخر) بعض جواب دے دیتیں بعض یوں دیکھتیں جیسے سیمی کی دماغی حالت پر شک ہو۔

عدیل نے تنگ آکر کہہ دیا بھول جاؤ ان فیشنز کو، سیدھا سیدھا گھر کا سلا سوٹ پہنا دو شلوار قمیص بس......

اب سیمی کو یہ بھی منظور نہ ہوتا۔

عدیل کا منہ تو بند کروا دیتی مگر دل کا کیا کرتی۔ جو ہمک ہمک کر ریڈی میڈ کپڑوں پر لپکتا تھا اور جن کی قیمتیں سن کر دل بند بھی ہوتا تھا۔

☆☆☆

شادی بہت شان دار طریقے سے بھگتائی گئی۔

صرف عمر اور ڈیڑھ برس کا ماہیر سکھ میں رہے کہ کپڑے جوتے پورے آ گئے۔ جبکہ علی نے ہر چیز میں تنگ کیا۔

سیمی نے ساڑھی بھی خریدی اور بڑی پیاری لگی۔

سب چیزوں کو بہت سنبھال کر رکھا۔ بچیوں کو چوڑیاں بندے...... کلپ، جوتے۔

مگر نیا خرچا تیار تھا۔ اسکول کھلے تو علی کے نئے جوگرز اسے تنگ ہو چکے تھے۔ صبح صبح تو وہ پیرز بردستی اندر ٹھونس کر چلا گیا۔ (یا وہ صبح صبح ماں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا) ہاں واپسی پر دونوں جوتوں کے تسمے آپس میں باندھے اور جوگرز کے ہار کو گلے میں ڈالے بیگ کمر پر چپکائے کسی فاتح کی طرح گھر لوٹا۔ سیمی دھک سے رہ گئی۔

گلے میں جوتوں کا ہار اور ننگے پیر......

"میں نے سوچا آپ نے بھی تو یہی کرنا ہے تو میں خود کیوں نہیں......" وہ ہار سمیت صوفے پر دراز ہو گیا۔

"اللہ نہ کرے علی کبھی ایسا وقت آئے۔ کتنی غلط حرکت کی تم نے...... اور میں بھلا ایسا کیوں کروں گی؟"

"یہی کیوں مام...... آپ اس جوتے سے میری پٹائی بھی کر سکتی ہیں۔"

"کیوں......" سیمی کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

"یوں کہ......" علی نے ڈرامائی رنگ اختیار کیا۔ "یہ مجھے چھوٹے ہو گئے ہیں۔"

"کیا؟" سیمی چلائی "ڈھائی ہزار کے تھے یہ......"

"جی نہیں......" علی کو غلط بیانی پر دکھ ہوا۔ "چوبیس سو ننانوے روپے کے تھے۔"

"علی!"

"ممی۔"

"اوہ خدا......" سیمی نے سر پکڑا۔

"میرے شوز بھی تنگ ہو گئے ہیں مما......" یہ منمناتی ہچکچاتی آواز سحر کی تھی۔ سیمی نے کرنٹ کھائے انداز سے سر اٹھایا۔ بے چاری بھائی کی طرح ڈرامہ باز نہیں تھی۔ جوتوں سے پیر نکالے تو سیمی کا دل دکھ گیا۔ ذرا سا دبا انگوٹھا اور آخیر کی چھوٹی والی انگلیاں سرخ

پھنسی پھنسی سی......

"اوہ خدا......" سیمی کو ترس آ گیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں ممی......!" عمر نے ماں کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"بھائی کے جوتے سنبھال لیں، اگلے سال میں پہن لوں گا میں ہوں ناں۔" عمر کے پاس ہمیشہ تسلی کے یہی بول ہوتے تھے۔

☆☆☆

صرف کپڑوں جوتوں کی شاپنگ سیمی کا مسئلہ نہیں تھی۔ راشن کی خریداری اس سے بڑا اور ہر مہینے کا درد سر تھا۔ اور عدیل نے یہ ڈیپارٹمنٹ اس کے حوالے کر رکھا تھا۔ وہ کھانے پینے کے معاملے میں نخرے نہیں کرتا تھا۔ بس سادہ مگر تازہ کھانا......

لیکن وہ جو عدیل کی اولاد تھی (سیمی کی بھی......) اصل تگنی کا ناچ وہ بچے نچاتے اور بچوں کو تو وہ ڈانٹ ڈپٹ کر بہلا پھسلا لیتی۔ مگر اپنے دل کا کیا کرتی جو ٹی وی دیکھ کر اشتہارات دیکھ دیکھ کر ہمک ہمک کر چیزوں کی طرف بڑھتا تھا۔

کبھی نام بدلتی کبھی برانڈ...... ایک چیز روکتی ایک خرید لیتی۔ اور جب سے بچوں نے راشن کے نام پر فن کرنے سیمی کے ساتھ جانا شروع کیا تھا۔ بیڑہ ہی غرق ہو گیا۔

بچے ٹرالی میں چیزیں بھرتے جاتے۔ سیمی دوسری جانب سے نکالتی جاتی۔ مگر آخر کتنی...... کیش کاؤنٹر پر بل دیکھتی تب بلبلا جاتی۔

ماہیر کے پیمپرز...... دن میں تین تین بھی لگ جاتے۔ سیمی کو اچھی طرح یاد تھا۔ پندرہ برس پہلے جب وہ علی اور عمر کو پال رہی تھی۔ تب باہر اندر آتے جاتے یا پھر سردیوں کے دنوں میں پیمپرز پہناتی تھی۔ مگر اب پیمپر لباس کا جزو لازمی بن گیا تھا۔

پھر ماہیر کے لیے دودھ کا انتخاب...... ڈبا ہفتہ بھی نہ چلتا۔ بات دودھ سے ٹھوس غذا پر آئی تو سیریلک کے ڈبے...... اور اس میں بھی برانڈ اور چوائس کا ٹنٹنا...... بسکٹ...... و دیگر ایسی چیزیں سیریلک کے ساتھ یہ مصیبت ہوتی کہ ماہیر تو کیا کھاتا۔

باقی کے چاروں بچے بشمول علی...... بھی موقع پا کر سیریلیک منہ میں بھر کے بیٹھ جاتا، ماہیر کے لیے آئے بسکٹ سب ہی کھاتے سوائے ماہیر کے......

ادھر علی نے جہاں اپنے بڑھنے (لمبا چوڑا ہونے) کی رفتار سے سیمی کو پریشان کر رکھا تھا وہیں اس کی حرکتیں بھی مزید تنگ کرنے والی ہو چکی تھیں۔

ہر روز نیا تماشا......

سیمی بچوں کو چائے پلانے کے حق میں نہیں تھی۔ وہ پورے دن میں ایک کپ سے زیادہ نہ دیتی۔ مگر علی کو نیا نیا چائے کا چسکا لگ گیا تھا۔

پہلے ماں سے منتیں کرتا۔ سیمی کے انکار پر خود بنانے کا بیڑہ اٹھا۔ سیمی نے کہا وہ کچن میں تالا ڈال دے گی۔ اور اس نے ڈال بھی دیا۔

علی حیران رہ گیا۔ ماں نہ ہو گئی سوتیلی ماں ہو گئی۔ اُف، چائے پینے کا شوقین عدیل بھی تھا۔ باپ بیٹا ساتھ مل گئے۔ سیمی عدیل کے بھی اتنا زیادہ چائے پینے کے خلاف تھی۔ مگر علی نے یہ چالاکی چلی جب اپنے لیے بناتا باپ کو بصد احترام پیش کرتا۔ اب جب کچن میں تالا تھا۔ عدیل بھی دیکھتا رہ گیا۔

دونوں باپ بیٹا خوب تیار ہوئے۔

"آپ دونوں کہاں...... یوں اچانک۔" سیمی حیران رہ گئی۔

"ثانیہ کے گھر جا رہے ہیں۔" علی نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

"ثانیہ...... یہ کون ہے؟" سیمی کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔

"تم ثانیہ سعید کو نہیں جانتیں۔" عدیل نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"نا...... نہیں...... ہاں اچھا ثانیہ سعید۔ مگر آپ لوگ وہاں کیا کرنے جا رہے ہیں۔" سیمی کو بروقت یاد آیا اور شدید اچنبھے میں گھر کر پوچھا۔

"چائے پینے۔" باپ بیٹا نے ہم آواز ہو کر کہا۔

"چا...... ئے...... پینے......؟" سیمی دھک سے رہ گئی۔

"ہاں ناں...... اتنی بار تو بے چاری نے کہا ہے

جب بھی اچھی چائے پینی ہو ادھر آ جانا میں دروازہ بند نہیں کروں گی۔" عدیل رٹو طوطا ہو گیا۔

"کیا؟" سیمی کی آنکھیں پھیلیں۔

"اس کا گھر معلوم ہے؟"

"ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے مام......"

آنکھیں خلا میں جما کر کشف کی نجانے کون سی منازل طے کر رہا تھا۔

"اللہ! تو کیا اب یہ دونوں باپ بیٹا مل کر مجھے ستائیں گے۔" سیمی خوفزدہ ہو گئی۔ ساتھ ہی اس نے علی کو کالر سے گھسیٹ کر صوفے پر پٹخ دیا۔

"ثانیہ دروازہ بند کرے گی یا نہیں...... مگر میں پھر بھی دروازہ کھولوں گی نہیں، سمجھے۔"

"اوہ مام......" علی واقعی حیران رہ گیا۔ عدیل ہنس پڑا۔ "بے وقوف ہو تم وہ تمہیں چڑاتا ہے اور تم...... ہم تو علی کے دوست کے ابو کو دیکھنے ہاسپٹل جا رہے ہیں۔ ایکسیڈنٹ ہوا ہے ان کا اور تم نے۔"

علی نے کھڑے ہو کر کالر درست کیا، بال سنوارے اور دونوں باپ بیٹا یہ جا وہ جا۔ "اف" سیمی۔ سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ عدیل کی اسمارٹ نیس......

عدیل کا ابھی تک لڑکا...... لڑکا سا دکھائی دینا بھی سیمی کی دکھتی رگ تھی۔ وہ بھی تو پانچ بچوں کا باپ تھا ناں...... مگر یہ پانچ بچے باپ کو چھو کر بھی نہیں گزرتے اور ماں میں کچھ چھوڑتے ہی نہیں جکڑ لیتے ہیں۔

اور اب علی کا دن بہ دن باپ سے بڑھ کے اسمارٹ ہوتے جانا یعنی وہ کس کس محاذ پہ لڑے گی۔

فروٹس کھائیں...... اور ڈرائی فروٹس تو لازمی...... اور کچھ نہ کھائیں تو کھیرا کھائیں، بند گوبھی کا سلاد۔

رمضانوں سے پہلے بند گوبھی غائب ہو جاتی تھی اور ڈھونڈنے پر ڈیڑھ سو روپے کلو اور کھیرا...... آرام سے 80 روپے کلو۔

ایک سلاد کی پلیٹ پر کیا وہ دو سو روپے یومیہ خرچ کر دے؟ پھر ان سب مسائل سے ابھی وہ بے چاری نپٹتی نہیں تھی کہ ملاوٹ کے مسئلے اور ایسے ایسے دل دہلا دینے والے۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والے کہ بس۔

سارے بچے (بشمول سیمی) پکے مسلمان تھے۔

گوشت مرغوب غذا...... گوشت کی خریداری جیب پر تو گراں تھی ہی مگر یہ جواب کتوں بلوں کا گوشت زندہ مردوں کا گوشت...... آخ تھو...... توبہ توبہ......

چلو وہ آج کے بعد اپنی آنکھوں کے سامنے مرغی ذبح کروائے گی۔ دل مطمئن ہوا مگر عمر نے آنکھوں سے دیکھی بتا کر سیمی کو مانو بے ہوش کر دیا۔

"مما مرغی والا ہماری پسند کی مرغی ذبح کر کے ڈرم میں ڈال دیتا ہے ناں تھوڑی ٹھنڈی ہونے کے لیے...... تو جب وہ نکالتا ہے ناں تو وہ...... وہ مرغ نہیں ہوتی جو ہم نے ذبح کروائی ہوتی ہے۔ بلکہ وہ، وہ ہوتی ہے جو پہلے سے مردہ اس نے اندر چھپا رکھی ہوتی ہے۔"

"کیا...... ؟؟؟"

سیمی نے یہ حل نکالا وہ ڈرم کے پاس جا کر کھڑی ہو جاتی، منہ پر رومال رکھ کے اپنی مرغی کو تڑپتا دیکھتی رہتی اور دل مطمئن ہو جاتا اس کی مرغی حلال ہے۔

دوسری طرف پھر ٹی وی...... آئے دن کے چھاپے اور چھاپوں کے دوران ملنے والے گندے اچار اور مربے اور چٹنیاں اور...... اور...... اور......

سیمی بوکھلا کر بڑے بڑے اسٹور کے بڑے بڑے ناموں والے جیم مربے خریدنے لگی۔

اور یہاں بچوں کی بہت چلتی تھی۔

وہ عجیب عجیب ناموں والی پاستا۔ اسپیگھیٹی، نوڈلز اور الم غلم بھر لیتے۔

خود سیمی اور عدیل کو بھی یہ ذائقے بھاتے تھے۔

مگر (یہاں بھی مگر) دس اجزا ملا کر بننے والی یہ چیزیں بہت مہنگی بنتیں اور جتنی بھی زیادہ مقدار میں بنالی جاتیں۔ ایک گھنٹے بعد بچے تو بچے خود سیمی کو بھی بھوک ستانے لگتی۔

"مما روٹی" "مما کھانا تو بنالیں" "مما بھوک لگی ہے۔"

"سیمی، ماش کی دال ساتھ سرکے والی پیاز...... کیسا آئیڈیا ہے۔" عدیل بھی آ جاتے۔

"اگر ماش کی دال سرکے والی پیاز کے ساتھ کھانی تھی تو میرا پانچ سو کا نوٹ، وقت اور محنت کیوں

برباد کروائی۔" وہ چلا اٹھتی اور باقی سب ادھر ادھر ہو جاتے۔ (تاوقتیکہ دسترخوان نہ لگ جاتا)

☆☆☆

"عید کی شاپنگ......" عدیل کی آواز شاک سے بھرپور تھی۔

"صرف شاپنگ نہیں۔ قربانی کے پیسے بھی۔"

سیمی نے دوسرا دھماکا بھی کر دیا۔ عدیل حسب معمول بڑے اطمینان سے لیپ ٹاپ لیے بیٹھا تھا، سیمی کے مخصوص انداز پر چونکا تو ہوا مگر اتنی توجہ نہ دی کیونکہ فی الوقت اس کے خیال میں راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ مگر سیمی نے کہا عید کا خرچا...... عدیل نے خود ہی لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ آج ذرا دو دو ہاتھ کر ہی لے۔

"ابھی تو ہزاروں روپے لگا کر شاپنگ مکمل کی گئی تھی۔" "ہاں عدیل مگر وہ تو چھوٹی عید کی تھی ناں...... سیمی نے رسانیت سے کہا۔" اور میں کون سا زیادہ کچھ کہہ رہی ہوں۔ بس ہم سب کے ایک ایک سوٹ اور شوز وغیرہ......"

"نہیں صرف وغیرہ کیوں...... اس وغیرہ کو بھی کھول کر بیان کرو۔" عدیل کا انداز اک ستم اور میری جاں...... ابھی جاں باقی ہے، کا سا تھا۔

"وغیرہ...... وہی بچیوں کے کچھ بندے وندے اور پرس اور......"

"سیمی! یہ سب ابھی خریدا گیا ہے۔" عدیل نے سنجیدگی اختیار کی۔

"ہاں مگر......"

"تم تو اچھی خاصی سمجھ دار ہو سیمی......!" عدیل نے جملہ ادھورا چھوڑا، مگر بات پوری تھی۔ سیمی نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔

"ہاں ہوں تو مگر......" سیمی کا ادھورا جواب بھی پورا تھا۔

"اچھا آپ کپڑوں کے لیے دے دیں۔ باقی چھوٹی موٹی چیزیں میں دیکھ لوں گی۔" سیمی نے درمیانی راہ اختیار کی۔

"بات تیرے میرے کی نہیں ہے۔ بات زبان کی ہے۔"

سیمی چپ رہی۔

"میرے نزدیک اگر کوئی خرچا اہم ہے۔ بلکہ ناگزیر تو وہ صرف قربانی کا ہے۔ جسے مجھے ہر صورت پورا کرنا ہے باقی کچھ نہیں۔" عدیل نے اعلان کیا۔

سیمی کے لب اب بھی بھنچے رہے۔

"اب بولتی کیوں نہیں ہو۔"

"کیا بولوں...... قربانی تو کرنی ہے ہی مگر......"

"اور ہم کون سا پوری گائے یا بکرا لاتے ہیں۔ ہر بار حصہ ہی تو ڈالتے ہیں۔"

"میں اتنی ہی گنجائش نکال پاتا ہوں، سیمی......" عدیل کا لہجہ مدھم ہو گیا۔

"گائے لانے کا خیال تو اب ایک خواب ہی لگتا ہے۔ بکرا تیس چالیس سے کم آتا نہیں اور پھر اس میں بھی گوشت کی تقسیم کا مسئلہ...... ایک بار لے آیا تھا تو عید کے تیسرے دن ہی تم "کیا پکاؤں کچھ ہے ہی نہیں" کا راگ الاپ رہی تھیں۔

اور پھر جہاں جہاں گوشت بھیجا گیا وہاں سے بھی اعتراض آیا کہ اس سے اچھا تھا دیتے ہی نہیں لہٰذا حصہ ڈالنا بہتر رہتا ہے۔ اور دو حصوں کے لیے بھی پچیس تیس کی رقم تو رکھنا ہی پڑتی ہے۔

"ہاں ٹھیک ہے مگر بچوں کے کپڑے؟" سیمی کا مسئلہ ہنوز تھا۔

"کپڑے دو ڈھائی ہزار کی کہانی نہیں ہیں سیمی! یہ بھی پندرہ بیس کا معاملہ ہے کم از کم۔"

"ہاں دو ڈھائی میں تو ایک بچی کا فراک ہی آپاتا ہے۔" سیمی نے تائید کی۔

"تم گھر میں ہی کچھ بنالو...... کپڑا خرید کر......" عدیل نے حل پیش کیا۔

"کیا گھر میں بنالوں ؟؟؟ گھر میں کپڑے بنانے کا صرف نام سنا ہے جبکہ یہ بڑی دردسری ہے۔ ایک تو چھوٹی بچیوں کے کپڑے کوئی درزی لیتا نہیں اور لے تو پیسے پورے مانگتا ہے۔ پھر سادہ کپڑا لے کر اسے سجانے سنوارنے میں جو پیسے اتنے مہنگے

ہیں، وہ آپ کی سوچ سے پرے ہیں۔
آپا کی نند کی شادی میں ہر دوسری لڑکی نے ٹیل گاؤن پہن رکھے تھے۔ میں نے سوچا اپنی سحر اور عینی کے بھی بنادوں۔ اللہ......" سیمی نے جھرجھری لی" اور بچیاں اف ......" سیمی نے سر پر ہاتھ رکھا۔" وہ مواحورم والا ڈراماد یکھ دیکھ کر ہر وقت ملکہ جیسے کپڑے لینے کی ضد کرتی رہیں۔ میں نے سمجھا دیا، یہ صرف ترکی میں ملتے ہیں۔
اور آپ کی بیٹیاں کہتی ہیں۔ پاپا سے کہیں ترکی جا کر ہمیں بھی یہ سوٹ لادیں اب بتائیے میں کیا کروں۔"
"بچیوں کو قناعت کا سبق کیوں نہیں دیتیں۔"
عدیل بہت دیر بعد بولا۔
"قناعت......" سیمی کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیلی۔
"اسلامیات کے مضمون میں سے قناعت کا سبق تو انہیں یاد ہوا نہیں آج تک ...... میں عملی زندگی میں قناعت کیسے سمجھاؤں......؟"
"ہم اور تم تو ایسے نہیں پلے تھے سیمی......"
عدیل کا انداز بھی بجھا بجھا تھا۔" عید شب برأت پر کپڑے بنتے تھے۔ سال میں ایک بار جوتا ملتا تھا اور وہ بھی ٹوٹ جائے تو موچی کے پاس جاتا تھا۔ اب تو لوگ جوتے کو جڑوانا بھی عیب سمجھتے ہیں۔
میں نے اپنی ماں کو کبھی تمہاری طرح کپڑوں جوتوں کے لیے پریشان نہیں دیکھا اور تم عورتیں جس طرح خریداری کا بجٹ بناتی ہو۔ خواہ وہ راشن کی خریداری ہو یا گرمیوں کے لباس کی تیاری...... ایسے تو ہمارے بچپن میں کسی لڑکی کی شادی کی تیاری کا بھی اہتمام نہیں ہوا کرتا تھا۔
ہماری بہنوں کے کانوں میں سال بھر کی عمر ہی سے سونے کی ننھی بالیاں پہنادی جاتی تھیں اور آج تم لوگ چھ چھ مہینے کی بچیوں کے لیے میچنگ کلپ ڈھونڈتی ہو۔
امی اپنی ہتھیلی میں عید کے دن مہندی گھول کر رنگ لیتیں ویسے ہی ہاتھ اور ناخن بہنوں کے اور تم نے عید پر پندرہ سو روپے کی مہندی لگائی۔"
"آپ سارا الزام مجھ پر لگا رہے ہیں عدیل!"
حرزدہ سی سنتی سیمی آخر کار پھٹ پڑی۔
"او سیمی!" عدیل نے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں۔" اوور ری ایکٹ مت کرو۔ تم پر نہیں تمہاری اس جنریشن پر...... بلکہ ہماری یہ جنریشن۔"
"ایک عید کا جوڑا مانگ لیا اور آپ نے تاریخ جغرافیہ اقدار و روایات کا پورا لیکچر دے دیا۔" سیمی ناراضی کا اظہار تو کر رہی تھی۔ مگر لہجہ دھیما تھا۔
"ہاں عید کا جوڑا۔" عدیل مسکرایا اور پھر جیسے کہیں کھو گیا۔
"چھوٹی عید کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ دو جوڑے تو لازمی بنتے تھے۔ ایک شلوار قمیص ایک پینٹ شرٹ...... ایک بار تین بھی بن گئے تھے۔ اور ایک بار فقط ایک امی عید کے دن پہنانے کے بعد شام میں اتروا تیں دھو دھا کر تھیلیوں میں سلیقے سے بند کر کے رکھ دیتیں۔ اور پھر وہی کپڑے بڑی عید پر دوبارہ پہننا نصیب ہوتے اور اس کے بعد بھی امی سنبھال کر رکھتیں کہ کسی بھی شادی بیاہ یا آنے جانے پر پہنے جائیں اور ان سب چیزوں کو بھی بھگتا لینے کے بعد سوٹ روٹین کا حصہ ایسے بنتا کہ جمعہ کے جمعے ــ ــ نماز کے لیے......" عدیل نے بات ختم کر دی تو سیمی کو اپنی طرف عجیب طرح سے دیکھتے پایا۔
"کیا ہوا ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟؟"
سیمی نے ٹھنڈی سانس بھری۔" آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے عدیل اور میں آپ کی طرف حیرت سے اس لیے دیکھ رہی ہوں کہ آپ یہ کیوں بھول گئے۔ جب آپ ایسا بچپن گزار رہے تھے تو آپ کے گرد و پیش کے لوگ پڑوسی رشتے دار امیر غریب سب اسی نہج اور سوچ کے ساتھ جیتے تھے۔
اب جو میں ان سب چیزوں کو اپنانا چاہوں ناں تو میرا وہ مذاق اڑے کہ بس۔
سب سے پہلے لوگ سوچیں گے۔ ہم فنانشل کرائسس کا شکار ہیں یا عدیل کی نوکری چھوٹ گئی

ہے جو...... سب کے سب پوچھنے آجائیں گے۔
اور سب سے بڑھ کر آپ کے اپنے بچے آپ کا جینا حرام کر دیں گے۔
آپ کی باتیں لاکھ اچھی سہی...... سونے میں تلنے والی...... مگر عدیل کھدائی کے دوران ملنے والا سکہ لاکھ قیمتی سہی ...... مگر وہ نوادرات میں شمار ہوتا ہے۔ بازار جا کر اس سے ماچس کی ڈبی تک خریدی نہیں جاسکتی۔
"یہ کیسی بات کر دی۔" عدیل چونکا سکہ تو کروڑوں مالیت کا ہو کر شوکیس میں سج جاتا ہے۔
"ہاں ناں...... کروڑوں کا ہو کر شوکیس میں سج ہی سکتا ہے۔ بازار میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کا سفر نہیں کر پاتا۔" سیمی اپنی بات پر ڈٹی رہی۔
"اچھا...... یعنی تم عید کے کپڑوں کے نام پر میرا کباڑا کر کے رہو گی۔" اب عدیل اور کتنی بحث کرتا۔
"نہیں ...... مگر کوئی اور راہ بھی تو ہو ناں...... آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔
بقر عید کی واحد اہم چیز قربانی ہے۔ اس پر توجہ دینا چاہیے۔"

☆☆☆

عدیل کی اس دن کی گفتگو نے سیمی پر سوچوں کے نئے در وا کیے تھے۔ ہاں زندگی صرف لباس اور نمود نمائش کا نام تو نہیں ہے۔
بقر عید آ گئی اور بخیر و خوبی گزر بھی گئی۔ عدیل نے حسب خواہش اور (حسب جیب) دو حصے ڈالے۔
سیمی نے اپنی جیب خاص کھولی اور بہت محتاط طریقے سے خرچ کرتے ہوئے بچوں کا ایک ایک سوٹ اور جوتے وغیرہ لیے۔

☆☆☆

عدیل کی بات پر وہ کتنی ہی دیر منہ کھول کر بیٹھی رہی۔ کچھ کہتی مگر کیا...... اور عدیل کے لہجے کا قطعی پن بتاتا تھا۔ جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک ہے اور ویسے ہی ہوگا۔
عدیل کی آپا نے اپنی بیٹی کی شادی نومبر میں رکھی تھی اور سارے ماموؤں نے مل کر فرنیچر دینے کا فیصلہ کیا تھا اور جو رقم عدیل کے حصے میں آئی تھی وہ سیمی کا حلق خشک کر گئی۔
"آپ بھائی جان سے کہیں ہماری رقم کچھ کم کریں۔ آخر ہم اتنی دور سے کرایہ لگا کر جائیں گے تو وہ بھی تو ہم پر بوجھ ہوگا ناں۔"
"ہم بھائی جان سے کچھ نہیں کہیں گے۔ رقم تو اتنی ہی دینی ہوگی جتنی طے ہوئی ہے۔" عدیل نے کہا۔
"ہاں پر...... شاپنگ وغیرہ پنڈی میں تو سردی ہوگی اور......"
"خبردار......" عدیل اچھل ہی پڑا۔
"خبردار جو تم نے شاپنگ کا نام لیا۔ میں شاپنگ کے نام پر تمہیں ایک آنہ نہیں دوں گا اور نہ ہی تمہارے خفیہ خانے سے رقم خرچ ہوگی۔ سمجھ گئیں تم۔"
سیمی گڑبڑائی۔
"مگر سردی......"
"وہ تم جانو اور تمہارا کام......"
"کیا مطلب میں اور میرا کام...... بچے ٹھٹھر کر ہی مر جائیں گے۔"
"دیکھو سیمی...... شاپنگ تو نہیں ہوگی تم کو جانا ہو گا تو چلنا ورنہ میں اکیلا ہی شادی نبٹا کر آجاؤں گا۔"
وہ واقعی اڑ گیا تھا۔
"لیکن عدیل......" (خاندان سے تھوتھو کرواتی ناجا کروہ......)
لیکن ویکن کچھ نہیں...... تمہیں اندازہ ہے یا تم نے کوئی حساب لگایا کہ سال کے آغاز سے اب تک ہم شاپنگ کے نام پر کتنی رقم خرچ کر چکے ہیں۔ جائز ناجائز کی بحث مت کرنا تم ...... یہ رقم لاکھوں میں جاتی ہے سیمی لاکھوں میں......"
"لاکھوں میں......" وہ بری طرح چونکی۔" خواہ مخواہ۔"
"خواہ مخواہ کیوں......" عدیل فائل کھولنے بیٹھا تھا۔" پھر میں گنواؤں تمہیں اور ہماری بچت صفر...... تم تو اچھی خاصی سمجھ دار ہو سیمی پھر بھی...... ستر ہزار تو صرف بچوں کے اسکول نئی کتابوں کلاسوں اور یونی فارم پر لگ گیا۔ فقط مارچ اپریل کے مہینے میں۔"
"تو وہ تو ضروری خرچا ہے ناں......"

"میں ضروری غیر ضروری کی بحث میں نہیں پڑ رہا اس وقت...... صرف یہ بتا رہا ہوں کہ تم یہیں سے گنتی شروع کردو اور پھر چلتی جاؤ۔

فرنیچر کے لیے تو پیسے جائیں گے ہی اور میں اپنی طرف سے بھی آپا کے ہاتھ پر پیسے رکھوں گا اور سلامیاں، لین دین اس کے علاوہ ہوگا۔ یہ بات تم کلیئر کرلو۔"

عدیل بات ختم کر کے کمرے سے نکل گیا۔ اور سیمی پہلے گم صم بیٹھی رہی پھر اس نے کاغذ قلم پکڑ لیا اور ہر مہینے میں روٹین کے راشن اور بل وغیرہ کو نکال کر ہونے والے خرچے لکھنے شروع کردیے۔

پچاس ہزار تو صرف رمضان میں کچن میں خرچ ہوئے تھے۔ عید شاپنگ پر بھی اڑتالیس ہزار خرچ ہو گئے تھے۔ عیدالاضحیٰ پر بہت احتیاط اور سلیقہ مندی بلکہ دل کو مار مار کر کیے جانے والے خرچے پچاس کو چھو رہے تھے۔ اور اب یہ شادی......

سیمی واقعتاً پچھتاوے میں گھر گئی۔ شرمسار بھی ہوگئی، وہ تو خود کو بڑی قانع اور دیکھ بھال کر خرچ کرنے والا سمجھتی تھی اور آس پاس بھی یہی مشہور تھا تو پھر......

اور سب سے بڑھ کر اب ایک بار پھر شادی میں شرکت کے لیے شاپنگ کا ہوّا سر پر کھڑا تھا۔ اسے پتا تھا عدیل نے پریشانی و ناراضی کے عالم میں کہہ تو دیا ہے۔ کہ کچھ بھی خریدا نہیں جائے گا لیکن وہ بھی بخوبی واقف تھا کہ کراچی کے بچے پنڈی کی سردی برداشت کر ہی نہیں سکتے۔ سو ایک بار پھر بازاروں کے چکر......

بچوں کے لیے بیٹھے بٹھائے ہفتہ بھر کی پکنک بن گئی شادی میں شرکت......

پنڈی جا کر سیمی ایک دن شاپنگ کے لیے ضرور رکھتی تھی اور شاپنگ کسی خاص ایونٹ سے نہیں بلکہ پنڈی آنے سے مشروط ہوتی تھی۔ گھریلو دستکاریاں، ہاتھ کی کڑھائی والے خوب صورت لباس...... کشنز اور دیگر ایسی چیزیں اور اس معاملے میں وہ کسی کی نہیں سنتی تھی۔ شاپنگ تو اسے کرنا ہی ہے۔ یہی سوٹ اور کشنز کراچی کی بوتیکس اور مالز میں ہزاروں روپے خرچ کر کے ملتے جبکہ ادھر گھر کی عورتیں ارزاں قیمتوں پر دے دیا کرتی تھیں۔

بہرحال ہفتہ گزرا...... شادی نبٹا کر جیب خالی کر کے یہ سب گھر کو لوٹے اور سیمی سارا راستہ حساب جوڑتی رہی، واقعی خرچے...... فالتو کے خرچے لاکھوں ہی میں تھے۔ اور یہ ایک مڈل کلاس کے گھر کا حال تھا۔ تو باقی تو پھر...... اللہ ہی حافظ۔ سیمی نے سوچا واقعی ضرورت سے پرے درحقیقت پیسے کا زیاں ہی ہوا ناں...... وہ اگلے برس بہت سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھائے گی، باقاعدہ پلاننگ...... بجٹ اور ضرورت کو مدنظر رکھ کر...... اس بار تو جو ہوا سو ہوا مگر...... سارے راستے انگلیوں کی پوروں پر گنتی کر کر کے جب سر پھٹنے اور انگلیاں گھسنے کا گمان ہونے لگا۔ سیمی نے دل کو تسلی دی اور ایک نئے عہد کے ساتھ ہلکی پھلکی ہوگئی۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے اتنے...... بہت سارے پیسے کا خرچ اب صرف اور صرف زیاں محسوس ہو رہا تھا۔

یا شاید یہ انسانی فطرت کا ایک پہلو ہے کہ ہم ہمیشہ بعد میں ہی عہد کرتے ہیں۔ قسم کھاتے ہیں۔ (توڑنے کے لیے...... ہی ہی ہی)

نقصان کے بعد، غلطی کے بعد، پچھتاتے ہوئے۔

اور پتا نہیں وہ عہد پر پورا اتری یا نہیں...... مگر اب کی دفعہ پچھتاوا بہت زیادہ تھا اور حیرت بھی کہ میں بھی یعنی کہ میرے جیسی سلیقہ شعار سمجھ دار عورت ایسی غلطیاں کرسکتی ہے کہ بچت بھی گئی جیب بھی خالی اور اس بار عدیل مقروض بھی ہوگیا تھا۔ اف۔

☆☆☆

دو ماہ بعد......

عدیل لیپ ٹاپ لیے مصروف تھا۔ سیمی نے چائے کا کپ بمعہ کباب ہمراہ پیاری سی مسکراہٹ عدیل کے نزدیک دھری۔ تب کام میں منہمک عدیل چونکا، ساتھ ہی اس کی چھٹی حس نے اسے بروقت خبردار کیا۔ خطرہ...... نہیں خرچا۔

عدیل نے پیر سمیٹ کر نظریں لیپ ٹاپ اسکرین پر گاڑ دیں۔ خود کو بڑا مصروف ظاہر کیا۔ مگر وہ بھی سیمی تھی۔ اس نے اپنی شہادت کی انگلی سے عدیل

کے سر کو گدگدایا۔ پکا منہ کر کے بیٹھے عدیل نے چونک کر دیکھا۔ تب سیمی ایسے مسکرائی کہ عدیل کا دل پسلیوں کی قید میں پھڑپھڑانے لگا۔

اسے یاد آئے دنیا میں جتنے بھی شاعر حضرات گزرے ہیں انہوں نے اسی مسکان پر شعر کہہ کہہ کر ورق کالے کیے ہوں گے۔ مگر وہ کون سے شعر ہیں یہ عدیل کو فی الوقت یاد نہ آیا مگر یہ کنفرم تھا، اسی مسکان پر شاعر سر دھنتے ہیں۔

اور یہ جو آنکھوں سے چھلکتی محبت و لگاوٹ تھی۔ اس پر تو پوری پوری غزلیں کہی گئی تھیں۔ مگر ان میں سے بھی کوئی عدیل کو یاد نہ آئی۔

پھر سب سے بڑھ کر جب سیمی کے لب کھلے اور اس نے کہا۔ "عدیل......" تب عدیل چاروں شانے چت ہوگیا۔

ایسا لگا عدیل کا نام نہیں پکارا گیا۔ منہ سے پھول جھڑے ہوں۔

اوہو...... مگر سجن تو وہ خود تھا اور گھر ہی میں بیٹھا تھا۔ پر یہ جو سامنے بیٹھی سجی تھی۔ واہ...... نہیں آہ...... کیونکہ سجی بولنا شروع کر چکی تھی۔

"امیرن بوا، ہیں جو کمیٹیاں ڈالتی ہیں۔ آج آئی تھیں، کمیٹی کا پوچھنے، دو ہزار سے پچاس ہزار اور اگر دو کمیٹیاں ڈال لی جائیں تو ایک نمبر شروع کا ایک آخر کا یا ضرورت کے وقت ایڈجسٹمنٹ بھی کردیں گی۔"

"اوں ہوں...... ہمیں کسی ایڈجسٹمنٹ کی ضرورت نہیں۔" شعر، غزل، نغمگی، آواز و انداز اور ساز سب کا فسوں ٹوٹ گیا۔ عدیل واپس ایک اصول پسند سمجھ دار شوہر بن گیا۔

"اوہو......" سیمی دھیرے دھیرے سجی سے بیوی بننے لگی۔ "آپ پوری بات تو سنیں۔"

"میں نے سوچا ہے کہ میں بھی دو کمیٹیاں ڈال لوں۔ ایک لے لوں گی مئی کے مہینے میں اور دوسری اگلے برس مئی میں۔" سیمی کا انداز وہ مارا جیسا تھا۔ (وہ کتنی سمجھ دار ہے ناں)

"مئی میں......" خود کو مصروف ظاہر کرتا عدیل چونکا۔ "مئی میں کیا خاص بات ہے؟"

"ایک تو آپ کا دھیان نہ جانے کدھر ہوتا ہے۔ بھئی مئی میں لوں گی تو آرام سے عید کی تیاری کر لوں گی۔ آپ کی ٹینشن بھی ختم اور مجھے بھی رمضان میں بازاروں کے چکر نہیں لگانے پڑیں گے اور یہ احساس بھی نہیں ہوگا کہ عید کا خرچا کیسے کریں۔ مزے سے پچاس ہزار خرچ کریں گے۔"

سیمی کو ابھی سے مزے آ رہے تھے جبکہ عدیل......

"کیا......؟" اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا (یا شاید خود بخود ہاتھ پڑ گیا)

"شاپنگ...... پھر شاپنگ۔" وہ چلاّ اٹھا تھا۔

"شاپنگ نہیں...... کمیٹی عدیل۔" سیمی نے قصداً خود کو دھیما اور پرسکون رکھا۔

"نہیں سیمی! شاپنگ صرف اور صرف شاپنگ...... اوہ میرے اللہ......" اس نے سر ہاتھوں پر گرا لیا اور سیمی اسے تاسف سے دیکھنے لگی۔

یہ مرد بھی ناں کتنے ناشکرے ہوتے ہیں اور عدیل تو خاص طور پر...... اتنی سمجھ دار اور سلیقہ شعار بیوی ملی ہے جو آنے والے وقت کو آسان بنانا چاہتی ہے۔ اور یہ...... اف۔

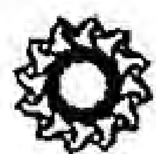
میں تو آپ ہی کی آسانی کے لیے......"

"کوئی آسانی نہیں سیمی...... خرچا صرف اور خرچا آہ......"

وہ شاید بال نوچ لیتا۔ سیمی کھڑی ہوگئی۔ کمیٹی تو اسے ڈالنا ہی تھی۔ ابھی ضروری تھا عدیل کے کان میں بات ڈالنا اور نازک سی سیمی کوئی لوہار تو نہیں تھی کہ ایک زور دار ہتھوڑا برساتی، وہ تو سنار تھی دھیرے دھیرے ضرب لگاتی۔

ہاں پہلے بوا کو فون تو کردے کہ وہ اس کے لیے نمبر رکھ لیں۔

عدیل سے تو بعد میں بھی نبٹا جا سکتا ہے۔ ہے ناں؟؟





مسکان قریشی

عمرہ اور گرہ

مکمل ناول

شام کی ٹھنڈی ہوا' فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی گلی میں کرکٹ کھیلتے بچے' ماؤں کی آواز نظر انداز کرتے ہوئے' آفریدی کی طرح چھکا لگانے کے بجائے صفر پر آؤٹ ہو رہے تھے اور بدلے کے طور پر ایک دوسرے کو کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے فیلڈنگ میں اپنے جوہر دکھا رہے تھے۔ چاچا شکور کی دکان پر گاہکوں کا رش معمول کے مطابق تھا کوئی دال لینے کے لیے بیزاری سمیت محوِ انتظار تھا تو کوئی انڈوں اور چاول کے بھاؤ پر بحث کر رہا تھا۔ چاچا شکور نہایت پھرتی سے گاہک کو فارغ کرتے ہوئے' ریڈیو کی طرف متوجہ ہو رہے تھے جو پورے زور و شور سے خبرنامہ نشر کر رہا تھا۔!!

بہت کچھ ایسا تھا اس وقت گلی میں' جو اس کے ذہن کے دریچے میں خوب صورت سی دستک دینے کا منتظر

تھا لیکن وہ اس منظر سے بے نیاز، صحن میں لگے پیپل کو فرصت سے تک رہی تھی جس کی شاخیں، چھت کے شانے سے لگی سرگوشیوں میں مصروف تھیں۔ پیپل کی ایک مضبوط ٹہنی سے لپٹے "انرجی سیور" کی روشنی پوری چھت کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئی تھی، کچھ روشنی کی لکیریں، ہوا کی سرسراہٹ پر، اپنی جگہ چھوڑ دیتیں تو زمین پر شاخوں کے سائے خوشی سے جھوم جھوم جاتے۔ وہ چھت پر صرف اپنا دھیان بٹانے آئی تھی لیکن یکدم ہوا کے دوش پہ صحن سے امی کی فکر سے لبریز آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"ثمرہ! میری برداشت کا امتحان مت لو۔ کہاں سے پورے کروں میں تمہارے شوق۔ سارے حالات تمہارے سامنے ہیں، باپ ریٹائرڈ ہے تمہارا۔ بھائی ابھی کسی قابل نہیں، جو دو روپے ہتھیلی پر دھر سکے۔ ایک لے دے کے مارکیٹ میں کپڑے کی دکان ہے جو آئے دن کے ہنگاموں کی وجہ سے نہ ہونے کے برابر ہے اور تم..... اچھی طرح جانتی ہو کہ گھر کے سارے خرچے نمرہ کی تنخواہ سے پورے ہو رہے ہیں تو پھر میں کہاں تک۔" اس سے پہلے کہ امی نمرہ کی مزید تعریف کرتیں وہ بات کاٹ کر خاصے تیکھے لہجے میں بولی۔

"امی! خدا کے لیے اب "نمرہ نامہ" سنانے نہ لگ جایئے گا۔" وہ اکھڑ لہجے میں دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔

"میں ذرا اپنی کوئی ضرورت بتا دوں تو آپ کو فرمائش لگنے لگتی ہے۔ میں ذرا سا اصرار کروں تو آپ کو ساری مجبوریاں یاد آجاتی ہیں۔ اب بھی پورا ایک سال ہو گیا ہے مجھے دو یونیفارم میں گزارہ کرتے ہوئے لیکن آپ کو ذرا خیال نہیں۔ جوتے بھی نجانے کون سی نسل کے آپ لائی ہیں جو سال گزرنے کے بعد بھی ڈھیٹ بنے میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ کلپ، ہیئر بینڈ میں استعمال نہیں کر سکتی کہ میرے جیسے لمبے بال شاید دنیا میں کسی کے نہیں ہوں گے اس لیے پراندے سے نجات ناممکن ہے۔" اس نے مبالغہ آرائی کی حد کرتے ہوئے کہا۔

"اور اب... اب جو میں نے آپ سے ایک سوٹ لینے کا کہہ دیا ہے تو آپ کو نجانے کس کس کی قربانیاں یاد آگئی ہیں۔" وہ تیز لہجے میں پاؤں سے زمین کو کھرچتے ہوئے عجب خود سری سے بولی۔

"جب کہ پچھلے مہینے ہی آپ نے نمرہ آپی کو نیا سوٹ لے کر دیا تھا۔ اس وقت گھر کا بجٹ نہیں ڈاؤن ہوا یا پھر آپ کی یادداشت سے نکل گیا ہے۔" ثمرہ کی بدگمانی پر امی اپنی جگہ تاسف میں گھر گئیں پھر دبے دبے غصے بھرے لہجے میں بولیں۔

"میری یادداشت کی بات تم رہنے دو۔ تم ہر مہینے نیا سوٹ لڑ جھگڑ کر بنواتی ہو پھر بھی تمہارے گلے شکوے ختم نہیں ہوتے جبکہ وہ کبھی فرمائش نہیں کرتی....." امی اپنی ضدی بیٹی کے تیور دیکھنے لگیں۔

"اسے پتا جو ہے کہ آپ بغیر کہے اس کی ضرورت پوری کر دیں گی۔" ثمرہ نے نہ جانے کس خیال کے تحت "فرمائش" کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کیا کہ زندگی نے شاید ہی اسے کبھی فرمائش کرنے کا موقع دیا ہو۔

"اور منتوں کے لیے مجھے چھوڑا ہوا ہے۔" ثمرہ نے امی کی بات کے جواب میں کھٹ سے کہا تو وہ فقط ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھنے لگیں۔ غصے کی شدید لہر ان کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔

"تو نہ کرو منتیں، کسی نے تمہارے آگے ہاتھ تھوڑی جوڑے ہیں۔" امی کی بات پر ثمرہ کی آنکھوں میں چمک سی بھر گئی اور اس دفعہ ثمرہ کا لہجہ نظرانداز کیے جانے والا نہ تھا۔

"بس تو پھر مجھے اجازت دے دیں....."

"کس چیز کی.....؟" امی اپنی جگہ یک دم چونکیں کیونکہ ثمرہ کے لہجے میں غیر معمولی جوش نمایاں تھا کہ جیسے ساری گفتگو کا کھڑاگ اسی مقصد کے لیے کیا گیا ہو۔

"جاب کرنے کی....." وہ منتظر نگاہوں سے امی کو دیکھنے لگی۔ وہ قطعیت سے بولیں۔

"میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"کیوں.....؟" ثمرہ تنک کر بولی اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ کیا کر بیٹھے۔

"کیونکہ تمہارے ابو تمہارا گھر سے باہر نکلنا پسند نہیں کریں گے ہم صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔" امی نے اس دفعہ رسانیت سے سمجھایا تو وہ اپنی جگہ بھڑک اٹھی۔

"یہ ابو کی پسند میرے معاملے میں ہی کیوں ایسی ہے۔ نمرہ آپی کو تو کچھ نہیں کہتے۔ جو جاب بھی کرتی ہیں۔ ہوم ٹیوشن بھی پڑھاتی ہیں اور الگ سے گھر میں بھی بچوں کی فوج لگا رکھی ہے۔"

"فضول بحث مت کرو مجھ سے۔" امی نے بے زاری سے زچ ہو کر کہا۔

اچانک ہی ٹھنڈی ہوا کا تیز جھونکا آیا اس نے پھر سے اپنا ذہن رونق میں گم کرنے کا سوچا تو نظریں خود بخود کچھ فاصلے پر رواں دواں ٹریفک پر تھم سی گئی اب کی دفعہ پیپل کی جانب اس کی پشت تھی۔ فٹ پاتھ پر چلتے لوگ اسے ہمیشہ کی طرح خوش باش اور مطمئن لگے، جبکہ نیون سائن بورڈ کی لائٹیں اسے اپنی طرح لگیں، جو جلتی بجھتی امیدوں کے ساتھ اپنے کام میں مگن تھیں۔ اچانک ہوا کے دوش نے انگڑائی لی اور اس کی توجہ نیچے سے آنے والی آواز کے سنگ باندھ دی۔

"امی! مجھے فیس دے دیں، کل آخری ڈیٹ ہے۔" بلال نے پریشانی سے کہا تو امی نے ابو کی طرف دیکھا جو یقیناً "ابھی باہر سے آئے تھے اور جب سے اپنی سوچوں میں مگن، بائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے سے اپنے سر کو آہستہ آہستہ مساج کے انداز میں مسل رہے تھے۔

"بلال! اپنے سر سے کہو۔ ابھی کچھ دن ٹھہر جائیں ذرا یہ ہڑتالیں ختم ہوں تو تمہارے ابو کچھ کریں۔" امی نے نہایت بے بسی کے ساتھ شوہر پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا تو وہ شدید بیزاری میں گھر کر بولا۔

"اور کتنے دن ٹھہر جاؤں.....؟"

"بس تھوڑے دن....." امی کو خود معلوم نہیں تھا اس لیے اسے تسلی دینے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی مایوسی میں گھرنے سے بچایا۔

"مجھے نہیں پتا! آپ یا تو فیس دیں۔ یا پھر میں پڑھائی چھوڑ دیتا ہوں۔" بلال کی غصے بھری آواز میں آر یا پار کی کیفیت نمایاں تھی

ثمرہ جو توجہ کا ہاتھ تھامے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ یکدم اپنے اندر ڈھیروں تھکن اترتے ہوئے محسوس ہونے لگی اور پھر نہایت خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف لگی کہ توجہ کا سرا ایک دفعہ پھر امی کی باتوں میں الجھ گیا۔

"آپا بھی تاریخ لینے آرہی ہیں۔ آخر منگنی کو دو سال ہو گئے ہیں کہہ رہی تھیں کہ یوسف بھی اچھی پوسٹ پر لگ گیا ہے تو پھر اب نمرہ کی رخصتی کی تیاری....." امی کی بات کو ابو کے قطعیت بھرے جملے نے کاٹ کر رکھ دیا۔

"ابھی آپا کو منع کر دو۔" ابو جی کی بات پر کمرے میں داخل ہوتی نمرہ کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ ثمرہ نے بہت غور سے نمرہ کا فق چہرہ دیکھا اور غصے سے منہ پھیر لیا۔

نفرت تھی اسے، ایسے لوگوں سے جو سارے حق رکھتے ہوئے بھی بڑی آسانی کے ساتھ اپنے حق سے دستبردار ہو جاتے تھے۔

☼ ☼ ☼

صبح ہمیشہ کی طرح شور و غل سے بھرپور تھی۔ سڑک پر ٹریفک سے زیادہ پیدل چلتے لوگوں کا رش تھا۔ فٹ پاتھ کے سینے پر قدم دھرتے، اسکول جانے والے بچے، ایک دوسرے کو بیگ سمیت دھکیلتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس رہے تھے اپنی شرارتی آنکھوں سے ایک دوسرے کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے، ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہے لگا رہے تھے۔ خواتین اپنے بچوں سے فارغ ہو کر اب شوہر حضرات کی شکایتیں پڑوسن سے کرتے ہوئے

اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھیں، دکانوں پر بڑھتا رش گاہکوں کی بھیڑ نمایاں کر رہا تھا تو خیز عمر کے دور میں داخل ہوتی، کالج جاتی لڑکیاں، پڑھائی کی فکر میں دبلی ہوتی اپنے گروپ کے سنگ سبج سبج قدم اٹھاتی اپنے اپنے ٹیسٹ کی تیاری کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ ہر کوئی کسی نہ کسی فکر میں مبتلا تھا۔ کم از کم اسے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

آفس میں کام کرتے کرتے یکدم اس کے ہاتھوں کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ توجہ کی پرواز ایک دفعہ پھر اپنا رخ بدل گئی تھی۔

"سچ نمرہ! جیسے ہی میری جاب پکی ہوئی۔ میں تمہاری ساری فکریں سمیٹ لوں گا۔ بس تم میرا ساتھ نہ چھوڑنا۔ زندگی کے کسی بھی موڑ پر' وعدہ کرو۔" یوسف نے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے اپنی کشادہ ہتھیلی پھیلائی تو اس نے جھجک کر اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کی مضبوط و توانا گرفت میں دے دیا۔ وہ کھل کر مسکرا دیا۔

وہ بند پلکوں سمیت' کرسی کی پشت سے سر ٹکائے' اپنے آپ میں مگن مسکرا رہی تھی کہ کسی نے انگلیوں کی پشت سے ٹیبل کو بجایا۔ وہ پٹ سے آنکھیں کھول کر اپنی جگہ گڑبڑائی' سامنے ہی باس فرصت سے اس کی مصروفیت کا جائزہ لے رہے تھے۔

"میرے خیال سے یہ نہ تو بریک ٹائم ہے اور نہ ہی اوور ٹائم۔" انہوں نے سوالیہ انداز میں کہا' لبوں پہ دبی دبی بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔

"دلیں سر۔" اس نے سنبھل کر جواب دیا۔

"تو پھر اس لاپروائی کو کیا سمجھوں....؟" سر کی گہری نظروں نے اسے اندر تک خائف کر دیا چنانچہ وہ جلدی سے خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"سوری سر! آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔"

"بے شک ہو۔ لیکن صرف میرے حوالے سے۔" وہ قطعیت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اپنے آفس کی طرف بڑھ گئے جبکہ وہ اپنی جگہ سن ہو گئی۔

کچھ دیر گزری ہو گی کہ ارم اس کے پاس چلی آئی وہ ابھی بھی گم صم کیفیت میں تھی۔ ارم اور نمرہ دونوں نے ایک ساتھ جوائن کیا تھا پھر بہت اچھی کولیگ ہونے کے ناتے آپس میں گہری دوستی تھی۔

"خیریت....؟ یہ رنگ کیوں اڑا ہوا ہے۔" ارم نے اس کی زرد پڑتی رنگت بغور دیکھتے ہوئے کہا تو وہ فوراً اپنے حواسوں میں لوٹ آئی پھر سنبھل کر بولی۔

"نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔"

"اچھا...." ارم جانچتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں بس! گھر میں کچھ مسئلے زیر بحث آئے ہوئے ہیں۔" وہ اس کی نظروں سے گھبرا کر موضوع بدل گئی تو ارم کو شرارت سوجھی۔

"ان مسئلوں میں کہیں ایک مسئلہ یوسف کا تو نہیں؟"

اس کی بات پر وہ بری طرح جھینپ گئی تو ارم قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر معصومیت اور سادگی کا ایسا دلنشیں عکس ابھرا کہ ایک لمحے کو ارم بھی پلکیں جھپکنا بھول گئی۔

"اچھا! اب جلدی سے ساری بات سچ سچ بتا دو بغیر سنسر کیے کیونکہ میں نے سر احمر کو ابھی یہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔" ارم کی بات پر وہ چپ سی ہو گئی پھر آہستہ آہستہ ساری بات بتا دی تو ارم ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

"کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ....؟" ارم پر سوچ انداز میں گویا ہوئی۔

"جب سے آئے ہیں۔" وہ اپنی جگہ جھجکی۔

"اف نمرہ! تم مجھے اب بتا رہی ہو۔" ارم نے غصے سے آنکھیں دکھائیں تو وہ اسے اپنے لیے پریشان دیکھ کر ہولے سے مسکرا دی۔

"تم بھی تو اب پوچھ رہی ہو۔"

"گھر میں کسی سے ذکر کیا؟" ارم نے اس کا جواب نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا تو وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔

"ہاں امی سے ذکر کیا تھا۔"

"پھر...." ارم نے بے تابی سے پوچھا۔

"پھر یہ کہ ابھی میں جاب چھوڑنا افورڈ نہیں کر سکتی۔"

"چاہے کوئی بڑا نقصان ہو جائے۔" ارم تیز لہجے میں بولی تو اس نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔

"پھر اب کیا کیا جائے۔" ارم جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"تم ایسا کرو۔ یوسف سے بات کرو۔" ارم نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

(ابھی آپا کو منع کر دو۔) ارم کی بات پر جیسے کسی جملے نے دستک دی تو وہ نا چاہتے ہوئے بھی تیز لہجے میں بولی۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ وہ کیا کرے گا۔ ہڑتالیں ختم کر دے گا۔ نمرہ کو جاب دلا دے گا۔ بلال کی فیس ادا کر دے گا یا پھر سر احمر کی آنکھیں نکال دے گا۔"

"اچھا.... اچھا زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ارم اس کے لہجے پر گھبرا کر نرمی سے بولی "فی الحال سکون سے جاؤ ٹیوشن پڑھانے۔ شام کو اگر فرصت ملی تو چکر لگاؤں گی ورنہ پھر کل آفس میں ملاقات ہو گی۔" نمرہ' ارم کی بات پر اپنی پیشانی بری طرح مسلتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئی پھر ارم کے جاتے ہی ایک دفعہ پھر ساری توجہ کو کام پر لگانے لگی۔

چھٹی ہوتے ہی وہ نازیہ آنٹی کی طرف چلی آئی جہاں وہ ان کے بیٹے کو ہوم ٹیوشن پڑھاتی تھی جیسے ہی وہ نازیہ آنٹی کی طرف پہنچی انہیں پہلے سے اپنا منتظر پایا۔

"آج ذرا حماد کی طبیعت خراب ہے۔ تم کل آجانا۔" آنٹی پریشانی سے ہاتھ مسلتے ہوئے بولیں تو وہ گھبرا گئی۔

"خیریت ہے!"

"ہاں! بس بخار ہے۔" نجانے اسے کیوں لگا کہ جیسے وہ اصل بات چھپا رہی ہوں' کریدنا اسے مناسب نہ لگا اس لیے خدا حافظ کہتی ہوئی واپس آگئی۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئی۔ رنگ برنگے کپڑے ہوا کے دوش پر لہراتے نظر آئے۔ یقیناً" امی نے مشین لگائی ہوئی تھی۔ نمرہ نے تیزی سے کپڑے بدلے اور کچن میں آگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے لیے کھانے کو کچھ نکالتی باہر سے امی نے آواز دے ڈالی وہ تیزی سے باہر آ گئی۔

"کیا ہوا؟ آج جلدی آگئیں؟" امی نے مشین کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ہاں بس! حماد کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" وہ فکر مندی سے بولتے ہوئے امی کو ہمیشہ کی طرح پیاری لگی۔

"آپ اب آرام کریں جب تک ٹیوشن والے بچے آجائیں گے تب تک میں مشین سے فارغ ہو جاؤں گی۔"

"تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔ میں یہ کر لوں گی۔" امی نے ایک نظر میلے کچیلے کپڑوں کے ڈھیر پر ڈالی اور پر شفقت لہجے میں بولیں۔

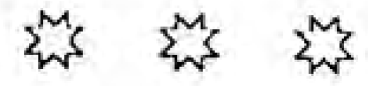
"امی! پلیز آپ تھک گئی ہوں گی۔" امی کے فکر مند لہجے پر وہ نہال ہو گئی پھر التجائیہ لہجے میں بولی تو امی اپنی صابر شاکر بیٹی کی محبت پر مسکرا دیں پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں رسانیت سے بولیں۔

"بیٹا! بندے کو تھکن اس وقت زیادہ ہوتی ہے جب اس کے پاس وقت وافر مقدار میں ہو لیکن کوئی کام نہ ہو۔ جسمانی تھکن سے زیادہ انسان کو ذہنی تھکن نڈھال کر دیتی ہے۔" امی کی بات پر اس کی آنکھوں میں تحیر سا امنڈ آیا جبکہ وہ مبہم سا مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"اور پھر یہ فکریں' پریشانیاں' تھکن' بیزاری وغیرہ کا اصل سبب ہی یہی ہے کہ ہم خود کو ذہنی طور پر باور کرواتے رہیں کہ ہم پریشان ہیں۔" وہ ایک لحظے کو رکیں۔ "بیٹا جی! پریشان تو اس دنیا میں ہر شخص ہے اب چاہے وہ بچہ ہو' بڑا ہو' جوان ہو' بوڑھا ہو یا پھر کوئی بھی.... پریشانی ہر کسی کی ذات سے ایک نومولود بچے کی طرح چمٹی ہوئی ہے۔ اب یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ کس

طرح اس کی پرورش کرتا ہے اگر وہ روتا ہے تو اس کے ساتھ روتا ہے یا پھر اسے چپ کرانے کا وسیلہ کرتا ہے۔

اور پھر جب ہمیں معلوم ہے کہ یہ زندگی کا لازمی جزو ہیں تو پھر کیوں ہم فضول سوچوں میں اپنا وقت گنوائیں۔ کیا یہ اچھا نہیں کہ ہم چھوٹی چھوٹی پریشانیوں کو نظرانداز کر کے کسی کے لیے خوشی کا سبب بن جائیں۔" امی نے رسانیت سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ نم آنکھوں سے مسکرادی۔



ابو کی سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کا سارا پیسہ گھر بنانے میں لگ گیا تھا۔ اسی طرح کہیں سے لے دے کے اور کچھ بچت کرتے ہوئے مارکیٹ میں کپڑے کی دکان کرائے پر لے لی تھی اور پھر پنشن کا بھی کافی سہارا تھا۔ نمرہ نے اکنامکس میں ایم اے کرنے کے بعد ابو کے توسط سے نوکری کرلی تھی۔ پھر ہوم ٹیوشن بھی اس کی محدود ضرورتوں کے لیے کافی تھی۔ لیکن بڑھتے مسائل اسے ہر وقت متحرک رکھنے میں اکساتے رہتے تھے۔ اپنی پڑھائی کے دوران ہی وہ گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگ گئی تھی۔ اس کے پڑھانے کا انداز بھی اتنا دلچسپ تھا کہ بچوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور سب سے اہم بات اسے مصروف رہنے میں مزا آتا تھا۔

نمرہ کے بعد ثمرہ تھی جو ہر چیز اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی تھی۔ یعنی نمرہ کے بالکل الٹ۔ بلکہ اس کا نام ثمرہ کے بجائے آرزو یا خواہش ہوتا تو زیادہ ٹھیک رہتا کیونکہ وہ زندگی میں ہر لحاظ سے بہت آگے جانا چاہتی تھی' جہاں اس کی ہر خواہش بغیر کسی روک ٹوک کے آنکھ کے اشارے پر پوری کردی جائے۔ وہ اپنی نا آسودہ خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر حد تک جانے کے لیے تیار تھی لیکن امی کی تربیت' ابو کا خوف اسے اپنے جامے میں رہنے پر مجبور کردیتا تھا۔ بی ایس سی کے بعد وہ ایم ایس کر رہی تھی اور اندر ہی اندر کسی اچھی سی نوکری کی تلاش میں لگی ہوئی تھی۔ ثمرہ کے بعد بلال تھا۔ بظاہر شوخ اور کھلنڈرا سا۔ لیکن اندر سے بہت زیادہ حساس۔ اسے امی ابو اور نمرہ کی محنت کا بھی احساس تھا اور ثمو کی خواہشات کا احترام بھی۔ لیکن وہ اپنی پڑھائی کے اوقات سے صرف اتنا ہی وقت نکال پاتا تھا کہ شام میں ابو کے ساتھ دکان پر بیٹھ سکے۔ کیونکہ میڈیکل کی پڑھائی سے زیادہ اس کے اخراجات نے اس کی راتوں کی نیند اڑائی ہوئی تھی۔ امی مکمل طور پر ایک گھریلو خاتون تھیں کتنا ہی کفایت شعاری سے کام لیتیں بڑھتی خواہشات' ضرورتوں سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھیں اب دو بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے کے لیے پائی پائی جوڑ کر جہیز تیار کرنے کی فکر میں مبتلا تھیں نمرہ کی بات دو سال پہلے اپنے اکلوتے خالہ زاد یوسف سے طے تھی۔ ابو نجانے کیوں اس رشتے سے اکھڑے اکھڑے سے رہتے تھے۔ ثمرہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا حق وصول کرنے کی نیت سے ددھیال کے قریب رہی تھی۔ اسے یہ بات آسانی سے ہضم نہیں ہوتی تھی ابو نے کبھی اپنے بھائیوں سے جائداد میں حصہ مانگنے کی ضرورت محسوس نہیں کی' جبکہ حالات بھی پریشان کن تھے اپنے تایا اور چچا کو عیش کرتے دیکھ کر اسے غش آتے تھے۔ اس لیے وہ جان بوجھ کر ددھیال میں اپنا قیام زیادہ رکھتی۔ پیچھے چاہے ابو غصے ہوں یا امی ڈانٹ پھٹکار کریں' وہ کم ہی خاطر میں لاتی تھی۔ خالہ کی مغرور طبیعت کی وجہ سے وہ انہیں کم ہی لفٹ کراتی تھی۔ البتہ بلال اس کے برعکس ددھیال اور ننھیال دونوں میں پسند کیا جاتا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ باادب بھی تھا اور بامروّت بھی۔



کپڑے دھونے سے فارغ ہونے کے بعد وہ صحن میں بچوں کے پاس آگئی جو چٹائی پر بیٹھے نہایت اطمینان سے باری باری اپنا کام نمرہ کو چیک کرانے لگے۔ وہ انتہائی انہماک سے بچوں میں مصروف تھی کہ زرینہ خالہ کی بیٹی سمیرا آگئی۔ اس کے ہاتھ میں کافی تعداد میں

پریکٹیکل کی کاپیاں تھیں وہ بلند آواز میں سلام کرتی تیزی سے نمرہ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ایک منٹ سمیرا! تم تھوڑی دیر رکو۔ میں ان سے فارغ ہو کر تم سے بات کرتی ہوں۔" نمرہ نے ذرا کی ذرا توجہ سے نوازا اور پھر سے بچوں میں لگ گئی۔ تو سمیرا کاپیاں وہیں کرسی پہ رکھ کر کچن میں امی کی طرف آگئی جو شام کے لیے سالن بنا رہی تھیں۔ کافی دیر تک ان کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی جو معمول کی تھیں اور نمرہ کی محنت اور تعریف و ستائش سے بھری ہوئی تھیں۔

"اچھا خالہ! میں نمرہ آپی کو دیکھوں۔ فارغ ہوگئیں تو میں انہیں کاپیوں کے بارے میں بتاؤں۔"

"کتنے مہینے تک کاپیوں کا سیزن رہے گا۔" وہ کچھ فکرمندی سے بولیں تو سمیرا ہنس کر بولی۔

"بے فکر رہیں۔ جب تک پیپرز نہیں ہو جاتے تب تک کام ہی کام۔ نمرہ آپی کی اسپیڈ اور ڈرائنگ دونوں کمال کی ہیں' اس لیے میں نے سب سے ہی کاپیاں لے لی ہیں۔ جو کلاس فیلوز رہ گئی ہیں۔ ان کی بعد میں لے آؤں گی۔ اس کے علاوہ نبیلہ آپی کی طرف بھی کافی مال آیا ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے بھی کاپیاں دے دیں۔ اچھا اب میں چلتی ہوں عشا کی اذانیں ہونے والی ہیں۔" سمیرا نے تفصیل سے امی کو آگاہ کیا اور پھر باہر صحن میں آگئی جہاں اب دو تین ہی بچے رہ گئے تھے۔

"نمرہ آپی! یہ کاپیاں میں اگلے ہفتے لے جاؤں گی۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو کسی بچے کے ہاتھ مجھے بلوا لیجیے گا۔ اور ہاں۔" وہ جاتے جاتے رکی "اس میں ایک سیمپل بھی ہے جس کے لحاظ سے آپ نے کاپیاں بنانی ہیں۔" سمیرا نے تیزی سے اسے بتایا تو وہ تشکر سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ابھی رکو' کھانا کھا کر چلی جانا۔"

"نہ بھئی! میں آپ کی طرح پھرتیلی نہیں ہوں۔ مجھے تو ابھی روٹی بھی بنانا ہے اور کھانا کھلا کر کچن بھی سمیٹنا ہے۔ کیونکہ بوا گاؤں گئی ہوئی ہیں۔"

پھر سمیرا کے جاتے ہی اس نے باقی ماندہ بچوں کو چھٹی دی اور کچن میں آگئی جہاں امی اب روٹی بنانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اتنے میں باہر سے ابو اور ثمرہ کی آوازیں آنے لگیں۔

"امی! ابو آگئے ہیں آپ ان کے پاس جا کر بیٹھیں یہ روٹی میں بنا لیتی ہوں۔" نمرہ ان کی تھکن کے خیال سے بولی تو وہ بے ساختہ اس کی پیشانی چوم کر بولیں۔

"بیٹا! تم بھی تھک گئی ہوگی۔ میں ثمرہ کو کہہ دیتی ہوں۔"

"نہیں رہنے دیں۔ ابھی تو وہ آئی ہے۔ پھر اس نے پڑھنا بھی ہوگا۔ کافی ٹائم لگ جائے گا۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔" نمرہ نے نرمی سے کہا۔ تھکن تو اس کی فقط ایک محبت بھرے لمس سے ختم ہوگئی تھی۔

امی کے جاتے ہی اس نے روٹیاں پکا کر ہاٹ پاٹ میں رکھیں۔ پھر صبح کے لیے آٹا گوندھ کر کچن کا پھیلاوا سمیٹنے لگی۔ ابھی وہ دوپٹے سے منہ خشک کرتے ہوئے باہر صحن میں ہی پہنچی تھی کہ بلال کے ساتھ حیدر آتا دکھائی دیا۔ بے ساختہ ہی وہ ہونٹ بھینچ کر صحن میں پھیلی اپنی کتابیں اور بچوں کے ٹیسٹ کی کاپیاں سمیٹنے لگی۔ ہاتھوں کی تیزی سے عجلت اور اندرونی جھنجلاہٹ نمایاں ہو رہی تھی۔

"السلام علیکم۔" حیدر نے بلال کے بعد بلند آواز میں سلام کیا تو ثمرہ کے ساتھ امی بھی اپنے کمرے سے باہر آگئیں۔

"کیسی ہیں چچی جان آپ۔۔۔؟" حیدر کے لہجے میں ہمیشہ کی طرح احترام اور عزت تھا۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹا! تم سناؤ گھر میں سب خیریت ہے۔ کافی دنوں بعد چکر لگایا۔" امی نے حیدر کے جھکے سر پر پیار کرتے ہوئے پوچھا۔ تو وہ سر اثبات میں ہلا کر بولا۔

"آپ کو پتا تو ہے کہ ابھی کچھ دن پہلے ہی میرا ایم بی اے کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا۔" امی اسے صحن میں رکھی

کرسیوں کی طرف لے آئیں۔ پھر جب ثمرہ' بلال اور امی اس کے اردگرد بیٹھ گئے تو وہ نہایت ادب سے اپنے نہ آنے کی مصروفیت بتانے لگا۔

"بس بابا جانی کو میری آزادی پسند نہ آئی اور آفس جانے کی ڈیوٹی لگادی۔ آج ذرا آفس ورک کچھ کم تھا تو آپ بہت یاد آئیں' اس لیے اس طرف آگیا۔" حیدر نے آخری جملہ کہتے ہوئے بطور خاص اسے دیکھا جو اب اندر جانے کے لیے پر تول رہی تھی کہ اس نے مخاطب کر ہی لیا۔

"تم کیسی ہو نمرہ!" الفاظ عام تھے لیکن لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ نمرہ نے ٹھٹک کر اسے دیکھا پھر لٹھ مارنے والے انداز میں بولی۔

"ٹھیک ہوں۔" امی نے بغور نمرہ کا چہرہ دیکھا جو کڑے ضبط میں گھری تھی۔ باپ کی طرح' وہ بھی ددھیال سے وابستہ برے سلوک کو بھولی نہیں تھی۔

"اور تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے؟" وہ اس کے لہجے کی بے زاری کو خاطر میں لائے بغیر بولا تو وہ جز بز ہو کر بولی۔

"ٹھیک جا رہی ہے۔" اس سے پہلے کہ حیدر' نمرہ کے ضبط کو مزید آزماتا امی نے دخل دینا مناسب سمجھا۔

"چلو نمرہ! بھائی کے لیے کھانا لگاؤ اور اپنے ابو سے کہو کہ کھانے کے لیے آجائیں۔" کوئی اور وقت ہوتا تو شاید نمرہ چلی بھی جاتی لیکن حیدر کے آتے ہی وہ کسی کام کو خاطر میں نہیں لاتی تھی اس لیے بغیر لحاظ کیے بولی۔

"امی! نمرہ آپی سے کہہ دیں۔ مجھے حیدر سے ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں۔ اتنے دن بعد تو آئے ہیں یہ۔" امی کو ثمرہ کی بے وقت کی ضد پر تاؤ آگیا۔ بلال اور حیدر اس دوران خاموش ہی رہے۔

"تمہیں معلوم ہے نا! وہ صبح سے لگی ہوئی ہے۔" اس سے پہلے کہ امی اسے دن بھر کی تھکن کا احساس دلاتیں وہ امی کی بات کاٹ کر بولی۔

"آپ سب لوگ اندر چلیں۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔" امی نے فہمائشی نظروں سے ثمرہ کو دیکھا جو نمرہ کے جواب دینے پر' بڑے مزے سے بلال کو اپنی باتوں میں شامل کیے' حیدر کو اپنی کالج کی روداد سنا رہی تھی۔

حیدر نے ایک نظر چچی جان پر ڈالی اور پھر کچن تک نمرہ کو جاتے دیکھا اور مبہم مسکراہٹ سمیت ثمرہ کی بے وقت کی راگنی سننے لگا۔ اس دوران ابو حیدر کے سلام کا جواب دے کر' بغیر کھانا کھائے اپنے دوست کی طرف چلے گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

رات کا آخری پہر' چھپتے چھپاتے چاند کے پہلو میں ٹکا ہوا تھا۔ سڑک پہ گزرتی بے نام سی ٹریفک تھی۔ درختوں کے جھنڈ ہوا سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے اردگرد سے لاپرواہ نظر آرہے تھے۔ چاروں جانب ہو کا عالم تھا۔

کھڑکی سے آتی اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں نمرہ تیزی سے پریکٹیکل کی کاپی پر ڈایاگرام بنا رہی تھی کہ ثمرہ نے کروٹ بدلتے ہوئے اسے ٹوکا۔

"اب بس بھی کرو ثمرہ۔" دل میں آتا تو وہ اسے ادب سے مخاطب کرتی ورنہ ہمیشہ بہت دوستانہ لہجے میں اسے ٹوکتی رہتی۔ لہجے میں اکثر دوستی کا عنصر مفقود ہی ہوتا۔

"بس تھوڑا سا رہ گیا ہے۔" ثمرہ کی آواز پر نمرہ تقریباً" اچھلنے کے انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر دل سنبھالتے ہوئے بولی۔ اسے معلوم تھا کہ کھڑکی سے آتی روشنی ثمرہ کی نیند میں خلل ڈال رہی ہے۔

"باقی! کل کرلینا ویسے بھی کل اتوار یعنی چھٹی ہے مس نمرہ۔" ثمرہ نے بے زاری سے کہا اور دانت بھینچ کر جمائی روکی تو نجانے کیوں وہ مسکرادی پھر نرمی سے بولی۔

"ثمرہ! کل تھوڑا مشکل ہے کیونکہ میں نے آفس کا بھی کام کرنا ہے۔" اس کی بات پر وہ منہ پھلائے بیڈ سے نیچے اتر کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی پھر جیسے زبردستی آنکھیں کھول کر بولی' لہجے میں زچ ہونے کی کیفیت نمایاں تھی۔

"مجھے یہ بتاؤ! تم اتنی محنت کس کے لیے کرتی ہو ۔۔۔؟"

"تمہارے اور بلال کے لیے۔" وہ ملائمت سے بولی' لہجے میں فقط ان کے مستقبل سے وابستہ فکر مندی اور بے غرض محبت تھی اس کی بات پر ثمرہ کے خوب صورت تیکھے نین نقوش بگڑ گئے جبکہ لہجہ بھی کم تیکھا نہ تھا۔

"مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ابو جائداد میں سے اپنا حصہ کیوں نہیں لیتے۔ بھائیوں سے محبت اپنی جگہ۔ لیکن بچوں کی بھی ضرورتوں کا خیال کریں اور ویسے بھی اپنا حق مانگنے میں کیسی شرم۔" ثمرہ جیسے تلملا کر بولی۔ انداز ہنوز خفا خفا تھے۔

"حق وہاں مانگا جاتا ہے جہاں اسے تسلیم بھی کیا جائے۔" اس کی بات پر نمرہ نے ملائمت سے کہا۔ انداز جتنا مگن تھا۔ اعصاب بھی اتنے ہی پر سکون تھے۔

"ہاں تو پھر ابو کورٹ میں مقدمہ دائر کردیں۔" ثمرہ چڑچڑے لہجے میں بولی۔ تو اس کے ہاتھوں کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ پھر وہ برہم سی ثمرہ کی ٹھوڑی پیار سے چھوتے ہوئے بولی۔

"اور مقدمے کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے؟" ثمرہ ہونٹ بھینچ کر چپ ہو گئی۔ تو نمرہ نہ چاہتے ہوئے بھی اندر ہی اندر اس کی چپ سے شرمندہ ہو گئی۔ کیا تھا اگر وہ تھوڑی دیر حقیقت پسندی سے کام نہ لیتی اور اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اسے خوش کردیتی۔

"اچھا چھوڑو ان سب باتوں کو اور آرام سے سو جاؤ۔" نمرہ اسے زیادہ دیر سوچنے سے روکنے کے لیے بولی تو وہ نجانے کس خیال کے تحت پھر سے بولی۔

"نمرہ! تمہیں معلوم ہے اگلے ہفتے خالہ تاریخ لینے آرہی ہیں؟" ثمرہ کی بات پر اس کے چہرے کا رنگ واضح طور پر بدلا۔ اسے اپنا سکون رخصت ہوتا دکھائی دیا۔ بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"ہاں ۔۔۔" اس کے مختصر سے جواب نے ثمرہ کو پھر سے تپ چڑھادی۔

"ایک تو مجھے ابو کی سمجھ ۔۔۔ نہیں آتی۔ جو بلاوجہ معاملے کو طول دے رہے ہیں اور دوسری طرف امی پتا نہیں کس آس پہ بیٹھی ہیں جو انہیں تمہاری پروا نہیں۔" ثمرہ کے لہجے میں غصہ' پریشانی' بے بسی اور جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔ نمرہ اس کی فکر مندی پر ہلکی پھلکی ہو کے مسکرادی۔

"زیادہ مسکرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھیں ۔۔۔!" وہ ڈپٹ کر بولی "اور دفع کرو اس دو ٹکے کی جاب کو اور بھاڑ میں ڈالو اس ہوم ٹیوشن کو۔" وہ اس طرح کہہ رہی تھی جیسے وہ شوقیہ نوکری کر رہی ہو۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے اتنی محنت کرنے کی۔ یہ تمہاری ہی کرم نوازیاں ہیں جن کی سزا ہمیں بھگتنی پڑ رہی ہے۔" ثمرہ نے طیش و غصے میں گھر کر کہا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی پھر اس کے گھورنے پر ہنسی کو روکتے ہوئے بولی۔

"مثلاً" کون سی کرم نوازیاں؟" انداز سوالیہ ضرور تھا لیکن جواب جاننے کا اشتیاق فقط حظ اٹھانے کے لیے تھا۔

"ویسے مجھے تمہاری بھی سمجھ ۔۔۔ نہیں آتی۔" وہ جلے بھنے انداز میں بولی "تم واقعی اتنی بھولی ہو یا معصوم بننے کے سارے ریکارڈ توڑنا چاہتی ہو۔ تم سارے بجلی' گیس' دکان کے بل پے کرتی ہو' سارے مہینے کا راشن لاتی ہو پھر ہمارے کالج اور ٹیوشن کی بھاری فیسیں' امی کی دوائیاں۔"

"بس بس ۔۔۔ بھئی۔" وہ دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے گھبراہٹ سے بولی "اس میں سارا کمال امی کی کفایت شعاری اور سلیقہ کا ہے اور جہاں تک بات ہے محنت کی تو میں کوئی احسان نہیں کرتی۔ کیونکہ تم غیر نہیں ہو جن کے لیے میں جان کھپاتی ہوں۔ یہ فقط وقت کے تقاضے ہیں کہ اپنی ذمہ داری بخوشی احسن طریقے سے

سنبھالوں۔"

"ذمہ داری.... ذمہ داری' بھاڑ میں گئی تمہاری ذمہ داری۔ جو جس کی ذمہ داری ہے ثمرہ صاحبہ! اسے نبھانے دو۔" ثمرہ اپنی غصیلی طبیعت کے زیر اثر بھڑک کر بولی پھر تمسخرانہ نظر ڈالتے ہوئے گویا ہوئی۔

"صرف تمہاری اس جاب کے چکر میں ابو نے شادی کی تاریخ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ دکان تو لگتا ہے ہڑتالوں کی نذر ہو گئی۔" اس کی بات پر ثمرہ ہاتھوں کی لرزش پر قابو پانے لگی۔ غصے کا اظہار وہ بہت کم کرتی تھی۔ اب بھی سرد و جامد لہجے میں بولی۔

"غلط بات مت کرو ثمرہ!"

"غلط میں نہیں بلکہ تم کر رہی ہو۔ ابو کو ہماری ذرا پروا نہیں اور امی بھی بجائے اس کے ابو کو سمجھائیں اُلٹا تمہاری تعریفوں کے قصیدے سناتی رہتی ہیں۔

نجانے کیوں ہر کوئی تمہاری ذات پہ تکیہ کیے بیٹھا ہے جیسے باقی سب اپاہج ہو گئے ہیں۔" ثمرہ نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے غصے سے کہا تو ثمرہ کی آنکھیں شدت کرب سے نم ہو گئیں۔

"اتنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی ثمرہ!" وہ دکھ و تاسف میں گھر کر بولی۔

"اتنی خوش فہمیاں بھی اچھی نہیں ہوتیں۔" ثمرہ تنک کر بولی اور بستر کی طرف بڑھ گئی۔

ثمرہ ہاتھوں کی لرزش پہ قابو پاتے ہوئے پھر سے کام کی طرف متوجہ ہوئی۔ لیکن آنکھوں میں چھائی دھند اسے ہر چیز سے بیگانہ کر رہی تھی۔ وہ تیزی سے واش روم میں گھس گئی۔ ثمرہ نے دروازہ بند ہونے کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا اور "ہونہہ" کہہ کر کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

صبح سے ابو کا موڈ نہایت خوش گوار تھا۔ امی بھی بڑی گرم جوشی کے ساتھ ان کے سوالوں کے تسلی بخش جواب دے رہی تھیں۔ اتوار کا دن تھا اس لیے وہ بھی کچن میں رکھی پیڑھی پر بیٹھی صحن میں ہونے والی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی اور سکون سے ناشتہ کر رہی تھی کیونکہ باقی سب کر چکے تھے، کچھ دیر باتیں توجہ سے سننے سے اسے پتا چل گیا کہ ابو کل بلال کی اکیڈمی گئے تھے اور وہاں ان کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ بلال کی شان دار کارکردگی کی وجہ سے' جبکہ امی اس وجہ سے خوش تھیں کہ خالہ جان آرہی ہیں۔

ابو نے سرسری لہجے میں آنے کی وجہ پوچھی لیکن امی اتنا کہہ کر موضوع بدل گئیں "کہہ رہی تھیں کافی دن ہو گئے تم سے ملے ہوئے" نجانے کیوں ثمرہ کو لگا کہ جیسے امی نے ابو کو ٹالا ہے۔

سر جھٹکتے ہوئے اس نے اپنی توجہ فوراً" ناشتے اور صحن سے آتی آوازوں سے ہٹائی کیونکہ اسے ابھی آفس کا کام بھی کرنا تھا اور گھر کا بھی جو ہفتہ وار صفائی پر مشتمل تھا۔ البتہ ثمرہ اتوار کے دن زیادہ تسلی سے

ددھیال کا چکر لگاتی تھی اب یہ سامنے والے کی قسمت پر منحصر تھا کہ قیام کس کے گھر فرمایا جاتا کیونکہ ددھیال میں چار پھوپھیاں' تین تایا اور دو چچا بھی تھے جو کافی خوشحال تھے۔

ثمرہ وہاں جا کر بظاہر خوب خوش ہوتی جبکہ اندر ہی اندر جلتی رہتی کہ یہ ٹھاٹ صرف ابو کی وجہ سے اس کی پہنچ سے دور تھے۔ بلال اسے بمشکل چھوڑنے اور لے جانے پہ راضی ہوتا کیونکہ چھٹی کے دن اس نے بہت سے کام نمٹانے ہوتے جو پڑھائی اور کھیل کے ساتھ ساتھ گھر سے متعلق تھے۔

دن کے دس بج چکے تھے رات کو وہ دیر سے سوئی تھی اس لیے نماز پڑھ کر دوبارہ سو گئی تھی۔ عام دنوں میں وہ نماز پڑھنے کے بعد سوتی نہیں تھی بلکہ گھر کے چھوٹے چھوٹے کام نہایت پھرتی سے نمٹا لیتی تھی۔ اب بھی جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی تو ثمرہ اپنی تیاری کے آخری مرحلے میں تھی اسے دیکھ کر وہ خوش دلی سے مسکرائی پھر مگن انداز میں اس کی گھڑی اور ٹاپس پہنتے ہوئے بولی۔

"تم بھی چلو ثمرہ! سچ' وہاں سب لوگ تمہیں بہت

یاد کرتے ہیں آفٹر آل تمہارا بچپن وہاں گزرا ہے اور حیدر بھی بڑے مزے سے بچپن کی شرارتیں ڈسکس کرتا ہے جو زیادہ تر تمہارے متعلق ہوتی ہیں۔" ثمرہ کے لہجے میں کچھ خاص رنگ تھے جنہیں محسوس کر کے وہ فقط اتنا کہہ سکی۔

"آئندہ سہی! آج تو فارغ نہیں ہوں۔ بہرحال تم سب کو میری طرف سے سلام کہہ دینا۔" ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہہ دے۔

"اتنا ہی یاد کر رہے تھے تو سال میں ایک چکر ہی لگا لیتے آخر ابو بھی تو ملنے جاتے ہیں' بے شک وہ ثمرہ کی بدولت ممکن ہوا تھا۔

نہ جانے ابو کو ثمرہ سے شدید محبت تھی یا پھر ثمرہ کو ابو سے اپنی بات منوانے کا گر آتا تھا' جو بغیر چوں چراں کیے اس کی بات مان لیتے تھے جاب کی بات بھی ابھی فقط امی تک محدود تھی ورنہ ثمرہ کب کا اپنا شوق پورا کر چکی ہوتی۔

"سلام تو میں کہہ دوں گی۔ لیکن مجھے اتنا ضرور پتا ہے کہ فرصت تم کبھی نہیں نکالو گی وہاں بے چارا حیدر جو کہ ہمارے ددھیال کا لائق فائق' لاڈلا اور ہونہار سپوت ہے اس بات سے انجان بنا ہوا ہے کہ تمہارے سارے مطلب ہمارے "بچے کھچے" ننھیال سے وابستہ ہیں۔" ثمرہ نجانے کیوں بولتے وقت سامنے والے کی تکلیف کا ذرا خیال نہیں کرتی تھی شاید اس کی درگزر کی وجہ سے اسے یقین ہو گیا تھا کچھ بھی کہہ لو اثر تو ہونا نہیں۔

ثمرہ کی بات پر وہ بلبلا اٹھی لہجہ کسی حد تک ترش تھا۔

"ثمرہ! غلط بات مت کیا کرو۔"

"مجھے معلوم تھا۔ تمہارا جواب یہی ہو گا' خیر خالہ آجائیں اب کی دفعہ یقیناً" تمہاری عقل ٹھکانے آجائے گی۔" پھر نخوت سے بولی "میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ یہاں آکر کس بات پر اکڑتی ہیں۔" پھر خود ہی وجہ بتانے لگی "ٹھیک ہے بھئی! شوہر اچھی پوسٹ پر ہے گھر بھی شاندار ہے اب بیٹے کو جاب ملتے ہی پر لگ گئے ہیں جن سے تمہارا تابناک مستقبل وابستہ کیا جا رہا ہے۔ بے شک بیٹے جی کہیں اور کسی صورت پر ریجھ گئے ہوں۔" وہ اب بھی اس کا دل دُکھانے سے باز نہ آئی۔

نجانے کیوں وہ اس کی کڑوی کسیلی باتیں خاموشی سے برداشت کر جاتی تھی حالانکہ وہ اسے بڑے اچھے طریقے سے جواب دے سکتی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنے اعصاب کو کنٹرول کرتے ہوئے پرسکون نظر آتی اور یہی سکون ثمرہ کو اذیت' بے سکونی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیتا۔ ہوتے ہیں نا کچھ لوگ....!

جو اپنی خودساختہ ناآسودہ خواہشات کا بدلہ دوسروں کی زندگی کا سکون درہم برہم کر کے لیتے ہیں۔ جنہیں تھالی میں سجے مال سے مطلب ہوتا ہے یہ جانے بغیر کہ اس کے لیے کتنی دوڑ دھوپ کی گئی ہے کیونکہ انہیں اس چیز کی کبھی قدر نہیں ہوتی جو بیٹھے بٹھائے مل

بلال اور ثمرہ کے جانے کے بعد وہ سارے گھر کی صفائی سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کمرے میں آگئی۔ کمرے کی حالت نہایت قابل رحم تھی۔ بستر پر الماری سے نکلے کپڑے تکیے اور کمبل سے بغلگیر ہو رہے تھے الماری کے دونوں پٹ وا تھے جس میں باقی ماندہ کپڑے گولوں کی شکل میں ٹھونسے گئے تھے۔ میز پر چائے کے برتن' مکھیوں کے لیے پکنک اسپاٹ بنے ہوئے تھے۔ قالین پر ٹافیوں کے کاغذ چہل قدمی فرما رہے تھے کتابوں کے ریک میں گرد میں اٹی کتابیں کچھ کہنے سے قاصر تھیں کھڑکی کے پردے بھی میلے ہو رہے تھے سارے ہفتے پھر بھی کچھ سکون رہتا تھا لیکن اتوار کے دن ثمرہ ایسی افراتفری مچاتی جیسے سال سے اس کمرے میں کسی نے جھانکا نہ ہو۔ وقت تھا کہ کسی شرارتی بچے کی طرح بھاگنے کے لیے تیار کھڑا تھا اس نے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد فٹافٹ لائحہ عمل تیار کیا اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد کمرے کی حالت ایسی ہو گئی جیسے یہاں کوئی رہتا نہ ہو وہ صفائی سے فارغ ہونے کے بعد جیسے ہی کچن میں

آئی۔ امی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف ملیں وہ ابھی مدد کے خیال سے آگے بڑھی تھی کہ امی نے زبردستی نہانے کے لیے بھیج دیا۔ پھر جب وہ نہا کر فارغ ہوئی تب تک ظہر کی اذانیں ہو چکی تھیں۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ امی کے پاس آگئی جو کھانے کے لیے اُسے بلانے آرہی تھیں۔ کھانے کے دوران ہی اس نے پوچھا۔

"ابو نہیں آئے کھانے پر.....؟"

"نہیں وہ آج کھانا ساتھ لے گئے تھے۔" امی روٹی کا نوالہ توڑتے بولیں۔

"کیوں.....؟" وہ حیرانی سے بولی ابو کھانا ہمیشہ گھر آکر ہی کھاتے تھے۔

"دیر سے گئے تھے۔ اس لیے۔" امی نے سادگی سے جواب دیا۔

"اچھا....." وہ طویل سانس لے کر گلاس میں پانی ڈالنے لگی۔

ایک چھٹی کا دن تو ملتا تھا جب وہ کچھ وقت ابو کے ساتھ گزار لیتی تھی اب چاہے بظاہر ابو کا مزاج کتنا ہی خراب ہو۔

"بلال نہیں آیا؟ کیا کچھ کہہ کر گیا تھا.....؟" وہ کسی خیال کے تحت بولی۔

"ہاں' آج اس کا ارادہ ثمرہ کے ساتھ ہی رکنے کا تھا۔"

"چلو! اچھا ہے۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔

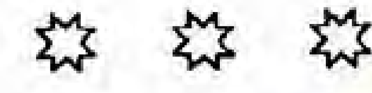
"پورے ہفتے میرے پاس ان کے لیے مختصر سا وقت ہوتا ہے لیکن چھٹی کے دن ان کے پاس مختصر سا وقت بھی نہیں ہوتا میرے لیے۔" بھوک کا احساس ختم ہو چکا تھا وہ فقط امی کے خیال سے آہستہ آہستہ کھانا نگلنے لگی۔ امی نے غور سے اس کا پھیکا پڑتا چہرہ دیکھا اور اندرونی کرب کو بھی محسوس کیا۔

جب نمرہ پیدا ہوئی تو ان کی شادی کو دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا ساس سسر حیات تھے' نندیں شادی شدہ تھیں' دیور جیٹھ بھی بیوی بچوں والے تھے وہ سب ساتھ مل کر رہتے تھے' بھرا پُرا سسرال تھا اس لیے نمرہ کی خوشی سب نے ہی پرجوش طریقے سے منائی۔ نمرہ نے بچپن ہی سے انہیں بالکل تنگ نہیں کیا' وہ ہر وقت ہنستی کھیلتی' کبھی کسی چچا کی گود میں ہوتی تو کبھی تایا کی۔ بے شک سب شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے لیکن پھر بھی نمرہ کی معصوم قلقاریوں میں ایسی کشش تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی سب اس کی طرف متوجہ ہو جاتے امی سارا دن اپنے کاموں میں لگی رہتیں پھر جب اس کی بھوک کے خیال سے چونکتیں تو وہ رونے کے بجائے' سب بچوں کے ساتھ مزے سے کھیل رہی ہوتی۔ وہ کھانے کی نہ زیادہ شوقین تھی اور نہ ہی چور۔ جو مل جاتا کھا لیتی اگر نہ ملتا تو تقاضا نہ کرتی۔ عجب بے نیازی اس کی ذات میں نمایاں تھی۔

نمرہ کی پیدائش کے پانچ سال بعد ہی دادا' دادی کی وفات ہو گئی۔ ابھی کفن میلے نہیں ہوئے تھے کہ جائداد اور کاروبار کے بٹوارے کی باتیں گردش کرنے لگیں۔ ساس سسر کی وفات سے سب سے زیادہ نقصان ابو کے حصے میں آیا جنہیں دو بیٹیاں ہونے کی وجہ سے کسی سے خاطر میں لائے بغیر ان کے حصے کا چوتھا حصہ بطور خیرات دیا گیا ابو موسم کے اتنی جلدی رنگ بدلنے پر حیران تھے تو دوسری طرف امی کو اپنی بیٹیوں کے مستقبل کی فکر چین نہ لینے دے رہی تھی بہرحال ابو اور امی نے خیراتی حصہ لینے سے انکار کر دیا اور محنت کی چکی میں پسنے لگے۔ ابو نے اپنی نوکری پر اکتفا کرتے ہوئے مکان کرائے پر لے لیا اور کھینچ تان کر گزر بسر کرنے لگے ددھیال سے اگر رابطہ ٹوٹا نہیں تھا تو جڑا ہوا بھی نہ تھا۔

پھر دو سال کے بعد کچھ بہتر حالات ہوئے اور بلال دنیا میں آگیا۔ نمرہ اور ثمرہ کو جلد ہی اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا پتا چل گیا نمرہ اپنی حساس اور خوددار طبیعت کی وجہ سے امی ابو کی ڈھال بن گئی لیکن ثمرہ روز بروز چڑچڑی اور بدمزاج ہوتی گئی وہ امی کو خوب تنگ کرتی۔ ابو سے الٹے سیدھے سوال کر کے زچ کرتی' بلال کو غصے میں آکر مارتی اور پھر بھی غصہ کم نہ ہوتا تو نمرہ سے بدتمیزی کرنے لگتی۔ کیونکہ نمرہ ہر وقت مصروف' پُرسکون اور بے نیاز دکھائی دیتی اور اسی سکون سے ثمرہ کو چڑ تھی۔ بلال اور ثمرہ کے ذریعے تعلقات پھر سے بحال ہو گئے لیکن دونوں طرف گرم جوشی مفقود تھی۔ ثمرہ کو اس بات کی قطعی پروا نہ تھی۔ وہ تو بس اپنا حق لینا چاہتی تھی۔ وہ ہر حال میں ایک آسودہ پُرآسائش زندگی گزارنے کی خواہش مند تھی۔ ددھیال سے انسیت اسے صرف نام کی تھی۔

"امی!" نمرہ کی آواز پر امی ماضی سے حال میں لوٹ آئیں۔ نمرہ برتن اٹھائے کچن کی طرف چل دی بغیر کچھ کہے۔



رات کا آخری پہر' شب کی مسافت سے تھک کر' کچھ دیر سستانے کے ارادے سے کھڑکی کے پٹ تھامے' حیرانی سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ جو بیڈ کی پشت سے کمر ٹکائے' گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حصار کیے سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ کمرے کی فضا میں عجب سی سوگواری رچی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے کناروں سے آنسو باہر نکلنے کو بے تاب تھے عجب اداسی کی کیفیت تھی جس نے کمرے کی ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔

صبح جب وہ آفس جانے کی تیاری کر رہی تھی امی نے اسے یاد دہانی کرائی کہ واپسی پہ جلدی آجانا کیونکہ سہ پہر تک خالہ اور یوسف آئیں گے۔ آفس میں اگر آج اہم میٹنگ نہ ہوتی تو وہ امی کی پریشانی کے خیال سے چھٹی کر لیتی۔ بہرحال آفس پہنچتے ہی وہ تقریباً سب کچھ فراموش کر گئی کیونکہ آفس کا کام اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ پھر نہ نہ کرتے ہوئے بھی اسے کافی دیر ہو گئی تو اٹھ آئی کہ باقی کا کام گھر جا کر' کر لے گی۔ کم از کم سر پر کوئی ٹینشن تو نہیں ہو گی لیکن واپسی پر انتہائی شدید ٹریفک جام نے قسم کھائی ہوئی تھی کہ اسے آج جلدی گھر نہیں جانے دینا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی نو بج گئے کیونکہ اسے دو بسیں بدلنی پڑتی تھیں اس لیے عجلت میں وہ رکشے کا ارادہ کر بیٹھی۔ راستے میں رکشے نے دغا دے دیا وجہ یہ تھی پیٹرول کم تھا پھر جب تک کسی پیٹرول پمپ پر پہنچے پیٹرول ڈلوایا تب تک دس بجنے میں صرف دس منٹ ہی رہ گئے تھے۔ دس بج کر تیس منٹ پر وہ گھر پہنچی تو دروازے میں قدم رکھتے ہی ایک طوفان تھا جو اسے اندر تک ویران کر گیا۔

صحن میں خالہ کے روبرو بیٹھے امی ابو نے اسے چونک کر دیکھا تھا پھر ابو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اسے بے نقط سنائیں حالاں کہ پہلی دفعہ وہ دیر سے گھر آئی تھی لیکن ابو کے غصے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہمیشہ دیر سے آتی ہو۔ امی اشارے سے ابو کو چپ کرانے کی کوشش کرتی رہیں لیکن حسب توقع آج بھی یقیناً غصہ خالہ کے آنے پر تھا اور بھڑاس نمرہ پر نکلی۔ بلال کڑے ضبط میں گھرا' لب بھینچے' یوسف کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں بدگمانی کے بادل پھیلتے جا رہے تھے۔ ثمرہ بڑی خاموشی سے جائزہ لے رہی تھی۔ نمرہ سر جھکائے' شرمندگی' خفت' سبکی کے احساس میں گھری اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے منظر سے غائب ہوتے ہی ابو اور خالہ کے درمیان بحث چھڑ گئی بات معمولی تھی لیکن موقع کی تاک میں رہنے والے' اتنی ہی آسانی کے ساتھ رائی کا پہاڑ بناتے ہیں جس طرح خالہ اور ابو نے بنایا تھا' بہن سے زیادہ بیٹے سے مجبور ہو کر یہاں بہو لینے آنے والی خالہ نے مصلحت کی چادر اتار پھینکی۔ دونوں میں سے کسی نے بھی یوسف اور نمرہ کے بارے میں سوچنے کی زحمت نہ کی۔ یوسف شدید غصے میں بلال کے کمرے میں چلا گیا۔ ثمرہ بڑی دلچسپی سے خالہ کے منہ سے نمرہ کے خلاف نکلتی بھڑاس کو سن رہی تھی۔ بات نوکری سے شروع ہوئی تھی کہ۔

"والدین کو اولاد کی کمائی کھانے کی عادت پڑ جائے تو وہ رشتوں میں ٹال مٹول کرتے ہیں' بے شک گھر میں بیٹی کو دینے کے لیے ایک تولے کی چوڑی نہ ہو۔"

دوسری طرف ابو نے خالہ کا لحاظ کیے بغیر نہایت نخوت سے بے بھاؤ کی سنائیں کہ "رشتہ ہم دینے نہیں گئے تھے بلکہ آپ خود مانگنے آئے تھے اور اب بیٹے کی اچھی نوکری کیا لگ گئی۔ اپنی اوقات ہی بھول گئیں۔" اس دوران امی دونوں محاذوں پر پھنسی بیٹی کے مستقبل کی فکر میں، دونوں کو سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ خالہ نے بلند آواز میں یوسف کو بلایا جو اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ چہرہ لیے باہر آ گیا۔ خالہ نے اسے چلنے کا اشارہ کیا تو وہ ایک نظر ثمرہ کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے پر ڈال کر تیزی سے باہر کی طرف نکل گیا۔ خالہ الوداعی انداز میں امی کی طرف بڑھیں، جو کچن کی دیوار تھامے گم صم ساکت کھڑی تھیں۔

ایک لمحے کو خالہ کو لگا جیسے ان کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو لیکن جیسے ہی نظر ابو کے چمکتے چہرے پر پڑی تو وہ ساری شرمندگی، پریشانی جو انہیں ضمیر کی عدالت میں گھیرے ہوئے تھی اپنے آپ ہی غائب ہو گئی۔ انہوں نے قریب جا کر امی کے ہاتھوں کو آہستہ سے دبایا تو امی کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ خالہ کی ہتھیلی کی پشت پر گرنے لگے۔ خالہ نے بغیر کچھ کہے ایک لحظے کو بہن کے بھیگے، بے بس، لٹے ہوئے مسافر کی طرح، خدشوں، وسوسوں میں گھرے چہرے کو دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گئیں۔ امی خالہ کے جاتے ہی وہیں دیوار سے لگی نیچے بیٹھتی چلی گئیں اور اپنی سسکیاں دبانے لگیں بلال تڑپ کر انہیں چپ کرانے لگا۔ ثمرہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے کہہ رہی ہو "خس کم جہاں پاک" پھر تیزی سے بنا امی کی طرف دیکھے ابو کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

جبکہ اندر بیٹھی ثمرہ یہ سوچ رہی تھی کہ کیا اس شخص کے پاس، میرے حوالے سے کہنے کے لیے ایک لفظ بھی نہ تھا؟"

☼ ☼ ☼

خالہ کو گئے کافی دن گزر گئے ہر چیز اپنے معمول پر آ گئی تھی ابو اور ثمرہ کے چکر دن بدن ددھیال کی طرف بڑھتے جا رہے تھے بلال کا رزلٹ آ گیا تھا انٹری ٹسٹ پاس کرنے کے بعد وہ میڈیکل کی پڑھائی میں بری طرح مصروف ہو گیا تھا۔ امی بھی بظاہر پرسکون اور مطمئن دکھائی دیتی تھیں لیکن کچھ ایسا تھا جس کو وہ خاطر میں نہیں لا رہی تھیں۔

حسب معمول چھٹی کا دن تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آفس کا کام کر رہی تھی جبکہ امی کچن میں مصروف تھیں۔ اچانک اسے لگا جیسے کوئی باہر آیا ہو وہ سر جھٹک کر پھر سے کام میں مگن ہو گئی۔

"تم تھکتی نہیں ہو....؟" جملہ ہمیشہ کی طرح عام سا تھا لیکن لہجے میں چھپی بے قراری، فکر مندی، دکھ، پریشانی ایسی تھی جسے وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔ حیدر اس کے بیڈ پر بکھرے کاغذات پر نگاہ ڈال کر بالکل سامنے والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے پاس جواب دینے کے لیے کچھ نہ تھا سو خاموش رہی۔ جبکہ وہ دوستانہ انداز میں پھر سے بولا۔

"ویسے کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے تم زندہ رہنے کے لیے مصروف رہتی ہو۔ صبح ناشتہ بنانا، پھر آفس جانا، آفس سے واپسی پر ہوم ٹیوشن، گھر آ کر چچی کا ہاتھ بٹانا، آئی ایم سو ایمپریسڈ اور پھر یہاں موجود بچوں کی فون سے نبرد آزما ہونا۔" وہ اندر ہی اندر اس کی معلومات پر خائف ہو گئی جبکہ وہ ہمیشہ کی طرح اپنی فکر مندی، بے چینی، بے تابی بیان کرتے ہوئے اس کے مزاج کی لاپروائیوں کو فراموش کیے ہوئے تھا۔ اب بھی وہ اس سے مخاطب تھا۔ لیکن اس کے خاموش، سپاٹ، بے تاثر چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے دیواروں سے باتیں کر رہا ہو۔

"شام میں بھی، چاچی بتا رہی تھیں کہ آفس کا کام کرتی ہو۔ بارہ بجے سے پہلے تمہارے کمرے کی لائٹ آف ہو جائے ایسا ویک اینڈ پر بھی مشکل سے ہوتا ہے وہ بھی صرف ثمرہ کے شور مچانے پر۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر اس کی جھکی جھکی نظریں دیکھتے ہوئے بولا "مجھے تو لگتا ہے تم لائٹ آف کر کے بھی کام کرتی ہو گی۔ آنکھیں بھی تمہاری سوئی جاگی کیفیت میں دکھائی دیتی ہیں۔ سچ بتاؤ! کس طرح تم یہ سب مینیج کر لیتی ہو؟" وہ حیرانی اور ستائش کے ملے جلے تاثرات سمیت بولا لیکن اس نے کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ کی طرح گونگوں سے شرط لگائے اس کے صبر کو آزماتی دکھائی دی۔

"اچھا! ویسے خالہ کب آئی تھیں تمہاری؟" اسے بات کرتے ہوئے ایسا لگا جیسے ایک لمحے کے لیے اس کے خدوخال میں تغیر رونما ہوا ہو۔ لیکن دوسرے لمحے ہی وہ اس خیال کی نفی کر گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتا امی کمرے میں داخل ہوئیں ایک نظر خاموش خاموش سی ثمرہ پر ڈالی پھر ایک ٹھنڈی سانس فضا کے سپرد کر کے حیدر سے مخاطب ہوئیں جو نجانے کس سوچ میں غرق تھا کہ اسے امی کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔

"حیدر بیٹا" وہ یکدم چونکا عجیب خالی الذہن کیفیت تھی جس نے ثمرہ کی بے نیازی پر اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔

"مجھے کچھ چیزیں منگوانی تھیں۔ تمہیں پتا ہی ہے چھٹی کے دن بلال کم ہی گھر پر ٹکتا ہے جبکہ تمہارے چچا آج دیر سے آنے کا کہہ کر گئے تھے۔" امی تذبذب میں گھری اس سے مخاطب تھیں۔ ثمرہ کے چہرے پر لکھی بیزاری کی تحریر امی نے کبھی نظر انداز نہیں کی تھی۔ اب بھی وہ اسی خدشے میں گھری ہوئی تھیں لیکن اس نے کوئی بھی ردِعمل ظاہر نہیں کیا عجیب طرح کی لاتعلقی تھی جو خالہ کے جانے کے بعد سے چھائی ہوئی تھی شاید وہ خود کو ابھی تک سنبھال نہ سکی تھی کہ یوسف سے رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے حالانکہ جب رشتہ طے ہوا تھا تب بھی اس سے پوچھا نہ گیا تھا اور اب توڑا تھا تو بھی کسی نے جاننے کی کوشش نہ کی تھی کہ منسوب ہونے کی وجہ سے وہ کتنی دور نکل آئی تھی۔ جہاں سے واپسی اس کے لیے کتنی تکلیف دہ تھی۔

کسی نے اس کے دکھ کو جاننے کی کوشش نہ کی اور جس نے کوشش کی وہ اس پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔

کتنا دل چاہتا تھا اس کا... کہ وہ بھی کسی کے کندھے پر سر رکھے، ساری فکروں، پریشانیوں اور اندیشوں سے نجات حاصل کر لے۔

کوئی تو ہو جو اپنے لہجے کی مٹھاس سے اس کے دل کو تسلی دے۔ اطمینان دلائے کہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی تو ہو جو اسے پوری شدت کے ساتھ اپنے ہونے کا یقین دلائے، کوئی تو ہو جو اس کے شانے پر بڑے مان سے اپنے بازو دھرے آنکھوں میں اعتبار کے رنگ بھر دے اور ساری تھکن سمیٹ لے لیکن ...؟

یہ سب وہ سوچ کے رہ جاتی اور پھر خیالات کی رو بدل جاتی۔

"جی! آپ مجھے لسٹ بنا دیں۔ میں آپ کو سامان لا دیتا ہوں۔" پھر یکدم خیال آنے پر بولا "ثمرہ کہاں گئی ہے۔ ابھی تک نظر ہی نہیں آئی....؟"

"وہ اپنے چچا کی طرف گئی ہے۔ تم نہیں ملے؟" امی کا انداز سادہ تھا لیکن نجانے کیوں اسے کھوجتا ہوا لگا۔ وہ اپنی جگہ گڑبڑا گیا۔ پھر سنبھل کر بتانے لگا۔

"نہیں! دراصل صبح ہی میں واک کے لیے چلا جاتا ہوں پھر واپسی پر ناشتے کے بعد گھر پر کم ہی ملتا ہوں اور اب تو آفس کی ذمہ داری بھی ہے۔ جو زبردستی کے بجائے خوش اسلوبی سے نبھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" اس کی بات پر ثمرہ نے پہلی دفعہ سر اٹھا کر دیکھا نجانے کیوں اسے آخری جملہ بہت ہی اچھا لگا، مانوس سا۔ جلد ہی وہ ماحول میں لوٹ آئی اور تیزی سے آفس کی فائلیں سمیٹنے لگی حیدر سے یہ عجلت چھپی نہ رہ سکی۔ اس لیے بے اختیار اسے مخاطب کر بیٹھا جو عام سے گھریلو حلیے میں بھی خاص لگ رہی تھی۔

"ثمرہ! کہاں جا رہی ہو؟" وہ امی کی وجہ سے لحاظ کر کے بولی۔

"کچن میں" اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ حیدر سے کم سے کم سامنا ہو اور مخاطب کرنے یا پھر جواب دینے کی نوبت نہ آئے۔ اس کی پریشانی، غصہ، جھنجلاہٹ، بے بسی اسے بھی نظر آتی تھی لیکن اس معاملے میں وہ خود کو کچھ حدود میں رکھنے کی قائل تھی۔ جس گاؤں نہیں جانا اس کے کوس کیا گننے۔

"اوکے! آفس ٹھیک جا رہا ہے۔" اس کے مختصر نرم لہجے میں جواب دینے پر وہ اس طرح خوش ہوا جیسے کوئی پہاڑ سر کر لیا ہو۔ خوشی میں وہ جملے بھی ٹھیک سے ادا نہ کر پایا تو وہ ہونٹ بھینچ کر اثبات میں سر ہلا گئی۔ پھر کارنر کی میز پر فائلیں رکھ کر تیزی سے باہر نکل گئی جبکہ وہ ہلتے پردے کو دیکھ کر ایک بے نام سی اداسی، بے کلی لیے چاچی سے لسٹ لے کر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

شب و روز لگے بندھے معمول کے تحت گزر رہے تھے کہ اچانک ایسی بات ہو گئی جس کا اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ پچھلے مہینے بھی اس نے اپنی تمام تنخواہ امی کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا تھا "امی! اگر اور کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیجیے گا۔ میں پوری کوشش کروں گی کہ بہتری کے مواقع میسّر آسکیں۔" امی فقط بھیگی پلکوں سے مسکرا دیں۔ پھر سب بل بھی بھرے گئے۔ راشن بھی آ گیا۔ بلال اور ثمرہ کی فیسیں بھی ادا ہو گئیں اور دکان کا کرایہ بھی چلا گیا۔ اور اس میں کمال امی کی کفایت شعاری اور سلیقے کا تھا جو ابھی تک رشتہ داروں میں بھرم رکھے ہوئے تھا۔

وہ معمول کے مطابق آفس سے فارغ ہوتے ہی ہوم ٹیوشن کے لیے نازیہ آنٹی کی طرف آ گئی تو انہوں نے اسے بتایا کہ حماد اپنے ماموں کے پاس انگلینڈ جا رہا ہے اور کل اس کی فلائٹ ہے۔

"خیریت؟ اتنی اچانک۔" وہ بس اتنا ہی پوچھ سکی۔

"اچانک کہاں... کافی عرصے سے اس لڑکے نے میری جان کھا رکھی تھی۔ پھر اب بھائی نے بھی زور دینا شروع کر دیا تو میں نے سوچا چلو کچھ عرصے کے لیے بھیج ہی دوں۔" نازیہ آنٹی نے جیسے ہی بات ختم کی وہ فوراً اٹھ گئی پھر وہ اسے روکتی رہ گئیں لیکن وہ سیدھا گھر آ گئی۔ راستے بھر اس کا سوچ سوچ کر برا حال تھا کہ آگے کیسے چلے گا۔ ایک تو ہوم ٹیوشن اس کی ضرورتوں کے لیے کافی تھی اور پھر جاننے والے اچھے شریف لوگ تھے۔ لیکن اب ایک دم اتنے پیسوں کا کم ہو جانا فرق ضرور ڈالے گا۔ دوسری طرف وہ جاب بھی چھوڑنے کا سوچ رہی تھی۔ وہ راستے بھر یہ سوچ کر ہی حواس باختہ ہوتی رہی کہ امی کو کس طرح بتائے گی۔ غم روزگار نے اسے غم جاناں کافی حد تک بھلا دیا تھا۔

آج پھر سمیرا نے خود ہی چکر لگا لیا تھا اور وہ جو اتنے دنوں سے وقت نکالنے کی تگ و دو میں پھنسی ہوئی تھی یکدم پرسکون ہو گئی۔

"بہت بری بات ہے نمرہ آپی! میں کتنی دفعہ آپ کو کہہ کر گئی تھی کہ خدارا، ایک چکر لگا لیجیے گا۔ مانا کہ آپ بہت مصروف ہوتی ہیں جناب، لیکن کچھ خیال اپنے سے وابستہ لوگوں کا بھی کر لینا چاہیے۔ کبھی کبھی تو مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ جیسے آپ پر بھی عمر بھائی کا سایہ پڑ گیا ہو، وہ بھی مجال ہے کسی رشتے دار یا عزیز و اقارب کے گھر چکر لگا لیں۔" سمیرا کے محبت بھرے شکوے پر وہ بے ساختہ مسکرائی۔

"بس کام، کام اور کام۔"

"تو بیٹا! اس کی ذمہ داریوں کا احساس تمہیں بھی ہونا چاہیے۔ ابھی تم ہو، تم سے چھوٹے فاہد اور فراز ہیں پھر ابھی تو سب لوگ پڑھ رہے ہو، کل کو تمہارے شادیاں بھی کرنی ہیں کہ نہیں....؟" امی رسانیت سے سمجھانے لگیں "اللہ جنت نصیب کرے تمہارے باپ کو، وہ بھی ایسا ہی محنتی اور فرض شناس تھا اور بیٹا بھی اتنا ہی قابل اور ذمہ دار" امی کے لہجے میں عمر کے لیے فخر، ستائش اور طمانیت کا ایک جہان آباد تھا۔ بے اختیار سمیرا کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ بھلا وہ اپنے ہیرے جیسے بھائی سے واقف نہ تھی جس نے ابو کی وفات کے بعد گھر اس طرح سنبھالا تھا کہ سب اس کی ہمت کی داد دیتے تھے۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے خالہ! لیکن بندے کو اپنی فکر بھی کرنی چاہیے یہ کیا کہ ساری زندگی دوسروں کی پروا کرنے میں گزار دے۔" سمیرا کی بھرائی آواز پر امی ہولے سے مسکرا دیں جبکہ نمرہ نے تھپکی دینے والے انداز میں اس کے شانے پر دباؤ ڈالا پھر نرمی سے گویا ہوئی۔

"سمیرا! ہم ہمیشہ ان لوگوں کی پرواہ کرتے ہیں جن سے خود کو وابستہ سمجھتے ہیں۔ ہم جب ان رشتوں کی فکر میں ہلکان ہوتے ہیں نا۔ تو گویا اپنی فکر کر رہے ہوتے ہیں۔ پھر کہاں سے سوال اٹھتا ہے کہ ہم اپنی نہیں بلکہ دوسروں کی فکر کر رہے ہیں۔"

نمرہ کی بات پر وہ بے ساختہ مسکرا دی "ہم" کا صیغہ اچانک ہی ایک بڑی خوشی سے ہمکنار کر گیا پھر یکایک آنکھوں کی جوت کسی سوچ کی آندھی سے بجھ گئی۔ نمرہ بڑی فرصت سے اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا کوئی پریشانی اب بھی ہے؟" نمرہ، سمیرا کی بھائی سے محبت سے واقف تھی اس لیے فوری طور پر یہی نتیجہ اخذ کر سکی۔ سمیرا نفی میں سر ہلا گئی۔ پھر مرے مرے انداز میں گرمجوشی پیدا کرنے کی سعی میں مسکرا کر بولی۔

"آپ بتائیں خالہ آئی تھیں۔ کیا ڈیٹ فکس ہوئی؟" سمیرا کی بات پر وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی، چہرے پر کچھ ایسا تھا جو اندرونی سکون کو درہم برہم کر رہا تھا۔ سمیرا نے حیرانی سے اس کی اضطرابی کیفیت کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی ثمرہ نے اسے کچن میں آواز دے ڈالی نمرہ بغیر کچھ کہے تیزی سے کچن میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لوازمات سے بھری ٹرے لائی تب تک امی سمیرا کو ساری تفصیل بتا چکی تھیں۔ سمیرا نمرہ کو دیکھ کر گہرے ملال و تاسف میں گھر گئی۔ نمرہ خود کو سنبھال چکی تھی اب اسے چیزیں کھانے کے لیے پیش کرنے لگی۔ بے اختیار نمرہ کو دیکھتے ہوئے وہ ذہن میں تانے بانے بننے لگی پھر امی کے ہاتھ کی پشت سہلاتے بولی "خالہ! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ خدا بھی اپنے پیارے بندوں کے ساتھ برا نہیں کرتا اور نہ ہی انہیں تنہا چھوڑتا ہے، اس میں بھی ضرور کوئی مصلحت پوشیدہ ہو گی، خدا نے ان کے لیے بھی، ضرور کوئی پیارا سا شخص رکھا ہو گا بالکل ان ہی کی طرح، مخلص، بے ریا، پرخلوص" سمیرا کی بات پر وہ دھیرے سے اثبات میں سر ہلا گئیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی فاہد، سمیرا کو بلانے چلا آیا۔

"عمر بھائی آ گئے ہیں، بہت ساری چیزیں لائے ہیں آتے ہی سب سے پہلے آپ کو پوچھ رہے تھے فراز کہنے لگا اپنی سمیرا، نمرہ آپی کو پیاری ہو گئی ہیں۔ اب جلدی چلیں یہ نہ ہو کہ وہ ساری چیزیں خود ہی لے لے۔" فاہد کی بات پر امی اور نمرہ سمیت سمیرا بھی ہنس پڑی پھر اس کے جلدی جلدی مچانے پر عجلت میں امی اور نمرہ کو خدا حافظ باہر نکل گئی۔ فاہد جو ثمرہ سے کھسر پھسر کر رہا تھا۔ پھرتی سے سمیرا کے پیچھے بھاگا۔ نمرہ جو اپنے کمرے میں جا رہی تھی پشت پر امی کی آواز سن کر رک گئی جو کہہ رہی تھیں۔

"بڑا ہی نیک بچہ ہے۔ اللہ ایسی ہی خیال کرنے والی گھر والی دے۔" ایک عجیب سے احساس نے، بڑی تیزی سے اس کا گھیراؤ کیا تھا احساس کی تقویت، سمیرا کی بازگشت سے ہوئی تھی۔ "بالکل آپ کی طرح ہیں عمیر بھائی۔" وہ اپنی جگہ گم صم تھی۔

آفس سے واپسی پر وہ عجیب سی کیفیات کا شکار تھی۔ آج ارم نے اسے وہ کام کرنے کا مشورہ دیا تھا جس کا سوچتے ہوئے بھی، اسے بری طرح گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ مسلسل خود میں مگن، اب کالونی میں داخل ہو رہی تھی۔

"کیا چلا جاتا اگر میں ارم کو خالہ کے انکار کا نہ بتاتی۔ اس نے کون سا گھر آ کر میرے سچ یا جھوٹ کی تصدیق کرنا تھی۔ میں نے فضول میں اسے جانتے بوجھتے اپنا ہمراز بنایا۔ معلوم بھی ہے کہ وہ عام لوگوں کی طرح فقط ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالنے والوں میں شامل ہے۔ جو صرف اور صرف وقت گزاری کے لیے ہمدردی جتاتے ہیں اور پیچھے مذاق اڑاتے ہیں۔

"سر احمر کو بھی میرے حالات کے بارے میں اسی نے بتایا اور میں کتنی آسانی سے اس کا شکار ہو گئی وہ تو اگر آج عدنان نہ بتاتا کہ۔۔۔۔"

"بہت افسوس ہوا مس نمرہ! یہ سن کر کہ آپ کی منگنی ٹوٹ گئی۔" عدنان کی بات پر اس نے چونک کر سر اٹھایا پھر اچنبھے سے بولی۔

"آپ کو کس نے بتایا؟" حیرانی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

"ارے! ارم نے بھئی' کس نے بتانا تھا۔ ویسے آپ کے حالات جان کر بہت افسوس ہوا۔ سر احمر کو تو لگ رہا تھا جیسے گہرا صدمہ ہوا ہے۔" آخر میں عدنان کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تو اسے اپنا سکون رخصت ہوتا محسوس ہوا۔ اندر سے کسی نے دکھ سے کہا تھا۔

"بھلا کوئی اس طرح سے بھی کرتا ہے۔"

"یہاں سب لوگ سمجھتے تھے کہ آپ شوقیہ جاب کرتی ہیں۔ اس میں یقیناً" آپ کی ریزرو طبیعت کا کمال تھا۔ لیکن دوست۔۔۔" عدنان نہ جانے کیا کچھ کہہ کر جا چکا تھا لیکن وہ فقط چپ کی دبیز تہہ میں خود کو دبتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

وہ گھبراہٹ میں بری طرح گھری' سر احمر کے روم میں تھی۔ جنہوں نے تھوڑی دیر پہلے ہی اسے کال کیا تھا کہ وہ فائل لے کر اندر آئے۔ اب بھی وہ غائب دماغی سے کرسی پر بیٹھی تھی۔ عجیب سے احساس کی تپش سے پلکوں پہ لرزش نمایاں تھی۔ جھکی نظروں میں گریز نہاں تھا۔ سر احمر بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر کمرے میں سر احمر کی آواز سے اس کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ تمام اعصاب یک لخت کپکپاہٹ کے زیر اثر آ گئے جبکہ سر احمر گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"مس نمرہ! میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟ اگر نہیں ہے تو پھر میں کل ہی اپنے والدین کو انفارم کر دوں۔ کیونکہ انہیں پاکستان آنے میں کچھ ٹائم لگے گا۔"

" سر احمر بڑی گہری نظروں سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" لہجہ معمول کے مطابق تھا لیکن انداز پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ اس کی حالت سے حظ اٹھایا جا رہا ہے۔ وہ تیزی سے اپنی کرسی سے کھڑی ہوئی۔ ضبط کی حد "میں اب چھونے کو تھیں۔

"سر! آج مجھے گھر جلدی جانا ہے۔ میں جاؤں۔" وہ نظریں جھکائے مضبوطی سے فائل تھامے' سخت لہجے میں بولی تو وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے پھر اس کے سرخ پڑتے چہرے پر نظر ڈال کر' ایک طویل سانس لے کر رہ گئے۔

"ٹھیک ہے' آپ جا سکتی ہیں۔ لیکن میں۔۔۔ آپ کے جواب کا شدت سے انتظار کروں گا۔" وہ ان سنی کرتے ہوئے تیزی سے باہر آ گئی اور اپنی اتھل پتھل ہوتی سانسوں کو معمول پر لانے لگی۔ اچانک ہی پاس پڑے فون کی گھنٹی بجی۔ اس وقت وہ بات کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ پھر بھی خود پر کسی حد تک قابو پاتے فون ریسیو کر لیا۔ دوسری طرف ارم تھی جو اسے مفت کے مشوروں سے نواز رہی تھی۔

"نمرہ پلیز! یوسف کے غم سے باہر نکل کر دیکھو۔ بہت سے لوگ تمہارے طلبگار ہیں۔ لوگ بھی ایسے جو تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو آسانی سے سپورٹ کر سکتے ہیں۔" اسے ارم کی باتوں سے آج پہلی دفعہ محسوس ہو رہا تھا کہ جب آپ کی ذات بے مول کی جاتی ہے تو کیسی تکلیف ہوتی ہے۔و

☼ ☼ ☼

وہ آج آفس سے جلدی واپس آ گیا تھا اور حسب معمول سمیرا کو گھر میں نہ پا کر ابو سے پوچھا اسے لینے کے لیے چلا گیا کیونکہ فاہد اور فراز کل سے تایا کی طرف گئے ہوئے تھے۔ وہ ابھی چند قدم ہی بڑھا ہو گا کہ اچانک نمرہ کو دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔ لیکن وہ تو جیسے کسی اور دنیا میں پہنچی ہمیشہ کی طرح تھکے تھکے قدموں سے چلتی نظر

آ گئی۔ لیکن آج کچھ مختلف تھا۔ شاید اس کی سست چال اس کے بھید عیاں کر رہی تھی یا اس کی چال میں ہمیشہ کی طرح گھر پہنچنے کی جلدی نہ تھی بلکہ عجیب سی خود فراموشی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سوچتا۔ اس نے دروازے کا پٹ تھامے' گرتی نمرہ کو دیکھا تو بے اختیار بجلی کی سی تیزی سے اسے سہارا دینے کو آگے بڑھا۔ لیکن وہ تو ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔

امی اور سمیرا تیزی سے نمرہ کی آواز پر دروازے کی طرف دوڑیں۔

"یا اللہ! میری بچی کو کیا ہو گیا۔۔۔؟" امی نے دہل کر اپنے سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ دروازے کی چوکھٹ پر ٹھٹک کر رک گیا۔ جبکہ سمیرا نے پھرتی سے نمرہ کے نازک وجود کو سہارا دیا۔ امی بھی بے شمار خدشوں' وسوسوں میں گھری پریشانی سے اسے دیکھنے لگیں تو وہ متوقع سوالات کو خاطر میں لائے بغیر' یہ کہتے ہوئے برق رفتاری سے باہر نکل گیا۔

"میں ڈاکٹر شہلا کو لینے جا رہا ہوں۔ تم ان کو کمرے میں لٹاؤ۔" اس نے سمیرا کو منہ کھولتے دیکھ کر کہا تو وہ ہونٹ بھینچ کر اسے کمرے میں لے گئی۔ امی بھی روتی ہوئی پیچھے پیچھے تھیں۔ تھوڑی دیر بعد بلال ابو کے لیے کھانا لینے آ گیا۔ ابھی وہ اندر ہی داخل ہوا تھا کہ عمر ڈاکٹر شہلا کو اپنے ساتھ لے آیا۔ تو انہوں نے چیک اپ کرنے کے بعد تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ جسمانی کمزوری' ذہنی دباؤ کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ آپ یہ دوائیاں لے آئیں۔ میں صبح آ کر پھر دیکھ جاؤں گی۔ ان شاء اللہ جلد ہی یہ ہوش میں آ جائیں گی۔" عمر نے دوائیوں پر ایک نظر ڈالی اور ڈاکٹر شہلا کو چھوڑنے چلا گیا۔ بلال' نمرہ کے زرد پڑتے چہرے پر ایک نظر ڈال کر امی کو تسلیاں دے رہا تھا۔ جو اسے یک ٹک دیکھتے ہوئے بے آواز آنسو بہا رہی تھیں۔ عمر نے تھوڑی دیر پہلے ہی اسے بتایا تھا کہ کس طرح وہ سمیرا کو لینے آ رہا تھا کہ دروازے میں نمرہ کو گرتے ہوئے دیکھا تو فوراً" ڈاکٹر کو لے آیا۔ سمیرا بھی انہیں حوصلہ دے رہی تھی۔

ابو دکان پر تھے اور بلال ان کا بتانے آیا تھا کہ وہ آج دیر سے آئیں گے اس لیے ان کا کھانا دے دیں لیکن یہاں آنے پر جب بلال نے نمرہ کی حالت دیکھی تو اس کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ اب وہ عمر کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ جو بروقت ڈاکٹر کو لے آیا تھا عمر نے اکثر ہی نمرہ کو آتے جاتے دیکھا تھا لیکن باضابطہ نہ کبھی بات ہوئی اور نہ کبھی ملاقات۔ کچھ اس کی مصروفیت تھی تو کچھ نمرہ کی طبیعت کا گریز۔ جبکہ ثمرہ کی سب سے بات چیت تھی۔ اور پھر ایف۔ ایس۔ سی کے دوران ثمرہ نے عمر سے ٹیوشن بھی لی تھی۔ اس لیے عمر سے اس کی اور باقی گھر والوں کی بھی کافی بات چیت تھی۔ ماسوائے نمرہ کے اب بھی امی مسلسل پریشانی میں گھری بلال کو کہہ رہی تھیں۔

"جاؤ بلال! ثمرہ کو پھوپھو کے گھر سے لے آؤ۔"

بلال' عمر کو چھوڑ کر امی کو پھر سے سنبھالنے لگا۔

"امی! میں نے فون کیا تھا وہ پھوپھو کی فیملی سمیت حیدر بھائی کے ساتھ ڈنر کے لیے جائیں گے۔ مجھ سے اس نے بات بھی نہیں کی بلکہ صائمہ کے ہاتھ کہلوا دیا کہ وہ آج وہیں رہے گی اور یہ کہ اس نے ابو سے اجازت لے لی ہے۔" بلال کے لہجے میں عجیب سی بے بسی' لاچاری اور بے زاری رچی ہوئی تھی۔

ایک طرف یہ بہن تھی جو حقیقتاً" سونے کا نوالہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔ لیکن برے وقت میں بھی اپنے آپ کو سنبھال گئی تھی۔ بے شک وہ ناز و نعم میں پلی تھی۔ مگر حالات سے سمجھوتا کیے ہوئے تھی۔ دوسری طرف ثمرہ تھی جسے نہ گھر کی فکر تھی اور نہ ہی کسی اور کی۔ اس کی شخصیت میں خود سری تھی لیکن اسے تیزی سے پروان ددھیال کی صحبت نے چڑھایا تھا۔ ابو کی شہ الگ اسے لاپروا کیے ہوئے تھی۔ وہ صرف اور صرف اپنی خواہشات کے حصول کی تکمیل

چاہتی تھی۔ نجانے اس کے اندر اتنی تشنگی کہاں سے آگئی تھی۔

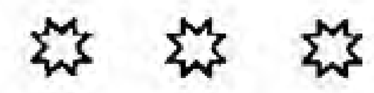
تھوڑی دیر بعد جب بلال عمر اور سمیرا کو دروازے تک چھوڑنے آیا اور ایک دفعہ پھر شکریہ ادا کرنے لگا تو عمر نے اس کی فکرمندی، احساس ذمہ داری سے متاثر ہو کر اسے گلے لگا لیا۔ پھر اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔

"فکر مت کرو یار! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آنٹی کا خیال رکھنا۔ میں سمیرا کو گھر چھوڑ کر انکل کو کھانا دے آتا ہوں۔ تم گھر میں رہو۔ اور ثمرہ کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں اور بوا صبح چکر لگائیں گے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف کہہ دینا۔ خدا حافظ۔" عمر کی بات پر وہ کڑے ضبط سے مسکرا دیا۔

امی ابھی تک اس کے سرہانے بیٹھی آیتیں پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ بلال کو اندر آتے دیکھ کر وہ پھر سے حوصلہ ہار گئیں۔

"بلال! میری بچی کو کسی کی نظر لگ گئی۔ اس نے کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی۔

بلال، مجھ سے اس کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ نہیں ہوتی برداشت۔ اس سے کہو اٹھے۔ کہو اس سے....." بلال نے بڑے حوصلے اور مان سے انہیں ساتھ لگا لیا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگیں۔



اسے تین دن ہو گئے تھے بخار میں جلتے ہوئے۔ امی پوچھ پوچھ کر تھک گئی تھیں کہ وہ انہیں بتائے کہ اسے کیا پریشانی ہے جبکہ وہ انہیں تسلی دے رہی تھی کہ کوئی پریشانی نہیں بس آفس میں کچھ کام زیادہ تھا۔ اور بھوکے رہنے کی وجہ سے چکر آ گیا تھا۔ لیکن وہ کسی طرح اس کی بات پر کان نہیں دھر رہی تھیں، وہ پہلی دفعہ انہیں اپنی طرف سے مطمئن کرنے میں بری طرح ناکام ہو رہی تھی۔ آفس سے کئی بار سر احمر، ارم اور دوسرے کولیگ کا فون آ چکا تھا۔ لیکن اس نے کسی سے بھی بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر طبیعت سنبھلنے پر اس نے بلال کے ہاتھ ارم کے گھر استعفیٰ بھجوا دیا تھا۔ اگلے دن وہ گھر آ گئی اور اب بھی وہ مروت کے ہاتھوں اس سے منہ نہ پھیر سکی۔ امی خوشی خوشی

ارم کی خاطر تواضع میں لگ گئیں البتہ ثمرہ برے برے منہ بناتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ وجہ یہ تھی کہ امی اور بلال کوئی بھی ضرورت کے علاوہ بات نہیں کر رہا تھا۔ جبکہ نمرہ اس طرح بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ حیدر بزنس کے سلسلے میں کچھ دن ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس لیے وہ نمرہ کی بیماری سے انجان تھا۔ ابو اندر ہی اندر فکرمند ضرور تھے لیکن کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ عمر، بوا کے ساتھ خیریت دریافت کرنے آ گیا تو امی نے بوا کو اپنے پاس بٹھا لیا جبکہ عمر تھوڑی دیر میں معذرت کرتا ہوا بلال کے ساتھ نمرہ کے کمرے کی طرف بڑھا تھا کہ راستے میں ثمرہ نے بلال کو حیدر کے فون کا بتا دیا۔ بلال عمر کو اندر کی طرف جانے کا اشارہ کرتا، ثمرہ کے ساتھ فون سننے چلا گیا۔ کیونکہ اس نے آج جلدی آفس پہنچنا تھا کیونکہ اس کی بہت اہم میٹنگ تھی۔ ابھی وہ دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اندر سے آتی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"تم پاگل ہو گئی ہو.....؟ بجائے اس کے کہ سر احمر کو اپنی رضامندی دیتیں الٹا تم جاب سے ریزائن کر رہی ہو۔ کیا اب گھر کے حالات تمہارے سامنے نہیں ہیں.....؟" ارم کی آواز میں غصہ، جھنجلاہٹ نمایاں تھی اس کے برعکس نمرہ ہمیشہ کی طرح پرسکون لہجے میں بولی۔

"پاگل نہیں ہوں، تب ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ گھر کے حالات بے شک میرے سامنے ہیں لیکن اب میں مزید اپنی ذات کے حوالے سے ایشو برداشت نہیں کر سکتی۔ جب تک کسی کو معلوم نہ تھا تب تک اور بات تھی لیکن اب..... اب بالکل نہیں....." اس کی بات پر ارم چپ سی ہو گئی جبکہ نمرہ کہہ رہی تھی۔

"پہلے بھی اس کی ذات نے وسیلہ بنایا تھا۔ اب بھی وہی وسیلہ بنائے گا۔ ہم اس قابل کہاں کہ کسی کو رزق عطا کرنے کے اہل ٹھہریں۔"

"بہرحال، تم اچھا نہیں کر رہیں۔ پاگل لڑکی! عیش کرو گی سر احمر کے ساتھ۔"

"پلیز ارم! میں اب اس ٹاپک پہ مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔" نمرہ نے بغیر اسے شرمندہ کیے، اس کی غلطی کا احساس دلائے سادہ لہجے میں کہا تو وہ فی الوقت اس کی شخصیت کے رعب کے زیر اثر آ گئی پھر جلد ہی اٹھ گئی۔

"اچھا پھر میں چلتی ہوں اگر تم ایک دفعہ سوچنا چاہو تو ضرور سوچ لینا۔" "میں نے اچھی طرح سوچ کر ہی ریزائن دینے کا کہا ہے اگر تمہیں کوئی پرابلم ہو رہا ہے تو مجھے بتا دو۔" وہ اب کی دفعہ سختی سے بولی تو ارم اس کی نظروں سے خائف ہوتی اپنی جگہ گڑبڑا گئی۔ پھر لہجے میں خود ساختہ فکرمندی سموتے ہوئے بولی۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے۔ تم فکر مت کرنا۔ جیسے ہی کوئی اچھی جاب میری نظروں سے گزری۔ میں ضرور اطلاع کروں گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں خود ڈھونڈ لوں گی۔ مجھے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے نہ آج اور نہ ہی آئندہ۔" وہ قطعیت سے کہتے ہوئے سرد مہری سے ہونٹ بھینچ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی، شدت جذبات سے اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ اب کی بار عمر نے مداخلت ضروری سمجھی اور بلند آواز میں سلام کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ ارم نے ایک تیز نظر نمرہ پہ اور دوسری نظر عمر پر ڈالی اور باہر نکل گئی۔ عمر پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جبکہ اب وہ نظریں جھکائے سختی سے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پیوست کیے ہوئے تھی۔ یکدم خاموشی نے سانس لیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی....." وہ ماحول کو اپنے لہجے کے موافق کرنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ سیاہ رنگ کے سوٹ میں اپنے سوگوار حسن سمیت کسی بھی قلعے کو فتح کرنے کے لیے کافی تھی۔ عمر کو لگ رہا تھا کہ وہ پہلی نظر میں ہی اس کی شخصیت کا اسیر ہو گیا تھا کجا اس سے باضابطہ گفتگو۔

"ڈاکٹر شہلا آئی تھیں۔؟" لہجے میں اپنائیت ہی اپنائیت تھی۔

"جی....." نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔

"میڈیسن لی آپ نے۔" لہجے میں ذمہ داری کا احساس نمایاں تھا۔

"جی....." وہ اب بھی بغیر نظریں اٹھائے اس سے مخاطب تھی، لگ ہی نہیں رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے جو شعلہ بنی ہوئی تھی اب شبنم میں ڈھلی ہوئی ہے۔ وہ اس پر نظریں جمائے آہستہ سے بولا۔

"جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ آپ بیمار بالکل اچھی نہیں لگتیں۔"

"جی....." جواب مختصر تھا لیکن آواز کی لرزش بتا رہی تھی کہ وہ ضبط کے کن مراحل میں تھی، کہاں اس نے اپنے کسی کزن سے دو سیکنڈ سے زیادہ بات نہیں کی اور اب یہ عالم تھا بے خودی کا کہ وہ مسلسل اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کبھی مختصر تو کبھی ایک آدھ جملہ بول رہی تھی جیسے یہ معمول کی بات ہو۔

"میں شام کو آؤں گا۔" الفاظ عام تھے لیکن لہجے میں دنیا جہان کا اشتیاق تھا کہ جیسے وہ کہے گی۔

"میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

"آؤں پھر شام کو.....؟" وہ نجانے کیوں ایک ہی پل میں سارے فاصلے مٹا کر آنکھوں میں ڈھیروں احترام لیے شوخی سے مخاطب ہوا تو وہ تحیر سے بے ساختہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی اور یہی لمحہ تھا کہ جب عمر کو لگا کہ اب وہ کبھی خود کو اس لمحے کی قید سے آزاد نہ کرا سکے گا۔

"جی....." ناسمجھی سے کہتے ہوئے وہ معصومیت سے بولی تو وہ بے ساختہ اپنی بے اختیاری پر ہنس پڑا۔ ثمرہ نے اچانک ہی کمرے میں حاضری دی ہاتھ میں فون سیٹ تھا۔ چہرے پہ نہ سمجھ میں آنے والے تاثرات

تھے۔

"ثمرہ! تمہارے لیے حیدر کا فون ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک نظر عمر پر ڈالی اور باہر نکل گئی۔ باہر سے بلال عمر کو آوازیں دینے لگا تو وہ ہونق بنی ثمرہ پہ ایک نظر ڈال کر مسکراہٹ دباتا باہر نکل گیا۔ وہ اپنی جگہ گم صم سی تھی۔ ثمرہ کی حرکت پر وہ بری طرح پریشان تھی کیونکہ وہ پہلے ہی حیدر سے بات کرنے سے منع کر چکی تھی پھر عمر کے سامنے اس طرح کی حرکت کا کیا مطلب تھا۔ ریسیور ہاتھ میں لیے وہ بری طرح حیدر کی آواز نظر انداز کر رہی تھی۔ سوچیں اسے اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہی تھیں۔ لیکن بے بسی کی انتہا یہ تھی کہ وہ کھوکھلے وجود کو بچانے سے گریزاں تھی۔

"ثمرہ! خدا کے لیے میری بات سنو۔ مجھے اپنی طبیعت کے بارے میں بتاؤ میں یہاں بہت پریشان ہوں....." وہ ریسیور کریڈل پر رکھ کر، بیڈ کی پشت سے کمر ٹکائے، آنکھیں موند گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وقت کا کام گزرنا تھا۔ اتنی تیزی سے گزرے گا کم از کم اسے امید نہ تھی۔ ابو نے دن رات محنت کر کے پھر سے مارکیٹ میں اپنی ساکھ بنالی تھی۔ ثمرہ کو نوکری کی اجازت بڑی آسانی سے مل گئی تھی۔ نجانے اس نے کیا صور پھونکا تھا کہ گھر میں کوئی بھی دوبارہ سے ثمرہ کی نوکری کے حق میں نہ تھا۔ امی اور بلال پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھتے تھے۔ ابو بھی آتے جاتے ہلکی پھلکی گفتگو کر لیتے تھے۔ البتہ ثمرہ کے دن رات کا کچھ پتا نہ تھا۔ گھر میں ہوتی تو ہر وقت افراتفری مچائے رکھتی، البتہ وہ اب بھی سکون سے ہر کسی کی ضرورت کا پہلے سے بڑھ کر خیال رکھتی، گھر کی مصروفیت کے علاوہ بچے اب ابھی پڑھنے آتے تھے۔ جن سے ثمرہ بدستور چڑتی تھی اگر کبھی جلدی آجاتی۔

آج بھی معمول کا دن تھا لیکن تایا، تائی کی بمعہ حیدر آمد نے اسے کچھ خاص بنادیا تھا۔ ثمرہ، بظاہر پرسکون امی کے ساتھ کچن میں لگی ہوئی تھی۔ بلال مارکیٹ سے چیزیں لینے چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں ابو، تایا تائی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے جبکہ حیدر تھوڑی دیر میں بلال کے آتے ہی چھت پر چلا گیا۔ ثمرہ خلاف توقع جلدی آفس سے آگئی۔ امی کے بتانے پر اس کی آنکھوں کی چمک بے تحاشا بڑھ گئی۔

"تو حیدر صاحب! آپ کو ہمارا خیال آہی گیا۔ اگر تم ہماری خوشی نہ بنے تو ہم بھی تمہیں کسی کی خوشی نہیں بننے دیں گے۔" ثمرہ کی بڑبڑاہٹ ثمرہ تک آسانی سے رسائی حاصل کر گئی پھر جیسے ہی وہ کپڑے تبدیل کر کے باہر صحن میں چائے پینے کی غرض سے آئی۔ تب تک حیدر، بلال کے ساتھ نیچے آگیا۔ بلال، حیدر سے معذرت کرتا اپنے دوست کی طرف چلا گیا کیونکہ کل اس کا ایک بہت اہم ٹیسٹ تھا جس کی تیاری انہوں نے مل کر عمر کی بیٹھک میں کرنی تھی۔ ابو کی آواز تایا تائی سے نمایاں تھی۔ امی نے ہی اندر چیزیں پیش کی تھیں۔ گزرے دنوں کی کوئی تلخی، خفگی یا ناراضگی کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ اپنوں سے ملنے کی حقیقی خوشی پھوٹ رہی تھی۔ ابو البتہ سپاٹ چہرہ لیے گفتگو میں حصہ لے رہے تھے۔ تایا تائی کے لیے یہ سب غیر متوقع تھا۔ البتہ حیدر کا ذہن مختلف سوچوں کا شکار تھا۔ عجب کشمکش میں گھرا وہ محو انتظار تھا۔ ثمرہ کا دل نجانے کیوں گھبرانے لگا۔

وہ کچن سے باہر نہیں آئی البتہ صحن میں کھڑی ثمرہ اور حیدر کی آواز بخوبی سن رہی تھی۔

"تم کیس واپس لو ثمرہ! یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اتنی مشکل سے حالات اپنے حق میں کیے ہیں۔ اور تم نے....." حیدر کی آواز میں دبا دبا غصہ تھا جبکہ ثمرہ کے چہرے پر بڑی دلآویز مسکراہٹ تھی۔

"کیس واپس لے لوں لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم ہمارا حصہ آرام سے دے دو گے؟"

"تم مجھ پہ اعتبار کرو....."

"سوری! تم پہ اعتبار کیا تھا جب ہی اتنی دیر ہو گئی ورنہ میں زیادہ ڈھیل دینے کی قائل نہیں ہوں۔" ثمرہ کے لہجے میں بے مروتی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حیدر یک دم بپھر اٹھا۔

"تم نہایت بے وقوف لڑکی ہو۔ تمہیں ذرا خاندان کی بدنامی کی پروا نہیں۔ تمہیں صرف اپنی ذات نظر آتی ہے تم....."

"شٹ اپ حیدر! اگر مجھے خاندان کی بدنامی کی فکر ہوتی تو آج تم اس دہلیز پہ کھڑے نہ ہوتے۔ ابھی صرف تمہیں نوٹس ملا ہے اگر کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔ ورنہ آئندہ کے حالات کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔" وہ بغیر کسی کا لحاظ کیے بولی تو وہ شدید طیش میں گھر گیا۔

"تم کس کی بنا پر اتنا بڑا دعوا کر رہی ہو۔ اس احمر کی وجہ سے.....؟"

"جب معلوم ہے تو اعلان کیوں کر رہے ہو۔ میں تمہاری طرح چوری چھپے محبت کر کے حالات سازگار کرنے کے چکر میں بوڑھی نہیں ہوں گی بلکہ علی الاعلان اس بات کا اعتراف کروں گی۔" وہ تمسخرانہ انداز میں اپنی عادت کے مطابق اس کی ذات کے بخیے ادھیڑنے لگی۔

"حیدر! تمہارا المیہ تو یہ ہے کہ جس سے محبت کرتے ہو اس کو بتا بھی نہیں سکتے۔ معلوم ہے کیوں.....؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی تو وہ اپنی جگہ ٹھٹک گیا۔

"کیوں کہ تم اس کی چپ سے ڈرتے ہو۔ اس کی رگ رگ سے واقف ہونے کے باوجود اس کے ٹھکرانے سے ڈرتے ہو.....؟ شاید میں غلط کہہ رہی ہوں..... ہے نا.....؟ اب تسلی دو اپنے دل کو۔ میرے خیال سے تایا، تائی اب تک ابو، امی پر پریشر ڈال چکے ہوں گے میں ذرا اندر کی صورت حال معلوم کر لوں تم..... بس۔" اس نے ذرا کی ذرا اس سفاک حقیقت پسند، خود غرض اور سرکشی میں ڈوبی لڑکی کو دیکھا جو بڑے بے رحم انداز میں کہہ رہی تھی۔

"تم بس اچھے دنوں کا انتظار کرنا۔" باہر حیدر کی حالت، اندر بیٹھی ثمرہ کی حالت سے مختلف نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

عمر نے کافی دنوں کے بعد چکر لگایا تھا۔ مصروفیت زیادہ تھی، لیکن پھر بھی وہ سمیرا، فائدہ، فراز اور بوا سے مسلسل اس کی خیریت دریافت کرتا رہتا۔ اس لیے بھی وہ گھر کے سارے حالات سے واقف تھا۔ بلال حسب معمول ابو کے ساتھ دکان پر گیا ہوا تھا کیوں کہ سالانہ امتحان دینے کے بعد فارغ تھا۔ ثمرہ آفس سے آنے والی تھی امی کچن میں تھیں وہ انہیں سلام کرتا سیدھا ثمرہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ ثمرہ کی طبیعت خراب تھی وجہ جو تھی وہ اسے ماننے سے گریزاں تھی۔ دل آزاری کا خوف اسے آکٹوپس کی طرح جکڑے ہوئے تھا۔ اب بھی وہ بیڈ کی پشت سے سر ٹکائے، کھڑکی کے پٹ پر نظریں جمائے ہوئے تھی، جو ہوا کی وجہ سے آپس میں ٹکرا رہے تھے۔

"بھائی نے ثمرہ کے لیے حیدر کا رشتہ دیا ہے۔" فکر مند آواز آئی۔

"تو آپ ہاں کر دیتے، سوچ بچار کا وقت کیوں لیا۔" خوشی سے لبریز آواز ماں کی تھی۔

"لیکن وہ کہہ رہے تھے یہ اسی صورت ممکن ہے جب ہم کیس واپس لے لیں۔" اندیشوں سے بھرا انداز ابو کا تھا۔

"ہاں تو ٹھیک ہے۔ آپ کیس واپس لے لیں۔" صلح جو انداز میں امی نے کہا۔

"کیوں واپس لے لیں۔ اگر انہیں اتنا ہی نام اچھلنے کا خطرہ ہے تو خاموشی سے انصاف کے ساتھ جائیداد میں سے حصہ دے دیں۔" قطعیت سے بھرا لہجہ ثمرہ کا تھا۔

"تم چپ رہو۔ تم سے کسی نے رائے نہیں مانگی۔" مستقبل کے اندیشوں وسوسوں میں گھری فکر مند آواز ماں کی تھی۔

"رائے نہیں مانگی تھی۔ تب ہی تو ہمیں یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔ کیا آپ کی بیٹی اتنی گری پڑی ہے کہ آپ ہر جائز ناجائز مطالبہ مان کر اسے رخصت کر دیں گی یا ہمیشہ اپنا حق چھوڑ کر دوسروں سے امداد حاصل کر کے احسان مند ہوتی رہیں گی۔" پرخطر، ٹھوس آواز میں باغی لہجہ یقیناً ثمرہ کا تھا۔

"تم بکواس مت کرو۔" ایک مجبور ماں۔
"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" بے لچک، مضبوط ارادہ میں ڈھلی آواز باپ کی تھی اور پھر حیدر کو انکار ہو گیا۔
ہوا نے پھر سے رخ بدلا۔
"تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا..." ناراضی میں ڈوبا لہجہ شکایت کر رہا تھا۔
"میں اولاد کو والدین سے علیحدہ کر کے بددعائیں سمیٹنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔" مبہم سے انداز میں تردید کی گئی۔
"اپنے بارے میں کہہ رہی ہو، لیکن... میرا بھی سوچا۔" خفا خفا انداز میں کہا گیا۔
"تمہارا ہی سوچا تھا..." دل کی آواز آئی۔
"غلط کہہ رہی ہو۔ ہمیشہ دوسروں کا سوچتی ہو۔ کبھی اپنے دل کا بھی سوچا۔" وہ طیش بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔
"وہ دوسرے بھی میرے اپنے ہیں۔" ٹھوس انداز میں تصدیق کی گئی۔
"اور میں کچھ بھی نہیں...؟" آنسوؤں کے گولے میں پھنسا، احساس کمتری میں ڈبا آخری شکوہ۔
اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے اس گھر سے رخصت ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"اوہو! آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں۔" ثمو جیسے ہی آفس سے آئی، امی کے حکم پر فوراً چائے لے کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ کیوں کہ آتے ہی اسے اطلاع مل گئی تھی کہ عمر آیا ہوا ہے۔ اس لیے وہ بغیر تھکن کو خاطر میں لائے، لوازمات کے ہمراہ چائے لیے کمرے میں داخل ہوئی اور بلند آواز میں خوش دلی سے بولی تو عمر سلام کا جواب دیتے ہوئے ہنس کر بولا۔
"جی جناب! آپ کو تو توفیق نہیں ہوئی، میں نے سوچا میں ہی چلا جاتا ہوں۔ ویسے تمہیں دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ بے مروت کسے کہتے ہیں۔ ایک گلی میں رہتے ہوئے استاد کی خیریت پوچھی نہیں جا سکتی۔" عمر کے شکوے پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"سر عمر! اب آپ یہ زیادتی کر رہے ہیں، میں تو روز ہی سمیرا یا فاہد سے آپ کے بارے میں پوچھتی ہوں البتہ آپ سال میں ایک دفعہ چکر لگاتے ہیں۔"
"اب تم غلط کہہ رہی ہو۔ میں تقریباً" ایک ہفتے سے روزانہ آ رہا ہوں۔" عمر نے ایک نظر خاموش بیٹھی نمرہ پر ڈال کر کہا۔
"تو سر، عیادت کے لیے آ رہے ہیں، شاگرد کی مزاج پرسی کے لیے نہیں آ رہے۔" ثمرہ نے اس کی نظر کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔
"چلو، کسی نہ کسی طرح آ تو رہا ہوں نا!" عمر نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا تو وہ کھنکتے لہجے میں بولی۔
"ہم تو بے وقت دشمن کو بھی نظرانداز نہیں کرتے۔ آپ تو پھر...؟ ویسے آج سمیرا نظر نہیں آ رہی۔" ثمرہ نے نجانے کیوں فوراً" بات بدلی۔ نمرہ نے بہت توجہ سے اس کا چہرہ دیکھا، عمر صرف اڑتی بھاپ پر نظر جمائے پرسوچ انداز میں گویا ہوا۔
"کیس کب سے شروع ہو گا...؟"
"اگلے ہفتے پہلی پیشی ہے۔" ثمرہ نہ چاہتے ہوئے بھی سنجیدہ ہو گئی۔
"انکل سے اجازت لی...؟" وہ اس کی خود سری سے واقف تھا۔
"ظاہری بات ہے۔ ابھی میں اتنی باغی نہیں ہوئی کہ بغیر بتائے اپنی مرضی سے چل پڑوں۔" وہ لاپروائی سے نمرہ کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی۔ نمرہ نے فقط ہونٹ بھینچے اور نظریں جھکا کر اپنی ہاتھ کی لکیروں کو دیکھنے لگی۔ عمر کو لگا جیسے کمرے کی فضا میں حبس بڑھ گیا ہو۔
"تم نے سوچا کہ پڑھائی ادھوری چھوڑ کر تم نے اچھا نہیں کیا۔ جاب کرو گی تو پڑھائی کا کیا بنے گا...؟" وہ فکرمندی سے گویا ہوا۔
"کیا بنے گا...؟" وہ الٹا سوالیہ انداز میں گویا ہوئی۔ انداز ہنوز لاپروا، بے نیاز اور دل جلانے والا تھا۔
"پلیز سر! یہ مس نمرہ بھی مجھ سے ناراض ہیں۔" وہ

چڑچڑے انداز میں بولی "کہ میں نے پڑھائی چھوڑ کر جاب کیوں کر لی۔ بلکہ اس سے زیادہ اس بات پر حیران ہیں کہ اتنی جلدی مجھے جاب کیسے مل گئی اور جب میں نے وجہ بتا دی تو پانچ سیکنڈ کی ناراضگی پانچ دنوں میں بدل گئی۔" وہ کسی خیال سے جھنجلائی۔ "بھئی! ارم آپ کے ساتھ کیسی تھی۔ کیسی نہیں تھی۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ مجھے صرف جاب سے مطلب ہے اب وہ کس طرح ملی اس چکر میں مجھے بوڑھا نہیں ہونا۔"
"ارم کے ذریعے سے تمہیں جاب ملی ہے...؟" عمر واقعی حیران ہوا تھا اس کی بے نیازی پہ۔
"ہاں بالکل! اسی آفس میں۔" اس نے ایک اور انکشاف کیا۔
"اوہ..." وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔
"ثمو بی بی، ہر بات کو آرام سے نہیں لیتے۔ پیپرز تمہارے سر پر ہیں اور تم نے جاب کا بھوت سر پر سوار کر لیا ہے۔" وہ ڈپٹنے والے انداز میں نرم لہجے میں بولا تو وہ خفگی سے اسے دیکھنے لگی۔
"بس کر دیں سر! مجھے ایک یہ نمرہ ہی کافی ہے نصیحتوں کے لیے۔ آپ کو میں بالکل برداشت نہیں کروں گی۔"
"کیا مطلب...؟" اس نے آنکھیں دکھائیں۔ تو وہ عمر کے انداز پر ایک بار پھر ہنس پڑی۔
"مطلب یہ کہ مجھے جو اس وقت اہم لگا۔ وہ میں نے کر لیا۔ اگر آپ کو میری اتنی ہی پروا ہے تو شام کو سمیرا کے ساتھ مجھے بھی اسٹڈی کے لیے ایک گھنٹہ دے دیں۔ آئی پرامس یو، میں آپ کو بالکل بھی تنگ نہیں کروں گی۔" وہ اتنے آرام سے بولی کہ نمرہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی اور اب اس صورت حال میں ہنسنے کی باری عمر کی تھی۔
"تمہارا کیا خیال ہے یہ بہت آسان ہو گا...؟" وہ جیسے اس کو چیلنج کرنے لگا۔
"میرے خیال سے اتنا مشکل بھی نہیں اب اگر آپ نہ پڑھائیں تو وہ الگ بات ہے۔" وہ لاپروائی سے بسکٹ کھاتے ہوئے بولی تو وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا پھر رسانیت سے بولا۔
"اگر تمہارا خیال ہے کہ تم مینیج کر سکتی ہو، تو ٹھیک ہے۔ میری طرف سے اجازت ہے تم کل سے ہی ہمیں جوائن کر لو۔" عمر کے جواب دینے پر وہ پرجوش لہجے میں تقریباً" چیختے ہوئے بولی۔
"تھینک یو سو مچ سر!"
عمر اس کے انداز پر مسکرانے لگا تو وہ تیزی سے اپنا آئندہ کا لائحہ عمل بتانے لگی۔ تھوڑی دیر میں ہی امی نے ثمرہ کو آواز دے ڈالی تو نہ چاہتے ہوئے بھی نمرہ بول پڑی۔ اس وقت اسے محسوس ہو رہا تھا۔ ثمرہ اگر اس لمحے کسی کی بات مان سکتی ہے تو وہ صرف عمر ہے۔
"عمر پلیز! اسے سمجھائیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ایک وقت میں ایک ہی کام اچھا لگتا ہے۔ اتنی محنت اس کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔" نمرہ کے لہجے میں ثمرہ کے لیے دنیا جہان کی فکرمندی تھی وہ اس کی محبت پر رسانیت سے بولا۔
"نمرہ! کیا ٹھیک ہے اور کیا نہیں، اس کا فیصلہ وقت ہی کرے گا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے بھی زندگی کی حقیقت کو قریب سے دیکھنے کا موقع دو۔ اسے بھی سمجھنے دو کہ خواہشوں کے حصول کے لیے کس طرح زندگی کو برتا جاتا ہے۔ میرے یا تمہارے منع کرنے سے وہ باز نہیں آئے گی بلکہ تجسس کا شکار ہو کر بغاوت پہ آمادہ ہو جائے گی۔" نمرہ الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی جب کہ وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔
"اس کی ہمت بندھاؤ۔ اپنی صلاحیتوں کو منوانے کا موقع دو۔ حوصلہ افزائی کرو، لیکن اس کا راستہ مت روکو۔ کیونکہ خود سری کا جذبہ صرف روندنا جانتا ہے سمیٹنا نہیں۔" عمر کی بات پر وہ ایک تھکن زدہ طویل سانس لے کر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر بیٹھ گئی۔ خاموشی بڑی سرعت سے اپنی جگہ بنا رہی تھی۔
مایوسی، اداسی اور بے زاری نے اسے اندر تک نڈھال کر دیا تھا۔ وہ اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی جو

ایک طرف اسے صحیح قرار دے رہی تھی تو دوسری طرف اسے بری طرح شرمندہ کررہی تھی کہ اپنی ذات کو مقدم جان کر اس نے گھر والوں کے بارے میں سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اگر وہ آج تھوڑا سا برداشت کرلیتی تو ثمرہ کو اپنا کل محفوظ کرنے کے لیے نوکری نہ کرنا پڑتی۔ عجیب سی سوچیں تھیں جو پیچھا چھوڑنے کا نام نہ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

نمرہ کے لیے عمر کا پروپوزل آیا تھا اور بغیر کسی اعتراض کے قبول کرلیا گیا تھا۔ نمرہ اپنی جگہ گم صم سی تھی۔ ثمرہ اور بلال کا خوشی کے مارے برا حال تھا جس کا اظہار کرنے میں وہ خود کو حق بجانب سمجھ رہے تھے۔

"سچ! جب پہلی دفعہ میں نے عمر بھائی کو دیکھا' مجھے لگا جیسے وہ آپی کے لیے بنائے گئے ہوں جب وہ گھر کے ہر فرد کے لیے فکر مند ہوتے تھے اسی وقت سے میں دعا مانگتا تھا کہ خدا حالات عمر بھائی کے حق میں کردے۔"

بلال کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خوشی میں کیا کر ڈالے۔ امی بھی خوشی خوشی بوا کے ساتھ لگی' صندوق سے سامان نکال رہی تھیں۔ ابو لسٹ بنارہے تھے۔

گھر میں چہل پہل معمول سے ہٹ کر تھی۔ محلے میں مٹھائی بڑے اہتمام کے ساتھ بانٹی جارہی تھی۔ ہر کوئی وقفے وقفے سے مبارک باد دینے آرہا تھا۔ ثمرہ بظاہر خوشی کے ساتھ خاطر تواضع میں لگی ہوئی تھی۔

وہ چپ چاپ سی کمرے میں بیٹھی تھی کہ ٹیلی فون کی متواتر بجتی گھنٹی نے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ ریسیور ہاتھ میں لیے ساکت تھی۔

کیا کہنا چاہیے؟ معذرت' معافی' کیا دینا چاہیے؟ دلاسا' تسلی' حوصلہ کیا ظاہر کرنا چاہیے؟ خفگی' غصہ' بے نیازی وہ کچھ نہیں کہہ رہی تھی' کچھ نہیں سن رہی تھی فقط محسوس کررہی تھی۔ لفظ آپس میں گڈمڈ ہورہے تھے۔ منتشر سوچیں بے چینی بڑھا رہی تھیں۔

دوسری طرف سے آنے والی آواز میں' کھو دینے کا احساس بڑی شدت سے محسوس ہورہا تھا۔ لہجے میں دکھ' تکلیف' اذیت' ملال نمایاں تھا۔

"میں نے جب تمہیں چاہا تھا۔ سمجھتا تھا کہ ساری کائنات میری مٹھی میں ہے' لیکن قسمت میں شاید تمہارا ساتھ میرے لیے نہ تھا۔۔۔" طویل سانس۔ "خیر جانے دو۔۔۔" اس نے تیزی سے خود سنبھالا اور زبردستی بشاشت پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "میری طرف سے تمہیں عمر مبارک ہو اور عمر کو تمہاری پرخلوص رفاقت مبارک۔۔۔ شاید۔۔۔" کڑا ضبط تھا لہجے میں "یقیناً"۔۔۔ اسی شخص کے حوالے سے تمہاری ذات معتبر ٹھہرنی تھی۔۔۔ تمہاری خوشی ہمیشہ کی طرح آج بھی کسی امتحان سے کم نہیں۔۔۔ میں سوچتا تھا یہ یک طرفہ محبت' میں اٹوٹ محبت میں بدل دوں گا۔۔۔ پتا نہیں مجھے شروع سے یہ لگتا تھا کہ اگر میں نے تم سے اظہار محبت کر بھی دیا تو تم مجھ سے ہمدردی ضرور کروگی۔" وہ خود اذیتی کی انتہا پر تھا۔ "لیکن آج معلوم ہوا کہ تم مجھے اپنی ہمدردی کے قابل بھی نہیں سمجھتیں۔۔۔ خیر۔"

"حیدر۔۔۔!" وہ تمام حوصلے مجتمع کرتے ہوئے بولی' وہ یک دم رکا وہ جانتی تھی وہ اس کی محبت مانتی تھی' لیکن کبھی بھی اس نے خود کو اس کا ہم سفر نہیں بنایا۔ اس کے خواب دیکھنے کی چاہ نہیں کی تھی نہ جانے یہ کیسا رشتہ تھا کہ وہ اس کو خوش دیکھنا چاہتی تھی' لیکن خوشی کا سبب اپنی ذات نہیں بنانا چاہتی تھی۔

"حیدر۔۔۔ میری بات غور سے سنو۔۔۔ ہم کبھی بھی اس راستے کے مسافر نہیں بنتے جس کی کٹھنائیاں' ہمیں اذیت میں مبتلا کرتی ہوں۔۔۔ تمہارا ملال بے معنی ہے۔۔۔ میں کبھی بھی۔۔۔" وہ یک دم اس کے ٹھنڈے ٹھار لہجے پر تڑپ اٹھا۔

"نہ نہ۔۔۔ بس۔۔۔ بس۔۔۔ ایسا کچھ مت کہنا جو میری روح کا ناسور بن جائے۔۔۔ تم مجھے نہیں چاہتیں تو نہ چاہو۔۔۔ لیکن اگر اقرار نہیں تو انکار بھی مت کرو۔۔۔ ٹھیک ہیں ہم اچھے دوست نہیں رہے۔۔۔ ہم میں کبھی کوئی وعدہ نہیں ہوا۔۔۔ لیکن پھر بھی ایک خاموشی کا رشتہ ہی سہی۔۔۔ بس۔۔۔ میری دعا ہے۔۔۔ تم ہمیشہ خوش رہو۔" دوسری طرف سے فون رکھا جاچکا تھا' لیکن وہ اب بھی جیسے کسی کی آواز کی گردش اپنے آس پاس محسوس کررہی تھی۔

"تم تھکتی نہیں ہو؟"

"نہیں۔۔۔" اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔

ابھی تم آنکھ جھپکو گے
ابھی میں ہاتھ اپنے دل پہ رکھوں گی
ابھی تم مجھ سے کہہ دوگے
جدا ہیں راستے اپنے' جدا ہیں منزلیں اپنی' مگر تم حوصلہ رکھنا
بچھڑنا ہی اگر لکھا ہے قسمت میں' تو اس میں دیر کاہے کی
چلو اس پل اسی لمحے بچھڑتے ہیں

رات کا پہلا پہر بڑی خاموشی سے محو سفر تھا۔ چاند کی کرنیں آہستہ آہستہ اپنی روشنی پھیلا رہی تھیں۔ فضا میں سکوت چھایا ہوا تھا' لیکن اس کے اندر شور مچا ہوا تھا جو اس کے سکون کو غارت کررہا تھا۔ وہ کھڑکی کی دہلیز پر' دونوں ہاتھ جمائے' گلی میں کم ہوتی چہل پہل کو دیکھ رہی تھی نجانے کہاں سے ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا اور آنکھوں میں دھند سی چھا گئی۔ ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی' لیکن وہ خود کو سمجھانے میں اتنی مگن تھی کہ اسے احساس ہی نہ ہوا کہ کمرے میں اس کے علاوہ بھی کوئی آگیا ہے۔

"تم مجھے یہ بتاؤ' اس وقت تم کس بات کا سوگ منا رہی ہو۔ حیدر کا پروپوزل ریجیکٹ ہونے کا یا پھر عمر کے پروپوزل پر ہامی بھرنے پر۔" ثمرہ نے جب اسے روتے دیکھا تو غصے سے بھڑک اٹھی۔ نمرہ نے تیزی سے چہرہ صاف کیا اور زبردستی مسکرانے لگی۔

"میں کسی بات کا سوگ نہیں منارہی۔ بس آنکھ میں شاید کچھ چلا گیا۔" اس کے لہجے میں انتہا درجے کا ٹھہراؤ اور سکون تھا۔ وہ اس کی بات ان سنی کرتے جھجھکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"جب تمہیں حیدر کے لیے رضامند کرتی تھی تو تمہاری جان کو یوسف چمٹ گیا تھا کسی آسیب کی طرح' اب عمر کے نام کی لاٹری نکل آئی ہے۔ تو تم اب بھی ناخوش ہو۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ تم فضول بات مت کرو۔" نمرہ نے ہونٹ بھینچتے ہوئے خود پر کنٹرول کیا اور تیزی سے اپنے بستر پر آگئی۔

"اب کسی بات کا دکھ نہیں ہے۔" وہ بستر کی پشت سے ٹیک لگا کر بولی۔

"یعنی پہلے تھا۔۔۔؟" ثمرہ نے اندھیرے میں اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"شاید۔۔۔؟" وہ اتنے آہستہ سے بولی جیسے خود سے باتیں کررہی ہو۔

"نمرہ! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے جاب کس لیے کی ہے؟ صرف تمہارے لیے' ابو کی سپورٹ کے لیے' اپنے اور بلال کے بہتر مستقبل کے لیے۔" ثمرہ اپنی عادت کے خلاف اسے سمجھانے کے لیے کمربستہ ہوگئی جو حیرانی سے اس کی مبالغہ آرائی سن رہی تھی۔ جو اپنی تنخواہ کا ایک چوتھائی حصہ بھی اپنی مرضی سے دیتی ہے گھر کا خرچا ابو اور بلال کی کمائی سے چل رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر بولی۔

"لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"بھاڑ میں گیا یہ تمہارا "نصیحت نامہ" تنگ آگئی ہوں میں سنتے سنتے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔" غصے سے ثمرہ کا چہرہ سرخ ہوگیا تو وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں جنہوں نے ہمارا سکون چھینا ہے انہیں سکون سے رہنے نہیں دوں گی' چاہے ان میں حیدر ہی کیوں نہ شامل ہو۔" ثمرہ بدلے کی آگ میں جلتے ہوئے بولی تو وہ گھبرا گئی۔

"ثمرہ! وہ شخص ٹھیک نہیں ہے تم جانتی ہو میں نے جاب کیوں چھوڑی۔۔۔؟" نمرہ نے آخری امید کے طور پر اسے سمجھانا چاہا تو وہ تمسخرانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں جانتی ہوں اس شخص نے تمہارے ساتھ افیئر چلانے کے بجائے تمہیں پروپوز کردیا تھا۔" ثمرہ نے بے خوفی سے اس کے سر پر دھماکا کیا کیونکہ اس

نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی۔

"تمہیں کس نے بتایا...." وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"سر احمر نے....؟" ثمرہ لاپروائی سے بستر تا نگیں لٹکا کر تیز تیز ہلانے لگی' جب کہ وہ ضبط کے کڑے مرحلے میں گھری اس کی بدگمانی دیکھ رہی تھی اس سے پہلے کہ وہ بولتی وہ یک دم بولی۔

"رہی بات نوکری چھوڑنے کی' تو تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ فریضہ امی اچھی طرح ابو کی برین واشنگ کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں' لیکن امی کو شاید اس بات کا ابھی تک پتا نہیں چلا کہ جس بات کے لیے میں ابو کو قائل کرلوں وہ ہو کر رہتی ہے۔" پھر منہ پر ہاتھ رکھے ہنسی کو روکتے ہوئے بولی۔ لہجے میں فقط تمسخر ہی تمسخر تھا۔

"تمہیں ایک اور بات بتانی تھی' حیدر انگلینڈ جارہا ہے ہمیشہ کے لیے 'اب پتا چلے گا تایا' تائی کو کہ کسی کو بے گھر کرنے کی تکلیف کیسی ہوتی ہے۔" ثمرہ نے خود کو پتھر ہوتے دیکھا جب کہ وہ آنکھوں میں اپنی جیت کا نشہ لیے اب مزے سے لیٹ گئی تھی۔

"کل بے چارے کا الوداعی فون آیا تھا۔ "تمہارے لیے۔" وہ اب بھی باز نہ آئی۔ "میں نے بڑے پیار سے کہا جناب عالی جو بات کرنی ہے مجھ سے کرلو کیونکہ ثمرہ تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ لاپروائی سے ہنسی۔ "شاید اسے میری سریلی آواز پسند نہیں آئی محترم غصے میں آگئے بس پھر کیا تھا مجھے تو سنہری موقع ملا تھا اپنی بھڑاس نکالنے کا۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

"میں نے بھی اس بدتمیز انسان کو خوب سنائیں جب سے کیس کیا تھا بڑا پھنے خاں بنا ہوا تھا۔ اتنے عرصے سے اسی کوشش میں لگی ہوئی تھی کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکل آئے' لیکن سرپھرے لوگوں کے لیے ٹیڑھی انگلیاں ہی کام آتی ہیں۔ سر احمر بتا رہے تھے اگلی پیشی پر فیصلہ ہمارے حق میں ہو جائے گا۔ آہا! اب مزا آئے گا۔" وہ چٹخارہ لیتے ہوئے کروٹ بدل گئی جب کہ وہ اپنی جگہ سن سی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

شادی میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ امی' ابو کی مصروفیت پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ ابو کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ بلال پڑھائی کے ساتھ دکان میں مصروف تھا۔ ثمرہ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ دیر سے آفس جاتی اور دیر سے ہی واپس آتی۔ گھر میں ہونے والے فنکشن میں اس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ البتہ گھر سے باہر کے کام وہ امی کے ساتھ بخوشی انجام دے رہی تھی جن میں کراکری کا سامان' کپڑے' جوتے اور فرنیچر وغیرہ شامل تھا۔ ہر چیز میں اس کی پسند نمایاں' منفرد ہونے کے ساتھ نہایت مہنگی تھی۔

آج بھی وہ شاپنگ کرکے تھکی ہاری آئی تھیں۔ امی آتے ہی سارا سامان دکھانے لگیں جب کہ ثمرہ جلدی سے ترو تازہ ہو کر پھر سے کہیں جانے کو تیار کھڑی تھی۔ امی نے حیرانی سے اسے تیار ہوتے دیکھا جو بازار میں تھکن سے بے حال تھی اور اب پھر سے چاق و چوبند کہیں جانے کے لیے دل جمعی سے تیار ہو رہی تھی۔

"تم کہاں جارہی ہو اس وقت؟" ثمرہ نے امی کے دل کی بات کہی کیونکہ جب سے کیس جیتا تھا تب سے وہ شاذ و نادر ہی کسی کو خاطر میں لاتی تھی۔ اوپر سے ابو کی بھرپور حمایت حاصل تھی' اس لیے امی بھی اپنی خود سر بیٹی سے گریز برتنے لگی تھیں۔

"کہاں جاسکتی ہوں؟" ثمرہ نے تیز لہجے میں الٹا اسی سے پوچھا تو وہ ایک نظر امی کے پریشان چہرے پر ڈال کر پھر سے بولی۔

"یہ تو تم ہی بتا سکتی ہو۔"

"ثمرہ صاحبہ! میں دعوتیں اڑانے نہیں جارہی بلکہ آفس سے چھٹی لے کر آئی تھی کیونکہ آج رات بزنس ٹور کے سلسلے میں ہم ملک سے باہر جارہے ہیں۔ اس لیے سر احمر نے کہا تھا کہ شام تک آفس پہنچ جاؤں۔" ثمرہ نے انگارے چباتے ہوئے وضاحت کی۔ اس کی بات پر وہ دونوں دنگ رہ گئیں۔

"لیکن رات.... رات باہر رہنے کی اجازت ابو نے نہیں دی' یہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے۔ تمہیں منع کردینا چاہیے تھا۔" ثمرہ نے امی کے ہاتھ پر دباؤ ڈالتے' رسانیت سے کہا تو نجانے کیوں وہ یک دم بھڑک اٹھی۔

"ابو کی تم بات رہنے دو۔ ابو کو میں بتا چکی ہوں' لیکن تمہیں میں یہ بتا دوں کہ پیسے درختوں پر نہیں لگتے جب دل چاہا توڑ لیے۔ ان کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔"

"محنت کرو' لیکن اپنی حدود کا بھی خیال رکھو۔" وہ اب بھی نرمی سے بولی ورنہ محنت کے معنی اس سے زیادہ اچھی طرح جانتی تھی۔

"مجھے اپنی حدود کا پتا ہے۔ تم اپنے یہ فضول اعتراضات اپنے پاس رکھو۔" وہ نہایت کھردرے لہجے میں بولی تو امی بھی بول پڑیں۔

"یہ فضول اعتراض نہیں ہے وہ ٹھیک کہہ رہی ہے رات باہر...." امی نے بھی اس کی حمایت لی تو وہ درمیان میں ہی ان کی بات کاٹ گئی۔

"امی جی! باہر نکل کر دیکھیے کہ رات کو دن میں کیسے بدلا جاتا ہے۔ آپ نے ساری عمر گھر میں دو کے چار کرتے گزار دی اور یہ محترمہ باہر ضرور نکلیں' لیکن جلد ہی اپنے مقام پر آگئی ہیں' لیکن میں...." اس نے انگلی اٹھا کر اپنی طرف اشارہ کیا۔

"میں صرف گھر تک محدود ہو کر نہیں رہ سکتی۔ میں نے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ آگے بڑھنا ہے اور ڈھیر ساری دولت اور آسائشوں کو حاصل کرنا ہے جو صرف آپ لوگوں کی روک ٹوک کی وجہ سے مجھ سے دور ہیں۔"

"ثمرہ! بدتمیزی مت کرو۔" ثمرہ امی کو ہراساں دیکھ کر زور سے بولی تو وہ بڑی دلاویز مسکراہٹ سجائے قریب آتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے جناب! میں بدتمیزی نہیں کرتی' لیکن آئندہ میرے معاملات میں مداخلت مت کرنا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" ثمرہ کا لہجہ آخر میں نہایت روکھا اور سرد ہو گیا۔ تیزی سے ہینڈ بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ امی منہ پر دوپٹا رکھے سسکنے لگیں تو وہ شکستہ حالت میں انہیں سنبھالنے لگی۔ کمرے میں چاروں طرف بکھرا بیش قیمت سامان اپنی بے وقعتی پر حیران ہو رہا تھا کیونکہ کمرے میں موجود نفوس ان کی ہوس سے پاک تھے۔ تقدیر ان کے خدشوں کو سچ کرنے چلی تھی جس سے وہ دونوں انجان تھیں۔

☼ ☼ ☼

رات کا نجانے کون سا پہر تھا وہ چت لیٹی یک ٹک چھت کو تکے جارہے تھی۔ نجانے کس احساس کے تحت اس نے کروٹ لی تو نظریں خود بخود ثمرہ کے وجود پر ٹک گئیں شادی کے بعد آج وہ پہلی مرتبہ گھر رہنے کے لیے آئی تھی۔ نیند میں بھی چہرے پر بڑی معصوم سی دلکش مسکراہٹ تھی۔ آج بہت عرصے بعد اتنا پرسکون دیکھا تھا ورنہ جب سے اس نے نوکری کی تھی ثمرہ اکثر پریشان مضمحل سی رہنے لگی تھی۔

"اگر اس بے وقوف کو پتا چل جائے کہ خالہ اور ابو کو بھڑکانے میں کس کا ہاتھ تھا تو شاید یہ مجھ سے بات بھی نہ کرے۔ لیکن نہیں یہ بہت ڈھیٹ ہے۔ تب شاید مجھے جلانے کے لیے اپنی مسکراہٹ سے نواز دے۔ اور احسان جتاتے ہوئے کہے۔ اس میں تمہارا قصور نہیں' تم دل چھوٹا نہ کرو.... یہ سب اسی طرح ہونا تھا' پتا نہیں' یہ لڑکی شکوہ کیوں نہیں کرتی' مجھ سے لڑتی کیوں نہیں' مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس نے کبھی ڈانٹا بھی ہو۔ صرف اچھی بہن نظر انداز آنے کے لیے ہونہہ۔" اس کی ذہنی رو پھر بھکی' نظر۔ روشن دان پر جم سی گئی۔ میں نے شروع سے اس شخص کو اپنا مانا' اس کے لیے اپنے باپ سے بغاوت کی' لیکن اسے...." اس کا دل پھر سے بھڑ بھڑ جلنے لگا۔

اسے حال سے زیادہ ماضی سے وابستہ یہ عزیز تھی۔ یہ جو ماں باپ کی رضا میں راضی نجانے کب سے اس سے گریزاں تھی۔ اگر یہ اس سے گریز نہ برتی تو یقیناً اس شخص کی اسیر ہو جاتی۔ لیکن پھر "اچھی بیٹی" کا

لیبل ہٹ جاتا۔" وہ بدگمانی کی انتہا پر تھی۔ "میری ماں نے ہمیشہ اسے مجھ پر ترجیح دی۔ میرے باپ نے ہمیشہ غیر محسوس انداز میں اس کی طرف داری کی۔ میرے اکلوتے بھائی نے ہمیشہ اس کی رائے کو صحیح گردانا۔ تو میں کیوں اپنے سکون کی دشمن سے اچھی بیٹی ہونے کا خراج وصول نہ کرتی۔ لیکن یہ میری سوچ سے زیادہ "ناٹک باز" ثابت ہوئی۔ جو اتنی آسانی سے یوسف سے دستبردار ہوگئی۔ اور حیدر......؟ جو اپنی محبت کا کشکول لیے نجانے کب سے اچھے وقت کے انتظار میں رہا۔ لیکن مجھے یہ کھلی چٹنگ نظر آگئی کہ میرے ذریعے نمرہ تک پہنچنا چاہتا تھا اور یہ حقیقت معلوم ہوتے ہی میں نے سر احمر کی طرف پیش قدمی کردی کیونکہ میں حیدر کو...... کس صورت بھی نمرہ کا ہونے نہیں دینا چاہتی تھی اور اگلا پتا مجھے وہاں لے گیا جہاں کا میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ خیر...... اس احمق نے اب بھی لحاظ نہ کیا اور ہری جھنڈی دکھادی۔

یہ لڑکی نجانے کس مٹی کی بنی ہے۔ جو اپنے سے زیادہ دوسروں سے وابستہ لوگوں کی فکر میں دبلی ــــ ہوتی ہے...... ہاں بھئی...... آخر "اچھی بیٹی" بن کر بھی تو دکھانا ہے۔ اور اب عمر؟ میں نے سوچا تھا کہ وہ اس شخص کے خلاف ضرور احتجاج کرے گی جو اپنے تایا کے ٹکڑوں پر پل رہا تھا گھر اپنا سہی لیکن تھا تو آثار قدیمہ کا نمونہ 'پھر دیور' نند اور اس پہ اضافی بوجھ بوا کا۔ لیکن نہیں 'اس نے یہاں پر بھی کوئی اعتراض نہ کیا اور سر جھکا کر ہامی بھرلی۔ کیا ہے یہ لڑکی......؟ جو ہمیشہ میری راہ کھوٹی کرتی آئی۔ مجھے اس طرح نصیحت کرتی جیسے میں نے ابھی دنیا کو دیکھنا سیکھا ہو۔ بے جا روک ٹوک' اعتراض' اور اگر اسے معلوم ہوجائے کہ میں کن راستوں کی مسافر ہوگئی ہوں تو یہ میرا جینا حرام کردے۔" وہ نہایت تنفر سے اس پہ نظریں جمائے سوچ رہی تھی۔

اچانک ہی اسے متلی سی ہونے لگی۔ وہ تیزی سے واش روم کی طرف بھاگی۔ واش بیسن پر لٹکے لٹکے وہ ادھ موئی ہوگئی تھی۔ لمبے لمبے سانس لیتے' سرخ چہرہ لیے جیسے ہی وہ پیچھے مڑی' امی کو ساکت کھڑے پایا۔ ہاتھ میں مصلیٰ لیے وہ ہراساں و پریشان اسے دیکھ رہی تھیں یقیناً" وہ تہجد کی تیاری کررہی تھیں۔ اس نے اچٹتی سی نگاہ امی پر ڈالی ایک لمحے کو وہ خوف زدہ ہوئی لیکن دوسرے لمحے لاپروائی سے دوپٹے سے منہ صاف کرتی کمرے کی طرف جانے لگی لیکن امی کی جہاں دیدہ نگاہیں جو دیکھ چکی تھیں' وہ اس سے انکاری نہیں ہوسکتی تھی۔ انہوں نے تیزی سے بیچ راستے میں اسے پکڑا اور ابو کے کمرے کی طرف کھینچ کرلے گئیں۔ ابو ایک ہفتے سے کام کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے جبکہ بلال آج چھت پر سو رہا تھا۔ کمرے میں جاکر انہوں نے تیزی سے کمرے کی کنڈی چڑھائی اور اس کی طرف شدید غیض و غضب سے مڑیں۔

"نمرہ! یہ سب کیا ہے......؟" صدمے اور بے یقینی نے ان کی قوت گویائی چھین لی۔ بے اعتباری اور مان کے ٹوٹنے کی کرچیاں' آنکھوں کو لہولہان کررہی تھیں۔

"امی! میں نے کچھ نہیں کیا۔" ماں کی وحشت زدہ حالت دیکھ نمرہ کی گھگھی ــ بندھ گئی۔ سارا طنطنہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"تم نے "کچھ" نہیں کیا تو یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔" امی نے سرد لہجے میں کہا تو اسے اپنے جسم و جاں سے روح نکلتی محسوس ہوئی۔

"بتادے نمرہ! کس کے ساتھ منہ کالا کرکے آئی ہے۔" امی نے اسے بری طرح جھنجوڑتے ہوئے کہا تو اس کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔

"میری جان! ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے میں جلد ہی ممی پاپا کو پاکستان بلوالوں گا۔" کان کے پاس ہی تسلی بھری سرگوشی۔

"امی! ایسا کچھ نہیں ہے' آپ بلاوجہ مجھ پر الزام لگارہی ہیں۔" وہ جلدی ہی خود کو سنبھال کر ہٹ دھرمی سے بولی۔

"میں...... تیری ماں...... تجھ پر الزام لگاؤں گی۔" بے یقینی سے اسے دیکھنے لگیں۔ پھر انہوں نے آؤ دیکھا نہ

تاؤ تھپڑوں سے اس کا منہ لال کردیا۔

"امی......!" تھپڑوں سے خود کو بچاتی اس جملے پر وہ اس زور سے چیخی کہ اس کے گلے کی رگیں تک پھول گئیں لیکن وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ایک ہی جملے کی رٹ لگائے ہوئے تھیں۔

"بتادے مجھے اس کا نام ورنہ میں تجھے زندہ گاڑ دوں گی۔" وحشت دیوانگی اور جنون سے ان کی بری حالت تھی نمرہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح معاملہ سنبھالے۔

"امی...... دروازہ کھولیں۔" یہ دوسری آواز یقیناً" نمرہ کی تھی جو شور سن کر باہر کھڑی دروازہ بجارہی تھی۔ امی نے تھکے تھکے قدموں سے دروازے کی کنڈی گرائی اور وہیں چوکھٹ میں بیٹھ گئیں۔ نمرہ کے لیے یہ صورت حال غیر متوقع تھی۔ ثمو دیوار سے لگی گھٹی گھٹی آواز میں سسک رہی تھی۔ جبکہ امی سکتے کی حالت میں اسے دیکھے جارہی تھیں۔

"نمرہ...... امی...... یہ سب۔" اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر الفاظ نکلے آواز گلے میں پھنس گئی تھی۔

"نمرہ! اس سے پوچھو' کہاں کمی رہ گئی میری تربیت میں' کیا کچھ نہیں کیا ہم نے اسے پروان چڑھانے کے لیے۔ اس کی ضدی اور خود سر طبیعت کے ہاتھوں تمہارے منہ کے نوالے بھی اسے دیے کہ یہ کچھ محسوس نہ کرے۔ ہر لحاظ سے اچھا پہنایا مہنگے تعلیمی اداروں میں پڑھایا کہ کہیں احساس کمتری کا شکار نہ ہوجائے لیکن ہمیشہ ہماری محبتوں کا اس نے مذاق اڑایا۔ اس کے گلے کبھی ختم ہی نہیں ہوئے فقط ایک رٹ کہ اس کے لیے ہم نے کچھ نہیں کیا۔" امی کی آواز میں لاچاری' بے بسی اس مسافر کی طرح تھی جو منزل پہ پہنچ کر مایوس کی دیمک کا شکار ہوگیا تھا۔

"کیا کرتے ہم۔ خود کو بیچ دیتے کہ اس کی بھوک ختم ہوجائے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں پھر نمرہ کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"تمہیں گھر تک محدود رہنے کا شوق تھا لیکن اس کی نازک مزاجی اور سرکشی دیکھ کر تمہیں گھر سے نکلنا پڑا' کیا کیا نہیں پاپڑ بیلے ہم نے اس کی محبت میں' لیکن یہ خود غرض' لالچی لڑکی...... کہیں بھی سیر نہیں ہوئی اور اب......؟"

"اب کیا......؟" نمرہ جو اتنی دیر سے بات سمجھنے کی کوشش کررہی تھی کسی انہونی کے ڈر سے سانس لینا بھول گئی۔

"اب یہ نجانے کس کے در کا کیچڑ ہمارے منہ پر ملنے کے لیے اپنے ساتھ لے آئی ہے۔"

"امی......!" دو نفوس کی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ ایک کے لہجے میں بے انتہا تڑپ تھی۔ تو دوسرے لہجے میں شدید بے یقینی۔

"مت لو اپنی ناپاک زبان سے میرا نام' بے موت مار دیا تم نے مجھے۔ اگر معلوم ہوتا تم گھر سے نکلنے کے لیے بے چین اس مقصد کے تحت ہورہی ہو تو نمرہ سے پہلے تمہاری شادی کردیتی۔ کم از کم یہ ذلت تو نہ ملتی۔" امی نے رنج و غم میں ڈوبے لہجے کو شدید غصے و برہمی میں لپیٹ کر بولیں۔

"اس لڑکی نے بہت بڑے بڑے خواب دیکھ لیے ہیں وہ شخص اسے کبھی رخصت کرانے نہیں آئے گا' ہاں اگر یہ خود بھاگ جائے تو الگ بات ہے۔" ان کی حالت بھنور میں پھنسی کشتی کی مانند تھی۔

"امی......!" نمرہ بے اختیار چیخی۔

"آپ مجھے اتنا غلیظ سمجھتی ہیں......؟" اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کو دیکھ کر وہ مجروح سی ہنسی ہنس دیں۔

"جیسا سمجھا تھا تم نے اس بات کا کب مان رکھا جو اب......"

"امی! خدا کے لیے مجھے معاف کردیں' وہ جلد ہی اپنے والدین کو لے آئیں گے۔" ثمرہ روتے ہوئے لجاجت سے بولی۔

"جو مرد ناجائز طریقے سے تعلقات قائم کرے وہ کبھی جائز مقام نہیں دلاتا۔"

"امی' آپ کا خون گندا نہیں ہے۔"

"لیکن تم نے ثابت کردیا میرا خون ہی نہیں میری اولاد بھی غلیظ ہے۔"

"خدا کے لیے امی! بس کریں۔" ثمو ایک دفعہ پھر لڑکھڑاتے لہجے میں روتے ہوئے بولی۔

"بس کروں.....؟ تم نے تو ہمیں زندہ درگور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کاش میں تمہاری ماں نہ ہوتی۔ یا پھر..... کاش..... حرام موت جائز ہوتی تو میں اسی وقت خودکشی کرلیتی۔" امی کی بات پر نمرہ تڑپ کر انہیں اپنے ساتھ لگا کر حوصلہ دینے لگی۔ زندگی میں پہلی دفعہ۔ پہلی دفعہ وہ اس طرح ٹوٹ کے بکھری تھیں۔ اپنا گھر بچوں کی اچھی پرورش' عزت و سکون سے ان کے فرض سے سبکدوش ہونے کی خواہش سب کچھ ختم ہوگیا تھا..... سب کچھ راکھ ہوگیا تھا۔

"کیا منہ دکھاؤں گی میں اس کے باپ کو' جسے اس نامراد کے آگے نہ کبھی بیوی نظر آئی نہ اپنی خودداری اور عزت نفس' جسے روندنے یہ ددھیال میں لے گئی۔ نہ اسے وہ بچے نظر آئے جنہیں ہل میں جوت کرا سے سکون پہنچایا۔" ثمو کو ایسا لگا جیسے کوئی اس کے منہ پر جوتے مار رہا ہو۔

"کیا جواب دوں گی میں اس شخص کو' جس کی پہلی اور آخری محبت فقط اس بیٹی تک محدود ہوگئی تھی جو اس کی ماں کا عکس تھی۔ جس سے اس کے باپ کو عشق تھا اور اگر آج اسے پتا چل جائے کہ یہ۔" انہوں نے آنے والے وقت کے خوف سے خود کو نکالا۔

"اس سے کہو نمرہ! یہ میری نظروں کے سامنے سے چلی جائے ورنہ یہاں سے ایک نہیں' تین جنازے نکلیں گے باپ کی عزت کا' ماں کے اعتبار کا اور بھائی کی غیرت کا۔"

"امی!" ثمو نے خوفزدہ ہو کر ماں کے پاؤں پکڑنے چاہے لیکن انہوں نے جھٹک کر اسے ایک طرف کردیا اور کمرے سے نکل گئیں۔

"نمرہ..... امی سے کہو' مجھے آخری موقع دیں بس ایک ہفتہ دے دیں۔" روتے بلکتے لہجے میں اس نے نمرہ کے آگے ہاتھ جوڑے تو وہ جو ضبط کی انتہا پر تھی اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر' سر ٹکائے ایک معصوم بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔ وہ سکتے میں آگئی۔

وہ اسے رلانا چاہتی تھی.....؟ وہ رو رہی تھی..... اس کے لیے.....؟ اس کا دل چاہا کہ وہ خود کو..... سنگسار کردے.....

☼ ☼ ☼

چار دن ہوگئے تھے اسے مسلسل فون کرتے ہوئے' لیکن وہ شخص اسے کسی نہ کسی بہانے سے ٹال رہا تھا۔ امی نے بول چال بند رکھی تھی۔ ابو پرسوں آنے والے تھے۔ عمر نمرہ کو لینے آیا تھا۔ امی نے زبردستی اسے بھیج دیا تھا۔ بلال کی اپنی وہی پڑھائی اور دکان کی مصروفیات تھیں۔

وہ اندر ہی اندر خائف ہوتی' ہمتیں مجتمع کرتی مسلسل احمر سے رابطہ کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ پاس ہی کہیں کوئی سرگوشی اسے بار بار متوجہ کررہی تھی۔

"ثمو! وہ شخص ٹھیک نہیں ہے۔" وہ شدید گریہ و زاری کی حالت میں پھر سے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ آخر کار رابطہ ہوگیا لیکن اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ کسی کوڑے سے کم نہ تھے جو اسے بری طرح پیٹ رہے تھے۔

"ثمرہ! کیا مصیبت ہے یار' میں یہاں بہت مصروف ہوں' تم کیوں بار بار ڈسٹرب کررہی ہو۔" اس نے بروقت خود کو سنبھال لیا۔

"میں ڈسٹرب نہیں کررہی' فقط آپ کو اطلاع دے رہی ہوں' میرے والدین میری شادی کررہے ہیں۔ آپ جلدی سے اپنے والدین کو....." وہ بیچ میں ہی بول پڑا۔

"ہاں تو کرلو شادی' کس نے روکا ہے تمہیں.....؟"

"احمر' آپ ہوش میں تو ہیں۔ میری جان یہاں سولی پر لٹکی ہوئی ہے اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔" وہ اس کی بے زاری خاطر میں لائے بغیر روہانسے لہجے میں بولی۔

"میں مذاق نہیں کررہا۔" اس نے سنجیدگی سے تردید کی۔

"مذاق نہیں کررہے تو میری زندگی کیوں خراب کی؟"

"زندگی میں نے خراب نہیں کی تم نے خود کی ہے۔"

"چلیں' میں نے ہی کی۔ اس میں آپ بھی برابر کے شریک ہیں۔"

"اچھا چلو! میں مان لیتا ہوں..... اب پھر.....؟" اس کی آنکھوں میں مرچیں لگنے لگی۔

"پھر یہ کہ آپ مجھ سے شادی کرلیں۔"

"یار! شادی ضروری ہے؟ ہم اسی طرح بھی تو مل سکتے ہیں۔" ثمرہ کو ایک لمحے کے لیے لگا جیسے اس نے دوزخ میں سانس لیا ہو۔ دوسرے لمحے اس نے زندگی دوزخ کے حوالے کردی۔

"ٹھیک ہے پھر آج شام کو لانگ ڈرائیو پر ملتے ہیں۔ ڈرائیونگ میں کروں گی۔" وہ بولی۔

"شیور....." وہ خوش دلی سے ہنسا۔

☼ ☼ ☼

"ثمو کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہوگئی۔" ہر سننے والا اس جواں سالہ موت پر حیران تھا۔ ہر آنکھ اشک بار تھی۔ گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ ہر آنے جانے والا اس ماں کو دیکھ رہا تھا جو خبر ملتے ہی سجدے میں گری ابھی تک نہ اٹھی تھی۔ رونے والے آخر کیسے نہ روتے؟ جبکہ وہ فقط آنسو بہاتے "یا اللہ! تو نے میرا پردہ رکھ لیا۔" کہے جارہی تھی۔

"نمرہ! یہ بات صرف تمہارے اور میرے درمیان رہے۔"

"امی! آپ کو یہ بات اپنی نمرہ سے کہنے کی ضرورت ہے.....؟" اور یہیں ثمو کا باب اختتام کو پہنچا۔ اور نمرہ کے لیے دعاؤں کا باب کھلا۔

☼ ☼ ☼

"نمرہ آپی! میرے موزے نہیں مل رہے۔ پلیز فراز سے پوچھیں کہیں وہ کل کی طرح میرے جوتوں کے بجائے آج موزوں پر ہاتھ صاف کرگیا ہو۔" فاہد کی دہائی پر وہ کچن سے ناشتا بنانا چھوڑ کر نکلی۔ تو فاہد کو فراز سے لڑتے ہوئے پایا کیونکہ اس کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس نے ان دونوں میں صلح کرا کے کچن میں ناشتا کرنے کے لیے روانہ کیا کہ سمیرا بھاگتی ہوئی آگئی۔

"بھابھی! میرے بال بنادیں۔ میں کالج سے لیٹ ہو رہی ہوں۔"

"وین آگئی تمہاری.....؟" وہ تیزی سے اس کی چلتی زبان کو بریک لگانے کے لیے یوں ہی سوالیہ انداز میں بولی غالباً" ناشتا کے لیے بوا کچن کی طرف جاچکی تھیں۔

"بس آنے والی ہے۔" وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بیگ اٹھانے بھاگی۔ تو وہ دوبارہ سے کچن میں آگئی۔ جہاں بوا تیزی سے پراٹھے بنارہی تھیں۔

"چلو فراز! تم آج آل ریڈی لیٹ ہوچکے ہو۔ جلدی کرو۔" فاہد کو لنچ باکس پکڑاتے ہوئے وہ فراز سے مخاطب ہوئی تو وہ سلوٹ مارتے ہوئے بولا۔

"یس سر!" پھر آنکھوں میں ڈھیروں شرارت لیے بولا۔

"بھیا کو بھی اٹھادیں یہ نہ ہو' آفس سے چھٹی کرلیں۔" فراز کی بات پر وہ کانوں کی لوؤں تک سرخ پڑ گئی جبکہ وہ ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ فاہد بوا سے منتیں کررہا تھا۔

"بوا! آج نہ جائیں۔ کل چلی جائیے گا۔"

"نہ میاں! تمہاری کبھی کل نہیں آنی۔ اب گھر سنبھالنے والی آگئی ہے۔ میں شام کو ان شاء اللہ اپنے گاؤں میں ہوں گی۔"

"فاہد! ضد مت کرو۔ بوا ہم سے ملنے آتی رہیں گی۔" نمرہ کی بات پر وہ منہ پھلا کر باہر نکل گیا۔

کیونکہ باہر سے ہارن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"اللہ حافظ' بوا۔" وہ گیٹ کھولتے ہوئے بولا۔

"اللہ حافظ آپی۔"

"بیٹا! تم جاؤ اور عمر کو اٹھاؤ۔ اتنے' میں تمہارے لیے ناشتا بنادوں۔" بوا فاہد کو ہاتھ ہلاتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر بولیں۔

"بوا! آپ رہنے دیں۔ میں بنالیتی ہوں۔" وہ نرمی سے بولی۔ تو وہ ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے بولیں۔

"کل سے ان شاء اللہ سب کچھ تم نے ہی کرنا ہے۔ آج اپنے شوہر کو وقت دو۔" بوا کی بات پر وہ تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

بیڈ کی چادر پُر شکن تھی۔ الماری کھلی ہوئی تھی۔ جبکہ واش روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ ایک طویل سانس خارج کرتی کمرے کی چیزیں سمیٹنے لگی۔ کہ دروازہ کھلا۔ عمر گلے میں تولیہ ڈالے' ہاتھوں سے گیلے بالوں کو جھاڑتا باہر نکل آیا۔

"صبح بخیر۔" وہ خوش دلی سے مسکراتے ہوئے بولی تو وہ شیشے میں گردش کرتے عکس پر نظر ڈالتے' تیزی سے بال بنانے لگا۔ آنکھوں کی چمک بے تحاشہ بڑھ گئی تھی۔

ابھی وہ کمرے کی حالت درست بھی نہ کرپائی تھی کہ بوا ناشتہ لیے کمرے میں آگئیں۔ وہ اپنی جگہ شرمندہ سی ہوگئی۔

"چلو بھئی! جلدی سے گرما گرم ناشتا کرلو۔ پھر میں چلوں۔"

"بوا! کچھ دن اور رک جاتیں۔" عمر پرفیوم اسپرے کرتا ہوا بولا تو وہ ہنس پڑیں۔

"بیٹا! جانا تو ہے نا! پھر کیا آج کیا کل' تم اب جلدی گاؤں کا چکر لگانا' میں انتظار کروں گی۔ باہر زاہد (بوا کا بیٹا) مجھے لینے آگیا ہے۔ اس ڈر سے کہیں آج بھی میرا ارادہ نہ بدل جائے۔" بوا خوش دلی سے ہنستے ہوئے بتانے لگیں۔

"بوا.....!" وہ جھنجلایا۔

"بیٹا! قدر کرنا اس بچی کی' نصیبوں سے ملتی ہیں ایسی لڑکیاں۔" بوا نے خوب لپٹا لپٹا کر نمرہ کو پیار کرتے ہوئے کہا تو وہ اپنی جگہ جھینپ گئی جبکہ عمر نے اس کے سرخ پڑتے چہرے پر بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ پھر تھوڑی دیر میں وہ لوگ بوا کو رخصت کرکے کمرے میں آگئے۔

"اچھا سنیں! وہ امی کا فون آیا تھا۔" وہ بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

"خیریت.....؟" وہ جوتے پہنتے ہوئے ذرا سا چونکا۔

"ہاں! آج بلال کے سسرال والے ڈیٹ لینے آرہے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے تم چلی جانا۔" وہ لاپروائی سے بولا تو وہ یک دم ڈھیلی پڑگئی کچھ ایسا تھا جس نے عمر کو چونکایا۔ اس نے بڑے پیار سے اپنے حصار میں لیا اور اس کی بالوں کی لٹ چھیڑتے ہوئے بولا۔

"جان عمر! میں فارغ ہوتے ہی سیدھا گھر پہنچ جاؤں گا۔ تم سب کے ساتھ چلی جانا۔ ٹھیک ہے.....؟" وہ اس کی طرف شریر انداز میں دیکھتے ہوئے سوالیہ ہوا۔

"ہوں۔" وہ دل کی دھڑکن سنبھالتی بامشکل بول پائی۔

"جناب عالی! شیئر کرنے کی عادت ڈالیے میں آپ کے دل سے منسلک ہوں۔ آپ کا ہر طرح سے خیال رکھنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن آپ بھی غلطی کرنے پر مجھے ٹوکیں گی۔ ناراض بھی ہوں گی کیونکہ منانے میں مجھے مزا آئے گا۔ تاکہ اگلی دفعہ اگر میں روٹھوں تو تم مجھے مناؤ۔ ٹھیک ہے ناں.....!" وہ بڑی محبت سے اس کے ہاتھوں کو تھامے کہنے لگا تو وہ بڑے دنوں کے بعد کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ باہر ہوا کے دوش پر ان کے ملن کی خوشی میں ابر رحمت برسنے لگی۔ اندر وہ اس کے شانے سے لگی حکایت دل سننے لگی۔

☆

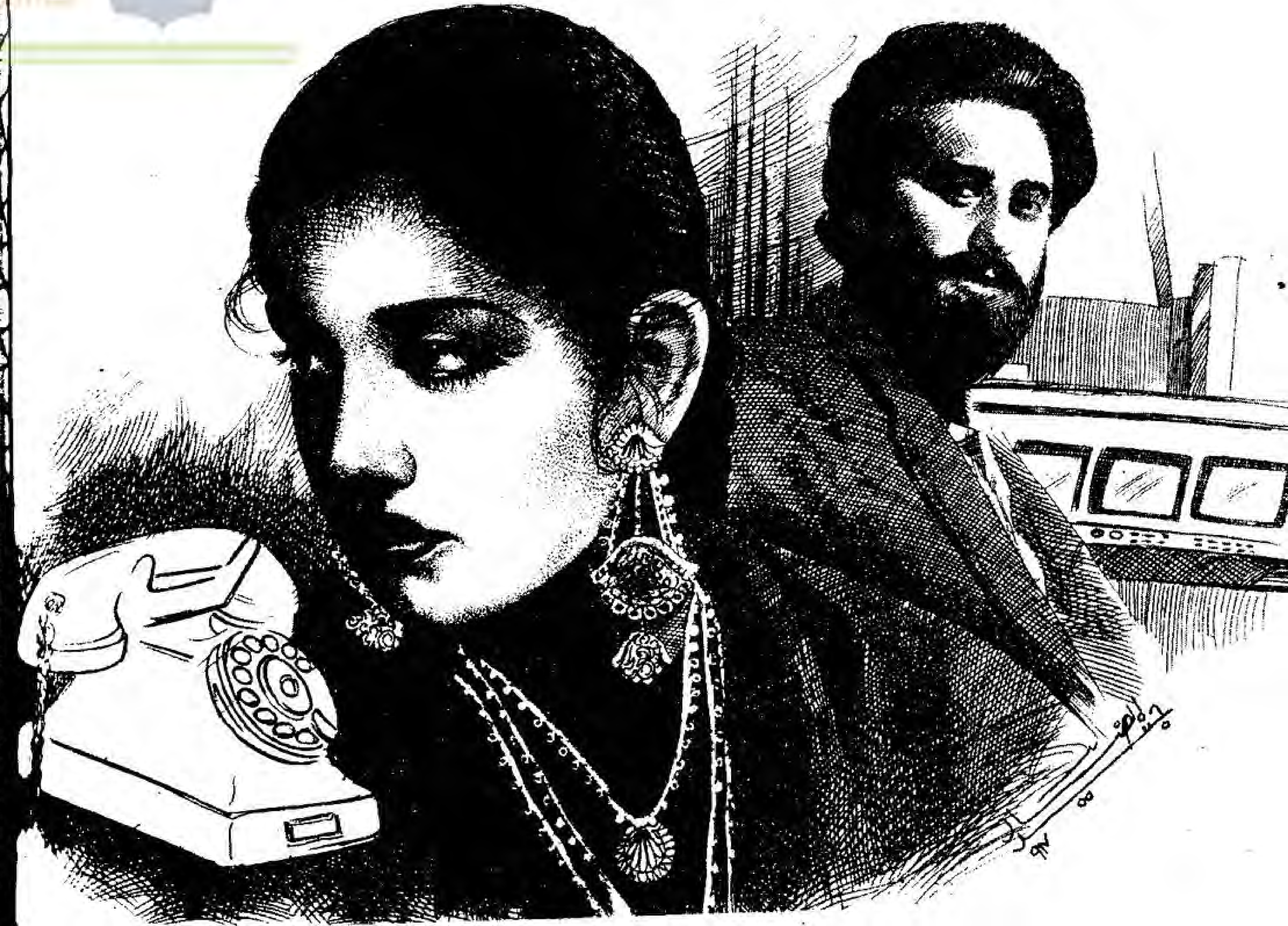
صائمہ اکرم چوہدری

شہزاد

شہزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا، اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے' ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹری پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہوگئی۔

میر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔
محتشم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام در شہوار ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے



ندرت بیگم سے دوسری شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہوسکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو، تو ان کے دونوں بچے نمیرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمیرہ کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا سرد رویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

ٹینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں، دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں، آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیوروکریٹ سیف الرحمٰن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہزاد جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خودکشی کی دھمکی دے کر شہزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہزاد کی آمد ٹینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہزاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبیٰ اور در شہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا، وہاں محمد ہادی آچکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے، تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنی دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

محتشم علی کا بیٹا وہاج شادی شدہ ہے لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

در شہوار اور طوبیٰ طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتے ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں، محمد ہادی سختی سے



پیش آتا ہے تو درشہوار اسے دھمکی دیتی ہے، ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

یہ جان کر کہ مناہل، ہادی کی بہن ہے درشہوار کا رویہ اس سے بدل جاتا ہے۔ مناہل اور برہان کی بے تکلفی سے اسے انابیہ کے مستقبل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وقار درانی، شہرزاد کے پاس سمجھنے کے لیے آتے ہیں۔ ہارون رضا، سیفی کے فون سے مشتعل ہو کر ٹینا بیگم کو طلاق دے دیتے ہیں۔ شجاع غنی کیس واپس لے لیتا ہے، اس بار پر ہادی اور شہرزاد بہت چراغ پا ہوتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ رومیصہ اور وہ ایک گھر میں جا کر چھپتے ہیں جہاں رومیصہ اسے اپنے حالات و واقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ دونوں کا نیا رشتہ قریب لے آتا ہے۔ یہ جان کر کہ شاہ میر طوبیٰ کو پسند کرتا ہے تاجدار بیگم کا غصہ گھر میں سب پر اترتا ہے۔ صندل کی بہن سندس کو طوبیٰ کی پرانی کتابوں سے اپنی بہن کا آخری خط ملتا ہے اور وہ حقیقت جان لیتی ہے۔

مونیکا، ذوالکفل کو مائیکل کی آمد سے آگاہ کرتی ہے، وہ اسے لاہور آنے کا مشورہ دیتا ہے۔

صندل کے گھر والے اس کی موت کی وجہ جان کر راتوں رات حویلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ رومیصہ کو ارسل بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے۔ شجاع غنی میر حاکم کی دھمکیوں کی وجہ سے کیس واپس لے لیتا ہے، شہرزاد کو یہ جان کر صدمہ ہوتا ہے، ہادی کو بھی غصہ آتا ہے اور اسی وجہ سے اسے درشہوار مزید بری لگتی ہے۔

انابیہ، درشہوار اور مناہل کی بے تکلف گفتگو سن کر صدمے کا شکار ہو جاتی ہے اور درشہوار اور برہان کے ساتھ بے رخی

مسز قریشی کے ڈنر میں برہان اور درشہوار کو دیکھ کر ہادی کو دھچکا لگتا ہے۔ وہ مناہل کو اشاروں میں برہان سے دور رہنے کا کہتا ہے مگر وہ اس کی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ طوبیٰ اور نمیرہ کی باتوں سے برہان کو درشہوار اور ہادی کے بارے میں پتا چلتا ہے وہ اپنی ماں کو بتاتے ہیں اور درشہوار کی شادی ارسل سے کرانے کا مشورہ دیتے ہیں، اس رشتے پر داجی کو بھی اعتراض نہیں۔

ہم زاد، شہرزاد کو اپنی فیملی کے بارے میں بتاتا ہے۔ ارسل کی کوششوں سے روحیل کا دوست صارم خان، رومیصہ کے حق میں گواہی دیتا ہے جس سے کیس کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ منال کو یونی ورسٹی میں برہان اور انابیہ کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوتا ہے۔

برہان کی شادی کا مناہل کو سخت دھچکا لگتا ہے۔ وہ دبئی جانے لگتی ہے مگر ہادی کے سمجھانے پر اپنا ارادہ بدل لیتی ہے۔
برہان اور تاج دار بیگم کی خواہش پر درشہوار کا رشتہ ارسل سے اور شاہ میر کا رشتہ نمیرہ سے طے کر دیا جاتا ہے۔ داجی کا یہ فیصلہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی پریشان کن ہے۔
مونیکا امتحان دے کر ذوالکفل کے ساتھ عمرے پر چلی جاتی ہے اور گھر والوں کو شادی اور اسلام قبول کرنے کا بتا دیتی ہے۔

صارم کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ ہم زاد، شہرزاد کی سیکیورٹی کا بندوبست کرتا ہے۔ رومیصہ کو ڈاکٹر خوش خبری سناتا ہے یہ خبر رومیصہ اور ارسل کے لیے پریشانی لاتی ہے۔

پندرہویں قسط

رومیصہ شدید شاک کی زد میں تھی۔
اس کی آنکھوں میں عجیب خوف کی سی کیفیت تھی۔ وہ ارسل کا بازو، ہاتھ کی گرفت میں لے کر باقاعدہ کھینچتی ہوئی باہر آئی تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے حواسوں میں نہ ہو۔
"کیا ہو گیا ہے رومی، ایسے کیوں ری ایکٹ کر رہی ہو؟"

ارسل کو اس کے چہرے پر چھائے ہوئے تاثر سے خوف سا آیا۔ اس لیے اس نے ذرا درشتی سے پوچھا، لیکن اس وقت رومیصہ جذباتیت کی انتہا پر تھی، اس نے سر اٹھا کر ارسل کی طرف دیکھا اور اسے جھٹکا لگا کیونکہ ارسل کے چہرے پر اس وقت خوشی کا رنگ بکھرا ہوا تھا۔
"تم خوش ہو رہے ہو اس بات پر؟"
"اس میں ناخوش ہونے والی کیا بات ہے رومیصہ، ہم نے نکاح کیا ہے، تم بیوی ہو میری اور تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ یہ آنے والا بچّہ ہم دونوں کے رشتے کو کتنا مضبوط کر دے گا۔"
"لیکن میں دنیا والوں کو کیا جواب دوں گی؟ مام اور شیری تو مجھے جان سے مار دیں گی۔" وہ ایک دم رو دی۔
"اچھا تم یہاں بیٹھو۔" ارسل نے محبّت سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے بینچ پر بٹھایا اور تاسف بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا، زندگی واقعی انہیں اس مقام پر لے آئی تھی جہاں اتنی بڑی خوشی کی خبر اپنے ساتھ اندیشوں کا ایک جہاں لیے ہوئے تھی۔
"میرا کیس چل رہا ہے عدالت میں اور ساری سچویشن تمہارے سامنے ہے، تمہیں اندازہ نہیں ہے اس موقعے پر کتنی انگلیاں میرے کردار پر اٹھیں گی، میں لوگوں کے سوالات کا جواب کیسے دوں گی۔"
"دیکھو رومی! تم اس موقعے پر صرف اور صرف اپنے آنے والے بچّے کے بارے میں سوچو۔" ارسل نے اس کے سرد ہاتھوں کو تھام کر انہیں اپنی محبت کی حرارت دینے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ وہ سر جھکائے ایسے بیٹھی تھی جیسے اپنی کسی غلطی پر بہت زیادہ نادم ہو۔
"میں ایسا نہیں سوچ سکتی ارسل، تمہیں اندازہ نہیں ہے میری پوزیشن کا۔"
"یار! کچھ نہیں ہوتا تمہاری پوزیشن کو، بھاڑ میں جائے ساری دنیا۔ ہمیں کسی سے کوئی لینا دینا نہیں، ہم دونوں ہی کافی ہیں ایک دوسرے کے لیے۔" وہ اسے پرسکون کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا، لیکن رومیصہ اس وقت کچھ بھی سننے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔
"نہیں ارسل! ہمیں کچھ اور سوچنا ہوگا۔" وہ آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت لیے بولی۔
"مثلاً؟" اس کا ماتھا ٹھنکا۔
"ہمیں نہیں چاہیے ابھی یہ بے بی! میں ڈاکٹر سے بات کرتی ہوں۔" رومیصہ فیصلہ کن انداز میں کھڑی ہوئی اور وہ دنگ رہ گیا۔
"کیا کہا تم نے؟ تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ تم اپنے حواسوں میں تو ہو؟" ارسل بولا نہیں غرّایا تھا۔
"ہاں نہیں ہوں میں اپنے حواسوں میں، کیونکہ یہ سب مجھ اکیلی کو فیس کرنا ہے، تمہارا کیا جائے گا، تم تو ہاتھ جھاڑ کر ایک سائیڈ پر کھڑے ہو جاؤ گے۔" وہ مشتعل لہجے میں بولی تو ارسل کا چہرہ ضبط کی کوشش میں سرخ ہوا۔
"کس کس موقعے پر میں نے تمہیں اکیلا چھوڑا ہے؟ تم ایک بار ہاں کرو، میں ابھی لے جاتا ہوں تمہیں میر ہاؤس۔"

"سوری...... مجھے ضرورت نہیں ہے، اور میں واقعی فیصلہ کر چکی ہوں۔"
"تم ایسا کچھ نہیں کرو گی رومیصہ، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" اسے طیش آیا۔
"آئی ایم سوری ارسل! تم مجھے اس بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتے، میں اس موقعے پر یہ مصیبت اپنے گلے میں نہیں ڈال سکتی۔" رومیصہ کے منہ سے نکلنے والے لفظ "مصیبت" پر ارسل کا ہاتھ اٹھا اور چٹاخ کر کے

اس کے منہ پر پڑا۔ وہ ششدر ہو کر فق چہرے کے ساتھ اپنے سامنے کھڑے اس شخص کو دیکھنے لگی جس کا آج یہ روپ پہلی دفعہ کھل کر اس کے سامنے آیا تھا۔

☆☆☆

مہندی لگا کے رکھنا......!!!
ڈولی سجا کے رکھنا......!!!
لینے تجھے او گوری آئیں گے تیرے سجنا......!!!

میر ہاؤس میں گونجتے ہوئے گانوں کی آوازیں درشہوار کے ضبط کا کڑا امتحان لے رہی تھیں۔

ارسل پچھلے دو دن سے غائب تھا اور یہ بات درشہوار کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھی۔ سونے پہ سہاگہ وہ اس کا فون بھی نہیں اٹھا رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، درشہوار کی امیدوں کے پل ایک ایک کر کے ٹوٹتے جا رہے تھے۔

''کہیں اس منحوس نے ہتھیار تو نہیں ڈال دیے بزرگوں کے اس فیصلے پر۔'' درشہوار کو اس سوچ نے بے چین کیا۔ ''اگر اس نے ایسا کیا تو میں اپنے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی حرام کر دوں گی۔'' وہ مختلف قسم کی سوچوں سے نبرد آزما تھی۔

''لیکن وہ مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کر رہا۔'' اس نے غصے سے اپنا سیل فون اٹھایا، ارسل کا نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف پھر پاورڈ آف کی ٹیپ سن کر اس کا دماغ گھوم گیا۔ اس بار اس نے سیل فون انتہائی غصے کے ساتھ اپنے بیڈ پر پٹخا۔ طوبیٰ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کے ناخن اضطراری انداز میں چبانے لگی۔ وہ خود بھی شدید ڈپریشن کا شکار تھی۔

میر ہاؤس میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو چکی تھیں، ویسے بھی بیچ میں صرف ایک ہفتہ ہی تو تھا۔ تاجدار بیگم کل ہی ندرت امی کے ساتھ رابی سینٹر کا چکر لگا کر آئی تھیں۔ سارا دن کپڑوں کا حساب کتاب لگایا جاتا اور ملتان سے دو ملازمائیں اسی مقصد کے لیے بلائی گئی تھیں جو سارا دن سلائی مشین پر بیٹھی دھڑا دھڑ کپڑے سی رہی تھیں۔

چونکہ درشہوار اور ارابیہ دونوں نے اسی گھر میں رہنا تھا اس لیے جہیز کی تو قطعاً ضرورت نہیں تھی، البتہ کپڑوں اور زیورات کے معاملے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جا رہی تھی۔

آج نمیرہ نے ندرت امی سے پوچھ کر ڈھولکی بھی رکھ لی اور خوشی تو اس کے انگ انگ سے نمایاں تھی، وہ پورے گھر میں جھومتی پھر رہی تھی، اور اس کی یہ ادائیں درشہوار اور طوبیٰ دونوں کے لیے ناقابل برداشت تھیں، جن کا غم ایک تھا۔

''دل کر رہا ہے جمال گوٹا ڈال کر پلا دوں اس نمیرہ کی بچی کو کسی چیز میں، تاکہ سارا دن واش روم کے باہر کھڑی رہے۔'' درشہوار نے اپنے سامنے بت بنی بیٹھی طوبیٰ کو دیکھ کر کہا جس کے چہرے پر سوگواری کا رنگ نمایاں تھا۔ ہال کمرے میں نمیرہ نے شوخی سے ایک نئی تان اٹھائی۔

میری ہریالی گھونگھٹ کھول، راج دلاری گھونگھٹ کھول......
ایک لاکھ دوں گا بنّو! گھونگھٹ کھول، دولاکھ دوں گا منہ سے بول، راج دلاری گھونگھٹ کھول......

باوا کی پیاری گھونگھٹ کھول، اماں کی دلاری گھونگھٹ کھول......

اس گیت کو سنتے ہی درشہوار کا دماغ کھول اٹھا۔ ضبط کی ساری طنابیں ٹوٹ گئیں، وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی اور پاؤں پٹختی ہوئی لاؤنج کی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ سامنے ہال کمرے میں نمیرہ، ندرت امی اور ملازمین کے کچھ بچوں کو اپنے ساتھ بٹھائے بڑے پرجوش انداز میں ڈھولکی بجا رہی تھی، اسے دیکھ کر اس نے شرارت سے آنکھیں مٹکائیں، کچھ بھی تھا، اب درشہوار اس کی ہونے والی بھابی تھی۔ اس لیے اس نے شرارت سے فوراً گانا بدلا اور ساتھ ہی بلند آواز میں گانے لگی۔

مہندی ہے رچنے والی......
ہاتھوں میں گہری لالی......
کہے سکھیاں، اب کلیاں، ہاتھوں میں کھلنے والی ہیں......
تیرے من کو، جیون کو نئی خوشیاں ملنے والی ہیں......

''یہ کیا بکواس ہے، اس گھر میں کیا کوئی سکون سے سو بھی نہیں سکتا......'' وہ بولی نہیں بلکہ دھاڑی تھی۔

اسٹور روم سے شادی کے لیے سامان نکلواتے ہوئے تاجدار بیگم نے چونک کر اپنی لاڈلی بیٹی کو دیکھا، جس کے ملگجے سوٹ پر پڑی شکنوں سے زیادہ اس کے ماتھے پر بل تھے، بال بکھرے ہوئے اور چہرہ ستا ہوا۔ وہ غضب ناک آنکھوں کے ساتھ سب کو گھور رہی تھی۔

''شادی میں اتنے کم دن تو رہ گئے ہیں، اب بندہ اپنے چاؤ بھی پورے نہ کرے۔'' ندرت امی برہمی سے بولیں، ویسے بھی وہ اب درشہوار کی ساس کے رتبے پر فائز ہونے جا رہی تھیں اس لیے یہ ان کا حق بنتا تھا۔

''یہ چاؤ شاؤ اپنے کمروں میں جا کر پورے کریں، میرا دماغ مت خراب کریں۔'' درشہوار نے بدتمیزی کی انتہا کرتے ہوئے کہا۔

''آئے ہائے بھابھی! دیکھیں ذرا اس لڑکی کو......'' ندرت امی نے تپ کر اپنی جٹھانی کی طرف دیکھا جو خود بھی اس حملے پر ہلکا سا گڑبڑا گئی تھیں۔

''درشہوار! یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔'' تاجدار بیگم کا لہجہ قدرے نرم ہی تھا کیونکہ وہ اپنی اولاد کے رنگ ڈھنگ جانتی تھیں اور درشہوار تو ویسے ہی آج کل آگ کا گولہ بنی ہوئی تھی۔

''مجھے تو بس یہی طریقہ آتا ہے، جس نے بات کرنی ہے وہ کرے، جس نے نہیں کرنی وہ نہ کرے۔'' وہ انگارے چبا کر بولی۔

''ارے چھوڑو درشہوار، آجاؤ۔ شرماؤ مت، اپنی شادی کے نہ سہی برہان بھائی کے لیے گانے گا لو۔ مجھے پتا ہے تمہیں کتنا شوق ہے ہلا گلا کرنے کا۔'' نمیرہ نے تو گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کی بات سنتے ہی درشہوار کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''بے فکر رہو، ایسا طبلہ بجاؤں گی، پورا خاندان یاد رکھے گا۔'' وہ غضب ناک انداز میں نمیرہ کی طرف بڑھی، اس کے آگے رکھی ڈھولک اٹھائی اور گھما کر ہال کمرے کے دوسری طرف اچھال دی۔

ڈھولک اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے محتشم صاحب کے قدموں میں جا گری اور انہوں نے تھوڑا اچھل کر خود کو اس ہتھیار سے بچایا۔ کمرے میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ تاجدار بیگم کے ساتھ ساتھ وہاں موجود سب

ہی لوگوں کا خون خشک ہوا۔

محتشم صاحب نے نظر اٹھا کر اپنی صاحب زادی کی طرف دیکھا، جس کا چہرہ انار کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور بات اس کے مشتعل ہونے کی نہیں، اس کے انداز سے چھلکنے والی بغاوت کی تھی، جس نے ایک لمحے کو انہیں بھی گنگ کر دیا تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے درشہوار، تمیز تمہیں چھو کر نہیں گزری کیا؟" اپنی بیٹی کے اس انداز پر تو وہ گویا انگاروں پر جا بیٹھے۔

"رات سے بخار ہے اسے، ڈھولک کی آواز سے تنگ ہو رہی تھی بے چاری، منع بھی کیا تھا میں نے نمیرہ کو۔" تاجدار بیگم نے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی۔

"بخار لگتا ہے صاحب زادی کے دماغ کو چڑھ گیا ہے، اسے تھوڑا انسانوں کی طرح رہنا سکھاؤ۔" ان کی پُرجلال آواز پر تاجدار بیگم تو بوکھلا گئیں جبکہ درشہوار پر اس جلال کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا، وہ یوں کھڑی تھی جیسے میر محتشم اس سے نہیں، اس کمرے کی دیواروں سے مخاطب ہوں۔

"درشہوار! تم جاؤ اپنے کمرے میں، اور جا کر میڈیسن لو۔" تاجدار بیگم نے معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے سب سے پہلے اس فساد کی جڑ کو منظر سے غائب کرنا چاہا اور ساتھ ہی آنکھ کے اشارے سے نمیرہ اور بچوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا وہ فوراً ہی کھسک گئے۔

درشہوار نے بے زاری سے سر جھٹکا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور تاجدار بیگم نے کن انکھیوں سے اپنے شوہر کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو جانچا، جن کی نظریں درشہوار پر جمی ہوئی تھیں اور اتنے زمانہ شناس تو وہ بھی تھے کہ اپنی اولاد کے رنگ ڈھنگ پہچان پاتے۔

"تم ذرا کمرے میں آ کر میری بات سنو۔" محتشم صاحب کے سرد لہجے نے تاجدار بیگم کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔ وہ لمحہ آ چکا تھا، جس کا انہیں ڈر تھا۔ ان کا دل سہم کر رہ گیا۔

☆☆☆

میر محتشم کے کمرے کے بھاری پردے گرے ہوئے تھے۔

وہ جانچتی ہوئی نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی تاجدار بیگم کو دیکھ رہے تھے اور تاجدار بیگم کو ان کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ انہیں ان کے کمرے میں آئے ہوئے پورے پانچ منٹ گزر چکے تھے، انہوں نے سامنے وال کلاک پر لگے گھڑیال کو دیکھ کر اندازہ لگایا اور ابھی تک محتشم صاحب نے اپنی گفتگو کا آغاز نہیں کیا تھا۔

"کیا چل رہا ہے تمہاری صاحبزادی کے دماغ میں؟" لہجے کی کاٹ فطرت ثانیہ تھی اور بغیر طنز کے ان کی گفتگو کبھی مکمل نہیں ہوتی تھی۔

"میری صاحب زادی تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے میں جہیز میں ساتھ لائی تھی۔" تاجدار بیگم نے دانستہ تلخ انداز اپنایا کیونکہ اتنا تو وہ بھی جانتی تھیں کہ اس موقعے پر نرمی کا مظاہرہ کرنا خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔

"لیکن بچوں کی تربیت تو ماں ہی کی ذمے داری ہوتی ہے ہمارے خاندان میں اور اسی حوالے سے

پوچھ رہا ہوں تم سے۔" آگے بھی محتشم تھے، جن کے پاس ہر سوال کا جواب موجود تھا۔

"خیر، ایسی بھی کوئی بات نہیں، آخرت میں پوچھا تو ماں باپ دونوں سے ہی جائے گا اور جہاں تک بات درشہوار کی ہے تو پورا خاندان جانتا ہے کہ وہ مزاجاً اپنے دادا پر گئی ہے۔" تاجدار بیگم نے بھی سارا الزام اپنے سسر کے مزاج پر رکھ دیا۔

"لیکن اب کیا مسئلہ ہے اسے؟ ان ساری حرکتوں کا مقصد کیا ہے آخر؟" وہ ہلکا سا جھنجھلا کر گویا ہوئے۔

"کوئی بھی مقصد نہیں ہے، بتا تو رہی ہوں، اس کی طبیعت خراب ہے اور نمیرہ بھی تو بار بار اسے چڑانے سے باز نہیں آ رہی تھی۔" تاجدار بیگم نے اپنے لہجے کو دانستہ لاپرواہ بنا کر سارا الزام نمیرہ کے سر پر رکھ دیا۔ اتنا تو انہیں بھی پتا تھا کہ وہ کون سا تصدیق کرنے کے لیے جائیں گے۔

"دیکھ لو تاجدار بیگم! کوئی بات چھپا تو نہیں رہی ہو مجھ سے۔؟" انہوں نے کھوجتی ہوئی نظروں سے اپنی بیگم کی طرف دیکھا تو انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"کمال کرتے ہیں آپ بھی، ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا کر رکھ دیا، بھلا ایسی کون سی بات ہونی ہے۔ اچھا خاصا پتا بھی ہے درشہوار کے مزاج کا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپے سے باہر ہو جاتی ہے وہ۔" انہوں نے نظریں چرا کر حتی الامکان اپنے میاں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور دل ہی دل میں درشہوار کو دو چار صلواتیں بھی سنائیں جس نے انہیں آج کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا۔

"ایک بات اپنے دماغ میں بٹھا لو، تمہاری اولاد جو بھی غلط قدم اٹھائے گی، اس کی باز پرس تم سے ہی کی جائے گی، اس لیے اپنی زبان میں سمجھا دو اس کو۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ رکے نہیں، لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

تاجدار بیگم کو تو لگتا تھا جیسے سانپ ہی سونگھ گیا ہو۔

☆☆☆

رومیصہ جب سے گھر واپس آئی تھی اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا......!!!

ارسل کے ہاتھ اٹھانے والے واقعے نے اسے بہت زیادہ دل برداشتہ کیا تھا، حالانکہ وہ بار بار اس سے راستے میں معذرت کرتا آیا تھا لیکن رومیصہ کے دل میں گرہ پڑ گئی تھی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ارسل اس طرح آپے سے باہر بھی ہو سکتا ہے۔ اس بات نے اسے کافی خوف زدہ کر دیا تھا۔

"آئی ایم سوری یار! تم نے اتنی غلط بات کی، مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔" وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بار بار پریشانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا، جس کی آنکھوں سے ابھی تک بے آواز آنسو بہہ رہے تھے اور وہ ارسل کو ندامت میں مبتلا کر رہے تھے۔

"تم نے سوچا بھی کیسے کہ ہم اپنے ہونے والے بچے کو خود اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیں، کم از کم میں تو اتنا ظالم نہیں ہو سکتا اور تمہیں بھی میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانے دوں گا، تم مجھ پر اعتماد رکھو، میں ان شاء اللہ بہت جلد چیزوں کو ہینڈل کر لوں گا، تم میری محبت ہی نہیں اب عزت بھی ہو۔" ارسل اسے سارا راستہ تسلیاں دیتا آیا تھا لیکن رومیصہ کے ہونٹوں پر تو جیسے خاموشی کی مہر ثبت ہو چکی تھی۔

"اگر تم اسی طرح خاموش رہو گی تو میں گاڑی نہیں چلاؤں گا۔" ارسل نے سچ مچ گاڑی سڑک کے

کنارے پر کھڑی کر دی اور بے چارگی سے اپنے ساتھ بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا، جواب اسے اپنی زندگی سے بھی پیاری تھی۔

''کیسے ہینڈل کرو گے تم چیزوں کو؟ مجھے صرف اتنا بتا دو؟'' وہ روتے روتے ایک دم پھٹ پڑی۔

''تم نیکسٹ ٹائم میرے ساتھ چلو، پہلے نادرا کا آئی ڈی کارڈ بننے دیں گے اور جیسے ہی تمہارا کارڈ آجائے گا میں ارجنٹ پاسپورٹ بنوالوں گا۔'' ارسل کی اس بات نے اسے چونکا دیا۔

''تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟''

''میں نے باہر ایک دو جگہوں پر اپلائی کیا ہے، ان شاء اللہ کہیں نہ کہیں سے پوزیٹو جواب آجائے گا، بس ہم دونوں خاموشی سے نکل جائیں گے۔'' اس نے رومیصہ کو اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔ اس نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

ارسل نے استحقاق بھرے انداز سے اپنا بازو آگے بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگایا تو وہ جذباتی ہو کر رو دی، ارسل کا بھی دل بھر آیا۔ قسمت نے ان دونوں کو ایک عجیب سے دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا۔

''تم مجھ سے وعدہ کرو رومی، تم خود کو اور اس بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔'' ارسل نے اس کے ماتھے کا بوسہ لیا اور وہ اس کی محبت کے آگے ہار گئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے وہ وعدہ کرنا پڑا، جو اس کے لیے کسی پل صراط سے کم نہیں تھا۔

گھر آ کر اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا اور بیٹا بیگم نے جب تیسری بار ملازمہ کو اس کے کمرے میں بھیجا تو اس کے صبر کی انتہا ہو گئی۔ وہ جو خود اکیلے بیٹھ کر اپنے لیے کچھ سوچنا چاہ رہی تھی، کمرے کے دروازے پر ہونے والی بار بار کی دستک سے بُری طرح تنگ آ کر اس نے دروازہ کھولا اور سامنے کھڑی سندس کو بُری طرح سے لتاڑا اور دروازہ پھر پوری قوت سے بند کر دیا۔

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتی ہوئی شہزاد نے سندس کا تاریک ہوتا چہرہ غور سے دیکھا اور ایک لمحے میں اسے اس کا پس منظر معلوم ہو گیا۔ سندس اسے دیکھ کر خفت زدہ انداز میں مسکرائی۔

''کیا ہوا؟ رومی نے ڈانٹا ہے کیا؟'' شہزاد کے نرم انداز پر سندس نے شرمندگی سے وضاحت دی۔

''بڑی بیگم صاحبہ ان کو کھانے پر بلا رہی ہیں لیکن وہ شاید غصے میں ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ میں بات کرتی ہوں اس سے۔'' شہزاد نے ہلکا سا دروازہ بجایا۔

دوسری طرف رومیصہ سمجھی کہ شاید سندس دوبارہ اسے بلانے کے لیے آ گئی ہے۔ تب ہی وہ دروازہ کھولتے ہی دھاڑی۔ ''کیا تکلیف ہے...؟ ایک دفعہ کی کہی ہوئی بات سمجھ میں نہیں آتی کیا؟''

''کیا ہوا ہے رومیصہ؟'' اپنے سامنے شہزاد کو دیکھ کر رومیصہ کے چہرے پر غصے کی جگہ جھنجلاہٹ نے لے لی۔

''اس گھر کے ملازموں کو ذرا بھی تمیز نہیں ہے، ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ کہہ چکی ہوں کہ مجھے بھوک نہیں ہے لیکن بار بار بلانے آ رہے ہیں۔''

''اس میں سندس بے چاری کا کیا قصور ہے؟ مام بھیج رہی ہیں اسے۔''

''مام بھی حد ہی کر دیتی ہیں، اب کیا زبردستی منہ کھول کر ڈالیں گی کھانا۔'' وہ بُری طرح سے چڑ کر بولی۔

''اٹس او کے...... ٹیک اٹ ایزی۔'' شہزاد کو لگا وہ ذہنی خلجان کا شکار ہے۔

''ذہن پہلے ہی اتنا الجھا ہوا ہے، اوپر سے ان کی ٹھک ٹھک ہی ختم نہیں ہو رہی۔'' وہ اپنے بکھرے بالوں کا جوڑا بنانے لگی۔

''صارم خان کی ڈیتھ کی وجہ سے ڈسٹرب ہو گیا؟'' شہزاد نے اس کی متورم آنکھوں کو دیکھ کر آہستہ سے پوچھا۔

''تو کیا نہیں ہونا چاہیے؟'' رومیصہ کو اس کی پریشانی کا بھرپور جواز شہزاد نے خود ہی فراہم کر دیا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس سے فائدہ نہ اٹھاتی۔

''میری راتوں کی نیندیں اور دن کا سکون غارت ہو چکا ہے۔'' وہ جھنجلا کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''ٹینشن مت لو، صارم خان کی موت زیادہ دیر تک معمہ نہیں رہے گی اور پولیس بہت جلد ملزموں تک پہنچ جائے گی۔''

''ہونہہ...... پولیس پہنچ ہی نہ جائے کہیں۔'' رومیصہ نے استہزائیہ انداز اپنایا۔

''ہر بار ایسا نہیں ہوتا رومی، بعض دفعہ ان جانے میں ملزم خود کوئی نہ کوئی ایسا ثبوت چھوڑ جاتے ہیں اور صارم کے کمرے سے ان لوگوں کا گرا ہوا ایک سیل فون ملا ہے پولیس اس کا سارا ڈیٹا نکلوا رہی ہے۔'' اس کی اس بات پر رومیصہ بُری طرح سے چونکی۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی در آئی۔

''تم ساری باتوں کو چھوڑو، ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں کہ نہیں؟'' شہزاد نے انجانے میں اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تو اس کا رنگ اُڑا۔

''مجھے پتا تھا، اس معاملے میں تم انتہائی سست ہو، اس لیے میں نے ڈاکٹر سہیل سے آج شام کی اپائنٹمنٹ لے لی ہے۔''

''نن نہیں، میں گئی تھی آج ڈاکٹر کے پاس۔'' رومیصہ نے بوکھلا کر کہا تو اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''بس اسٹامک تھوڑی گڑبڑ کر رہا ہے، اس کے لیے انہوں نے میڈیسن دے دی ہے، اب جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''چلو یہ تو بہت اچھا ہو گیا، میں بھی تھوڑا فریش ہو جاؤں، پھر مل کر کھانا کھاتے ہیں۔'' شہزاد مطمئن ہو کر کمرے سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

برہان بے چینی سے پورے گھر میں گھوم رہے تھے۔

مناہل کا بند نمبر انہیں وہ ان کہی داستانیں سنا رہا تھا، جو وہ سننا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی چھٹی حس چیخ چیخ کر انہیں کسی انہونی کا احساس دلا رہی تھی اور یہ بات ان کے لیے شرم سے ڈوب مرنے کے مترادف تھی کہ ان کی شادی کی خبر کسی اور کے ذریعے مناہل تک پہنچتی۔

مختلف قسم کی سوچوں نے ان کا دماغ شل کر دیا اور وہ کچھ سوچ کر پچھلے لان کے برآمدے سے نکلے، ان کا ارادہ ہادی کے گھر جانے کا تھا، آخر کار انہوں نے ڈھیٹ بننے کا ارادہ کر ہی لیا۔ جیسے ہی وہ باہر نکلے تاجدار بیگم ان کی طرف لپک کر آئیں۔

''برہان! تم انابیہ اور درشہوار کو شاپنگ کے لیے اسلام آباد تو لے جاؤ، انہوں نے برائیڈل ڈریس لینے

ہیں۔'' ان کی فرمائش سن کر ان کا دماغ گھوم گیا۔

''امی، مجھے کیا پتا ان چیزوں کا، آپ ندرت چچی سے کہیں۔'' وہ ہلکا سا چڑ گئے۔

''اب کیا اکیلی لڑکیوں کو بھیج دوں، شاہ میر کو چھٹی نہیں ملی اور ارسل خود اسلام آباد گیا ہوا ہے۔'' وہ بُرا مان گئیں۔

''ڈرائیور کے ساتھ بھیج دیں۔'' انہوں نے اپنی طرف سے مسئلے کا حل بتایا۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا، درشہوار کی طرف سے دل ڈرا ہوا ہے میرا' اسے تو کسی صورت نہیں بھیجوں گی میں اکیلے۔'' تاجدار بیگم نے ان کو جھاڑا۔

''اچھا ٹھیک ہے، آپ ان کو ریڈی کروائیں، میں ذرا ایک کام نبٹا کر آتا ہوں۔''

وہ جیسے ہی میر ہاؤس سے باہر نکلے، سامنے ہی سعد پیدل چلتا ہوا ہادی کے گھر کی طرف آ رہا تھا، برہان اس کی طرف دیکھ کر پھیکے سے انداز میں مسکرائے لیکن سعد نے مروتاً بھی ایسا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ مناہل والے قصے کے بعد تو اسے بھی برہان سے شدید قسم کی چڑ سی ہو گئی تھی لیکن پڑوسی ہونے کے ناتے اب وہ بالکل ہی بے مروتی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا تب ہی تو ان کے سلام کا جواب دے دیا۔

''کیسے ہو سعد! ہادی نظر نہیں آ رہا تمہارے ساتھ۔'' وہ انجان بن کر بولے۔

''وہ اسلام آباد گیا ہوا ہے اپنے گھر، آپ سنائیں۔ سنا ہے شادی ہو رہی ہے آپ کی، پیشگی مبارک باد قبول کریں۔'' سعد نے ان پر بم گرایا۔

''آپ کو کس نے بتایا؟'' برہان بوکھلائے، ان کے خیال کے مطابق تو یہ بات ابھی میر ہاؤس تک ہی محدود تھی۔

''آپ کیوں اتنے حیران ہو رہے ہیں؟'' سعد نے کمینگی کا مظاہرہ کیا۔

''ایکچوئلی ابھی کارڈز وغیرہ زیادہ نہیں دیے تو اس لیے تھوڑی حیرانی ہوئی۔'' برہان نے خود کو سنبھالا۔

''ویسے کس نے بتایا؟'' ان کی سوئی اسی بات پر اٹکی ہوئی تھی۔

''ہادی ذکر کر رہا تھا کچھ ایسا۔'' سعد دل ہی دل میں ان کی حالت سے محظوظ ہوا۔

''لیکن ہادی کو کیسے پتا چلا، میں نے تو ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا اس کے سامنے۔'' ان کا چہرہ دھواں دھواں سا ہوا۔

''شاید اس کی سسٹر مناہل کولیگ ہے آپ کی۔'' سعد نے ان کے چہرے پر پھیلی سراسیمگی کو غور سے دیکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''مناہل ہی نے ذکر کیا ہوگا، آپ نے بلایا تو ہوگا اپنے ڈیپارٹمنٹ کے لوگوں کو۔'' سعد نے ان کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دی۔ برہان کو اپنی سانس سینے میں اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ انہوں نے اپنے دماغ میں کڑیاں جوڑنے کی ناکام کوشش کی اور پھر تھک کر گویا ہوئے۔

''ہاں شاید...... اینی ہاؤ، آپ کا اور ہادی کا انویٹیشن کارڈ میرے پاس پڑا ہے۔ ٹائم ملے تو ضرور آیئے گا۔''

''آف کورس......!'' سعد کو اپنے اندر ٹھنڈک سی اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔

برہان نے اپنا سرد ہوتا ہوا ہاتھ بمشکل سعد سے ملایا اور بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے گھر کی طرف بڑھ گئے، ان کے دماغ میں بہت دنوں سے الجھی ہوئی گتھی سلجھ تو گئی تھی لیکن کچھ اس طرح سے سلجھی تھی کہ اس نے

ان کی پوری زندگی کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔

☆......☆......☆

شہزاد نے ساتویں دفعہ ہم زاد کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد سیل فون مایوسی سے میز پر رکھ دیا۔

اس کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔

اس وقت وہ ٹینا ہاؤس کے خوب صورت لان میں ٹہل رہی تھی اور پچھلے دو دن کی مصروفیت میں اسے ایک پل کو بھی ہم زاد کا خیال نہیں آیا، صندل کی پوسٹ مارٹم رپورٹ اور اس کے کیس کے ساتھ ساتھ رومیصہ کے کیس نے اسے ہوش وحواس سے بیگانہ کر رکھا تھا۔ آج اسے تھوڑی فراغت محسوس ہوئی تو ساتھ ہی اسے کسی چیز کی کمی کا احساس بھی پوری شدت سے جاگا۔

''اوہ شٹ! کافی سوچنے کے بعد اسے یاد آیا کہ ہم زاد کی آخری کال اسے مری جاتے ہوئے راستے میں آئی تھی جس کا اختتام قطعاً بھی خوش گوار نہیں تھا، تب ہی تو اس نے دوبارہ اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

''عجیب شخص ہے، بات بات میں بچوں کی طرح خفا ہو جاتا ہے۔'' وہ ہلکی سی کوفت کا شکار ہوئی۔

''سونے پہ سہاگہ نمبر بھی مسلسل آف کر رکھا ہے، آن کرنے کے بعد نوٹیفکیشن تو ملے ہی ہوں گے اسے۔''

وہ آسٹریلین گھاس پر ٹہلتے ہوئے مسلسل کڑھ رہی تھی جب اس کی نظر سیکورٹی گارڈ کے کیبن میں بیٹھے ہوئے اپنے باڈی گارڈ رضا پر پڑی، جو سیل فون پر کوئی ٹیکسٹ کرنے میں مصروف تھا، شہزاد کچھ سوچ کر اس کیبن کی طرف بڑھی اور رضا اسے آتا دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہوا۔

''رضا! میجر توصیف کو کیسے جانتے ہیں آپ؟'' وہ ملازمین کے ساتھ بھی احترام سے بات کرنے کی قائل تھی۔

''توصیف صاحب ہماری کمپنی کے پرانے کلائنٹ ہیں اور اکثر اسپیشل لوگوں کے لیے مجھے ہی ہائر کرتے ہیں۔'' اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''ان کا نمبر ہے آپ کے پاس، ذرا دیں مجھے۔'' اس نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

رضا نے اپنے سیل فون سے ایک نمبر اسے جلدی سے لکھوایا، وہ نمبر ڈائل کر کے لان کی دوسری طرف آ گئی، میجر توصیف نے چوتھی بیل پر فون اٹھا لیا تھا۔

''السلام علیکم، شہزاد کیسی ہیں آپ؟'' میجر توصیف کے پہچاننے پر وہ مسکرائی، یقیناً اس کا نمبر اس کے پاس محفوظ تھا۔

''میں ٹھیک ہوں میجر توصیف! آپ سے ایک دو باتیں کرنا تھیں مجھے۔'' وہ محتاط انداز میں گویا ہوئی۔

''آف کورس، کیوں نہیں۔''

''کیا میں آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کو میرے سلسلے میں آفیشلی آرڈرز کس نے دیے تھے۔۔؟''

''دیکھیں میم! آفیشلی تو ایسے آرڈرز ممکن نہیں لیکن جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ ہم اپنے کولیگز کے لیے بہت سی چیزیں ان آفیشلی بھی کر رہے ہوتے ہیں اور آپ کے معاملے میں بھی بالکل ایسا ہوا تھا، مجھے کرنل طاہر نے کہا تھا اور انہیں شاید لیفٹیننٹ جنرل خالد صاحب نے۔''

''اور یقیناً انہیں کسی اور نے کہا ہوگا۔'' شہزاد کے لہجے میں چھپے طنز کو بھانپ کر وہ ہلکا سا مسکرایا۔

''آپ کہیں تو میں آپ کو کرنل طاہر کا نمبر دے سکتا ہوں۔'' اس نے قدرے سوچ کر آفر کی۔

''تھینک یو، اس کی ضرورت نہیں۔''

وہ میجر توصیف کے ساتھ بات کر رہی تھی جب اسے کال ویٹنگ میں ہم زاد کی کال کا نوٹیفکیشن ملنے لگا، شہزاد کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ یقیناً اس کے سورسز اسے الرٹ کر چکے تھے۔ شہزاد نے عجلت بھرے انداز میں اسے خدا حافظ کہہ کر ہم زاد کی کال لی تو دوسری طرف سے ایک ٹھنڈی آہ بھری گئی۔

''یقیناً آپ کو علم ہو گیا ہوگا کہ میں اس وقت میجر توصیف سے بات کر رہی تھی۔''

''اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی آواز مجھ سے زیادہ خوب صورت نہیں ہو سکتی۔'' اس کے بے ساختہ انداز پر شہزاد مسکرائی۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ آپ سے زیادہ ہینڈسم بھی نہیں ہوگا لیکن آپ کو پتا ہے ناں کہ مجھے مردوں میں ہمیشہ ذہانت اٹریکٹ کرتی ہے۔''

''پھر تو میں تسلی رکھوں کہ مجھ سے کوئی نہیں جیت سکتا۔'' خلاف توقع اس کا موڈ خاصا خوش گوار تھا۔

''اللہ آپ کی خوش فہمیوں میں مزید اضافہ فرمائے، لگتا ہے آپ پاکستان میں قدم رنجہ فرما چکے ہیں۔'' شہزاد نے بالکل درست اندازہ لگایا۔

''آ جائیں، آپ کو 'چائے خانہ' میں چائے پلواتا ہوں۔'' وہ شرارتی انداز سے گویا ہوا۔

''اور میں آ بھی جاؤں گی، اس بات کا بھی آپ کو علم ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''آ تو میں بھی گیا تھا پچھلی بار، لیکن آپ ہی فائرنگ کی آواز سن کر بھاگ گئی تھیں۔'' وہ دامن کوہ والے واقعے کی طرف ہنستے ہوئے اشارہ کر رہا تھا۔

''بے فکر رہیں۔ اس بار میدان آپ ہی چھوڑ کر بھاگیں گے۔'' وہ پروقار انداز میں مسکرائی۔

''چلیں پھر آ جائیں، بیٹھ کر اپنی زندگیوں کے مسائل کا حل نکالتے ہیں۔'' اس کی سنجیدگی پر وہ ہلکا سا چونکی۔ ''لیکن شرط یہ ہے کہ سیاہ رنگ کا سوٹ پہن کر آئیں گی آپ۔'' اس کی اگلی فرمائش پر وہ بدکی۔

''آپ کو یہ غلط فہمی کیسے ہو گئی کہ آپ ایسی کوئی بے تکی فرمائش کریں گے اور میں ٹین ایجر لڑکیوں کی طرح پوری کر کے بھاگتی ہوئی آؤں گی۔'' شہزاد نے اپنے سیاہ رنگ کے سوٹ سے دانستہ نظریں چرائیں کیونکہ وہ چاہ کر بھی اسے نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ اس وقت یہی رنگ پہنے ہوئے ہے۔

''جن سے ہم محبت کرتے ہوں ان کی فرمائش پوری کرنا آپ کے نزدیک امیچورٹی ہے کیا؟'' وہ سنجیدہ ہوا۔

''فرمائش بھی تو کوئی ڈھنگ کی ہو۔'' اس نے بھی منہ بنا کر کہا۔

''اب آپ سے میں کوئی ایٹمی دھماکہ کرنے یا تازہ بجٹ بنانے کی فرمائش تو نہیں کر سکتا۔'' وہ ہلکا سا چڑ کر گویا ہوا۔

''مجھے اچھا لگے گا اگر آپ عام لڑکیوں کی طرح ٹریٹ نہیں کریں گے مجھے۔''

''یاد رکھیے گا شہزاد! ہم سب اس دنیا میں عام لوگ ہی ہیں، ہم سے محبت کرنے والوں کی نظریں ہی ہمیں ''خاص'' بناتی ہیں۔'' وہ بھی باقاعدہ بحث کرنے پر اتر آیا۔

''بے شک ایسا ہوگا، لیکن مجھے ذاتی طور پر ایسی چیزیں پسند نہیں۔'' وہ بے زاری سے بولی۔

''اور آپ میری ایک بات آج لکھ لیجیے گا کہیں، جب انسان محبت کو اوڑھ لیتا ہے تو پھر وہ سب کچھ کرنے لگتا ہے جو عام حالات میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا اور ایک دن آپ بھی وہ سب کچھ کریں گی اور بہت

دل سے کریں گی۔'' اس کا لہجہ یقین میں ڈوبا ہوا تھا۔

''یہ تو آنے والا وقت ثابت کرے گا، اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم ایسی بحث ابھی نہ کریں۔'' وہ اس کے لہجے اور انداز میں چھپی ہلکی سی ناگواری کو بھانپ کر بولا۔

''چلیں پھر کام کی بات کرتے ہیں میڈم! صارم خان کے قاتلوں کا سراغ تقریباً مل چکا ہے۔'' ہم زاد تھوڑا سنجیدہ ہوا۔

''یقیناً اس کے ڈانڈے جسٹس محمود یا بریگیڈیر وقار کے خاندان سے ملتے ہوں گے کہیں نہ کہیں سے۔'' اُس نے آہستہ سے لقمہ دیا۔

''لڑکی حسین ہی نہیں ذہین بھی ہے۔ ویسے بتا سکتی ہیں کہ یہ اندازہ کیسے لگایا آپ نے؟''

''سیدھی سی بات ہے کہ بریگیڈیر وقار اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے اور جسٹس محمود اپنی نیک نامی پر دھبہ نہ لگانے کے لیے ہی کوئی انتہائی قدم اٹھا سکتے ہیں اور صارم کی گواہی ان کے بیٹے کے کریکٹر پر ایک سوالیہ نشان ہی تو ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''ہاں۔ اس دفعہ یہ بے وقوفی واقعی جسٹس محمود کی طرف سے ہوئی ہے جو کم از کم رومیصہ کے حق میں بہتر ثابت ہوگی۔'' وہ خاصا مطمئن تھا۔

''لیکن مجھے صارم خان کی موت کا بہت دکھ ہے، اور کم از کم اس حد تک ان لوگوں کو نہیں جانا چاہیے تھا۔''

''ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے، آپ بھی تھوڑا احتیاط کریں، کیونکہ آپ نے بھی اپنے دشمنوں کی لسٹ میں خاصا اضافہ کرلیا ہے۔'' وہ فکر مند ہوا۔

''جب تک آپ جیسے دوستوں کی دعائیں میرے ساتھ ہیں، مجھے کسی چیز کا خوف نہیں۔'' وہ اس کے بے خوف لہجے پر ہلکا سا جھنجھلایا۔

''ان ساری باتوں کے ساتھ آپ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ آپ ایک عورت بھی ہیں اور کسی عورت کے لیے سب سے قیمتی چیز اس کی عزت ہوتی ہے۔''

''تو اس عزت کی حفاظت کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' وہ ہلکے پھلکے لہجے میں گویا ہوئی۔

''مجھ سے شادی۔'' جواب انتہائی برجستہ انداز میں آیا اور شہرزاد کے دل کی دھڑکن بے ربط ہوئی۔ اس کا سفید اجلا چہرہ گویا خون کی حدت سے دہک اٹھا، اور قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔ ہم زاد کو کچھ لمحوں کی غیر معمولی خاموشی کے بعد اندازہ ہوا کہ کال منقطع کی جا چکی تھی۔

☆......☆......☆

برہان شدید قسم کے ڈپریشن کا شکار تھا۔

اس کے باوجود وہ ندرت چچی کے ساتھ جناح سپر مارکیٹ آ گیا تھا۔ انابیہ اور درشہوار بھی اس کے ساتھ تھیں، وہ چاروں اس وقت محسن سنز پر دلہن کے ملبوسات دیکھ رہے تھے اور سچ بات یہ تھی کہ برہان ذہنی طور پر کہیں اور تھا اور درشہوار کو بھی اپنے سامنے رکھے قیمتی لہنگوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

انابیہ کن اکھیوں سے اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی کا دل ہی دل میں اندازہ لگا چکی تھی کیونکہ اس کی فرینڈ کرن کے مطابق میم مناہل ایک ماہ کی چھٹی پر پاکستان سے باہر جا چکی تھیں اور انابیہ نے یہ سن کر سکون کا

سانس لیا تھا۔

''برہان! یہ فان کلر کیسا ہے؟'' ندرت چچی نے ان کی بے زاری کو بھانپ کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

''مجھے کیا پتا، میں نے کون سا کلرز پر ریسرچ کر رکھی ہے۔'' وہ دکان دار کا لحاظ کیے بغیر تپ کر بولے۔

''جب کچھ بتانا ہی نہیں تھا تو دونوں بہن بھائی کرنے کیا آئے تھے یہاں۔''

انہوں نے نسبتاً دھیمی آواز میں دونوں کو جھاڑا تو برہان نے چونک کر درشہوار کی طرف دیکھا، کوفت، بے زاری اور جھلاہٹ ایک ایک نقش سے نمایاں تھی، وہ اسٹول پر اس طرح سے بیٹھی تھی جیسے ان لوگوں کے ساتھ نہ آئی ہو۔

''درشہوار! تم بتاؤ یہ لہنگا کیسا ہے؟'' ندرت چچی نے بادل نخواستہ درشہوار کا کندھا ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے نظر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

''تمہارے لیے پیک کروالوں؟'' وہ جھنجلا کر گویا ہوئیں۔

''مرضی ہے آپ کی۔۔۔'' درشہوار نے ان کو مزید تپایا۔

''باجی! آپ یہ دوپٹہ لے کر پلیز مرر میں چیک کریں، بہت زبردست چیز ہے یہ۔۔'' سیلز مین نے درشہوار کو مشورہ دیا جو اسے سخت ناگوار گزرا۔

''یہ مشورے آپ ان لوگوں کو دیں، جو دیکھ رہی ہیں۔ میرے ساتھ باجی شاجی کہہ کر رشتے داریاں گانٹھنے کی ضرورت نہیں۔'' اس کے نخوت زدہ انداز پر سیلز مین ہلکی سی خفت کا شکار ہوا۔ اسے اندازہ ہوا کہ باجی اس وقت خاصی مرچیں چبا کر بیٹھی ہوئی ہیں۔

''میں انابیہ کے لیے پیک کروا چکی ہوں، اب تم بھی دیکھنے کی تھوڑی زحمت کرلو ورنہ بعد میں گھر جا کر شور مچاؤ گی۔''

ندرت چچی نے دبے دبے انداز میں اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی، لیکن درشہوار کے دل کی دنیا میں تو اس وقت تلاطم برپا ہو چکا تھا، ہادی اپنی والدہ مسز عالیہ قریشی کے ساتھ اسی شاپ میں داخل ہو رہا تھا اور اس کی نظر بھی درشہوار اور برہان پر پڑ چکی تھی۔

''آئیں آئیں مسز قریشی! آپ کا آرڈر بالکل ریڈی ہے۔'' ایک سیلز مین پُرجوش انداز میں ان کی طرف بڑھا۔

جب کہ برہان اور ہادی دونوں کے لیے یہ انتہائی عجیب صورت حال تھی اور اتفاق سے مسز قریشی بھی برہان اور درشہوار کو پہچان چکی تھیں جنہیں مناہل نے ان کی پارٹی میں بطور خاص ان سے ملوایا تھا۔ برہان خفت زدہ انداز میں ان سے اٹھ کر ملا اور درشہوار کی آنکھوں میں بھی چمک در آئی۔

''السلام علیکم آنٹی! کیسی ہیں آپ؟'' درشہوار کا گمشدہ اخلاق واپس لوٹ چکا تھا اور وہ بظاہر مسز قریشی سے مخاطب تھی لیکن اس کی نظریں بھٹک بھٹک کر ہادی کے بے زار چہرے کی طرف جا رہی تھیں جو برہان سے بہت سرد انداز میں ملا تھا اور مجبوراً انہیں بھی اپنے ساتھ آئی ہوئی اپنی چچی اور کزن انابیہ کا تعارف کروانا پڑا، مسز عالیہ قریشی ان سب سے بڑے پرجوش انداز میں ملیں۔

''لگتا ہے آپ کے ہاں کسی کی شادی کا فنکشن ہے۔'' انہوں نے سامنے رکھے لہنگے کو دیکھ کر مسکرا کر

اندازہ لگایا۔
''ایک نہیں، ماشاء اللہ دو دو شادیاں ہیں، ایک تو برہان کی اور دوسری اس کی بہن درشہوار کی۔'' ندرت چچی کی بات پر درشہوار نے بے چینی سے کھڑے کھڑے پہلو بدلا، جبکہ ہادی کے چہرے پر بھی تھوڑے سکون کے تاثرات نمودار ہوئے اور اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔
''ماشاءاللہ، اللہ پاک قسمت بہت اچھی کرے۔'' مسز قریشی نے کھلے دل سے دعا دی۔
''ویسے مسز قریشی کی پسند بھی بڑی لاجواب ہے، ہماری بہت پرانی کسٹمر ہیں۔ آپ ان سے بھی مشورہ لے سکتی ہیں۔'' سیلز مین نے مزید خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔
''جی جی آنٹی! بتائیں، ان سب میں کون سا بیسٹ ہے؟'' درشہوار کے لہجے میں چھپی بے تابی برہان کو سخت زہر لگی جبکہ مسز قریشی کی نظریں سامنے کھلے ہوئے نفیس اور خوبصورت دوپٹوں پر تھیں اور ہادی مسلسل اپنے سیل فون پر کوئی ٹیکسٹ کرنے میں مصروف تھا۔
''بیٹا! آپ خود دیکھیں ناں، آپ کی تو شادی ہے۔'' مسز قریشی نے مسکرا کر ٹالنے کی کوشش کی۔
''نہیں آنٹی! آپ بتائیں پلیز۔ مجھے خوشی ہوگی۔'' درشہوار مچلی تو انہوں نے مجبوراً، دو تین دوپٹوں کو اٹھا کر دیکھا۔
''میرا خیال ہے کہ یہ فان اور ڈیپ ریڈ بہت اچھا لگے گا فرسٹ ڈے کے لیے۔'' ان کے منہ سے نکلنے کی دیر تھی اور درشہوار جھٹ سے بولی۔
''بس یہی پیک کردیں۔''
ندرت چچی اور انابیہ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا، جس نے ڈیڑھ لاکھ کا لہنگا لینے کے لیے ڈیڑھ منٹ بھی نہیں سوچا تھا اور کھڑے کھڑے پیک کروانے کا حکم دے دیا، لیکن ندرت چچی اس وقت کڑوا گھونٹ پینے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتی تھیں۔ اتنا تو انہیں بھی اندازہ تھا کہ وہ اگر دو لاکھ کے ڈریس پر بھی ہاتھ رکھ دیتی تو تاجدار بیگم بھی اپنی لاڈلی کی فرمائش پوری کرنے کے لیے دو منٹ بھی نہ سوچتیں۔
مسز عالیہ قریشی، اپنا آرڈر اٹھا کر ان سے مل کر جاچکی تھیں لیکن ہادی کے لباس سے اٹھنے والی قیمتی کولون کی مہک درشہوار کو مدہوش کیے جارہی تھی، وہ لاشعوری طور پر اسی جگہ پر آکر کھڑی ہوگئی تھی جہاں کچھ دیر پہلے ہادی کھڑا تھا جبکہ برہان کا موڈ مزید خراب ہوچکا تھا۔ ہادی کے تاثرات سے انہیں بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ مناہل کے غائب ہونے کی اصل وجہ صرف اور صرف ان کی شادی ہی ہے اور اس سوچ نے انہیں مزید انابیہ سے بے زار کردیا تھا۔

☆☆☆

''شیری! آج مجھے سچ سچ بتاؤ۔ کیا مسئلہ ہے؟''
وہ ابھی ابھی آفس سے گھر آئی تھی، سامنے ٹینا بیگم بالوں میں کرل ڈالے، ماسک لگائے سٹنگ روم کے کاؤچ پر نیم دراز تھیں، اسے دیکھتے ہی انہوں نے جلدی اسے اپنا ماسک اتارا، اور اس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ ان کے چہرے پر تشویش کے رنگ غالب تھے۔
''کیوں، کیا ہوا۔؟'' شہزاد کو آج اتنے عرصے بعد انہیں پرانے روپ میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔
''یہ میجر توصیف آج پھر پورے گھر میں گھسا ہوا تھا، ایک ایک روم کی سیکیورٹی کے حوالے سے علیحدہ

علیحدہ چیزیں گنوا رہا تھا وہ۔'' وہ ہلکا سا تپ کر بولیں۔
''مام! وہ قابل اعتبار بندہ ہے، جو کررہا ہے اسے کرنے دیں۔'' شہزاد نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔
''بات اعتبار کی نہیں ہے شیری!'' وہ ہلکا سا جھنجلائیں۔ ''بات اس خطرے اور پریشانی کی ہے، جس کی وجہ سے یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت پیش آرہی ہے، تم مجھے سچ سچ بتاؤ کہ تمہاری جان کو خطرہ ہے یا رومی کی۔ اصل بات کیا ہے۔''
''مام! ایسا کچھ نہیں ہے، آپ کو پتا ہے ناں' مسز قریشی میرے حوالے سے کتنی کانشس رہتی ہیں، اور میجر توصیف ان کے بیٹے ہادی کا دوست ہے۔ اسی وجہ سے وہ یہ سب کررہا ہے، ورنہ آفیشلی تو ایسا نہیں ہوسکتا۔'' شہزاد نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے مسز قریشی کے خاندان کا حوالہ دیا۔
''آپ بس اپنا بیوٹی سیلون دیکھیں اور باقی معاملات میرے اوپر چھوڑ دیں، یہ بتائیں انکل سیفی نہیں آئے کافی دن سے۔''
شہزاد نے دانستہ سیف الرحمٰن کا نام لیا کیونکہ اسے یقین واثق تھا کہ اس نام کو سننے کے بعد ٹینا بیگم باقی ساری چیزوں کو بھلا دیں گی، اور وہی ہوا، وہ یہ موضوع بھلا کر اسے سیف الرحمٰن کے کوریا کے تازہ ترین دورے کے بارے میں بتانے لگیں، ان کے ساتھ ایک گھنٹہ گپ شپ لگانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور جیسے ہی اس نے اندر قدم رکھا، ایک جانی پہچانی سحر انگیز کولون کی خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔
شہزاد کے پاؤں زمین پر جم گئے، وہ خاموش وساکت کھڑے کھڑے ایک دم چونک گئی۔
دل حلق کے راستے باہر آنے لگا۔
ہم زاد جس مخصوص کولون کا استعمال بے تحاشا۔ کرتا تھا اس کی خوشبو اس کے بیڈروم میں رقص کررہی تھی۔
وہ حواس باختہ پلٹی اور تیز تیز سیڑھیاں اترتی ہوئی سٹنگ روم میں پہنچی، ٹینا بیگم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ میں ٹی وی کا ریموٹ پکڑے بیٹھی چینل بدلنے میں مصروف تھیں۔
''مام! میجر توصیف کے ساتھ کون آیا تھا آج گھر میں؟'' اس کے لہجے میں تجسس تھا۔
''آئی ڈونٹ نو...... مجھے تو رشیدہ نے بتایا تھا، یہ آرہی ہے اس سے پوچھ لو۔'' ٹینا بیگم نے کمرے میں داخل ہوتی ہوئی رشیدہ کی طرف اشارہ کیا، جس نے ٹرے میں کافی کا بڑا مگ رکھا ہوا تھا۔
''رشیدہ، آج میجر توصیف کے ساتھ کون آیا تھا گھر میں اور میرے کمرے میں کون گیا تھا؟''
''چار لوگ تھے جی، اور وہ تو سب ہی کمروں میں گئے تھے۔''
''آرمی کے یونیفارم میں تھے کیا؟''
''نہیں جی، ایک ہی تھا یونیفارم میں، جو پہلے بھی آیا تھا اپنے گھر میں۔'' رشیدہ کا اشارہ میجر توصیف کی طرف تھا۔ وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر پلٹی اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہم زاد کا نمبر ڈائل کرچکی تھی۔
''زہے نصیب......'' دوسری طرف وہ چہکا۔
''ہم تو نظر تک چاہتے تھے، آپ جان تک آگئے۔'' اس نے طنزیہ انداز اپنایا۔ وہ اپنے بیڈروم میں دوبارہ پہنچ گئی تھی۔
''بائے گاڈ، آپ کی خواب گاہ سے کچھ نہیں چرایا سوائے ایک خوشبو کے۔'' دوسری طرف وہ شرارت

سے ہنسا تو وہ چونک گئی، ڈریسنگ ٹیبل سے اس کی پسندیدہ خوشبو کی بوتل غائب تھی۔

''دوسروں کی خوشبوئیں چراتے چراتے اپنی خوشبو کو وہیں چھوڑ آئے۔ بہت خوب...... ایسے لٹیرے پہلی دفعہ دیکھے ہیں زندگی میں۔'' وہ ہلکا سا تپ کر بولی۔

''ہم کچھ لو اور کچھ دو کے اصولوں پر چلتے ہیں جناب! اپنی سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولیے، ایک چھوٹا سا نذرانہ چھوڑ آئے ہیں وہاں، دل چاہے تو قبول کر لیجیے گا یا پھر واش روم کے دروازے کے پاس رکھے نیلے رنگ کے ڈسٹ بن میں ڈال دیجیے گا۔''

وہ اس کے کمرے کا خاصی گہری نظروں سے جائزہ لے کر گیا تھا اور اس کا ثبوت وہ ہر بات میں دے رہا تھا، جبکہ شہرزاد کی سوئی تو ایک ہی پوائنٹ پر اٹکی ہوئی تھی تب ہی وہ جتاتے ہوئے انداز میں بولی۔ ''میجر توصیف' دوستی کا حق خوب نبھا رہے ہیں۔''

''شکر ہے' آپ نے مجھ پر میجر توصیف ہونے کا ہی دعوا نہیں کر دیا، قسم سے اس بار تو میں شرم سے مر ہی جاتا۔'' اس کا مزاج خاصا خوش گوار تھا۔

''شاید اس طرف بھی سوچ لیتی، اگر پہلے دن اس کے سامنے کھڑے ہو کر آپ سے بات نہ کی ہوتی۔'' وہ مسکرائی۔

''بہت مہربانی آپ کی، ورنہ یہ صدمہ تو واقعی مجھے لے ڈوبتا۔'' وہ شرارتی انداز سے گویا ہوا۔

''اینی ہاؤ، اس ہنگامی وزٹ کی وجہ پوچھ سکتی ہوں میں؟''

''کچھ دن میں جسٹس محمود، صارم خان کی فیملی اور بریگیڈیر وقار کے خاندانوں کے درمیان ایک عظیم دنگل شروع ہونے والا ہے، اس لیے سوچا کہ اس سلسلے میں ہم بھی اپنے انتظامات کر لیں۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے؟'' شہرزاد نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

''پہلی فرصت میں اپنا بیڈ روم چینج کر لیں، کیونکہ وہاں تک رسائی سب سے زیادہ آسان ہے۔۔'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ میرے بیڈ روم میں پہنچ گئے تو کوئی بھی منہ اٹھا کر آ سکتا ہے۔۔؟'' وہ ہلکا سا بُرا مان گئی۔

''اگر کوئی میری زندگی میں ایسا کرنے کی کوشش کرے گا تو اسے کم از کم میرے ہاتھوں سے کوئی نہیں بچا سکتا، اتنا تو اپنی صلاحیتوں پر ٹرسٹ ہے مجھے۔۔''

''تو ٹھیک ہے' جب تک آپ زندہ ہیں تب تک تو کھل کر جی لینے دیں۔'' اس نے مذاق میں بات اڑانی چاہی۔

''چلیں جناب، ہم آپ کی خاطر اپنی نیندیں قربان کر دیں گے، اگر اتنی بھاری ذمے داری ہم پر ڈال ہی دی ہے تو۔'' ہم زاد کا قہقہہ فضاؤں میں گونجا اور اس سے بات کرتے کرتے شہرزاد نے اپنی سائیڈ میز کی دراز کھول کر دیکھی، اس میں رائل بلیو کلر کی ویلوٹ کی چھوٹی سی تھیلی تھی، اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اسے کھولا تو وائٹ گولڈ کا ایک دلکش سا بریسلیٹ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔

''یہ گفٹ کس خوشی میں دیا گیا ہے مجھے؟'' وہ اتنا قیمتی تحفہ دیکھ کر سنجیدہ ہوئی۔

''بے فکر رہیں، میں اپنا گفٹ اتنے ان رومینٹک طریقے سے نہیں دوں گا، یہ آپ کے لیے گڑیا نے

بھجوایا ہے امریکہ سے۔'' اس نے اپنی چھوٹی بہن کا نام لیا تو وہ کچھ مطمئن ہوئی، اس کے والد سے بات کر کے اتنا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی ساری فیملی اچھی طرح سے شہرزاد سے واقف ہے۔

''میری طرف سے تھینکس کہہ دیجیے گا اسے۔'' شہرزاد مسکرائی اور اس کے بعد ان دونوں کے درمیان رومیصہ کے کیس پر جو بات چیت شروع ہوئی، وہ ارتضیٰ پر آ کر ختم ہوئی۔

''احمد عباسی کرپشن کیس، ارتضیٰ کے گلے پڑ جائے گا۔ اس بے وقوف کو سمجھاؤ کہ ذرا طریقے سے چیزوں کو ہینڈل کرنا سیکھے۔'' ہم زاد کی بات پر وہ چونکی، آج کل احمد عباسی کرپشن کیس۔ اخبارات میں خاصا آ رہا تھا۔ ارتضیٰ حیدر نے کئی کامیاب چھاپوں کے بعد بہت سے ثبوت اکٹھے کر لیے تھے۔ اپنا کام وہ بہت دیانت داری سے کرنے کا قائل تھا۔

''ہاں' میں اس سے اکثر کہتی ہوں، لیکن وہ اپنے اصولوں پر کوئی کمپرومائز کرنے کو تیار نہیں۔''

''دیٹس گریٹ...... لیکن زندگی کے بعض معاملات میں تھوڑا بیک فٹ پر بھی کھیلنا پڑتا ہے۔'' ہم زاد خاصا سنجیدہ تھا۔

''چلیں' میں بات کروں گی اس سے، اب تھوڑا مجھے رومیصہ کو بھی ٹائم دینا ہے، وہ خاصی ڈسٹرب ہے ان دنوں۔'' شہرزاد نے الوداعی سلام دعا کے بعد فون بند کر دیا۔

☆☆☆

''قسم سے خود کو بڑا ہی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں میں آج۔''

ہادی کافی کا مگ پکڑے سعد کے ساتھ ٹیرس پر کھڑا تھا اور ان دونوں کی نظریں میر ہاؤس پر لگے ہوئے برقی قمقموں پر تھیں، جو شاید نہیں یقیناً برہان کی شادی کی خوشی میں لگائے گئے تھے۔ اس گھر کی روشنیاں پہلی بار ہادی کو اپنے دل میں اترتی محسوس ہوئیں۔

''کیا واقعی درشہوار کی بھی شادی ہو رہی ہے؟'' سعد کو یقین نہیں آ رہا تھا۔۔

''کیوں دکھ ہو رہا ہے تمہیں؟'' ہادی نے اسے چھیڑا۔

''میری بلا سے بلکہ خس کم جہاں پاک۔'' وہ ہلکا سا چڑ کر بولا۔

''تمہاری محبت تو پانی کے بلبلے سے بھی کم مدت کی نکلی ٹھا کر۔۔'' ہادی کا موڈ آج بڑا خوش گوار تھا۔

''ہزار دفعہ بتا چکا ہوں کہ اس کی شوخی اور شرارتیں اچھی لگی تھیں شروع شروع میں لیکن بعد میں تو سخت چھچھوری لگنے لگی تھی وہ مجھے۔ بائی داوے' تمہیں کیوں اتنی خوشی ہو رہی ہے؟'' سعد نے حیرانی سے اس کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھا۔

''ویسے ہے تو یہ بہت گھٹیا بات لیکن سچ پوچھو تو درشہوار سے زیادہ مجھے برہان کی شادی کی خوشی ہے۔'' اس کی بات پر سعد چونکا۔

''میں سمجھا نہیں تمہاری بات۔''

''کم از کم منو کی تو جان چھوٹ گئی ان گھٹیا لوگوں سے اور اب تو یہ میر برہان سونے کا بھی بن کر آ جائے تو وہ تھوکے گی بھی نہیں اس پر۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں اس کے مزاج کو۔'' ہادی نے لاشعوری طور پر وہ ذکر چھیڑ دیا جس کو سننے کے لیے آج کل سعد کی سماعت بے تاب تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے، مناہل آسانی سے بھول جائے گی اس شخص کو؟'' اس نے ہلکا سا جھجک کر ہادی

سے پوچھا۔

''اگر اس کی زندگی میں کوئی بہت مخلص اور ٹوٹ کر چاہنے والا بندے کا پتر آگیا تو یقیناً بھول جائے گی، لڑکیوں کے لیے محبت سے زیادہ ان کی عزت نفس اہم ہوتی ہے یا کم از کم مناہل کے لیے تو ایسا ہی ہے۔'' وہ شرارتی انداز میں گویا ہوا۔

''اور بندے کا پتر ہی تو ملنا مشکل ہے آج کے دور میں۔'' سعد بھی غیر سنجیدہ ہوا۔

''ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ منو کی قسمت میں کوئی بہت محبت کرنے والا انسان ضرور آئے گا۔'' اس کے سنجیدہ انداز پر سعد نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا، جو میر ہاؤس پر نظریں جمائے اس وقت خاصا خوش و خرم تھا۔ سعد نے دانستہ موضوعِ گفتگو بدلا۔

''ہمسایوں کے ہاں سے شادی کارڈ آچکا ہے، کیا تم جاؤ گے؟'' وہ شرارتی انداز سے گویا ہوا۔

''میرا دماغ خراب ہے، تم چلے جانا۔''

''میں تو اس ویک اینڈ پر گھر جارہا ہوں امی سے ملنے، وہ بھائی کے پاس سے واپس آرہی ہیں پاکستان۔'' سعد نے اپنی والدہ کا بتایا جو اس کے بڑے بھائی کے پاس پچھلے دو سال سے قطر کے شہر دوحا میں مقیم تھیں۔

''میرے تو خود کانوینٹ دور کے کچھ فرینڈز دو دن کے لیے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ بھوربن میں، بس وہیں انجوائے کروں گا اس ویک اینڈ پر۔'' ہادی نے بھی اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔

☆☆☆

ارسل کے کمرے کا دروازہ پوری قوت سے کھلا۔۔۔!!!

اس نے ناگواری سے اپنے جوگرز کے تسمے کھولتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا۔

سامنے درشہوار خطرناک عزائم کے ساتھ اسے گھور رہی تھی، اسے یقیناً اس کی آمد کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اس کا انداز دیکھ کر وہ بُری طرح سے ٹھٹکا، وہ شاید ذہنی دباؤ کی وجہ سے پاگل پن کی حد تک پہنچ چکی تھی۔

''ہاں درشہوار! کیسی ہو؟'' اس نے ایک گہرا سانس بھر کر اسے مخاطب کیا جب کہ وہ تو کسی پریشر ککر کی طرح پھٹی۔

''میرا حال احوال چھوڑو، تم بتاؤ مجھے، تمہارے ارادے کیا ہیں آخر؟'' اس کے انداز میں جھلاّہٹ نمایاں تھی۔

''اپنے ارادوں کا میں تمہیں پہلے دن سے بتاچکا ہوں۔'' وہ خشک انداز میں کہہ کر کھڑا ہوا۔

''ایک بات یاد رکھنا ارسل! میرے ساتھ اگر تم نے کچھ غلط کرنے کی کوشش کی تو بہت بُرا حشر کروں گی میں، کیونکہ جس طرح کا روّیہ تم نے آج کل اپنا رکھا ہے، وہ چیخ چیخ کر بتارہا ہے تمہارے عزائم۔'' وہ آستین چڑھا کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

''مثلاً کیا ہیں میرے عزائم، مجھے بھی تو پتا چلیں؟'' ارسل کو اس کا انداز سخت ناگوار گزرا۔

''تم جس طرح سے گھر سے غائب رہے ہو، میرا فون سننے سے گریزاں ہو، مجھے لگ رہا ہے تم نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔'' وہ جارحانہ انداز سے گویا ہوئی کیونکہ پچھلے چار دن سے ارسل کی غیر موجودگی نے اسے انگاروں پر لا کھڑا کیا تھا۔

''ہاں ڈال دیے ہیں، اب بولو؟'' ارسل اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرد انداز میں بولا، اسے

درشہوار کا اسٹائل سخت بُرا لگا تھا، تب ہی تو وہ بھی جواباً بدتمیزی پر اتر آیا، ورنہ اس کا کوئی ایسا ارادہ نہیں تھا۔

''تم......'' درشہوار کے منہ سے چند لمحوں کے صبر آزما مراحل کے بعد طیش کے عالم میں اتنا ہی نکل سکا۔

''ہاں...... میں......'' ارسل بھی بے حد کوشش کے بعد اپنا ضبط کھو بیٹھا۔

''اس کا مطلب ہے، شروع دن سے تمہاری نیت خراب تھی اور تم صرف اور صرف مجھے دھوکا دینے کے لیے ایکٹنگ کر رہے تھے، اسی لیے تم نے اپنا نمبر بند کیا اور اسلام آباد بھاگ گئے، تم کیا سمجھتے ہو، پاگل بنالو گے مجھے......'' وہ بے قابو ہو کر چیخنے لگی۔

''تم جیسی پاگل کو مزید پاگل بنانے کی ضرورت کیا ہے اور تم ہو کس خوش فہمی میں؟ کبھی آئینے میں شکل دیکھی ہے اپنی؟ ہر کسی کو اپنا ذاتی ملازم سمجھ رکھا ہے تم نے کیا؟ نکل جاؤ میرے کمرے سے۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔

''تم ابھی اور اسی وقت داجی کو انکار کر کے آؤ۔۔'' درشہوار کے اگلے حکم پر اس کا دماغ الٹ گیا۔

''تمہارے منہ پر تالے لگے ہوئے ہیں کیا، جو بکواس تم اس وقت میرے سامنے کر رہی ہو، جا کر کرو اپنے باپ اور دادا کے سامنے۔'' وہ سلگ کر رہ گیا۔ ویسے بھی وہ پچھلے کئی دن سے رومیصہ کی وجہ سے پریشانی میں تھا اور رہی سہی کسر آج درشہوار کی فضول باتوں نے پوری کر دی، تب ہی وہ اسی لہجے میں اس سے بات کرنے لگا جس میں وہ اس سے مخاطب تھی۔۔

''گھٹیا انسان! میں چھوڑوں گی نہیں تمہیں۔ تم نے سمجھ کیا رکھا ہے مجھے۔'' اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا سنگ مرمر کا گلدان اٹھا کر پوری قوت سے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر دے مارا۔ چھناکے کی آواز پورے گھر میں گونجی۔ وہ طیش کے عالم میں آگے بڑھ کر اس کے پرفیوم اور مختلف چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دیوار پر مارنے لگی، اس وقت وہ ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ وہ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر زور زور سے چیخ رہی تھی۔

''جاہل لڑکی! دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔'' اس نے رومیصہ کا دیا ہوا پرفیوم جب دیوار پر مارا تو اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا۔

''میں مر جاؤں گی لیکن تم سے شادی نہیں کروں گی، جا کر بتادو یہ بات جس کو بھی بتانی ہے، میں کسی کے باپ سے بھی نہیں ڈرتی۔ جس نے میری زبان کاٹنی ہے آکر کاٹ لے، جس نے میری ٹانگیں توڑنی ہیں آکر توڑ دے۔'' وہ بول نہیں رہی تھی بلکہ چنگھاڑ رہی تھی۔

ارسل نے اس کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا، وہ آگے بڑھا اور اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا، جو اسے ہوش کی دنیا میں لے آیا، وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی، اس کے نچلے ہونٹ کے دائیں کنارے سے ہلکا سا خون بہنے لگا۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور شاہ میر اور تاجدار بیگم حواس باختہ اندر داخل ہوئے، سامنے کا منظر دیکھ کر دونوں بُری طرح سے ٹھٹکے۔ ارسل کی ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کی کرچیاں ٹوٹ کر فرش پر پھیلی ہوئی تھیں۔ کمرے کی حالت دیکھ کر شاہ میر نے الجھن بھری نگاہوں سے ارسل کی طرف دیکھا۔ کمرے کی حالت چیخ چیخ کر کوئی اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔

''اب بتاؤ ان لوگوں کو کہ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ اب چپ کیوں ہو گئی ہو؟'' ارسل کے مشتعل انداز پر دونوں ماں بیٹے کو دھچکا لگا۔ انہوں نے بوکھلا کر درشہوار کی طرف دیکھا جو اسے متنفر نگاہوں

سے دیکھتے ہوئے کمرے سے نکلی۔
''ساری دنیا کو بتاؤں گی کہ مجھے نہیں کرنی تم سے شادی، دیکھتی ہوں' کون روکتا ہے مجھے۔'' درشہوار کے باغیانہ انداز پر شاہ میر نے پریشانی سے اپنی ماں کا ہراساں چہرہ دیکھا، اسے کسی بڑی گڑبڑ کا احساس ہوا۔
''خدا کے واسطے ارسل! آہستہ بولو، ابا جی گھر پر ہیں۔'' تاجدار بیگم نے بوکھلا کر اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔
''جب وہ نہیں کرنا چاہتی مجھ سے شادی تو آپ لوگ کیوں زبردستی کر رہے ہیں۔'' وہ ترشی سے گویا ہوا۔
''امی! آپ جائیں۔ مجھے اکیلے میں بات کرنے دیں ارسل سے۔'' شاہ میر نے اپنی ماں کا بازو نرمی سے پکڑ کر کمرے سے نکالا اور پھر جانچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے عین اس کے سامنے کھڑا ہوا۔
''تم بھی تو اس سے شادی کرنا نہیں چاہتے۔۔۔'' وہ شاہ میر کے غیر معمولی انداز پر ٹھٹکا۔
''بے شک ایسا ہی ہے لیکن جہاں پر بات خاندان کی عزت اور وقار کی ہو گی، تم مجھے کسی سے بھی کم نہیں پاؤ گے۔ میں نے تو بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا ہے، یہ میرے کندھوں پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتی ہے، اور ایسا میں ہرگز نہیں کروں گا۔'' ارسل نے مصلحتاً جھوٹ بولا، اسے درشہوار کے آج کے رویے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ لاٹھی توڑے بغیر اس نے سانپ کیسے مارنا ہے۔ اس کے رویے سے شاہ میر الجھ کر رہ گیا۔
''لیکن درشہوار کے آج کے جارحانہ رویے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ اس کے پیچھے ایک مضبوط وجہ ہے، وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے یا کوئی اور وجہ ہے اس کا مجھے علم نہیں، لیکن اگر ایسا کچھ ہوا تو یہ میرے ساتھ اس گھر میں ہونے والی سب سے بڑی زیادتی ہو گی۔'' ارسل کی بات پر شاہ میر کا چہرہ تاریک ہوا، کیونکہ ارسل اپنے کورٹ سے گیند نکال چکا تھا۔
''تمہارے خیال میں وہ کون ہو سکتا ہے؟'' شاہ میر نے دل پر جبر کر کے وہ سوال کیا، جو شاید وہ اپنی بہن کے حوالے سے سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔
''ظاہر ہے' خاندان کا تو کوئی فرد ہو ہی نہیں سکتا، یقیناً کوئی ایسا ہے، جس کے لیے میر خاندان کے بزرگ کبھی نہیں مانیں گے تب ہی تو درشہوار ڈپریشن کی اس انتہا پر پہنچی ہوئی ہے، جہاں وہ اپنی خاندانی روایات کی دھجیاں کسی بھی وقت اڑا سکتی ہے۔''
ارسل کی بات سن کر شاہ میر کا چہرہ سرخ ہوا۔ اسے اپنے اندر ایک الاؤ سا بھڑکتا محسوس ہوا، وہ اپنے ہونٹ سختی سے بھینچتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے کمرے سے نکلا تو ارسل نے سکون کا سانس لیا۔ اپنے سامنے رکھا ہوا لفافہ ایک طرف رکھا جس میں رومیصہ کا اس کے نام کے ساتھ بننے والا آئی کارڈ اور نکاح نامہ تھا، اب اسے ارجنٹ بنیادوں پر اس کا اپنے نام کے ساتھ پاسپورٹ بنوانا تھا۔

☆☆☆

طوبیٰ ہراساں نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شاہ میر کے سنجیدہ چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔
وہ دونوں اس وقت سامنے والے لان میں موجود تھے اور شاہ میر خصوصی طور پر اسے درشہوار کے متعلق بات کرنے کے لیے یہاں لایا تھا۔ طوبیٰ کا چہرہ سوگوار تھا لیکن شاہ میر کے اس اچانک سوال نے اس کے دماغ کی ساری بند کھڑکیاں کھول دیں۔ وہ بالکل چونک گئی۔
''کیا، کہا تم نے؟'' طوبیٰ نے تصدیق چاہی۔

''مجھے سچ سچ بتاؤ طوبیٰ! درشہوار کس میں انٹرسٹڈ ہے؟ کون ہے وہ، جس نے اسے اتنی جرأت دی ہے؟''
''مجھے کیا پتا میرو!'' اس نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا، وہ کیوں پرائی آگ میں کودتی۔
''تمہیں میری قسم طوبیٰ! اور اس محبت کی قسم جو تم مجھ سے کرتی ہو۔'' شاہ میر کی اس بات پر وہ ایک دم بوکھلائی۔
''تم جا کر ڈائریکٹ درشہوار سے پوچھو ناں، وہ بتا دے گی تمہیں۔'' اس نے اپنی جان چھڑانی چاہی۔
''میں مانتا ہوں کہ اس کی میرے ساتھ بہت زیادہ بے تکلفی ہے، لیکن بہن بھائیوں کے رشتے کے درمیان موجود فطری جھجک کو ختم کرنا ہم دونوں کے لیے ہی آسان نہیں ہو گا، اس لیے میں نے سوچا کہ تم سے پوچھ لوں، کیونکہ میں خود کو یا درشہوار کو کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتا۔'' شاہ میر نے اذیت بھرے لہجے میں کہا۔
''دیکھو میرو! ان باتوں کا اب کوئی فائدہ نہیں اور ویسے بھی یکطرفہ چیزیں زیادہ دیر تک نہیں چلتیں۔'' وہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئی تھی۔
''کون ہے وہ؟ جس کے ساتھ یکطرفہ امیدوں کے پل کھڑے کر رکھے ہیں اس نے۔'' شاہ میر کے لہجے کی شکستگی اب صاف عیاں تھی، اور ویسے بھی اپنی سگی بہن کے حوالے سے اس قسم کی کوئی بات سننا اتنا بھی آسان مرحلہ نہیں تھا۔ شاہ میر خود کو پل صراط پر کھڑا محسوس کر رہا تھا۔
''میں بتا تو دوں گی لیکن یہ بات پہلے کلیئر کر دوں کہ دوسری پارٹی کی طرف سے درشہوار کو کبھی بھی پوزیٹو رسپانس نہیں ملا، اس لیے وہ زیادہ اذیت کا شکار ہے اور شاید وہ شخص اسے پسند بھی نہیں کرتا۔'' طوبیٰ نے ہلکا سا جھجک کر تمہید باندھی۔
''فار گاڈ سیک طوبیٰ! جو بھی ہے صاف صاف بتاؤ، تمہیں اچھی طرح سے پتا ہے کہ میں میر ہاؤس کے باقی مردوں کی طرح نہیں ہوں اور لڑکیوں کو بھی جینے کا حق دینے کا قائل ہوں۔'' شاہ میر کے لہجے کی سچائی پر طوبیٰ کو کبھی بھی شک نہیں ہوا تھا۔
''تو پھر سنو، اُس گھر میں رہتا ہے وہ۔'' طوبیٰ نے ہادی کے گھر کی طرف اشارہ کیا، شاہ میر نے جیسے ہی اس کے اشارے کو سمجھا، اس کا چہرہ ضبط کی کوشش میں لال ہوا۔
''کیا سعد کو پسند کرتی ہے وہ؟'' اس کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی۔
''نہیں...... ہادی کو......!'' طوبیٰ کی اس بات پر دونوں کے درمیان ایک مہیب قسم کا سکوت طاری ہو گیا۔
اس نے کن اکھیوں سے شاہ میر کے چہرے پر موجود مبہم تاثرات پڑھنے کی ناکام کوشش کی، اس کا چہرہ اس وقت اتنا سپاٹ اور پتھریلا تھا کہ طوبیٰ کو اس سے خوف محسوس ہوا۔ وہ کچھ لمحے کسی گہری سوچ میں غرق رہا اور پھر جھٹکے سے اٹھا اور اندر کی جانب چل پڑا، لیکن اس کی چال کی لڑکھڑاہٹ وہ وہاں بیٹھے ہوئے بھی محسوس کر سکتی تھی۔

☆☆☆

ارسل نے اپنی طرف سے جو کھیلا تھا۔
''وہ تو درشہوار کے کورٹ میں گیند پھینک کر اپنی تئیں مطمئن ہو گیا تھا۔
لیکن جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، ارسل کے دل میں بھی طرح طرح کے اندیشے اور وہم اب سر اٹھانے لگے تھے۔ درشہوار اس کے ساتھ بالکل وہی کر رہی تھی جو اس نے کچھ دن پہلے اس کے ساتھ کیا تھا۔ اس کی اور برہان کی مہندی کا فنکشن تھا اور پرسوں بارات تھی۔

وہ جو درشہوار کی طرف سے گھر میں کسی بڑے ہنگامے کا منتظر تھا، وہاں اب طوفان سے پہلے والی خاموشی کا راج تھا، نہ جانے درشہوار میر ہاؤس کے کس کونے کھدرے میں جا کر چھپ گئی تھی۔ تاجدار بیگم آتے جاتے ہوئے ارسل کو التجائیہ نظروں سے دیکھتیں اور وہ نظریں چرا کر رہ جاتا، کیونکہ قسمت نے ان سب کو عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔

وہ شام کو اپنے کمرے سے باہر نکلا تو ہال کمرے میں نمیرہ ڈھولک لے کر بیٹھی ہوئی بڑے پرجوش انداز میں مہندی کے گیت گا رہی تھی، سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے ایک نظر سامنے صوفے پر بیٹھی درشہوار کی طرف دیکھا، جو کم از کم اسے تو خاصی نکھری نکھری لگی تھی۔ درشہوار نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں ارسل کو ایک عجیب سی سرد مہری نظر آئی، وہ سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔

''آخر درشہوار کے دل میں کیا چل رہا ہے، اس نے کیا ٹھان رکھا ہے؟'' اس سوچ نے اسے بے چین کیا۔

سامنے لان میں برہان ہاتھ میں سگریٹ پکڑے کسی گہری سوچ میں گم تھے، ارسل کو تھوڑی حیرانی ہوئی کیونکہ اس نے اس سے پہلے انہیں کبھی سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر اس وقت اس قدر وحشت اور ویرانی تھی کہ ارسل گھبرا کر گھر سے باہر نکل آیا۔

وہ پیدل چلتا ہوا کشمیر پوائنٹ کی طرف جا نکلا، راستے میں اس نے پورا آدھا گھنٹہ رومیصہ سے بات کی۔ جو آئی ڈی کارڈ بننے کے بعد خاصی مطمئن تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لے گا۔

جبکہ ارسل دل ہی دل میں اپنا اگلا لائحہ عمل طے کر چکا تھا، اس کی برونائی دارالسلام کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب ہو گئی تھی جس کا انٹرویو اسکائپ پر ہوا تھا، اسے اب کمپنی کی طرف سے فیملی ویزے کا انتظار تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر گھر والے درشہوار کے نام کی کوئی زنجیر اس کے پیروں میں ڈالیں گے تو وہ خاموشی سے یہ کڑوا گھونٹ پی لے گا کیونکہ مصلحت کا یہی تقاضا تھا کہ وہ کسی کو۔ اپنے ارادوں کی بھنک بھی نہ پڑنے دے کیونکہ اس خاندان کی پہنچ اور اختیارات کو اس سے زیادہ کون جانتا تھا۔ وہ انہیں وقت سے پہلے اپنی طرف سے خبردار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے رومیصہ کے پیپرز بنوانے کا کام بہت تیزی سے شروع کر رکھا تھا اور جیسے ہی رومیصہ کے پیپرز مکمل ہوتے وہ چپ چپاتے اس کے ساتھ ملک سے باہر نکل جاتا اور باہر جاتے ہی اس کے ذہن میں تھا کہ وہ درشہوار کو طلاق کے کاغذات بھجوا دے گا، لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ کاتب تقدیر اس سے پہلے ہی میر ہاؤس کے مکینوں کے لیے کچھ اور لکھ چکا ہے جو آنے والے دنوں میں اس گھر کی بنیادوں کو ہلانے والا تھا۔

☆☆☆

ویک اینڈ پر ہادی اپنے گھر سے نکل رہا تھا جب اسے درشہوار کی کال آئی۔

مری کے پر پیچ راستوں پر گاڑی چلاتے ہوئے اس نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر اس کا پیر خود بخود بریک پر پڑا، وہ اب شاہ بلوط کے درخت کے پاس اپنی گاڑی روک چکا تھا۔

اسے اندازہ تھا کہ دوسری طرف موجود محترمہ اپنی باتوں سے کسی کا بھی دماغ گھما دینے میں ماہر ہیں اور سڑک پر کوئی بھی حادثہ رونما ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ خاموشی سے اس کی بات سن لی جائے۔

''جی فرمائیے، کس لیے کال کرنے کی زحمت کی آپ نے؟'' ہادی نے دانستہ اپنا لہجہ تھوڑا سخت رکھا۔

''مجھے آپ سے ابھی اور اسی وقت ملنا ہے۔'' وہ مایوں کے زرد جوڑے میں کسی اور کے نام کی مہندی

ہاتھوں پر لگائے اس سے فرمائش کر رہی تھی۔

''آر یو ان یور سینسز؟'' ہادی ہلکا سا جھنجھلایا۔ ''محترمہ! آج رات آپ کی مہندی اور کل شادی ہے۔'' اس نے غصّے سے یاد دلایا۔

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ مجھے آپ سے ملنا ہے، میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' درشہوار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر رو دی۔

''سو واٹ؟ مجھے اس چیز میں کوئی انٹرسٹ نہیں کہ آپ یہ شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں، یا کہاں کرنا چاہتی ہیں کیونکہ یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے، اس لیے براہ مہربانی مجھے دوبارہ کال مت کیجیے گا۔'' ہادی نے بے رخی کے ساتھ اس کی طبیعت صاف کی۔

''اگر آپ میری بات نہیں سنیں گے تو میں خودکشی کر لوں گی۔'' اس کے لہجے میں کچھ تھا جو ہادی کا فون کاٹتا ہاتھ فضا میں معلق ہوا۔

''آپ مجھے ایموشنل بلیک میل کر رہی ہیں؟'' وہ سلگ کر رہ گیا۔

''محترمہ! میں کچھ سننا نہیں چاہتا' مجھے آپ کی فضول باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، آپ کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آ رہی۔'' وہ ایک دم تپ اٹھا۔

''آخر پرابلم کیا ہے آپ کے ساتھ؟ کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہیں آپ؟''

''آپ مجھ سے آخری بار مل لیں' ہمارے گھر کے پچھلے لان میں، اس کے بعد میرا وعدہ ہے کہ آپ کو کبھی بھی تنگ نہیں کروں گی۔'' وہ منتوں پر اتر آئی۔

''پلیز' میری یہ آخری بات مان لیں۔'' وہ ایک دفعہ پھر رو دی۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ہادی نے صاف انکار کیا۔ ویسے بھی اسے دو گھنٹے کے بعد اپنے دوستوں کے ساتھ پی سی بھوربن میں ایک محفل موسیقی میں جانا تھا۔ اس کے دوست بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔

''آپ کو مجھ سے ہر حال میں اور ہر قیمت پر ملنا ہو گا۔'' وہ بھی ضد پر اتر آئی۔

''اچھا؟'' اس نے استہزائیہ انداز اپنایا۔ ''اگر نہ ملوں تو کیا کر لیں گی آپ؟''

''میں پھر کچھ ایسا کروں گی کہ ساری زندگی کا عذاب آپ کو بھگتنا پڑے گا۔'' وہ بھی باقاعدہ دھمکیوں پر اتر آئی۔

''پھر آپ، اب آپ کچھ کر ہی لیں کیونکہ میں کسی کی دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔'' ہادی نے بھی غصّے سے کہہ کر اپنا سیل فون ہی بند کر دیا، درشہوار نے اس کا دماغ گھما دیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی لڑکی اس حد تک بلیک میلنگ اور دھمکیوں پر بھی اتر سکتی ہے۔

درشہوار نے فون تو بند کر دیا تھا لیکن اس کے دل و دماغ میں ایک جنگ سی جاری تھی، اپنی ذات اور اپنی محبت کی توہین اس سے بالکل برداشت نہیں ہو رہی تھی، پورے گھر میں موسیقی گونج رہی تھی، اس کی مہندی کا فنکشن بھی ایک گھنٹے بعد پی سی بھوربن کے ہال میں ہی تھا۔

وہ ایک گھنٹہ تک اپنے کمرے میں ٹہلتی رہی، اس دوران کئی لوگوں نے اس کے کمرے کا دروازہ بجایا لیکن اس نے کسی کو بھی لفٹ نہیں کروائی اور جب اس کا دماغ سوچ سوچ کر شل ہو گیا تو وہ تھک ہار کر بیٹھ گئی۔

تاجدار بیگم کے کہنے پر وہ خاموشی سے انابیہ کے ساتھ پارلر چلی گئی اور وہیں سے اسے طوبیٰ اور نمیرہ ہال تک

لائی تھیں، اس کی خاموشی سب کو وہم میں ڈال رہی تھی، اس نے مہندی کے فنکشن میں ساری رسمیں چپ چاپ کروالی تھیں۔ اپنی کزنز کی چھیڑ چھاڑ کا بھی بُرا نہیں مانا تھا۔ نمیرہ اس سارے فنکشن میں سب سے زیادہ نمایاں تھی، ایک تو وہ دولہا کی بہن تھی اور دوسرے وہ ہر رسم کو بھرپور طریقے سے انجوائے کررہی تھی۔

''وہاج بھائی پلیز میری ایک زبردست قسم کی تصویر تو بنائیے گا۔'' نمیرہ نے پاس سے گزرتے ہوئے وہاج کو روکا، سنہری رنگ کے شرارے میں اس کا اَن چھوا حسن وہاج کو چونکا گیا۔ وہ آج دل لگا کر تیار ہوئی تھی، نفاست سے کیا ہوا میک اپ اور ماتھے پر جھومتی ہلکی سی بندیا کے ساتھ وہ خوب بجلیاں گرا رہی تھی۔

''ادھر دکھائیں مجھے، کیسی تصویر آئی ہے؟'' وہ وہاج کے ہاتھ میں موجود سیل فون پر جھکی تو انجانے میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کو مزید ہوا دے گئی۔ ویسے بھی اب وہ صندل والے صدمے سے باہر آچکے تھے اس لیے انہیں بھی ہری ہری ہی سوجھ رہی تھی۔ نمیرہ کی اس درجہ قربت نے انہیں گویا مفلوج کیا۔ انہوں نے اس کی روشن پیشانی پر جھولتی ہوئی لٹ کو چھونے سے خود کو بمشکل روکا۔

''یہاں پر کھڑی رہو، میں بناتا ہوں تمہاری تصویریں۔'' انہوں نے جان بوجھ کر اس کا بازو پکڑ کر ایک کونے میں کھڑا کیا۔ نمیرہ کو شدید قسم کی الجھن کا احساس ہوا۔

''بس کردیں وہاج بھائی! اتنی ہی تصویریں بہت ہیں۔'' وہ اپنا سیل فون لے کر زبردستی اسٹیج کی طرف آگئی لیکن وہاج کی گرم نظریں اس کے چہرے کا حصار کیے ہوئے تھیں اور اب اسے کوفت میں مبتلا کررہی تھیں، اتنی تو بچی وہ بھی نہیں تھی کہ ان کی نظر کے انداز کو نہ سمجھتی۔

درشہوار کے برابر میں جب ارسل کو اور انابیہ کے ساتھ برہان کو لاکر بٹھایا گیا تو دونوں دولہا حضرات کے چہروں پر غیر معمولی سنجیدگی تھی، ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ شادی نہیں کوئی ماتم گاہ ہو، ہر چہرہ افسردگی کا اشتہار تھا۔

تاجدار بیگم کے ساتھ ساتھ شاہ میر بھی درشہوار کو خاموش دیکھ کر تھوڑا پرسکون تھا، کیونکہ اسے لمحہ لمحہ یہ خوف کھا رہا تھا کہ وہ اٹھ کر ایک دم کوئی ہنگامہ نہ شروع کردے، لیکن درشہوار تو شاید دل میں کچھ اور ہی ٹھان کر بیٹھی تھی کیونکہ وہ بھی اپنی ضد کی غلام تھی اور آج تو ہادی نے باقاعدہ اسے للکارا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کا جواب نہ دیتی۔

☆☆☆

نمیرہ نیند میں جھومتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔

مہندی کا فنکشن رات بارہ بجے ختم ہوا تھا اور اس کے بعد ندرت امّی نے نمیرہ کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ ملتان سے آئے ہوئے مہمانوں کے سب بستر لگوا کر ہی اپنے کمرے میں جائے گی، ملازمین کی ایک فوج اس کے ہمراہ تھی، ان سب کاموں سے فارغ ہوکر وہ تھک کر چور ہوچکی تھی، جب تاجدار بیگم کے کمرے سے آتی ہوئی دبی دبی سی آوازوں پر اس کے کان کھڑے ہوئے۔

فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر وہ تاجدار بیگم کے کمرے کی طرف چلی آئی، دروازہ ہلکا سا کھلا ہوا تھا اور اندر وہاج اپنی والدہ کے ساتھ باقاعدہ بحث کررہے تھے اور ان کی آوازیں بحث کے دوران اتنی بلند ضرور ہوچکی تھیں کہ دروازے میں کھڑے کسی بھی انسان کو صاف سنائی دیتیں۔

''یہ دوسری شادی کا بھوت کہاں سے تمہارے دماغ پر سوار ہوگیا ہے۔'' تاجدار بیگم جھنجھلا کر بولیں۔ آج کل وہاج اور فارحہ بھابھی نے شادیوں کے فنکشن کے لیے میر ہاؤس میں ہی ڈیرے ڈال رکھے

تھے اور برہان کے ویسے پر تو میر حاکم نے سیاست سے تعلق رکھنے والے کافی لوگوں کو مدعو کر رکھا تھا اور پرنٹ میڈیا بھی اس شادی کو خاصی کوریج دے رہا تھا۔

"اچھی خاصی تو ہے فارحہ؟" وہ بےزاری سے گویا ہوئیں۔

"اتنی ٹھنڈی عورت کے ساتھ اب میرا گزارا نہیں ہے، آپ کیا چاہتی ہیں کہ میں بھی خاقان چچا کی طرح باہر منہ مارنا شروع کر دوں۔" وہ متنفر لہجے میں گویا ہوئے اور باہر کھڑی نمیرہ کو دھچکا سا لگا۔

"تمہیں پتا ہے ناں، ہمارے ہاں خاندان سے باہر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے تو کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں کوئی لڑکی۔" تاجدار بیگم اکتا کر بولیں۔

"لڑکی میں آپ کو بتا دوں گا لیکن آپ بابا سے بات کریں اس حوالے سے۔" وہاج کی بات پر تاجدار بیگم کے کان کھڑے ہوئے۔

"اگر تو طوبیٰ کی بات کر رہے ہو تو صاف بتا دوں شاہ میر قتل کر دے گا تمہارا، وہ ویسے بھی اٹھتے بیٹھتے دھمکیاں دے رہا ہے مجھے کہ طوبیٰ کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرے گا۔" ان کا پہلا دھیان طوبیٰ کی طرف ہی گیا کیونکہ اب وہی ایک تو بچی تھی پورے خاندان میں۔ اس لیے انہوں نے صاف صاف اپنے بیٹے کو بتایا اور باہر کھڑی نمیرہ نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔

"جب وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو آپ لوگ نمیرہ کے نام کا ہار کیوں ڈال رہے ہیں اس کے گلے میں؟" وہ ہلکا چڑ کر بولے۔

"کیوں وہ ہار تم نے ڈالنا ہے اپنے گلے میں۔" انہوں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں تو ہرج ہی کیا ہے اس میں؟" وہاج کی بات سن کر نمیرہ کو زوردار شاک لگا، اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر خوف زدہ انداز سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی، اسے وہاج سے پہلی دفعہ گھن سی محسوس ہوئی۔ ان کی گرم نظروں کے پیچھے چھپی خواہش اب مجسم صورت میں اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

شہرزاد آج سارا دن آفس میں مصروف رہی۔

رومیصہ کے کیس کے سلسلے میں خاصی مثبت پیش رفت ہو رہی تھی۔ پولیس صارم خان کے قاتلوں تک تقریباً پہنچ چکی تھی۔

جسٹس محمود کی فیملی کو اب رومیصہ کے بجائے اپنی جان بچانے کی لگ گئی تھی۔ وہ اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں بری طرح سے پھنسنے والے تھے اور اس کے پیچھے ان کے اکلوتے بھتیجے سلمان کا ہاتھ تھا جو کہ صارم اور روحیل کا بیسٹ فرینڈ بھی تھا اور اس نے رومی کے حق میں گواہی دینے پر صارم کے ساتھ نہ صرف اچھا خاصا جھگڑا بھی کیا تھا بلکہ کچھ لوگوں کے سامنے اسے جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی تھی۔

"مجھے لگتا ہے کہ جسٹس محمود کی فیملی اب رومیصہ کے کیس سے جان چھڑانے کی کوشش کرے گی۔" ارتضیٰ اس کے آفس میں موجود تھا، اور وہ اس کی بات پر مسکرائی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اب ایسا ہی ہوگا۔

"رومیصہ کا کیس جیسے ہی ختم ہوگا میں صندل کا کیس فائل کر دوں گی۔" شہرزاد نے اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کیا، ویسے بھی اب اس کی ارتضیٰ کے ساتھ اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی اور وہ بھی اپنے کام کے سلسلے میں اس کے مشوروں کو خاصی اہمیت دیتا تھا۔

"یعنی کہ آپ نے قسم کھا لی ہے کہ نہ تو سکون سے آپ خود بیٹھیں گی اور نہ ہی کسی اور کو بیٹھنے دیں گی۔" ارتضیٰ مسکرایا۔

"نہیں صندل کے کیس کے بعد میں تھوڑی بریک لوں گی، مام اور رومیصہ کے ساتھ کچھ باہر کے وزٹ پلان کرنے ہیں۔"

"ان دونوں کے ساتھ کیوں، اپنے لائف پارٹنر کے ساتھ جائیں، زندگی میں کچھ فیصلے وقت پر کر لینے چاہئیں۔" ارتضیٰ کی بے تکلفی پر وہ کچھ چونکی اور اس کا دھیان ایک دم ہم زاد کی طرف گیا، جس نے اس دن شادی کی بات اچانک ہی چھیڑ دی تھی اور پھر دوبارہ اس کا ذکر نہیں کیا۔

"شادی ابھی دو سال تک میری پلاننگ میں نہیں ہے، رومی کو سیٹ کرنے کے بعد ایسا کچھ سوچوں گی۔" شہرزاد نے اپنی میز پر رکھی فائلوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے انتہائی سرسری انداز سے جواب دیا اور ساتھ ہی بڑی مہارت کے ساتھ موضوع گفتگو بدل دیا۔

"میرا خیال ہے۔ ہمیں نکلنا چاہیے، آج صارم کے والد کے ساتھ میٹنگ بھی تو ہے ہماری۔" شہرزاد نے اسے یاد دلایا تو ارتضیٰ اسے کچھ کہتے کہتے رک سا گیا، شاید ابھی یہ مناسب وقت نہیں تھا۔

"لیڈیس موو......" وہ اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مسکراتا ہوا کھڑا ہوا، صارم کے والد کے ساتھ ہونے والی میٹنگ خاصی حوصلہ افزا تھی اور جب وہ دونوں ان کے گھر سے نکلے، مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں اور ہلکا ہلکا سا ملگجا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا، ایک سیاہ رنگ کی کار ان کے تعاقب میں تھی اور ارتضیٰ نے بہت جلد اسے نوٹ کر لیا تھا، جبکہ شہرزاد نے اس بار بھی رضا کو اپنی گاڑی کے ساتھ آفس میں ہی چھوڑ دیا تھا۔

"تمہاری گاڑی کا تعاقب ہو رہا ہے۔" ارتضیٰ کے لہجے کی سنگینی پر وہ تھوڑا الرٹ ہوئی۔

"اپنا روٹ چینج کر لیں آپ۔" شہرزاد کے مشورے پر اس نے گاڑی تھوڑے رش والے ایریا میں ڈال دی تھی اور شاید دوسری طرف ان لوگوں کو بھی اندازہ ہو چکا تھا اس لیے اگلے چوک پر اس گاڑی کے ساتھ ایک اور سفید رنگ کی کرولا بھی شامل ہو چکی تھی۔

ارتضیٰ بہت تیزی کے ساتھ سیل فون پر اپنے ماتحتوں کو مسلسل ہدایات دینے میں مگن تھا جبکہ شہرزاد پرسکون انداز میں اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جب اسے ہم زاد کی کال آئی، وہ تھوڑا بے چین لگ رہا تھا۔

"سنو شہرزاد! آغا شاہی ایونیو کے سگنل پر تمہاری گاڑی کے عین برابر میں میری جیپ آئے گی، یہ سگنل تھوڑا لمبا ہوتا ہے، تم اس گاڑی سے نکل کر میری جیپ میں آجاؤ۔" اس کے مشورے پر شہرزاد کا دماغ بھک کر کے اڑا۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے، میں کیسے آجاؤں۔۔۔؟" وہ اس بات پر تھوڑا جھنجلائی۔

"احمق لڑکی! ان لوگوں کا تم سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، تم کیوں پرائی آگ میں کود رہی ہو، یہ ارتضیٰ کے پیچھے ہیں، تم اس کے ساتھ مفت میں ماری جاؤ گی۔ میری بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آرہی ہے۔" وہ ایک دم غصے میں آیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

سویرا فلک

بیٹیاں پرائی ہوتی ہیں

کرن کالج سے گھر آئی تو ربیعہ اور احمد کو آنگن میں کھیلتا دیکھ اس کے تھکے ہوئے وجود میں گویا توانائی سی بھر گئی۔ چھ سالہ ربیعہ اور چار سالہ احمد بھی کرن کو دیکھتے ہی دوڑتے ہوئے آئے اور ننھے منے ہاتھوں سے کرن کو حصار میں لے لیا تو اس نے دونوں کو باری باری پیار کیا اور قدم اندر کی طرف بڑھا دیے۔ اس کے ذہن میں آگے کی صورت حال کا تصور جاگا تو اس کی تھکن دوچند ہوگئی۔ چاروناچار اس نے اپنے لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجائی اور اندر داخل ہوگئی۔

حسب توقع امی کچن میں تھیں اور سدرہ آپا محض ساتھ کھڑی گپیں ہانک رہی تھیں۔ جتنی تیزی سے امی کے ہاتھ ہنڈیا بھون رہے تھے اتنی ہی تیزی سے سدرہ آپا کی زبان چل رہی تھی' اسے غصہ تو آیا مگر وقت کا تقاضا تھا کہ امی کو ہٹا کر خود چولھے کے سامنے کھڑی ہوجائے۔ عام دنوں میں وہ کالج سے آکر فریش ہوکر پنکھے کے نیچے بیٹھ جاتی پھر جب تک امی نماز پڑھتیں' وہ روٹیاں ڈال لیتی تھی۔ پھر دوپہر میں صرف وہ اور امی ہوتے تھے تو زیادہ تر دہی یا پھر کبھی کسی سبزی کے ساتھ روٹی اور کبھی کھچڑی سے کام چلاتے تھے۔ ابو دوپہر میں سلاد اور رات میں دلیہ کھاتے تھے۔ رات کے لیے وہ بھائی کے آنے سے پہلے سالن تیار کرلیتی تھی۔

مگر آج تو آرام مفقود تھا کیونکہ شادی شدہ بڑی بہن سدرہ بمعہ بچوں کے موجود تھی اسے بہن کا آنا ہرگز نہیں کھلتا تھا' یہ ان کا میکہ تھا خود اسے بھی بہن اور بچوں سے فطری محبت اور لگاؤ بھی تھا مگر میکے آکر سدرہ آپا کا مہمان بن کر بیٹھ جانا اسے اس وقت سخت زہر لگتا تھا جب وہ اماں ابا کو بیٹی اور نواسا نواسی کے بے جا چونچلے پورے کرتے دیکھتی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر امی کو چولھے کے آگے سے ہٹانے لگی۔

''امی اتنی گرمی میں آپ کہاں کھڑی ہوگئیں' بی پی بڑھ جائے گا۔ آپ ہٹیں میں کرتی ہوں۔''

''ہاں دیکھو نا کرن! میں نے بھی کہا مگر امی سنتی کہاں ہیں' کہنے لگیں کہ تمہارا میکہ ہے تم آرام کرو۔'' سدرہ آپا نے ہنستے ہوئے کہہ کر چھری اٹھائی اور جانے کس خیال کے تحت گاجر چھیلنے لگیں۔ وہ اپنا آپ خود نمایاں کرنے میں اور اپنی آؤ بھگت کروانے کی خوب ماہر ہوچلی تھیں۔

وہ شادی سے پہلے ایسی نہ تھیں مگر شادی کے بعد خصوصاً بچوں کے بعد شروع شروع میں دیے جانے والے پروٹوکول کو اب انہوں نے اپنا حق سمجھ لیا تھا اور اس کے لیے بعض اوقات وہ کھلم کھلا ڈیمانڈ کرتیں تو بسا اوقات خاموش احتجاج' کرن امی کی وجہ سے زبان بندی پر مجبور تھی اور وہ چاہ کر بھی سدرہ آپا کو یہ احساس نہیں دلا پاتی تھی کہ آپ اپنے میکے کا کچھ تو احساس کریں۔ ابھی بھی اس نے خود پر بمشکل کنٹرول کیا ورنہ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ کہہ دے کہ......

''سدرہ آپا' امی کی تو عادت ہے منع کرنے کی مگر آپ ان کے ساتھ زبردستی کرتیں' ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیتیں کہ اب میں آگئی ہوں آپ آرام کریں۔ اب امی اگر سبزی بنا رہی ہیں تو آپ کم از کم اپنے بچوں کے لیے دال چاول تو خود بنا لیتیں۔ مگر ہر بار کی طرح وہ بس دل ہی دل میں سوچ سوچ کر کڑھتی رہی' ابھی

فرمائشیں شروع کردیں۔

''کرن' ذرا چار پانچ کھٹی مرچیں بھی تل لینا۔ تمہارے بہنوئی کو تو پسند نہیں تو میں بناتی ہی نہیں اور سنو' بچے تو خالی دال چاول تو نہیں کھائیں گے' کباب ہیں تو تل دو یا پاپڑ بنا لو۔ رکو' میں دیکھتی ہوں۔ ربیعہ شوق سے کھاتی ہے امی کے ہاتھ کے بنے کباب۔ مرچیں نہیں ہوتیں نا۔ سوچ رہی ہوں امی سے بولوں گی کہ اب ابو کے لیے بنائیں تو زیادہ بنا لیں مجھ سے تو اپنے بنتے ہی نہیں اور چار چار طرح کے کون بنائے۔ احمد کو چکن کے پسند ہیں۔ تو تمہارے بہنوئی کو شکم پوری اور ربیعہ کو ایسے بغیر مرچوں والے۔'' انہوں نے چھ کبابوں میں سے چار نکالے اور سامنے رکھے فرائی پین میں ڈال دیے۔ جس میں کرن نے مرچیں تلنے کے لیے تیل ڈالا تھا۔

''چلو میں ذرا بچوں کو دیکھوں کیا کر رہے ہیں۔ اور ہاتھ منہ دھلواؤں نہیں تو یونہی بیٹھ جائیں گے کھانے کے لیے۔'' وہ کہتے ہوئے باہر چلی گئیں۔ کرن نے ان کی پشت کو دیکھ کر حتی المقدور زبان باہر ——— نکالی اور پھر مرچوں کو چاک کرنے لگ گئی۔

☆☆☆

کرن کو سدرہ آپا سے قطعاً کوئی بیر نہ تھا۔ وہ اس کی ماں جائی تھیں۔ شادی سے پہلے تو سدرہ آپا ہی اس کی بیسٹ فرینڈ تھیں مگر شادی کے فوراً بعد ہی سدرہ آپا کے مزاج کو تیزی سے بدلتا دیکھ کر کرن ― حیرت میں گم ہوگئی۔ وہ جب بھی آتیں تو ان کی گفتگو کا آغاز میرا میاں، میرا سسرال اور پھر میرے بچوں سے ہوتا اور اختتام بھی یہی ہوتا۔ میکے اور اس سے بابت جڑی ہر بات کو وہ بالکل ایسے لیتیں جیسے کوئی چھوٹا چینل۔ جس کے پروگراموں سے لے کر بریکنگ نیوز تک کی اہمیت محض تھوڑے بدلاؤ کے لیے ہوتی ہے ورنہ اسے کوئی بھی قابل اعتنا نہیں جانتا۔

سدرہ آپا میں یہ بدلاؤ کیوں کر آیا' وہ چاہ کر بھی اس کا سراغ نہیں لگا پائی تھی۔ اور براہ راست ان سے

تھی سو طوعاً و کرہاً زبان کو تالو سے لگائے رکھتی تھی۔

لیکن زبان سے زیادہ آنکھوں اور کانوں کو پابند کرنا مشکل ہے سو اس کے ساتھ بھی یہی تھا اور سدرہ آپا کے مزاج کے اسرار بھی یوں کھلتے کہ اسے حیران کر کے ہی چھوڑتے تھے۔ ابھی بھی دوپہر کے کھانے پر انہوں نے بچوں کے نام پر کباب نکال کر اور پھر بچوں کے ذرا سے پس و پیش پر انہیں نانا ابو کے حوالے کی دھمکی دی اور پھر رات کے کھانے پر ابو سے بولیں۔

''ابو اب آپ ہی نمٹیں اپنے نواسا نواسی سے۔ پتا ہے مجھے' آپ پیزا منگوا کر دے دیں گے فوراً اور یہ آپ کے قابو میں آجائیں گے، یہاں آکر تو سنتے ہی نہیں میری۔ اب آپ جانیں اور یہ'' وہ کہہ کر رخ موڑ کر بیٹھ گئیں اور بچے تو گویا آپا کے بدلتے مزاج کے تمام اشاروں سے واقف تھے فوراً نانا کے گرد ڈیرہ ڈال لیتے اور کورس میں شور برپا کردیا۔



[illegible]

اور پھر ابو کو پزا کا آڈر کرتے ہی بنی اور کرن انہیں گیٹ پر ہزار دو ہزار کی کیش پے منٹ کرتے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح کڑھتی رہتی کہ جانے اب ابو اپنی اور امی کی دواؤں اور گھر کے راشن میں سے کس چیز کی کٹوتی پہلے کریں گے۔ ایسا نہیں تھا کہ سدرہ کو باپ کی فکر نہیں تھی۔ وہ ماں سے ان کے ڈاکٹر کے ہاں جانے اور چیک اپ کی تفصیلات لینا کبھی نہیں بھولتی تھیں۔ ماں کو اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرنا بھی ہرگز نہ بھولتی تھیں بس بھولتی تھیں تو یہ کہ ان کی شادی کے بعد ابا ریٹائر ہو چکے ہیں' اماں کی بڑھتی عمر اور گرتی صحت کے باعث وہ جلد تھکن اور پھر ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محض پینشن کے بل بوتے پر انہیں ''کرن'' نامی فرض سے بھی سبکدوش ہونا ہے اور رہ گئی بھائی کی تنخواہ وہ سب راشن، بلوں اور دوسرے خرچوں کی کی نذر ہو جاتی ہے اور اسی بھولنے کی عادت کے باعث وہ کئی بار کی طرح اس رات بھی جب کھانے کی میز پر بیٹھیں تو ہمیشہ کی طرح ماہرانہ انداز میں چونکتے ہوئے بولیں۔

''ارے ہاں امی' ایک ضروری بات کرنی تھی' وہ ثمینہ کے سسرال کی دعوتیں ختم ہو گئیں، وہ فارغ ہے تو میں کہہ رہی تھی کہ آپ لوگ بلوالیں اسے' خیال رکھیے گا۔ ہانیہ، چھوٹی جٹھانی، کے میکے والوں نے تو ریسٹورنٹ میں بلوایا تھا آپ لوگ گھر میں کریں بے شک مگر آئٹمز شان دار ہوں آخر میں تو بڑی بھاوج ہوں ثمینہ (نند) کی۔ ورنہ کہیں کمی رہ گئی تو ساری عمر باتیں سننا پڑیں گی آپ دن کنفرم کر کے مجھے بتا دیں' میں فون کر دوں گی پھر آپ بھی کر دیجئے گا۔'' اور میری ساس اور ہم لوگ تو خیر ہوں گے مگر آپ خود انہیں بھی فون کر دیجیے گا آپ کو پتا ہے' کیسے برا مان جاتی ہیں ذرا ذرا سی بات کا۔''

اور امی ان کی نئی فرمائش پر محض سر ہلا کر رہ گئیں۔

وہ یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ بیٹا تمہاری عزت بنائے رکھنے

[illegible] دے رہا ہے۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح خاموش رہیں مگر ان کے اور بچوں کے سو جانے کے بعد کرن امی کے کمرے میں چلی آئی جہاں وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر تسبیحات میں مصروف تھیں' وہ ماں کے پاس آ کر ان کے پہلو میں دوزانو ہو کر بیٹھ گئی اور دل میں مچلتے لفظوں کو لب پر آنے کی اجازت دے دی۔

''امی آپ سدرہ آپی کو سمجھاتی کیوں نہیں۔''

وہ کئی بار کا سوال دوبارہ کر بیٹھی۔

''بیٹا، تمہیں لگتا ہے کہ اس کی یہ عمر ہے سمجھنے کی۔'' ان کا جواب بھی وہی پرانا تھا۔

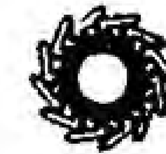
''کیوں امی اب تو وہ پریکٹیکل لائف میں آ گئی ہیں' اب انہیں ہمارے مسائل صحیح طور سے سمجھنے چاہئیں ہمارے حالات کوئی ڈھکے چھپے تو نہیں ان سے، آپ مجھے بھی کچھ نہیں کہنے دیتیں ورنہ......'' وہ رکی۔

''نہیں کرن تم کچھ نہیں کہو گی۔ یہ اس کا میکہ ہے۔ وہ یہ سب ہمیں اپنا جان کر کہتی ہے۔''

''حیرت ہے امی! اپنے تو دل کا حال بنا کہے جان لیتے ہیں اور وہ تو بیٹی ہیں۔'' وہ جذباتی ہونے لگی۔

''ہاں وہ بیٹی ہے اور بیٹیاں پرائی ہوتی ہیں۔''

امی کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔ وہ یہ کہہ کر آنکھیں موند کر لیٹ گئیں اور کرن پر گویا سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ چاہ کر بھی ان کے بیان کی تردید نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ ایسے میں اس کے الفاظ لاکھ جذبات کا جامہ پہن لیتے لایعنی رہتے سو اس نے خود سے عہد کیا کہ اپنی باری پر وہ اپنے لفظوں کو عمل کی تصدیقی مہر لگا کر امی کے حضور پیش کرے گی کہ اب بتائیں امی ''کیا واقعی بیٹیاں پرائی ہوتی ہیں......؟''





آج اس شہر میں، کل نئے شہر میں' بس اسی لہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے، فتنہ گر لوگ تھے
زخم کھاتا رہا، مسکراتا رہا شوقِ آوارگی

کوئی پیغام گُل تک نہ پہنچا مگر پھر بھی شام و سحر
نازِ بادِ چمن کے اٹھاتا رہا شوقِ آوارگی

کوئی ہنس کے ملے' غنچۂ دل کھلے' چاک دل کا کھلے
ہر قدم پر نگاہیں بچھاتا رہا شوقِ آوارگی

دشمنِ جاں فلک، غیر ہے یہ زمیں' کوئی اپنا نہیں
خاک سارے جہاں کی اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

حبیب جالب

بارش کا گیت

یاد کی روٹھی ہوئی بدلی کو لائی ہوں میں
ایک مدت سے بچھڑے ہوئے
ان کواڑوں سے، دیوار سے
آج مل مل کے رونے دو
ان آنسوؤں، ٹھنڈے سانسوں بھرے گیت سے
دُکھ کی مالا پرونے دو
میں دُکھ کے جنگل کی بھیگی ہوئی شام ہوں
خالی کمروں میں روتی ہوئی آنکھ کا پھول ہوں
کوئی خواہش ہوں، پیغام ہوں

سلیم الرحمٰن

ادارہ

اسماء کی مسکراہٹیں

کمرشل میرج

''یار سرمد بڑا خوش قسمت ہے۔''
''کیوں کیا اس کا انعامی بانڈ نکل آیا ہے؟''
بانڈ تو نہیں نکلا مگر اس سے بھی زیادہ اس نے ایک لکھ پتی عورت سے شادی کر لی ہے۔''
''کیا اس کے والدین نے لڑکی کو قبول کر لیا ہے؟''
''قبول تو کر لیا ہے لیکن اس کی امی اور بیوی آپس میں ملتی نہیں۔''
''کیوں''
''امی کہتی ہیں، میرا حق بڑا ہے پہلے وہ میرے پاس سلام کو آئے۔''
''اور بیوی؟''
''وہ کہتی ہے۔ عمر میں، میں بڑی ہوں پہلے وہ آئیں۔''

فرق

ایک شخص اپنے دوست سے کہہ رہا تھا......
''میں بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں، جس طرح لوگ مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔''
''تم بوڑھے تو نہیں ہو'' دوست نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ لوگ تم سے کس انداز میں باتیں کرتے ہیں؟''
''پہلے وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟''

آزادیٔ طبع

اٹلی کا ایک سائنس دان امریکہ گیا تو اسے ایک بڑے ملک پلانٹ کی سیر کرائی گئی۔ اسی دوران ایک نالی میں سوراخ ہو گیا اور اس میں سے دودھ کی دھار نکل کر چاروں طرف گرنے لگی۔ فوراً ہی ایک آدمی نے نہایت سکون کے ساتھ بڑا پائپ بند کر دیا۔ دوسرا آدمی سوراخ بند کرنے کے کام پر لگ گیا۔ اطالوی سائنس دان حیران و پریشان رہ گیا اور بولا۔
میرے ملک میں ایسے موقع پر ہر شخص شور مچاتا اور پکارتا ہوا دوڑنے لگتا تاوقتیکہ ہر شے دودھ سے آلودہ نہ ہو جاتی، کوئی بھی بڑے پائپ کو بند کرنے کا خیال نہ کرتا۔ اس حادثے سے بڑا لطف لیتے اور سارا دن اس کے ذکر میں گزارتے۔''
پھر اس نے سر ہلایا اور کہا۔
''یہی وجہ ہے کہ یہاں اعصابی شکستگی کے بہت سے کیس ہوتے ہیں۔ تم لوگ اپنے آپ کو دبا لیتے ہو اور طبع کو پوری آزادی نہیں دیتے۔''

اعتبار

''مجھے عورت ذات پر کوئی بھروسا نہیں۔''
''آخر کیوں؟''
''چند دن ہوئے، میں نے اخبار میں ایک فرضی نام سے شادی کے لیے اشتہار دیا تھا جس میں، میں نے اپنی اصل آمدنی سے دگنی آمدنی ظاہر کی تھی۔ اشتہار پڑھنے کے بعد جس لڑکی نے شادی کے لیے پہلا خط لکھا، وہ میری ہی محبوبہ تھی۔''

انکار

ڈاکٹر مریض سے۔
''آپ کے تین دانت ایک ساتھ کیسے ٹوٹ گئے۔''

مریض۔ ''بیوی نے روٹی سخت پکائی تھی۔''
ڈاکٹر۔ ''تو کھانے سے انکار کر دیتے۔''
مریض۔ ''انکار ہی تو کیا تھا۔''
ثمرہ جاوید...... بسم اللہ پور

چالاکی

زید...... بکر سے۔
''اس مقدمے کا کیا بنا جو تم نے اس آدمی پر دائر کیا تھا جس کے کتے نے تم کو کاٹا تھا؟''
بکر مسکینیت طاری کرتے ہوئے بولا۔
''یار! اس کا وکیل بہت چالاک تھا اس نے یہ ثابت کر دیا کہ کتے نے مجھے نہیں بلکہ میں نے کتے کو کاٹا ہے۔
ملائکہ کوثر...... بسم اللہ پور

کاہل

☆ وہ کچی مٹی کا بنا ہوا پائپ پیتا ہے تا کہ گر جائے تو کون اٹھانے کے لیے جھکے۔
☆ اس کی بیوی نے لکھ کر لگا رکھا ہے شکاری حضرات اس علاقے میں کسی ایسی چیز پر گولی نہ چلائیں جو حرکت نہ کر رہی ہو، کیونکہ وہ میرا شوہر بھی ہو سکتا ہے۔
☆ کیا اس کی سات سالہ خارش کھجانے سے دور ہو سکتی ہے؟ اسے نہیں معلوم کیونکہ اس نے کبھی کھجا کر نہیں دیکھا۔

یقین

قصبے کے سب ہی لوگ اتوار کو چرچ جاتے لیکن چارلس جو کہ ایک کسان تھا۔ اس روز شراب پینے کے لیے باہر کا رخ کرتا۔ ایک روز پادری نے اسے سمجھانے کی خاطر کہا۔
''چارلس مجھے افسوس ہے کہ ہم جنت میں ایک دوسرے سے نہیں مل پائیں گے۔''
''لیکن فادر! آپ نے آخر ایسا کون سا گناہ کیا ہے؟'' چارلس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

لاڈلا

ماں نے اپنے لاڈلے بیٹے سے کہا۔
''بیٹا جب تمہارے ابو امریکہ جائیں گے تو میں ان سے کہوں گی کہ وہاں سے ایسی چیز لائیں جو میرے بیٹے کا ہر کام کر دے۔ بٹن دبایا تو جوتے پالش، بٹن دبایا تو یونیفارم استری، بٹن دبایا تو لحاف منہ پر، بٹن دبایا تو بیگ کندھے پر، اس طرح میرے بیٹے کو کوئی کام نہیں کرنا پڑے گا۔
''وہ تو ٹھیک ہے ممی! لیکن بٹن کون دبائے گا؟''
لاڈلے بیٹے نے منہ بنا کر کہا۔

گدھے کے بچے

امی جان نے سعودی عرب میں مقیم اپنے بیٹے کو مبارک باد دی۔ دعائیہ خط لکھا۔
مجھے اور تمہارے ابا کو یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ تم جلد ہی ایک خوب صورت، اچھے خاندان کی پاکستانی لڑکی سے شادی کرنے والے ہو۔ ہم دونوں تمہاری خوشیوں میں برابر کے شریک ہیں اور دل سے دعا کرتے ہیں کہ تم میاں بیوی خوب پھلو اور پھولو۔ میری اور تمہارے ابا کی ہمیشہ سے دلی خواہش تھی کہ تم کسی اچھی لڑکی سے شادی کر کے اپنا گھر آباد کرو۔ اچھی بیوی اللہ کا عظیم ترین عطیہ ہوتی ہے۔ وہ شوہر کی اعلا صفات کو اپنی محبت سے ابھارتی اور بری صفات کو دبا دیتی ہے۔''
خط کے آخر میں باپ نے جلدی جلدی لکھا تھا۔
''تمہاری ماں لفافہ لینے گئی ہے۔ اکیلے رہو گدھے کے بچے۔''

سرورق کی شخصیت
ماڈل ...... ٹینا
میک اپ ... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی .... موسیٰ رضا

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔
"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے وہی کچھ اپنے بھائی (مسلمان) کے لیے نہ چاہے۔

عافیت،

شداد بن اوس کعب سے روایت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک بادشاہ گزرا ہے جس کے خصائل حضرت عمرؓ سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ جب کبھی ہم اس کا ذکر کرتے تھے تو حضرت عمرؓ ضرور یاد آجاتے تھے۔

اس بادشاہ کے زمانۂ بادشاہت میں ایک نبی علیہ السلام تھے۔ ان کو ایک مرتبہ وحی ہوئی۔
"تم اس بادشاہ سے کہہ دو کہ اس بادشاہ کی عمر کے تین دن باقی ہیں۔ اگر کچھ وصیت کرنا ہو تو کر دے۔"
جس وقت اس بادشاہ نے یہ سنا تو سجدہ میں گر کر نہایت عاجزی سے دعا کی۔
"اے اللہ مجھے اتنی مہلت دے دے کہ میرا لڑکا جوان ہو جائے۔ تو خوب جانتا ہے کہ میں نے تیرے حکم کی کہاں تک تعمیل کی ہے اور اپنی رعایا سے کتنا عدل کیا ہے۔"
نبی علیہ السلام کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھر وحی آئی کہ اس نے ایسی دعا کی ہے اور دعا میں جو کچھ واسطہ دے کر کہا ہے سچ کہا ہے۔ ہم اس کی عمر میں پندرہ برس کا اضافہ کرتے ہیں تاکہ اس کا بیٹا جوان ہو جائے اور پرورش پائے۔"
جب حضرت عمرؓ کے نیزہ لگا اور آپ زخمی ہو گئے تو حضرت کعبؓ احبار نے یہ قصہ بیان کیا اور کہا۔
"اگر حضرت عمرؓ بھی اللہ تعالیٰ سے یہی سوال کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں ابھی اور باقی رکھیں گے۔"
جب حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ہوئی تو آپؓ نے دعا کی۔
"اے اللہ مجھے بغیر عاجز کیے اور بغیر رنج دیے اٹھا لے۔"

(تاریخ خلفاء)

گناہ کی سزا،

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے۔
"گناہ کی سزا یہ ہے کہ عبادت میں سستی واقع ہو جاتی ہے۔ رزق میں تنگی اور لذت میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور جو حرام کی کمائی کو پوری طرح چھوڑ دینے کے لیے کوشاں ہوتا ہے، اس شخص کے دل میں ہی حلال کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔"
(تاریخ خلفاء)

سات باتیں،

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ سات باتیں شیطان کی طرف سے ہوتی ہیں۔
1۔ بہت زیادہ غصہ آنا۔
2۔ بہت زیادہ پیاس۔
3۔ جلدی جلدی جمائی کا آنا۔
4۔ قے آنا۔
5۔ نکسیر پھوٹنا۔
6۔ بول و براز۔
7۔ یادِ الٰہی کے وقت نیند کا آنا۔

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

انار کھانے کا طریقہ،

انار کو اس کی جھلی کے ساتھ۔ جو دانوں پہ لپٹی رہتی ہے، کھانا چاہیے کیونکہ وہ مقوی معدہ ہے۔
(حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

سونے سے قیمتی،

☆ جو شخص سجدوں میں روتا ہے، وہ تقدیر پر نہیں روتا۔
☆ کسی کا عیب تلاش کرنے والے کی مثال اس مکھی جیسی ہے۔ جو سارا خوبصورت جسم چھوڑ کر صرف زخم پر بیٹھتی ہے۔
☆ جو شخص موت کو زیادہ یاد رکھتا ہے وہ تھوڑی سی دنیا پر بھی خوش رہتا ہے۔
☆ ایسا کم ہوتا ہے کہ جلد باز نقصان نہ اٹھائے اور صبر کرنے والا ناکام ہو۔
☆ کسی کو اتنی اہمیت دو جتنی وہ آپ کو دیتا ہے، اگر کم دوگے تو مغرور کہلاؤ گے، اگر زیادہ دو گے تو خود گر جاؤ گے۔
☆ جب تم بغیر کسی وجہ کے خوشی محسوس کرو تو تم یقین کر لینا کہ کوئی کہیں نہ کہیں آپ کے لیے "دعا"، کر رہا ہے۔

اقرأ عزیز۔ گاؤں دریا خان جلبانی

ایثار،

صوفیائے کے ایک گروہ کے متعلق کسی نے بادشاہِ وقت کے سامنے شکایت کی۔ بادشاہ ناراض ہوا اور حکم دیا کہ ایسے تمام صوفیوں کو قتل کر دو۔"
حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ جو ان میں موجود تھے، ان سب سے آگے بڑھے اور فرمایا۔
"سب سے پہلے مجھے قتل کرو۔"
بادشاہ نے کہا۔ "کیوں؟"
فرمایا۔ "یہ سب لوگ میرے دینی بھائی ہیں۔ میں نے چاہا ایک گھڑی کے لیے اور کچھ نہیں تو اپنی جان ہی ان پر قربان کر دوں۔"
بادشاہ نے یہ ایثار دیکھ کر قتل کا حکم واپس لے لیا اور کہا۔
"جو لوگ اس درجہ کے ایثار پسند ہوں انہیں قتل کرنا ناروا ہے" اور سب کو چھوڑ دیا۔

اڑتی تتلیاں،

• یہ یاد رکھو کہ جتنا طویل سفر کر کے آؤ گے، نیند اتنی ہی پرسکون آئے گی۔
• مشکل راستے پہ چل کے، پہاڑوں سے اتر کر اور مشکلوں سے نکل کر جو ندی ملتی ہے اس کا پانی بڑا میٹھا ہوتا ہے۔
• اگر انسان کا سب کچھ کھو جائے تو اس کا مایوس ہونا بے کار ہے۔ کیونکہ پھر کھونے کو کچھ نہیں ہوتا۔ صرف پانے کے لیے سب کچھ ہوتا ہے۔

سونیا ربانی۔ موڑہ دھمیال

احسان کا بدلہ،

محمد بن سیرین فرماتے ہیں۔ ایک دہقان نے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے درخواست کی کہ وہ اس دہقان کی حاجت کے بارے میں حضرت علیؓ سے بات چیت کریں۔
چنانچہ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے حضرت علیؓ سے اس حاجت کے بارے میں گفت و شنید کی۔
حضرت علیؓ نے اس دہقان کی حاجت پوری کی تو اس دہقان نے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے پاس چالیس ہزار کی رقم بھیجی۔ لوگوں نے حضرت عبداللہ سے کہا۔
"یہ اس دہقان نے بھیجی ہے۔"
حضرت عبداللہ بن جعفر نے وہ واپس کر دی اور فرمایا۔
"ہم اپنے احسان کو بیچتے نہیں۔"
(حیاۃ الجاسم)
اقرأ عزیز۔ گاؤں دریا خان جلبانی)

توبہ،

(۱) اگر انسان کی اپنی عقل اس کی اپنی زندگی کو خوش گوار نہ بنا سکے تو اسے زعم آگہی سے توبہ کرنی چاہیے۔
(۲) اگر انسان ایک ہی پتھر سے دو دفعہ ٹھوکر کھائے تو اسے اپنی صحیح روی کی ضد سے توبہ کرنی چاہیے۔
(۳) اگر انسان میں اپنی کامیابی کا سرور ختم ہو جائے اور انسان کو یاد آ جائے کہ کامیاب ہونے کے لیے اس نے کتنے جھوٹ بولے تو اسے ضرور توبہ کر لینی چاہیے۔

رخسانہ عبدالغفار

ایثار،

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "صحابہ کرام میں سے ایک نے کسی کو بھنی ہوئی سری بھیجی۔ انہوں نے فرمایا۔

"میرا فلاں دوست زیادہ ضرورت مند ہے۔ یہ اسے دینا بہتر ہے۔"

چنانچہ وہ سری انہوں نے اس کے پاس بھیج دی۔ اس نے وہ سری دوسرے دوست کے پاس بھیج دی۔ اس نے آگے کسی اور کو دی۔ غرض کئی جگہ گھوم کر پھر پہلے دوست کے پاس آ گئی۔

خیر،

ایک شخص جنگل میں رہتا تھا اور راضی برضا ہو کر ہر بات پر کہتا تھا۔

"خیر اسی میں ہے۔"

ایک کتا اس کے سامان کا پاسبان تھا اور گدھا بار برداری کے لیے اس کے پاس موجود تھا۔ اس کا ایک مرغ بھی تھا جو صبح بانگ دے کر اس کو بیدار کیا کرتا تھا۔

ناگہاں ایک بھیڑیے نے اس کے گدھے کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ (اور وہ مر گیا) تو اس شخص نے کہا۔

"خیر اسی میں ہے۔"

اس کے گھر کے لوگ اس نقصان پر بڑے غمگین تھے۔ ان لوگوں نے اس سے کہا۔

"تم ہر حادثے پر یہی کہتے ہو کہ خیر اسی میں ہے۔ اب بتاؤ کہ جو جانور ہمارے کام کے تھے سب مر گئے۔ یہ کیسی بھلائی ہوئی۔"

"اس نے کہا۔" شاید کوئی بھلائی ہو۔"

جب دوسرا دن ہوا تو ڈاکو اس شخص کے پڑوسیوں کو قتل کر کے ان کا مال لوٹ کر لے گئے۔ گدھے کی آواز نہ ہونے سے یہ لوگ بچ گئے۔ (ڈاکوؤں کو معلوم نہیں ہوا کہ اس صحرا میں کوئی اور بھی آباد ہے۔)

تب اس شخص نے گھر کے لوگوں سے کہا۔

"تم نے دیکھا کہ ہم اس طرح بچ گئے۔ حق تعالیٰ کے کام کی خوبی بس اسی کو معلوم ہے۔"

نادیہ یاسر۔ کراچی

پاگل پن،

پاگل پن کی ایک تعریف یہ ہے کہ انسان بار بار ایک ہی کام کرتا ہے اور مختلف نتائج کی توقع رکھتا ہے۔ اگر ہم جو کام کر رہے ہیں' اسے جاری رکھیں گے تو ہمیں وہی کچھ حاصل ہوگا جو حاصل ہو چکا ہے۔

ثابت قدمی کی قوت،

کوئی چیز ثابت قدمی کی جگہ نہیں لے سکتی۔ صلاحیت اس کی جگہ نہیں لے سکتی کیونکہ بہت سے ہنر مند لوگ ناکام نظر آتے ہیں۔ تعلیم ثابت قدمی کی جگہ نہیں لے سکتی۔ دنیا تعلیم یافتہ ناکام لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ ذہانت' ثابت قدمی کی جگہ نہیں لے سکتی کیونکہ کہاوت ہے کہ ذہانت کو کبھی درست صلہ نہیں ملتا۔

صرف اور صرف ثابت قدمی اور ہمت و حوصلہ ہر جگہ کامیاب رہتا ہے۔

خالدہ جیلانی

ڈھلتا کیسے کیوں میرے دل کا معاملہ

رضوانہ شکیل راؤ ———— لودھراں

یہ جو دل میں قیام کرتے ہیں
یہ ہی جینا حرام کرتے ہیں

طیبہ سعید ———— گوجرانوالہ

انتظار عمر طویل کے بعد بھیجا جو قاصد کو ان کی طرف
قاصد پلٹ کے خوب رویا کہ تعارف پوچھتے ہیں وہ

صدف عمران ———— ایم۔ اے سہائی

ہجر والوں کے ہاں نہیں پہنچی
نیند رستے میں سو گئی شاید

فوزیہ ثمر بٹ ———— گجرات

نہیں آتی نیند بھی، موت بھی، چین بھی
نہیں آیا وہ بھی کچھ دنوں سے
ہلکا ہو گیا ہے آج کمل کے رونے سے
بہت بوجھل تھا جی کچھ دنوں سے

شاہانہ بلوچ ———— رینالہ خورد

خوش مزاجی بھی مشہور تھی' ہماری سادگی بھی کمال ہے
ہم شریر بھی انتہا کے تھے اب سنجیدگی بھی بے مثال ہے

طہٰ مصطفیٰ ———— فاروق آباد

بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دل ناکردہ کار کے

لیلیٰ رب نواز ———— ودھیوالی بھکر

تیرے باعث ہی تو سکتہ کا ہے عالم طاری
خود کو ناراض کیا تجھ کو منانے کے لیے
آج پھر شام گزری ہے اسی جنگل میں
ان درختوں سے تیرا نام مٹانے کے لیے

ندا طارق، فضہ ———— کراچی

جن کے ہاتھوں میں صداقت کے قلم ہوتے ہیں
طے شدہ بات ہے تعداد میں کم ہوتے ہیں

اقرا صادق ———— بہاول پور

مجھے احساس ہے سب کا میں سب کے کام آتا ہوں
مگر جو کینہ رکھتے ہوں میں ان رشتوں سے ڈرتا ہوں
میں بندہ ہوں خدا کا اور خوف ہے خدا کا مجھ کو
جو ڈرتے ہیں رب سے میں ان بندوں سے ڈرتا ہوں

ثمرہ اقراء ———— کراچی

ڈھلتی شام اور گہرے سائے
خالی کرسی میں اور چائے
دکھ نے سکھ کا سانس لیا ہے
کاش اب کوئی یاد نہ آئے

طاہرہ یاسمین ———— ٹیکسلا کینٹ

پاؤں پھیلائے تو پھر نہ دیکھی چادر ہم نے
تجھ کو چاہا تو ہم نے اوقات سے بڑھ کر چاہا
زیست آسان بھی ہو سکتی تھی لیکن ہم نے
تیری چاہ کو ہر اک بات سے بڑھ کر چاہا

ام عبدالمقیت ———— لیاری

اس نے مانگا بھی تو کیا ہم سے جدائی مانگی
ایک ہم تھے ہمیں انکار نہ کرنا آیا

ثمینہ اکرم ———— کراچی

اس کے بغیر آج بہت جی اداس ہے
جالب چلو کہیں سے اسے ڈھونڈ لائیں ہم

ثمرہ احمد ———— پتوکی

سکوں کا سمندر ہے میرے اندر
جو اضطراب میں اب تجھے ملیں
تیری زندگی عبرت ہو سب کے لیے
تیرے انداز کے لوگ اب تجھے ملیں





خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع ۔37 - اردو بازار، کراچی ۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خطوط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے آپ کی عافیت، صحت، سلامتی کے لیے دعائیں۔

اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش وخرم اور آپ کے گلشن کو سدا آباد رکھے۔

اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف۔

پہلا خط چک شالی سے صابرہ بیگم کا ہے، لکھتی ہیں

زندگیوں کے دائرے اتنے وسیع ہوگئے کہ بس گھومتے رہو، پتا ہی نہیں چلتا، کب صبح ہوئی کب شام۔ جوانی میں لگتا تھا، بڑھاپے میں فراغت ہوگی۔ دوچار پائیاں، کھانسی کی دوا، عینک پر لڑائی اور ہم میاں بیوی اخبار، کتابیں کیونکہ جتنا شوق مجھے پڑھنے کا اتنا ہی انہیں۔ مگر بہن جیتے دم فرصت کہاں، کبھی کوئی بیٹی آجاتی ہے، کبھی نواسی۔ اللہ رکھے پوتے پوتیاں۔ ضرورت ہی نہیں پڑی کبھی عینک پر میاں سے لڑنے کی۔ بڑی اچھی زندگی گزری، مصروف، بامعنی ماشاءاللہ۔

سب سے پہلے افسانے پڑھنے شروع کیے، حسب عادت خاص کر نعیمہ ناز کا آنگن ٹیڑھا، واہ کیا بات۔ برسوں پہلے بشریٰ انصاری اور شکیل کا کامیڈی ڈرامہ یاد آگیا۔ بہت ہی شاباش نعیمہ جیتی رہو۔

میں تو اسی کا ذکر کررہی تھی کہ پوتی نے مصباح مصباح الاپ دیا۔ ایک بات تو ہے اس لڑکی کے قلم میں، وہ روانی ہے جو پرانی لکھاریوں کی تھی۔ لیکن جس وجہ سے بطور خاص خط لکھا، میری پوتی اور بیٹی کو بہت شکوہ ہے مصباح سے۔ یہ اینڈ پر کیا کردیا انہوں نے۔ اختتام کسی انی کی طرح دل میں کسک اتار گیا۔ میرا دل تو صرف بوجھل ہوا، پوتی تو رو پڑی، آپ خود سوچیں، کتنی ذہین فطین لڑکی پھر فرماں بردار بھی، خجستہ نے تعلیم پر حرف نہ آنے کے لیے دل کچل ڈالا، فرسودہ روایات کا طوق گلے لگالیا۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں وہ آٹھویں پاس پھر کس مزاج کا...... مہربانی کرکے مصباح سے میری میری پوتی بیٹی کی طرف سے سفارش کردیں' اگلا حصہ لکھے بھلے دس سال بعد ڈاکٹر ہادی ملے مگر ملے ضرور۔ امبر خالد کا، ہلکا پھلکا، ہنستا ہنساتا جن کزنز کی آپس میں نہیں بنتی، اللہ کی طرف سے سدا کی لکھی ہوتی ہے، میری تو آپ بیتی ہے یہ۔

ایمل رضا کے ابا جی تو بہت ہی دل پر لے گئے، چاردن کی زندگی پھر اندھیری رات۔

خواب شیشے کا بس اب اس سے تو صرف عفت سحر ہی محفوظ ہورہی ہوں گی۔ بھلا ایسا بھی کیا سسپنس جو سالوں پر محیط ہوا اور اچھی بھلی کہانی کو بے لذت کردے۔ شہرزاد صائمہ اکرم کا مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے، اس عمر میں ویسے بھی مری کا ذکر کوئی پرانی یاد تازہ کرجاتا ہے۔ سمجھ جاؤ بہن...... اور سب سے اچھا کیا لگا۔ بھئی اپنے محمود صاحب، دل خوش کیا۔

☆ عزیز بہن! یہ پوتا پوتی اور نواسی کیا دنیا میں آگئی کہ آپ نے خود کو بوڑھا ہی سمجھ لیا۔ پوتی، نواسی کے

آنے سے کوئی بوڑھا ہوجاتا ہے کیا؟ خط پڑھ کر آپ سے ایک ہی شکوہ ہوا کہ آپ نے، پہلے کیوں خط نہیں لکھا، بہت بہترین خط لکھا ہے آپ نے۔

مصباح کی ہیروئن نے فرسودہ روایات کو گلے نہیں لگایا، اپنی تعلیم سے اپنے لوگوں کو فیض پہنچانے کے لیے یہ فیصلہ کیا۔ کیوں کہ اس کا اولین مقصد یہ ہی تھا۔ شادی نہیں اور درخزئی، خجستہ سے محبت کرتا تھا بس تھوڑا سا اکھڑ مزاج تھا۔ محبت تعلیم اور ذات نہیں دیکھتی، دیکھا نہیں آخر میں وہ اپنی خجستہ کے لیے ہسپتال بنوا رہا تھا۔

آپ سب نے خواہ مخواہ دل برا کیا، درخزئی کی ساری حرکتیں خجستہ کو روکنے کے لیے تھیں، وہ اپنی محبت کھونے سے ڈر رہا تھا بس اور کچھ نہیں۔ کچھ فیصلے دل سے نہیں دماغ سے کیے جاتے ہیں، اگر خجستہ اپنی محبت کی قربانی نہ دیتی تو روز بے توقیری کا عذاب سہتی۔ عزت، محبت سے زیادہ قیمتی چیز ہے اور جس مقصد کے لیے وہ ڈاکٹر بنی تھی، ہادی سے شادی ہوجاتی تو وہ مقصد بھی پورا نہ ہوپاتا۔ ڈاکٹر ہادی پہاڑوں پر آکر پریکٹس کبھی نہ کرتا۔ وہ ملک سے باہر جانے کی سوچتا یا پھر بڑے شہروں میں پرائیویٹ اسپتال بنوا کر مریضوں کی کھال اتارتا۔

صابرہ اب آپ باقاعدگی سے اس محفل میں شرکت کرتی رہیے گا۔

جڑانوالہ سے کوثر خالد نے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

پہلی شعاع، تینوں نامور لکھاریوں کو اعزاز مبارک ہو۔ حمد ونعت دین ما ایمان ما۔ کتاب کہانی' سمیرا جی اتنی کتابیں پڑھنے کو پڑی ہیں مگر وقت اور ہمت؟ ہمارے کہنے سے کون کتاب پڑھتا ہے؟ ہماری بیٹی ایم اے انگلش۔ بیٹا ایف اے مگر...... وقت ندارد۔ شوق بیٹے کو تو ہے ہی نہیں، مجھے بھی روکتا ہے۔ دستک، ناتا، زبردست رہا۔ "سنہری دھوپ" سوکن کے کردار مزا دے رہے ہیں، ہماری سوکن دعا جیسی ہوتی تو ہم اس کے نوکر بن جاتے۔ سچی ہم تو کسی سے مار کھا کر بھی اس سے ظالمانہ سلوک نہیں کرسکتے۔ ہاں کسی کے فائدے کے لیے اس پر پابندی لگائیں گے۔ ڈانٹیں گے بھی، ہمارا حق تو بس یہ ہے کہ ہم پر، ہمارے شوق پر پابندی جو لگائے، اس سے حق چھین لیں گے۔ "تمنائے روشنی" خجستہ میرے جیسی نکلی۔ شاباش۔ "بہار آئی ہے" بہت کردار تھے سو کاٹ کاٹ کر پڑھا۔ یہ بیچارہ یہ ظالم سماج ضرور روڑے اٹکاتے ہیں، بلکہ کبھی بھائی کبھی باپ، کبھی مائیں بھی۔ الحمدللہ ہم کبھی ایسے روڑے نہیں اٹکاتے، مگر میرا بیٹا، سچی وہ تو پکا روڑا ہے اور اسے پختہ اینٹ بنانے کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں، سب بولو آمین۔ "شب تاب" پچھلی قسط نہیں پڑھی مگر جیسا قارئین سے سنا ویسا ہی پایا۔ "ابا جی" بالکل سر سے گزر گئے۔ ایمل جی ذرا آسان لکھا کریں۔ "تیری راہ میں" سچ عتیقہ، تم نے تو میری کہانی لکھ دی، سچ میں ایسی ہی ہوں، ایسی ہی سب کا فائدہ سوچنا۔ سب کے لیے لڑنا اور سگریٹ غلط کام چھڑوانا، مگر ہمارے خالد تو پہلے دن ہی قابو آگئے تھے البتہ ان کی اجازت کے بغیر میں بھی کوئی من مانی نہیں کرسکتی تھی، تب بھی پانچ سو لے کر بازار جاتی تھی، آج بھی پانچ ہزار یا ہزار میں خریداری کرتی ہوں۔ "آنگن ٹیڑھا" واقعی کہانی ٹیڑھی تھی، آسان فہم نہیں۔ "آنے والا اجالا" عندلیب کی اچھی سوچ اچھے الفاظ کے ساتھ۔ "فارمولا کہانی" امید ہے آئندہ امبر اس سے اچھا مزاح لائے گی، پس آئینہ مکافات عمل ہے۔ تمام امتحان ہماری سوچ کے زیر اثر ہیں جیسے کہ میرے امتحان ہوئے، غزل صرف ایک؟ بندش والی اچھی ہے۔ ثمینہ اکرم کا شعر۔ اول رہا۔ "تاریخ کے جھروکے" کبھی ختم نہ ہوں۔ آئینہ خانہ، کیا زیبا کی موجودہ تصویر ہے یا پرانی؟

☆ پیاری کوثر! شکر ہے کہ آپ اپنے پرانے انداز میں لوٹ آئیں۔ پچھلے ماہ آپ کا مختصر خط اتنا الجھا ہوا تھا کہ اسے پڑھ کر ہم آپ کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہوگئے تھے۔

ایمل کی کہانی ہلکی پھلکی سی تھی، پتا نہیں آپ کو کیوں مشکل لگی۔ دراصل ہمارے ہاں یہ عام بات ہے کہ بوڑھے لوگوں کے لیے یہ تصور کرلیا جاتا ہے کہ ان کی تمام ضروریات اور دلچسپیاں بڑھاپے کے ساتھ ختم ہوگئی ہیں۔ وہ اپنی دولت اور جائیداد بچوں کو سونپ کر باقی زندگی اولاد کے رحم وکرم پر گزاریں، اولاد نے ابا جی کے

شوق پر پابندی لگائی تو انہوں نے بھی خوب بدلہ لیا۔ زیبا کی یہ تانۂ تصویر تھی۔

سونیا یٰسین نے خیر پور ٹامیوالی سے لکھا ہے

خوب صورت سرورق پر نظر دوڑاتے جیسے ہی آگے بڑھی تو شہرزاد کو اپنا منتظر پایا۔ میں نے تو مناہل کو خواب میں بھی دیکھ لیا۔ ''سنہری دھوپ'' کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ مصباح علی سید کا ''تمنائے روشنی'' ہمارے لیے اس ماہ کا سب سے بہترین تحفہ ہے۔ بہت عرصے بعد اس قدر بہترین شاہ کار پڑھنے کو ملا، جس کے کسی جملے کو چھوڑیے، حرف پر بھی اعتراض نہیں۔ ماہ وش طالب کا پس آئینہ اچھا تھا، تاریخ کے جھروکے بہت دلچسپ رہے۔ مہوش افتخار کا ''شب تاب'' بہت بہت زبردست لگا۔ حضرت معاویہؓ یا حضرت سلمان فارسیؓ کا کوئی دلچسپ قصہ تاریخ کے جھرکوں میں ڈال دیں۔

☆ پیاری سونیا! آپ نے تمام کہانیوں پر تفصیلی تبصرہ کیا، بہت شکریہ۔ مصباح علی سید اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

امیمہ، حیا اور حفصہ اسد نے نامعلوم شہر سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

میں شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں اپنی دوست جیسی بہن کا جو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے، جس نے مجھے شعاع لے کر دیا۔ ''شہرزاد'' میرا فیورٹ ناول بلکہ میری جان۔ فرزانہ تو جب بھی لکھتی ہیں ایک مشکل تحریر، سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ عتیقہ ایوب کا ناول رومینٹک اور نائس تھا، بہت مزا آیا۔ افسانوں میں صرف ''پس آئینہ'' پسند آیا۔ آخر میں دو سوال۔ کیا شعاع میں مرد بھی ناول لکھ سکتے ہیں؟ کیا شہرزاد سیریل بھی آئے گا؟

☆ امیمہ اور حفصہ! آپ کی جان سے پیاری دوست جیسی بہن کا شکریہ تو ہم بھی ادا کریں گے جنہوں نے آپ کو شعاع سے متعارف کرایا، اچھا ہوتا کہ آپ ان کا نام بھی لکھ دیتیں۔

شعاع میں مرد ناول نہیں لکھ سکتے۔ شہرزاد پر سیریل بنے گا یا نہیں یہ تو ہم نہیں بتا سکتے لیکن اس پر سیریل بن سکتا ہے کیونکہ اس میں کردار نگاری بہت عمدہ ہے اور کہانی میں بہت سے ڈرامائی موڑ ہیں۔

فائزہ بھٹی نے پتوکی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

اپریل کا شمارہ 2 کو ملا، ٹائٹل ٹھیک تھا۔ ایسے لگا جیسے بڑی عمر کی خاتون کو میک اپ کے ذریعے نوجوان لڑکی کا روپ دینے کی کوشش کی گئی ہو (کامیاب کوشش)۔ پہلی شعاع۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا، میرے جیسے گاؤں میں رہنے لے لوگ، الیکٹرونک اور سوشل میڈیا کا جنہوں نے نام تو سن رکھا ہو مگر استعمال سے واقف نہ ہوں۔ ان کے لیے پرنٹ میڈیا ہی واحد ذریعہ ہے، اس کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں۔

حمد و نعت کے بعد ''شہرزاد کو پڑھا۔ درشہوار جو مرضی کر لو، ہادی کو تو ہم نے تمہارا نہیں ہونے دینا۔ ہم زاد مانا تم بہت اچھے ہو، مگر یقین مانو اگر سامنے آجاؤ تو اور بھی اچھے لگو گے۔

''خواب شیشے کا'' ملاحہ مجھے لگتا ہے تمہارے اور درشہوار کے دادا جڑواں بھائی تھے جو میلے میں بچھڑ گئے۔ ایک صائمہ اکرم کے ہاتھ لگ گیا، دوسرا عفت سحر کے۔ دونوں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے، ویسے دادا ہی کیوں نمیر اور ہم زاد بھی یقیناً جڑواں ہیں۔ دونوں کو ہی لکا چھپی والا کھیل بے حد پسند ہے (مگر کوئی ہم سے بھی تو پوچھے ہمیں بھی پسند ہے کہ نہیں)۔

''شب تاب'' میں سیف اصل میں مصطفیٰ ہے۔ مہوش پلیز، اسے زیادہ لمبا نہ کیجیے گا۔

''بہار آئی ہے'' فرزانہ کھرل اچھا لگا، طنز و مزاح کا حسین امتزاج لیے خوب صورت کہانی۔ اس دفعہ رشتوں کا اتنا زیادہ الجھاؤ نہیں تھا۔ ایمل رضا کی ''ابا جی'' ابا جی جیسے لوگوں کو خراب کرنے میں معاون ہو سکتا ہے۔

☆ پیاری فائزہ! لڑکی ہو یا خاتون، ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ حسن کسی بھی روپ میں ہو سراہنے کے لائق ہوتا ہے اور یہ ''ابا جی جیسے لوگوں'' سے کیا مراد ہے؟ اب چار دن کی تو زندگی ہے کیا بندہ اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز بھی نہ ہو؟ ویسے اس دفعہ آپ نے تبصرہ خوب کیا، پڑھ کر مزا آیا۔

زینی شہزادی نے رائے ونڈ سے لکھا ہے

سرورق بہت پیارا تھا۔ سب سے پہلے ''شہرزاد'' پر پہنچے۔ اسٹوری بہت زبردست جا رہی ہے۔ ''خواب شیشے کا'' اچھی اسٹوری ہے۔ واہ رے ابا جی، کیا غضب کی کہانی تھی، آخر میں بہت ہنسی آئی۔ ہاں ایک بات پوچھنا تھی یہ ''خجستہ'' اور ''درخزئی'' کیا کوئی تاریخی نام ہیں؟ ان دونوں کا مطلب بھی بتا دیں تو مہربانی ہوگی۔ باقی سارے سلسلے بھی بیسٹ تھے۔ شعاع میں ''بندھن'' کا سلسلہ بہت زیادہ پسند ہے، ایک فرمائش ہے کہ ایف ایم 90 قصور (آپ کی آواز) کے سابق آر جے اور ڈی جے محمد خلیل آرائیں اور ایک نئے آر جے علی کا انٹرویو مع تصویر شامل کر دیں۔

☆ پیاری زینب! آپ کی دونوں کہانیاں موصول ہو گئی ہیں، مگر ابھی پڑھی نہیں۔ کہانیاں بھیج کر کم از کم دو ماہ تو ضرور ہی انتظار کیا کیجیے کہ ڈاک بے شمار ہوتی ہے۔ پڑھنے میں ذرا ٹائم لگتا ہے، آپ کی فرمائشیں نوٹ کر لی ہیں۔ خجستہ کا مطلب ''مبارک''۔ درخزئی کا مطلب ہمیں بھی نہیں معلوم۔

پری وِش! چلو بھئی، ہم سب کو درخزئی کا مطلب بتاؤ۔

حمیرا لطیف حور نے رائے ونڈ سے لکھا ہے

شعاع یکم کو ہی مل گیا، ٹائٹل پیارا تھا مگر صائمہ جی کے ہونٹ کچھ عجیب سے لگ رہے تھے۔ ''آنگن ٹیڑھا کا ٹیڑھا'' مزے کی اسٹوری تھی۔ عتیقہ ایوب نے بہت ہی اچھا لکھا۔ ''آنے والا اجالا'' بھی بیسٹ تھی۔ ''شب تاب'' سیف علی جنگ کی نیلی آنکھوں کا ارتکاز اچھا لگا۔ واہ رے ابا جی، اینڈ میں ہنسایا، ویسے کہانی اچھی تھی۔ ''پس آئینہ کچھ اور ہے'' میں تو متفق ہوں بھئی اس کہانی کے آخری جملوں سے۔ ''بہار آئی ہے'' ایسل اور حزام دونوں پیارے تھے، باقی تمام سلسلے اچھے تھے۔ کتاب کہانی بہت انٹرسٹنگ تھی۔ ''کھلتا کسی پہ کیوں'' فوزیہ جی ٹاپ آف دا لسٹ۔ پکوان اور خوب صورت بنیے بہترین تھے۔

☆ پیاری حمیرا! اس ماڈل کی پہلے بھی کئی تصاویر ٹائٹل پر لگ چکی ہیں ہمیں تو ماڈل کے ہونٹوں میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مسرت الطاف احمد کراچی سے لکھتی ہیں

اپریل کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی ماڈل گرل کو دیکھ کر اس کا انداز دل کو بھا گیا۔ ''خواب شیشے کا'' مائی موسٹ فیورٹ اسٹوری، یہ قسط مائنڈ بلوئنگ تھی۔ ''تمنائے روشنی'' تحریر زبردست لگی، ٹاپک بھی بہت اسٹرونگ تھا۔

خجستہ کی خاندانی روایت سخت ہونے کے باوجود اس کا لڑکوں کے ساتھ پڑھنا بلکہ تعلقات بڑھانا کچھ فلمی لگا، حقیقی زندگی میں ایسا کہاں ہوتا ہے۔ ''شب تاب'' یہ قسط فنٹاسٹک تھی۔ اسٹوری کافی اسٹرونگ ہے۔ ''تیری راہ میں'' ایکسی لینٹ اسٹوری، تھیم بہت ہی اٹریکٹو تھی۔ کردار نگاری لاجواب۔ ''بہار آئی'' تھکاوٹ کی وجہ سے پڑھتے پڑھتے نیند آگئی پھر بھی پڑھتی رہی، اسی لیے ساری اسٹوری ذہن میں گڈمڈ ہو گئی اسی لیے دوبارہ پڑھنے کا ارادہ ہے۔ ''ابا جی'' یہ اسٹوری سمجھ سے بالاتر لگی، ابا جی کا کردار بھی کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ کرمو کا کردار بھی اچھا نہیں لگا، اولاد کی اس حد تک خود غرضی دیکھ کر دل خون کے آنسو رویا۔ افسانوں میں ''فارمولا کہانی'' ہی متاثر کر سکی۔ ''آنے والا اجالا'' بھی قابل تعریف تھا، ''پس آئینہ'' سبق آموز تحریر تھی۔

☆ پیاری مسرت! حقیقی زندگی میں تو ایسے ایسے حیرت ناک واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے اور عجائبات سے بھری پڑی ہے اور سب سے بڑا عجوبہ تو انسان ہے جس کے بارے میں یقین سے کچھ بھی کہنا ممکن نہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں جہاں اکثر گھرانوں میں لڑکیوں پر تعلیم کے دروازے بند ہیں، وہیں امروز لالہ جیسے انسان ہیں جو دور افتادہ علاقے کی خجستہ کی راہ سے تمام کانٹے چن کر اسے اپنی تمنا پوری کرنے کا موقع دیتے ہیں۔

ابا جی کا کردار آپ کو کیوں پسند نہیں آیا، انسان اگر اپنے تمام فرائض پورے کرنے کے بعد اپنے لیے بھی

کچھ سوچ لے تو اس میں کیا برائی ہے۔

میمونہ، مریم رحمت اللہ شرق پور سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

میں یہ خط آپ کو رات بارہ بجے لکھ رہی ہوں، پورا رسالہ ہی شان دار تھا۔ ''دیکھ تمنائے روشنی'' مصباح علی نے محفل لوٹ لی۔ زبردست، سپرہٹ کہانی میں کہیں جھول نہیں تھا۔ ''شہزاد'' اور ''خواب شیشے کا'' ہمیشہ کی طرح کمال تھا۔ ''شب تاب'' مہوش افتخار کو پہلی دفعہ پڑھا، زبردست۔ مجھے تو پہلے ہی لگتا تھا کہ یہ سیف مصطفیٰ ہی ہے۔ فرزانہ کھرل ویل ڈن۔ ان کا طرز تحریر بے حد بھاتا ہے، تمام افسانے بہترین تھے۔ امی کہتی ہیں ''سنہری دھوپ'' کا اینڈ اچھا ہونا چاہیے

☆ پیاری میمونہ اور مریم! اتنا مختصر خط دیکھ کر ہمیں یقین آ گیا کہ واقعی خط رات بارہ بجے لکھا گیا ہے اور خجستہ نام آپ نے پہلی دفعہ سنا اور پڑھا، شاید اس لیے آپ کو عجیب لگا حالانکہ یہ بڑا قدیم نام ہے۔

حیروزہ ناہید چک 18 جنوبی سرگودھا سے لکھتی ہیں

میں ایک ایسے گاؤں سے تعلق رکھتی ہوں جہاں پر لڑکیوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی لیکن اب ایسا نہیں رہا۔ میرے گاؤں میں بہت سارے ترقیاتی کام جاری ہیں اور بچیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ زندگی میں سب سے پہلے شعاع کو ہی پڑھا اور اب سات سال گزر گئے۔ سب لکھاری بہت اچھا لکھتی ہیں، یارم، صنم سے صمد تک کا سفر اور پیر کامل میرے دل کے بہت قریب ہیں۔ پڑھنے کا شوق مجھے اپنا نانا جی، حاجی مختار احمد گوندل صاحب سے وراثت میں ملا۔ وہ بہت اچھے شاعر ہیں اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش شاہین رشید جی سے ملاقات ہے۔ ہوسکتا ہے زندگی کے کسی موڑ پر ملاقات ہو جائے۔ محترمہ یاسمین کنول صاحبہ پسرور کو سلام۔

☆ پیاری حیروزہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ پچھلے کچھ سالوں میں پنجاب میں واقعی تعلیم، صحت اور ٹرانسپوٹ کے شعبے میں بہت کام ہوا ہے اس کا اندازہ ہمیں اپنی قارئین کے خطوط سے ہوتا ہے۔ چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں بھی تعلیم کی سہولیات مہیا ہیں۔ نئے اسکول بھی کھلے ہیں، اللہ تعالیٰ پاکستان کے ہر شہر اور ہر گاؤں کو آباد اور خوش حال رکھے، آمین۔

شاہین رشید سے آپ آدھی ملاقات کر سکتی ہیں، آپ اپنا فون نمبر لکھ دیں، ہم ان کو دے دیں گے، وہ آپ سے بات کر لیں گی۔

رومیصہ قمر گوجرانوالہ سے لکھتی ہیں

شعاع وہ واحد چیز ہے جس کے بغیر میں رہ نہیں سکتی۔ شعاع کی ہر کہانی لاجواب ہوتی ہے، ہمارے ابو بھی ان ہی ابوؤں میں سے ہیں جو اپنے بچوں کو ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنے سے روکتے ہیں لیکن ان کو کون بتائے کہ شعاع کے ذریعے ہمیں کتنا قیمتی خزانہ ملتا ہے۔ اس سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ پچھلے ماہ شعاع میں سب کچھ لاجواب تھا، تفصیلی تبصرہ اگلے ماہ کے لیے ادھار۔

☆ پیاری رومیصہ! اتنی مشکلات اور مخالفت کے باوجود آپ نے شعاع کا ساتھ نہیں چھوڑا، یہ شعاع سے آپ سے محبت ہے۔ آپ نے جن پرچوں کے بارے میں لکھا ہے اگر ہمارے پاس ہوئے تو ضرور بھجوائیں گے۔

صغریٰ شہزاد ڈنگہ تریڑوانوالہ سے لکھتی ہیں

میرا خط شائع ہو گیا، بے پناہ خوشی ہوئی۔ امی نسیم کو بھی بتایا تو کہنے لگیں اگر شہزاد نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا (ہاہاہا)۔ شہزاد اٹلی میں ہوتے ہیں، قسط وار کہانیوں میں ''شہزاد'' کی تو میں دیوانگی کی حد تک فین ہوں۔ چھوٹے چھوٹے تین بچوں کا ساتھ اور یہ بڑا سا گھر، شعاع کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوتا ہے۔

☆ پیاری صغریٰ! اپنا خط دیکھ کر آپ کو اتنی زیادہ خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ شہزاد صاحب کون ہیں؟ اگر وہ ہمارا پرچا پڑھتے ہیں تو اٹلی میں ہمارا پرچا ملتا ہے اور وہ آپ کا خط بھی دیکھ لیں گے، اس کے بعد کیا ہوگا؟

تین چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ شعاع کے لیے ٹائم نکالنا واقعی مشکل ہے، لیکن محبت میں انسان کیا نہیں کرتا۔

عابدہ سعید نے ڈی آئی خان سے لکھا ہے

اس طویل لوڈ شیڈنگ میں، میں نے رسالہ چاٹ لیا۔ پہلے نمبر پر ''تمنائے روشنی'' مصباح کا تو نام ہی دیکھ کر میں اچھل پڑی، اوپر سے میڈیکل کی کہانی۔ قسم سے ایسا محو کیا اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔ کڑی کا پتا کرو، کیڑے شہر دی اے، جیڑی یونی دا لکھ دی اے۔ ان کی کہانیوں کا انتظار ویسے ہونے لگا ہے جیسے کبھی فرحت اشتیاق رخسانہ نگار کی کہانیوں کا ہوتا تھا۔ دوسرے نمبر پر فرزانہ کھرل کا ناول، بہار آئی تو کھل گئے ہیں گلاب سارے، جو تیری آنکھوں نے چن لیے ہیں۔ ایمل دادی پتا کرو، کتھے جاندی اے۔

شعاع کے قسط وار نے سپیچ لیس کر دیا، میں نہیں بولتی۔ نعیمہ آپی آنگن ٹیڑھا اور عتیقہ ایوب لاجواب۔

☆ پیاری عابدہ! جے سب کجھ سانوں ہی پتا کرنا اے کڑیے تے تسی کی کرو گے۔

شائستہ ساجد نے حضرو سے لکھا ہے

شعاع کی تمام پرانی رائٹر گم ہو چکی ہیں، عمیرہ احمد، نگہت سیما، نگہت عبد اللہ، راحت جبیں۔ آپ نے میرا خط شامل نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے، یقین مانیے شعاع کی مستقل قاری ہوں۔ ''شہزاد'' بہت ہی زبردست اسٹوری ہے، پر ہم زاد کو اب منظر عام پر اب آ جانا چاہیے۔ عفت جی کا ''خواب شیشے کا'' بھی بہت اچھا جا رہا ہے پر میرآفندی کی لکا چھپی اب بور کر رہی ہے۔ ''شب تاب'' بہت پسند آیا۔ ''آنگن ٹیڑھا'' زبردست افسانہ ہے۔

دو عدد چھوٹے بچے اور نہ ختم ہونے والے کام۔ ماشاء اللہ بہت بڑا گھر ہے اور کوئی کام والی بھی نہیں۔ ڈیڑھ سالہ سفیان بہت شرارتی ہے صفحے پھاڑ دیتا ہے، بڑا بیٹا صالح خان اکثر اپنے پاپا کو یاد کراتا ہے، پاپا بازار جا رہے ہو تو امی کا مسالا بھی لانا۔

☆ پیاری شائستہ! اللہ پاک نے کھانے پینے کی اتنی شان دار چیزیں پیدا کر رکھی ہیں۔ ہم خواہ مخواہ قسم کھائیں۔ یہ آپ کا پہلا خط ملا ہے، سو شامل کر رہے ہیں۔ سفیان اور صالح خان کو بہت پیار اور دعائیں، اللہ تعالیٰ انہیں ہر امتحان میں اسی طرح کامیاب کرے، آمین۔

اسلامک یونیورسٹی سے نورینہ نے لکھا ہے

سارا رسالہ ہی بہترین لگا، شہزاد تو محبت کدہ لگتا ہے ہر دوسرا بندہ دھواں دار محبت میں قید اور جنون عشق میں سبقت لے جانے کو بے قرار۔ ''خواب شیشے کا'' عفت سحر پاشا نے اتنے خواب دکھا دیے اب ڈر لگنے لگا جو ٹوٹیں گے تو کہیں آنکھیں کانچ سے زخمی نہ ہو جائیں۔ ''تمنائے روشنی'' اس مہینے کا بیسٹ ناول، کاش خجستہ کو ڈاکٹر ہادی مل جاتا تو کیا ہی بات تھی۔ فرزانہ کھرل کو اس بار پڑھا ہی نہیں بہت ہی الجھا لکھتی ہیں جیسے شاعری کی نثر کر رکھی ہو۔

افسانوں میں آنے والا اجالا عندلیب زہرا نمبر ون رہیں۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا تو بڑا صبر آزما سبق دے رہا ہے۔ سسرال کسی بھاری ڈگری سے کم نہیں، واصفہ آپی کو بہت سا سلام۔

☆ پیاری نورینہ! خجستہ کو ڈاکٹر ہادی مل جاتا تو پہاڑوں پر رہنے والوں کو اپنی ڈاکٹر خجستہ کیسے ملتی۔ ڈاکٹر ہادی جیسے لوگ تو بہت ہیں مگر دشوار گزار علاقوں میں جہاں طبی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں وہاں ڈاکٹر خجستہ جیسے لوگ اللہ کی رحمت ہیں۔

مقدس زہرا چک 214 ج ب تحصیل و ضلع جھنگ سے لکھتی ہیں

پہلے بھی خط لکھا مگر آپ کو شاید ہمارا آنا اچھا نہیں لگا اس مرتبہ ''شعاع'' بہت زیادہ اچھا اور منفرد ہے کیونکہ اس میں ''کتاب کہانی'' جو سمیرا احمید نے لکھی ہے پڑھ کر دل خوش ہو گیا کہ ابھی اردو کے دیوانے زندہ ہیں۔ ہم آدھے تیتر اور آدھے بیٹر کی مانند ہو چکے ہیں۔ اپنی قومی زبان کے بارے میں۔ انگلش میڈیم کے چکر میں بچے اردو میڈیم سے بھی جاتے رہے ہیں۔

☆ پیاری مقدس! ہمیں آپ کا آنا کیوں برا لگے گا۔ ہماری قارئین ہمیں بہت عزیز ہیں اور جتنی محبت سے وہ خط لکھتی ہیں پھر کتنی مشقت سے گزر کر وہ ہمیں خط پوسٹ کرواتی ہیں ہمیں اس کا بخوبی اندازہ ہے۔ ہم ان کی محبت کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ خط کیوں شائع نہیں ہوا۔ اس کی وجوہات ہم کئی بار بتا چکے ہیں۔ اب تو ساری قارئین پڑھ پڑھ بیزار ہو چکی ہوں گی۔ اس لیے دوبارہ

نہیں دہرائیں گے۔

تبسم بشیر حسین نے شاہ سوار ڈنگہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ٹائٹل پر ایک نگاہ ڈالی تو ہٹانا مشکل ہوگئی پتوں کی جھالر کے پیچھے سے جھانکتی حسینہ دل میں کھب گئی سرخ گلاب میں سنہری تتلی جیسے اور کوثر آپی آپ نے پریشان کر دیا نام تبدیل کر کے پلیز، بتا دیں کیوں؟ بلوچستان کی پریوں کا خط اچھا تھا۔ اس کے بعد مسکراہٹیں، مجبوری، ماچس اور تلاشی دلچسپ لطیفہ تھے "باتوں سے خوشبو آئے" لاجواب تھا۔ تاریخ کے جھرو کے سلسلے بہت عمدہ ہے۔ "موسم کے پکوان" میں صرف دو ترکیبیں، نظم وغزل دونوں ڈائری کی زینت ٹھہریں، میری ماما کے بازو کا آپریشن ہوا ہے اس لیے پورا شمارہ نہ پڑھ سکی ہماری امی کے سوا ہمارا ہے ہی کون ابو اور بھائی کی وفات ہو چکی ہے اور ایک چھوٹی بہن ہے۔ "ناولٹ میں میری خواہش پر ایمل رضا کو لانے کا شکریہ "اباجی اور تیری چاہ میں دونوں ناولٹ لاجواب تھے۔

☆ پیاری تبسم! اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو صحت وسلامتی کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے۔ ہمیں اپنے قارئین کی کوئی بات بری نہیں لگتی۔ ہم تو تنقید کا بھی برا نہیں مانتے۔ بلکہ اس میں سے اپنی اصلاح کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ شعاع کی پسندگی کا شکریہ۔

گوجرانولہ سے ہما فاروق نے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

حمد، نعت اور دین کی باتیں ہمیشہ کی طرح لاجواب تھیں۔ سمیرا حمید کتاب کہانی میں بہت اچھے انداز سے رہنمائی کر رہی ہیں۔ "دستک" میں "یمنیٰ زیدی" کی کامیابی پڑھ کر دل کو خوشی ہوئی۔ بہت پسند آیا۔ افسانوں میں "امبر خالد" کا فارمولا کہانی "بہت مزے کا لگا۔ آنے والا اجالا بھی بہت اچھا تھا۔ مکمل ناول سارے کے سارے بہترین تھے۔ اشعار کے تمام سلسلے حسب معمول اچھے تھے۔

آپی "سائرہ رضا" سے کہیں کہ وہ نوال والی کہانی پھر لکھیں۔ سالگرہ نمبر، ناولٹ نمبر اور عید نمبر کے صفحات زیادہ کر دیا کریں پلیز۔ قیمت میں اضافہ بھی کر دیں۔ جب اچھا مواد اور زیادہ مواد پڑھنے کو ملے گا۔ تو پھر پیسے خرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

☆ پیاری ہما! آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے تعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔ صفحات میں اضافہ ہماری بھی دلی خواہش ہے لیکن مجبوری آڑے آتی ہے۔ کاغذ کی گرانی اور نایابی بہت بڑا مسئلہ بن گئی ہے۔

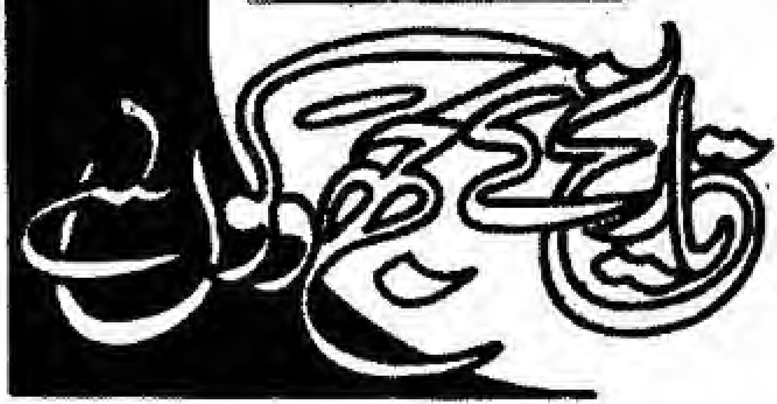
گجرات سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

شعاع دیکھتے ہی دل کی کلی کھل اٹھی نصاب اٹھا کر ایک طرف کیا اور شعاع کو سینے سے لگایا ویسے بھی ایم اے انگلش کی گونگی کتابیں کہاں اچھی لگتی ہیں۔ پہلی شعاع سے لے کر خوبصورت بننے تک کے سارے سلسلے جلدی جلدی دیکھے پھر سیدھا شہزاد پہ آ کر سانس لیا۔ شہزاد دی بیسٹ ہے۔ "خواب شیشے کا" میں جیسے ملاحہ نے سب کو شیشے میں اتارا ہوا تھا۔ "حال دل کھل چکا" ایک حقیقت پر مبنی کہانی، صائمہ اقبال نے بہت اچھا لکھا۔ ایمل رضا کی کیا ہی بات ہے۔ سب افسانے بھی اچھے رہے۔ آخر میں ایک سوال کہ کیا سماجی موضوعات پر لکھی جانے والی سنجیدہ کہانیاں قابل اشاعت ہیں۔

☆ پیاری خزیمہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ، ہم ہر طرح کی کہانیاں۔ شائع کرتے ہیں۔ شاید آپ نے نوٹ نہیں کیا، موضوع کوئی بھی ہوا اگر اچھے انداز میں لکھی گئی ہے تو یقیناً قابل اشاعت ہوگی۔



امتہ الصبور



انجام رقابت

نصیرالدین طوسی کی ہلاکو خان کے دربار میں بڑی عزت تھی۔ وہاں طوسی کا ایک حاسد بھی تھا۔ جو ہر وقت طوسی کے خلاف سازش میں مصروف رہتا تھا۔ اتفاقاً ان ہی دنوں ہلاکو کی والدہ بیمار تھیں۔ وہ تندرست نہ ہو سکیں اور ان کا انتقال ہوگیا۔

طوسی کے حاسد نے ہلاکو خان سے کہا۔ "جہاں پناہ! مرنے والے سے منکر نکیر قبر میں طرح طرح کے سوال کرتے ہیں۔ طوسی ایک عالم فاضل شخص ہے۔ طوسی کو والدہ محترمہ کے ساتھ دفن کرا دیجیے تاکہ یہ والدہ صاحبہ کی طرف سے منکر نکیر کو سوالوں کے صحیح جواب دے سکے۔"

ہلاکو خان نے طوسی سے اس مشورہ کا ذکر کیا۔ طوسی نے کہا۔ "بے شک قبر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر مجھے آپ اپنے لیے مخصوص رکھیں۔ کیونکہ ایک روز آپ نے بھی اس دنیا سے کوچ کرنا ہے۔ اپنی والدہ کے ساتھ اسی مشورہ گیر عالم کو دفن فرما دیں۔"

طوسی کی بات ہلاکو خان کے من کو لگی، اس طرح طوسی کے مشورے سے اتفاق کیا اور طوسی کے حاسد کو اپنی ماں کے ساتھ دفن کرا دیا۔

165 سال سے خوشبو

پیرس کے قریب ایک چھوٹا سا خوشبو دار قلعہ ہے جس کا نام شاتو دی مالمائزہ ہے۔ اس میں 165 سال سے مسلسل خوشبو آ رہی ہے۔ اس قلعہ میں نپولین کی بیوی جوزفین رہا کرتی تھی، ملکہ جوزفین کو خوشبوؤں سے بہت دلچسپی تھی اور اس کی کوشش تھی کہ نہ صرف وہ خود مشک میں نہاتی رہے بلکہ قلعے کے کونے کونے میں اس کی پسندیدہ خوشبو مشک بسی رہے۔ ملکہ جوزفین کی موت اس قلعے میں 1814ء میں واقع ہوئی۔ اس کے بعد فرانس کی مختلف اہم شخصیتوں نے یہ قلعہ خریدا لیکن کوئی بھی مالک کوشش کے باوجود مشک کی خوشبو دور نہ کر سکا۔ خوشبو کے ماہرین کا کہنا ہے یہ قلعہ جو آج بھی عجائب گھر ہے جب تک برقرار رہے گا اس کے درودیوار خوشبو میں بسے رہیں گے۔

شاہین بشارت کنول...... کراچی

خواب

یحییٰ بن اکثم کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مامون الرشید کے کمرہ میں سو رہا تھا۔ مامون بھی قریب ہی محو خواب تھا۔ مامون نے مجھ کو جگا کر کہا کہ دیکھنا کہ میرے پاؤں کے قریب کوئی چیز ہے۔ میں نے دیکھ کر کہا کچھ نہیں ہے لیکن مامون کو اطمینان نہ ہوا۔

اس نے فراشوں کو آواز دی۔ انہوں نے شمع جلا کر روشنی میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کے بچھونے کے نیچے ایک سانپ بیٹھا ہے، میں نے مامون سے کہا آپ کے کمالوں کے ساتھ آپ کو عالم الغیب بھی کہنا چاہیے۔ مامون نے کہا۔ "معاذ اللہ یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ بات صرف یہ تھی کہ میں نے ابھی خواب میں دیکھا ہے کہ کوئی شخص مجھ سے کہتا ہے کہ اپنے آپ کو ننگی تلوار سے بچاؤ، میری آنکھ کھل گئی اور میں نے سوچا کوئی حادثہ قریب ہی ہونے والا ہے۔ سب سے قریب بچھونا ہی تھا لہٰذا میں نے بچھونے کو دیکھا اور سانپ نکلا۔"

قدسیہ یاسمین...... بھکر

کتاب کہانی

سمیرا حمید

قارئین کا کہنا ہے کہ میں کچھ کتابوں کے بارے میں بات کروں اور پڑھنے کے لیے تجویز کروں۔ جو اردو میں ہوں اور آسانی سے مل بھی سکیں۔ سب سے پہلے تو میں آپ سب سے یہ کہوں گی کہ آپ اردو کے ادیبوں کی کتابیں پڑھیں۔ یعنی انہوں نے جو بھی لکھا ہے، جس بھی موضوع پر لکھا ہے، سب پڑھیں۔

یہ کتابیں آپ کے مزاج کے مطابق ہیں، مزاج کے مطابق نہیں ہیں، پھر بھی انہیں پڑھیں۔ وہ مشہور کتابیں ہیں یا غیر معروف۔ وہ تھوڑی مشکل ہیں یا آسان۔ بس انہیں پڑھ لیں۔ ہمارا "اپنے ادب" کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔ اگر ہم اپنی کتابیں نہیں پڑھیں گے تو کون پڑھے گا۔ ہر رائٹر کی کم سے کم ایک دو کتابیں تو آپ کو ضرور پڑھ لینا چاہئیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے خدیجہ مستور کا ناول "آنگن" تجویز کروں گی۔ ناول "آنگن" تقسیم ہند کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ انسانی جذبات، خاندانی اقدار، محبت اور پھر بدلتے وقت کی سنگ دلی کی کہانی ہے۔ دنیائے ادب میں بہت کم کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ سفر کریں یا جن میں وقت قید ہو۔ خوش قسمتی سے ہمارے ادب کے ناول "آنگن" میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔

آپ پہلا صفحہ کھولتے ہیں اور آپ اس وقت میں پہنچ جاتے ہیں جس وقت میں یہ کہانی لکھی گئی ہے۔ ہر چیز آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ چونکہ ہم نے اپنا ملک بڑی جدوجہد اور بہت سی قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے تو ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ وقت کیسا تھا جب پاکستان کے قیام کے لیے جدوجہد کی جارہی تھی۔ ہجرت نے کیا قیامت ڈھائی۔ ملک کی تقسیم نے اور کیا کیا تقسیم کردیا تھا۔

اس کے علاوہ میں یہ تین کتابیں تجویز کررہی ہوں۔ جو لوگ صرف کہانیاں، ناول وغیرہ پڑھنے کے عادی ہیں، میں یہ چاہوں گی کہ وہ نئی طرز کی ان کہانیوں کو بھی ضرور پڑھیں۔ جو کہانی کے انداز میں تو نہیں لکھی گئیں لیکن ہمیں بہت سی کہانیاں سنا دیتی ہیں۔

میرا داغستان ......از رسول حمزہ توف:

"بہار کا موسم گانا گانے کے لیے موزوں ہے اور سرما کا موسم کہانی سنانے کے لیے۔"

"رسول حمزہ توف" داغستان کے بہت بڑے اور عوامی شاعر ـــــ ہیں۔ ان کی شاعری دنیا بھر میں پڑھی جاتی ہے۔ کچھ نظمیں تو زبان زد عام ہیں۔ "میرا داغستان" ان کی پہلی اور آخری نثری کتاب ہے۔ یہ ان کے ملک "داغستان" کے بارے میں ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر جب نثر لکھتا ہے تو کیسا کمال کرتا ہے۔

میں نے بہت سی ایسی کتابیں پڑھی ہیں جن میں ملک موجود تھے، ایسی کتاب پہلی بار پڑھی ہے جس میں ملک "آباد" ہے۔ سانس لے رہا ہے۔ کھلیان لہلہا رہے ہیں۔ جھرنے بہہ رہے ہیں۔ گیت اور اقوال کانوں میں پڑ رہے ہیں۔ آپ ایسے سمجھ لیں کہ دنیا بھر کے جتنے ساز ہیں، اور جتنی خوش کن آوازیں ہیں، وہ اس کتاب کے الفاظ کے ذریعے گنگناتی ہیں۔ کم از کم مجھے تو یہ کتاب کسی خوبصورت گیت کی طرح لگتی ہے۔

قصے کہانیوں کا انوکھا جہاں۔ پڑھتے جائیں، پڑھتے جائیں اور احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم داغستانی نہیں ہیں۔ ہمیں آوار زبان نہیں آتی۔ ہم ابوطالب سے واقف نہیں ہیں اور ہم نے کبھی پاپوش نہیں پہنی (ٹوپی)۔ اس کتاب کا سب سے خوب صورت کردار ابوطالب ہے۔ جو بے حد معصوم اور بے حد ذہین ہے۔

اس کتاب سے ایک اقتباس

"محمود ایک عظیم شاعر تھے جن کا واحد موضوع مریم کے ساتھ ان کا ناکام عشق تھا۔ ایک بار ان کے دوست نے بچے کے لیے لوری لکھنے کی فرمائش کی۔ محمود نے فرمائش پوری کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ انہوں نے لوری اس لیے لکھی کہ بچہ آرام سے سو سکے لیکن یہ لوری سن کر وہ اور بھی رونے لگا۔ ایک دوسرے دوست نے مرحوم بیوی کے لیے مرثیہ لکھنے کے لیے کہا تو یہ کوشش بھی بے کار رہی۔ کیونکہ مرثیہ سننے کے بعد کسی کی آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکا۔ الٹا لوگ مسکرانے لگے۔ لیکن محمود نے مریم کے ساتھ اپنے ناکام عشق کے بارے میں جو نظمیں لکھیں، انہیں سن کر آج بھی لوگ رو دیتے ہیں۔"

بابا صاحبا......از اشفاق احمد:

"قرآن پاک حکم ہے اللہ تعالیٰ کا۔ حکم ماننا ضروری ہے، جاننا ضروری نہیں۔"

ہم سب جانتے ہیں کہ اشفاق احمد "قصہ گو" تھے۔ انہیں بات کرنے کا فن آتا تھا۔ اس کتاب میں وہ اس فن کے عروج پر ہیں۔ یہ کتاب ان کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات، کرداروں، قصے کہانیوں، سوچ، تدبر، اور صوفی فکر و عمل کی نمائندگی کرتی ہے۔ الفاظ میں یہ سمجھا دینا بہت مشکل ہے کہ دراصل یہ کتاب کیا ہے۔ یہ ایک ایسے سفر کی داستان

ہے، جسے زندگی درزندگی کیا جاتا ہے۔

اس کتاب میں روم کے قصے ہیں، اٹلی کی باتیں ہیں۔ چارلی چیپلن سے ملاقات کا ذکر ہے، سان مرینو کی سیر کا احوال ہے۔ محترم بابوں کی باتیں اور ان کے روحانی احوال کا ذکر ہے۔ مہاجر کیمپوں کی تباہ حالیوں اور نانی زلیخا کے فطری لالچ کی پردہ کشائی ہے۔

میرے نزدیک کتاب کا سب سے بہترین حصہ وہ ہے جس میں اشفاق احمد نوبل انعام یافتہ سائنس دان سر الیگزینڈر فلیمنگ جو پینسلین کے موجد ہیں، سے ملاقات کرتے ہیں۔ اس حصے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عظیم لوگ عظیم کیوں کہلاتے ہیں۔ وہ کون سی خوبیاں ہوتی ہیں جو ان کے اندر موجود ہوتی ہیں اور جنہیں اللہ پسند کرتا ہے۔ فلیمنگ وہ عظیم انسان ہیں جنہوں نے اپنی ایجاد یا دریافت ''پینسلین'' کو انسانیت کی خدمت کے لیے مفت بانٹ دیا تھا۔

اس کتاب کا یہ اقتباس پڑھیے ان ہی کی زبانی۔

''رات میں اپنا ٹائپ رائٹر نکال کر منشیوں کی طرح بیٹھا اور بڑے غور و انہماک سے شرطیں ٹائپ کرنے لگا۔ شرطیں کچھ سخت تھیں اور ساری ہی میرے حق میں تھیں۔ اس ایجاد کی وجہ سے اتنی رقم مل رہی تھی کہ اس نے مجھے دیمک کی طرح چاٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے لکھا کہ یہ دریافت میری ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ یہ ایک عطیہ ہے جو مجھے امانت کے طور پر ملا ہے۔ اس دریافت کا عطا کنندہ خدا ہے اور اس کی مالک پوری ''خدائی'' ہے۔ میں اس دریافت کو عام کرتا ہوں اور اس بات کی اجازت دیتا ہوں کہ دنیا کا کوئی ملک، کوئی شہر، کوئی انسان یا معاشرہ جہاں بھی اسے بنائے وہ اس کا انسانی اور قانونی حق ہو اور میرا اس پر کوئی حق نہیں۔''

یاد رہے کہ دس فیصد رائلٹی پر سر فلیمنگ کو اتنا پیسہ مل رہا تھا جو دو مغربی ملکوں کے سالانہ بجٹ کے برابر تھا۔ جو تاحیات ملنا تھا، اور بڑھ کر اتنا ہو جاتا کہ اس دولت کو شمار ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اتنی دولت کو ''ناں'' کہہ کر انسانیت کی خدمت کے لیے ایجاد کو مفت قرار دے دینا، عظیم لوگوں کا وصف ہی ہو سکتا ہے۔

تو یہ کتاب ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جو اشفاق احمد کے ساتھ پیش آئے۔ جن عظیم لوگوں سے وہ ملے۔ یہ ان کتابوں میں سے ایک ہے جسے جتنی بار پڑھیں، ہر دفعہ نئے معنی اخذ کریں۔ نئے جہاں اپنے سامنے پائیں۔ یہ کتاب عشق مجازی (دنیا) اور عشق حقیقی کا امتزاج ہے۔ وہ ادب خوش قسمت ہوتا ہے، جسے ایسی کتابیں نصیب ہوتی ہیں۔

اس کتاب سے ایک اور اقتباس

''انسانی تاریخ میں صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ مہاجر آئے تو انصار نے اپنے گھروں سے نکل کر ان کا استقبال کیا۔ انصار لڑکیاں دف لے کر مہاجروں کے سردار کے انتظار میں استقبالیہ گاتی ہیں۔ بس یہ ایک ہی موقع تھا جب بھائی چارے نے انسانیت کے سب سے اونچے مقام پر پہنچ کر نیچے فرشتوں کو اپنے اپنے کام میں مصروف و مشغول دیکھا۔ اس کے بعد پھر ایسا نہیں ہوا۔ کسی نے خوش دلی سے پناہ گزینوں کو قبول نہیں کیا۔''

ایک ترک خاندان ......از عرفان اور گا۔ (اردو ترجمہ)

عرفان اورگا اس کہانی کے قصہ گو ہیں۔ جو ترک تھے اور اپنے خاندان کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کی پیدائش کے وقت ماں کی عمر پندرہ سال اور باپ کی بیس سال تھی۔ دادی، دادا، ماں باپ اور عرفان، عظیم الشان نیلی مسجد کے عقب میں شاندار سے گھر میں رہتے تھے۔ گھر اور سمندر کے درمیان پتلی سی دیوار تھی۔ ماں انتہائی خوب صورت اور خوش لباس خاتون تھیں اور دادی بڑے اہتمام

اور جاہ وجلال کے ساتھ زرق برق بگھی میں بیٹھ کر حمام جایا کرتی تھیں۔ سیب کے درخت کی شاخوں سے لٹکتا عرفان، بحیرہ مامور سے گزرتی ہوئی کشتیوں کو دیکھا کرتا تھا۔

لیکن جنگ شروع ہوتے ہی سب کچھ بدل جاتا ہے۔ عرفان اورگا کا سارا خاندان' گھوڑے بگھیاں' ماں کی خوش لباسی اور دادی کی خوش ذوقی' خاندانی جاہ وجلال' زندگی کی سہولیات' سب آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے۔ عرفان کے والد جنگ کے لیے بلا لیے جاتے ہیں۔ دادا وفات پا جاتے ہیں اور سب کچھ بدل جاتا ہے۔ عورتیں اکیلی رہ جاتی ہیں۔ گھر جل جاتا ہے' املاک تباہ ہو جاتی ہیں۔ صندوق میں پڑے پیسے (لیرے) اور زیورات سب راکھ ہو جاتے ہیں۔

پھر ایک وہ وقت آتا ہے کہ یہ خاندان روٹی کے چند لقموں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ خوب صورت ماں غربت کی چکی میں پس کر بدحال ہو جاتی ہے۔ باپردہ عورتیں روٹی کے لیے دربدر ہو جاتی ہیں۔

اس کتاب کا یہ اقتباس پڑھیں

''ایک روز ماں کو روٹی تلاش کرنے میں معمول سے زیادہ مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ بعد میں ہماری تمام دنیا لفظ ''روٹی'' کے گرد گھومنے لگی۔ صبح کا زیادہ وقت نان بائی کی دکان پر گزارنے کے بعد وہ خالی ہاتھ اور مایوس لوٹ آئیں۔ دوپہر کے بعد ایک بار پھر بازار گئیں۔ لیکن نتیجہ وہی صفر۔''

حقیقتیں تلخ ہوتی ہیں لیکن اپنے خاندان کی کہانی بیان کرتے ہوئے بھی رائٹر کا قلم تلخ نہیں ہوا۔ یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ کتاب کا اسلوب ڈراؤنے خواب کو بھی بڑے سبھاؤ سے بیان کرتا ہے۔

''ایک ایک کر کے سب کچھ بک جاتا ہے۔ پھر چند سالوں بعد بس ایک سونے کا طشت بچتا ہے جو کہ دادی کی شادی کا تحفہ تھا۔ یہ طشت اب تک کسی طرح سے بکنے سے بچا رہا ہے۔ اور اب دادی اسے بیچنے جا رہی ہیں۔ (دادی کو عام دادی نہ سمجھیں)''

دیکھیں ان کے جانے کا اور آنے کا منظر مصنف کے قلم سے:

''جب وہ بازار جانے لگیںؒ تو انہوں نے نہایت محتاط طریقے سے لباس کا انتخاب کیا اور جیولری پہن لی۔ وہ تیار ہو کر نکلیں تو پوری گلی انہیں دیکھنے کے لیے اُمڈ پڑی۔ ہمارے ہمسائے مرعوب تھے کہ کیا نایاب اور زبردست طشت تھا۔ انہیں طشت کی قیمت پر شبہ تھا کہ جانے دادی کیا بھاؤ لگائیں۔ اصل قیمت سے کم نہ لے آئیں۔

پھر وہ روانہ ہوئیں۔ ساری گلی' سب لوگ' ان کی واپسی کے انتظار میں نظریں بچھائے بیٹھے رہے۔ جب دادی واپس آتی نظر آئیں تو ہجوم ان سے ملنے کو آگے بڑھا۔ ان کے ہاتھ میں کئی بنڈل تھے۔ دادی سب لوگوں کی توقع سے کہیں زیادہ کامیابی سے واپس آئی تھیں۔ دادی طشت کو اچھی' بلکہ بہت اچھی قیمت پر بیچ آئی تھیں۔''

اس کتاب میں ایک خاندان کی نہیں ایک دور کی کہانی ہے۔ یہ کہانی ہے جنگ اور جنگ کے بعد کے حالات کی۔ ترکی اور ترکوں کی۔ یہ ایک ترک خاندان کی نہیں، ہر ترک خاندان کی کہانی ہے۔ اس میں ایک نہیں کئی بے مثال کردار موجود ہیں۔ واقعات سبق آموز ہیں اور بے حد دلچسپ بھی۔ جہاں آنکھیں نم ہوتی ہیں تو وہاں بے ساختہ قہقہہ بھی چھوٹ جاتا ہے۔

یہ کتاب ایک ایسی فلم ہے جو اس دور کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو کچھ ایسے بیان کرتی ہے کہ آپ آنکھ نہیں جھپک پاتے۔

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

ہرا مسالا چکن

اجزاء۔

چکن	ڈیڑھ کلو
زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا	آدھی پیالی
ادرک لہسن پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچہ
تلی ہوئی پیاز	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ہری مرچیں	پانچ عدد
پودینے کے پتے	آدھا پیالی
تیل	آدھا کپ

ترکیب۔

چکن میں نمک اور لیموں کا رس ملا کر آدھے گھنٹہ کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد باقی تمام اجزا کو پیس لیں اور اس آمیزے کو چکن پر لگا کر مزید آدھے گھنٹہ کے لیے رکھ دیں پھر ہلکی آنچ پر پکائیں جب پانی خشک ہو جائے اور چکن پک جائے تو اتار لیں۔ (چاہیں تو اوون میں بھی بیک کر سکتے ہیں۔)

مزے دار ہرا مسالا چکن تیار ہے۔

مایونیز

کھانے کا تیل	ایک کپ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
سرکہ	ایک چائے کا چمچہ
انڈے کی سفیدی	دو عدد
لیموں کا رس	ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ (پسی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
گرم پانی	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب۔

گرائنڈر میں تیل، انڈا، نمک، چینی، اور پسی ہوئی، کالی مرچ ڈال کر پھینٹ لیں۔ اس میں لیموں کا رس، سرکہ اور پانی ڈالیں اور اچھی طرح گرائنڈ کر لیں۔ خوب جھاگ بن جائیں تو اسے نکال کر کسی برتن میں محفوظ کر لیں۔ مزے دار مایونیز تیار ہے۔ اگر گرائنڈر نہ ہو تو کانٹے سے اچھی طرح پھینٹیں۔ جب جھاگ اوپر آ جائیں تو پھر نکال لیں۔

ملائی قلفہ فالودہ

دودھ	ایک لیٹر
چینی	ایک کپ
ڈبل روٹی	دو سلائس
پسی الائچی	ایک چمچہ
کھویا	ایک پاؤ
کیوڑہ	ایک چمچہ
کریم (بالائی)	ایک کپ
بادام، پستے	حسب ضرورت
فالودہ کی سویاں	حسب ضرورت

ترکیب۔

ایک برتن میں دودھ ڈال کر ابال لیں۔ پھر اس میں چینی ڈال کر دس منٹ تک ابالیں۔ اب اس میں کھویا، ڈبل روٹی کے دو سلائس اور بالائی یا کریم ڈال کر ابالیں اور گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ برتن میں ڈال کر ٹھنڈا ہونے کے لیے فرج میں رکھ دیں۔ پھر اس میں بادام' پستے' الائچی اور کیوڑہ ڈال کر اچھی طرح پھینٹیں۔ اگر گرائنڈر میں پھینٹیں تو زیادہ اچھا ہے۔ پھر فرج میں رکھ دیں۔ فالودہ سویوں کے ساتھ پیش کریں۔

واصفہ سہیل



شرط

1994ء کے ہاکی ورلڈکپ فائنل میں ہالینڈ کے خلاف فیصلہ کن پینلٹی اسٹروک روک کر منصور احمد نے پاکستان کو چوتھی بار عالمی چیمپئن بننے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ وہی منصور احمد آج جناح اسپتال کے امراض قلب کے شعبے میں داخل ہیں۔ امراض قلب کے شعبے کے ڈاکٹروں نے ہاکی لیجنڈ منصور احمد کی ہیلتھ سمری دینے سے انکار کردیا ہے۔ شاہد خان آفریدی فاؤنڈیشن جس نے ہاکی لیجنڈ کے علاج کا بیڑہ اٹھایا ہے، وہ ہیلتھ سمری کی منتظر ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہیلتھ سمری کے بغیر غیر ملکی ڈاکٹر ان کا علاج نہیں کرسکتے۔ امراض قلب کی ایک خاتون ڈاکٹر منصور احمد کو ہر حال میں ڈسچارج کرنے پر بضد ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی ضد ہے کہ ہیلتھ سمری چاہیے تو شاہد آفریدی خود بات کریں (ہم شاہد



سعادت

معروف ثناء خوا آمنہ بنت طاہر کی پہلی آڈیو ویڈیو البم ریلیز کردی گئی ہے۔

ضلع اٹک کی تحصیل پنڈی گھیب سے تعلق رکھنے والی آمنہ بنت طاہر کی آڈیو ویڈیو کی ریلیز کے سلسلے میں کراچی پریس کلب کی ادبی کمیٹی کے زیر اہتمام ایک خوب صورت تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے تعلق رکھنے والی نمایاں شخصیات نے شرکت کی۔ تقریب سے اطہر جاوید، صوفی علاؤ الدین، ہمدم خانزادہ اور صدف منیر نے خطاب کیا۔

نظامت کے فرائض عبدالواسع قریشی نے ادا کیے۔ مذکورہ البم میں حضرت امیر خسرو، مولانا رومی، صفی حیدر اور دوسرے شعرا کا کلام شامل ہے۔ جب کہ طرز نگاری کی سعادت تنویر آفریدی کو حاصل ہوئی۔



آفریدی سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ ان بے حس لوگوں سے بات کرلیں جو ایک لیجنڈ کے علاج سے متعلق شرطیں عائد کررہے ہیں ویسے جب لیجنڈ کے ساتھ یہ رویہ ہے تو عام لوگ تو......؟)

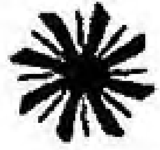
اعزاز

مومنہ مستحسن کو بین الاقوامی جریدے فوربس نے براعظم ایشیا کے ان نوجوانوں کی فہرست میں شامل کیا ہے جو تیس سال سے کم عمر ہیں اور اپنے شعبے میں انتہائی کامیاب ہیں۔ مومنہ کہتی ہیں کہ "میں بہت خوش ہوں کہ فوربس نے مجھے تیس سال سے کم عمر کامیاب لوگوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ 2018ء میرے لیے کام کرنے کا سال ہے۔ میں جلد ہی کچھ اعلان کرنے والی ہوں جو کہ گھریلو تشدد کا شکار خواتین اور ان کو ہنر مند بنانے کے حوالے سے ہوگا۔ ان کے ذریعے ہم خواتین کو معاشرے کا بہتر رکن بنائیں گے (مومنہ! خواتین کو بہتر رکن بنانے کے بجائے مردوں کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے)۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے کام کرنے کا موقع دیا، سخت محنت رنگ لائی ہے۔"

وجہ

فلم اسٹار صائمہ کا کہنا ہے کہ وہ فلم انڈسٹری سے دور ہوئی ہیں نہ وہ ایسا سوچ سکتی ہیں۔ صائمہ نے مزید کہا کہ "ان کو پاکستان فلم انڈسٹری نے پہچان اور عزت دی ہے، وہ کس طرح فلم انڈسٹری سے کنارہ کش ہوسکتی ہیں" (جیسے اب ہوئی ہیں بھئی) کوئی ان کو فلم اسٹار کہے تو وہ فخر محسوس کرتی ہیں (یہ تو سب کے ساتھ ہے۔)

صائمہ اس وقت لاہور سے کراچی شفٹ ہوچکی ہیں اور ٹی وی ڈراموں میں کام کررہی ہیں (یعنی صائمہ کو ٹی وی راس آگیا) اس وجہ سے ان کے پاس فلم میں کام کرنے کا وقت نہیں۔ (ویسے ٹی وی ڈراموں کے بعد پھر ان فلموں میں کام کرنا مشکل ہی ہے کیوں کہ......) صائمہ کا اس بارے میں کہنا ہے کہ انہیں فلموں میں کام کرنے کی آفرز ہیں لیکن ڈراموں میں مصروفیت کی وجہ سے وہ فلم کو وقت نہیں دے پارہی ہیں۔" (ویسے کون سی فلمز صائمہ! بھئی جن کو وقت نہیں دے پارہیں۔)





ادارہ

خوبصورت بنیے

گرمیوں میں جلد کی حفاظت

1۔ گرمیوں کی تیز دھوپ جلد کو بہت نقصان پہنچاتی ہے۔ اگر آپ باہر نکلتی ہیں تو چہرے کو دھوپ کی شعاعوں سے بچائیں اور ممکن ہو تو سن اسکرین استعمال کریں۔

2۔ ایک چمچہ دہی میں ایک چمچہ شہد اور ایک چٹکی ہلدی ملا کر پیسٹ بنالیں۔ اسے جلد پر لگائیں۔ 15 منٹ لگائے رکھیں پھر پانی سے اسے دھودیں۔ ہفتے میں ایک بار اس پیسٹ کا استعمال کریں۔

3۔ گرمیوں میں دودھ آپ کی جلد کے لیے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ دودھ میں شہد اور بیسن ملا کر پیسٹ بنالیں اور ہفتے میں ایک بار اس کا استعمال کریں۔

4۔ گرمیوں میں ملتانی مٹی کا ماسک زیادہ مفید ہوتا ہے ملتانی مٹی کو دودھ میں گوندھ کر پتلا سا پیسٹ بنالیں اور چہرے پر اس کا اچھی طرح لیپ کرلیں۔ خشک ہوجانے کے بعد پانی سے دھوڈالیں۔ آپ کا چہرہ تروتازہ نظر آئے گا اور چہرے پر چمک بھی پیدا ہوجائے گی۔

5۔ گرمیوں میں اکثر چہرے پر کیل مہاسے نکل آتے ہیں آپ کے چہرے پر کیل مہاسے نکلتے ہیں تو سب سے پہلے غذا پر توجہ دیں۔ جنک فوڈ بالکل نہ کھائیں۔ دن میں تین سے پانچ مرتبہ چہرہ دھوئیں تاکہ مسامات سے جراثیم اور زائد چکنائی نکل جائے۔ دن میں کم از کم دو لیٹر پانی پئیں، سبزیوں کا استعمال زیادہ کریں۔

6۔ کیل مہاسوں سے نجات کے لیے آٹھ سے دس پودینے کی پتیوں کا قہوہ بنالیں اور روزانہ بلاناغہ پیئیں۔ پودینہ تیزابیت دور کرتا ہے اور اس سے قبض بھی رفع ہوجاتا ہے۔

7۔ ایلوویرا کا گودا دو چائے کے چمچ، پودینے کے پتے دس عدد، دونوں کو اچھی طرح پیس کر کریم بنالیں اور رات کو سوتے وقت چہرے پر لگائیں، اس سے دو سے تین دن میں دانے مندمل ہوجائیں گے اور چہرے کے داغ دھبے اور چھائیاں بھی دور ہوجائیں گی، ایلوویرا دن میں ہرگز نہ لگائیں۔ اس سے رنگ خراب ہوتا ہے صرف رات کو سوتے وقت لگائیں۔ مکمل علاج کے لیے مسلسل ایک ماہ لگاتار لگائیں۔

بالوں کی دیکھ بھال

گرمیوں کا موسم جہاں جلد کے لیے مشکل ثابت ہوتا ہے وہاں اکثر خواتین کو بالوں کی حفاظت کی فکر بھی رہتی ہے۔ خاص طور پر گرمی کے موسم میں سر کی جلد چکنی ہوجاتی ہے۔ اس کے لیے درج ذیل تدابیر اختیار کریں۔

1۔ بالوں کو ہفتے میں دو سے تین بار شیمپو کریں تاکہ سر کی چکنائی کو دور کرسکیں۔ بالوں کے اختتامی سروں کی طرف کنڈیشنر لگائیں۔

2۔ تیز دھوپ میں نکلیں تو بالوں کو ڈھانپ کر رکھیں۔

3۔ ہفتے میں دو بار بالوں میں تیل لگا کر مساج کریں، اس سے بالوں میں چمک پیدا ہوتی ہے۔

3۔ متوازن غذا کا استعمال کریں یہ دلیہ، دہی، انڈے، مچھلی اور بادام وغیرہ بالوں کے لیے بہترین غذائیں ہیں، اس کے برعکس جنک فوڈ اور سوڈا مشروبات ــــــ بالوں کے لیے بہت نقصان دہ ہیں۔

4۔ شیمپو لگانے سے پہلے بالوں کو اچھی طرح گیلا کریں اور شیمپو کرنے کے بعد انہیں ٹھیک طرح دھوئیں۔ شیمپو کے بعد بالوں کو اچھی طرح دھویا نہ جائے تو سر سے تیل خارج ہونے لگتا ہے اور کھجلی شروع ہوجاتی ہے۔ بالوں کی چمک غائب ہوجاتی ہے اور وہ روکھے نظر آتے ہیں۔